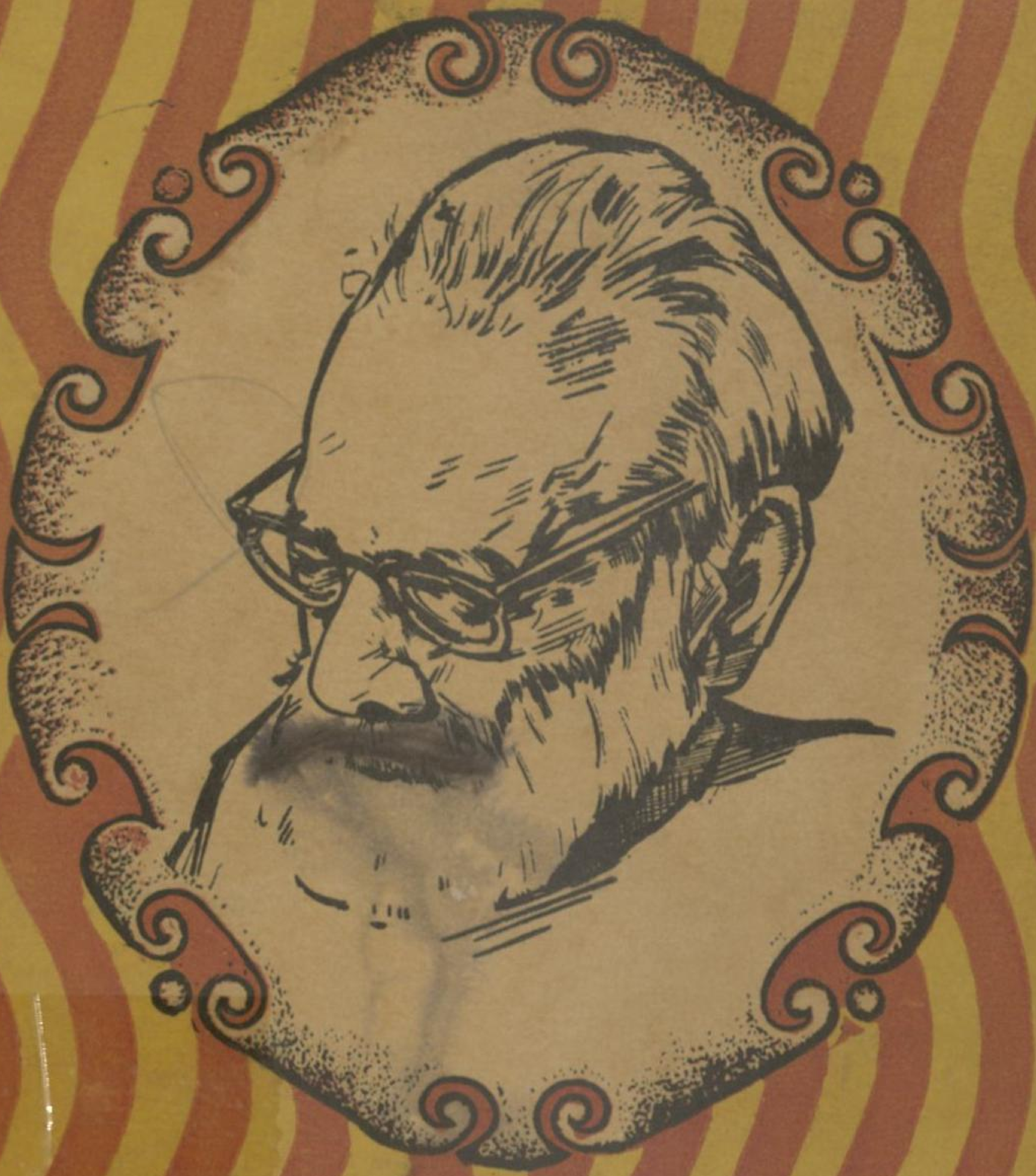


# مقدماتِ عبدالحق

اضافہ شدہ ایڈیشن

# مقدماتِ عبدالحق

# مقدّماتِ عبدالحق

(اضافہ شدہ)

مرتبہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ام۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

اُستاد شعبۂ اُردو و ثقافتِ پاکستان

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز

یونیورسٹی آف لندن

اُردو مرکز ۰ لاہور

پہلا پاکستانی ایڈیشن — ۱۹۶۴ء

تعداد — ۱۰۰۰

ناشر — اردو مرکز لاہور

طابع — اشرف پریس لاہور

قیمت اعلیٰ ایڈیشن — ۱۷ روپے پچاس پیسے

قیمت معمولی ایڈیشن — ۱۲ روپے پچاس پیسے

صدر دفتر

اُردو اکیڈمی سندھ

بہادر شاہ مارکیٹ کراچی

# فہرست

## نثر

## لسانیات



## متفرقات

## رسائل

# پیش لفظ

مقدماتِ عبدالحق عرصہ ہوا میرزا محمد بیگ صاحب نے مرتب کرکے دو جلدوں میں حیدرآباد سے شائع کئے تھے۔ اشاعت کے بعد ان مقدمات کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور انھیں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بہت تھوڑے عرصے میں ان کا پہلا اڈیشن ختم ہوگیا۔ ایک زمانے تک نایاب رہے۔ اس لئے آج سے چند سال قبل میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اِن مقدمات کو اُن کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر از سرنو ترمیم، تصحیح اور اضافے کے ساتھ شائع ہونا چاہیئے۔ میں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن پھر میرے اصرار پر انھوں نے نہ صرف اِن کو از سرنو مرتب کرکے شائع کرنے کی اجازت دے دی بلکہ تصحیح کے خیال سے ان کو ایک نظر دیکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ میں نے مرزا محمد بیگ صاحب کے مرتب کیئے ہوئے مقدمات کی دونوں جلدیں فراہم کیں۔ اور ان کے علاوہ اُن مقدمات کو بھی جمع کیا جو اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم نے ان سب پر نظر ثانی کی اور ترمیم و اضافے کے بعد ان کا مسودہ مجھے اشاعت کے لئے دیا۔ اب یہ تمام مقدمات ایک جلد میں یک جا کرکے شائع کیے جاتے ہیں۔

ایک عظیم ادبی شخصیت میں اپنے فن کے ساتھ ایک طرح کی بے نیازی ضرور ہوتی ہے۔ فن کار کو اپنی فنی تخلیق محبوب تو ہوتی ہے لیکن وہ اس کو مکمل نہیں سمجھتا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں بھی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جب بھی وہ اپنی تحریروں کو دیکھتے تو یہی کہتے کہ جب میں ان کو پڑھتا ہوں تو یہ میری نظر سے گر جاتی ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے،

اور اسی لیئے ان کو کتابی صورت میں شایع نہیں ہونا چاہیئے ۔ میرے اصرار پر انھوں نے جب ان مقدمات کی تصحیح کی اور ان کا مسودہ مجھے واپس بھیجا تو اپنے خط میں ان خیالات کا اظہار کیا :-

”مقدمات کی پہلی جلد تصحیح کے بعد بھیجتا ہوں ۔ یہ بے حد غلط چھپے ہیں اور خراب چھپے ہیں ۔ تصحیح میں میرا بہت سا وقت ضائع ہوا ۔

مرزا محمد بیگ صاحب نے یہ مقدمات مرتب کیئے تھے ۔ جب اُن سے میں نے ذکر کیا کہ میرے دوست ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اسے دوبارہ مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے ہیں تو اُنھوں نے دونوں جلدیں مہیا کر کے مجھے عنایت فرمائیں اور ان مقدمات کے بارے میں جو خط و کتابت اُن میں اور نواب صدر یار جنگ (مولوی حبیب الرحمٰن شروانی) اور مجھ میں اور مرزا صاحب میں ہوئی تھی اُس کی نقل بھی عنایت فرمائی جو میں آپ کو بھیجتا ہوں ۔ آپ اپنے مقدمے میں ان سے (مناسب سمجھیں تو) کام لے سکتے ہیں ۔ دوسری جلد اس کے بعد دیکھ کر بھیجوں گا ۔

مقالات کے بارے میں آپ جو فرمائیں گے تعمیل کی جائے گی ۔

اس مرتبہ جو میں نے اپنے مقدمات پڑھے تو یہ میری نظر سے گر گئے ۔ میری رائے میں ان کا شائع کرنا کچھ مفید نہ ہوگا ۔ آپ اس پر غور کر لیجیئے ۔ ان پر محنت ، وقت اور روپیہ صَرف کرنا بے سود تو نہ ہوگا ۔ آپ بے رو رعایت اپنی رائے لکھیئے ۔ بعض مقدمے فضول اور بہت طویل ہیں ۔ اگر آپ کی قطعی رائے شائع کرنے کی ہو تو بعض کو مختصر کرنا ہوگا اور بعض بالکل خارج کر دیئے جائیں ۔

البتہ مقالات میں اکثر ایسے ہیں جو قابل اشاعت ہیں “

عبدالحق

میں نے ان خیالات کو ان کی شخصیت کی عظمت کا نتیجہ سمجھا ۔ اسی لیئے نہ تو طویل

مقدمات کو مختصر کیا اور نہ ان میں سے بعض خارج کئے۔ جس صورت میں یہ لکھے گئے تھے بالکل اسی صورت میں اِس وقت بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔

مولوی صاحب مرحوم نے ان مقدمات کے بارے میں جو خطوط مرزا محمد بیگ صاحب کو لکھے تھے، اُن کو بھی یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان سے نہ صرف مولوی صاحب کی شخصیت اور ان مقدمات کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بعض مقدمات کے بارے میں کچھ نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں — ان خطوط کی نقلیں مجھے ازراہِ نوازش مرزا محمد بیگ صاحب نے بھجوائی ہیں اور میں اس کے لئے اُن کا بہت شکر گذار ہوں۔

"شفیقی و مکرمی

عنایت نامہ اور اُس کے ساتھ چار مقدموں کی نقل پہنچی۔ میں نہیں چاہتا تھا اور کئی عنوان سے آپ سے عرض بھی کیا تھا کہ آپ معرکۂ مذہب و سائنس کو اس مجموعے میں داخل نہ فرمائیں لیکن آپ نہ مانے۔ تعجب ہے کہ یہ مقدمہ آپ کو پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ میرے نوٹ تھے جو میں نے مقدمے کے لئے تیار کئے تھے۔ ظفر علی خاں صاحب کو آپ جانتے ہیں۔ اُن کی طبیعت میں جلدبازی ہے۔ وہ آئے اور لے کر چل دیئے۔ اس کے بعد دفعتاً ان کا یہاں سے جانا ہوا میں نے بہت لکھا کہ اِسے واپس کر دو تو میں اصل مقدمہ جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ دوں مگر اُنھوں نے کاغذات واپس نہ کئے۔ اور یہ خیال کیا کہ شاید میں نہ لکھوں کاغذات تلف کر دوں اور آخر یہی چھپ گئے۔ مجھے یہ مقدمہ اس لئے بھی پسند نہیں کہ اگر میں اب لکھتا تو وہ کچھ اور ہوتا۔ یہ وجوہ تھے کہ میں چاہتا تھا کہ یہ مقدمہ اس مجموعے میں شائع نہ ہو۔ مگر میں اب آپ کو روک بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ شائع ہو چکا ہے لیکن اگر کبھی مجھے ان مقدمات کے چھاپنے کی توفیق ہوتی تو میں اسے

کبھی شامل نہ کرتا۔ بہر حال اب جو آپ کی رائے ہو۔ میں دیکھ کر بھیج دیتا ہوں۔
مقدمۂ کلام میر کو میں از سر نو لکھنے والا ہوں۔ اس میں کچھ تغیّر و تبدل کی ضرورت ہے۔

اس زمانے میں میں نے ایک اور مقدمہ لکھا ہے جو فرہنگ اصطلاحات علمیہ پر ہے۔ یہ کتاب انجمن کی طرف سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی اور صاحب لکھ دیتے۔ ایک صاحب نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وقت گذرتا چلا گیا اور وعدہ وفا نہ ہوا۔ جب دو روز رہ گئے میں نے خود لکھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس کتاب کی چند جلدیں جشن جوبلی میں علی گڈھ لے جاؤں۔ فوراً لکھا اور چھپوایا، راتوں رات کچھ کتابوں کی جلدیں بنوائیں اور جوبلی میں ساتھ لے گیا۔ آپ فرمائیں تو کتاب بھیج دوں۔ اسے ملاحظہ فرمالیجیے۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو شریک کر دیجیے۔

کیوں صاحب آپ نے ٹکٹ پھر بھیجے۔ آخر آپ مجھے کیوں بار بار نادم کرتے ہیں۔ آپ بھیجتے رہیں گے اور میں واپس کرتا رہوں گا۔ اس سے نتیجہ؟

مولانا شروانی کے عزم حج کی اطلاع سے مجھے بھی کھٹکا ہوا تھا کہ اب مقدمے کا خدا حافظ لیکن ان کے خط سے جس کی نقل آپ نے بھیجی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور لکھیں گے لیکن یہ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ وہ بہت دیر لگائیں گے۔

تعجب ہے کہ مقدمہ تمدنِ ہند آپ کو ابھی تک نہیں ملا۔ اڈیٹر الناظر کے پاس ضرور ہوگا۔ ان کے پاس اپنے رسالے کی تمام جلدیں مکمل موجود ہیں۔ وہ چند روز کے لیے مستعار دے سکتے ہیں یا نقل کروا کر بھیج سکتے ہیں۔ میں ہاشمی صاحب کو لکھتا ہوں کہ وہ پھر لکھیں اور تاکید کر کے منگوالیں۔

آپ عطیہ بیگم کے خطوط سے متردد نہ ہوں۔ اس سے مولانا شبلی کی منقصت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ نرے خشک مُلّا یا مولوی نہ تھے۔ بلکہ

لطیف انسانی جذبات بھی رکھتے تھے۔ وہ شاعر تھے اور عاشق مزاج بھی تھے اور یہ ان کے لئے عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس سے ان کی وقعت اور بڑھنی چاہئے۔ لوگوں کے سمجھنے اور بدگمانی کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ رائیں فوری ہوتی ہیں، صحیح فیصلہ زمانے کے ہاتھ ہے۔

مقدمات کے متعلق ایک بات اور عرض کرنا چاہتا تھا وہ یہ کہ اعظم الکلام اور تمدنِ ہند کے مقدموں میں ایک حصہ مصنفین کے ذاتی حالات کا ہے۔ یہ حصہ زیادہ قابل قدر ہے۔ کیونکہ اِن دونوں کے حالات اس نہج سے کہیں نہیں ملیں گے اور ان کے کاموں کو سمجھنے کے لئے اِن کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صاحبوں نے ان حالات کی بہت قدر کی تھی کیونکہ وہ اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان مصنفین کی سیرت کا پڑھنے والوں کو صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نامناسب نہ خیال فرمائیں تو یہ حصے بھی ضرور شریک کر دیجئے ورنہ جو آپ کی رائے ہو۔ مجھے کوئی اصرار نہیں۔ اس کتاب کی ترتیب وغیرہ آپ کی رائے اور ذوق پر موقوف ہے۔"

نیاز مند
عبدالحق

---

بجارہ روڈ حیدرآباد دکن
۱۲ر مارچ ۱۹۳۲ء

شفیق مکرم زاد لطفہٗ تسلیم

دو تین روز ہوئے مجھے مکتبۂ ابراہیمیہ سے مقدمات کا اول حصہ وصول ہوا۔ میں نے آپ کا دیباچہ اور شروانی صاحب کا مقدمہ پڑھا۔ آپ صاحبوں نے میری بابت جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں میں اس کا ہرگز مستحق نہیں ہوں۔ میں ایک

معمولی مزدور ہوں لیکن آپ نے اپنی عنایت سے مجھے معمار بنا دیا ہے۔ یہ میں انکساری سے نہیں کہتا بلکہ امر واقعی ہے۔ ایسی حالت میں میں حیران ہوں کہ شکر کروں یا شکایت یہ محض آپ کی کریم النفسی اور مروت ہے جو آپ میری نسبت ایسا حسن ظن رکھتے ہیں۔ ورنہ میں اپنی اور اپنے مقدمات کی حقیقت سے خوب واقف ہوں میرے شان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ کہ یہ مقدمات کبھی اس طرح کتاب کی صورت میں شائع ہوں گے۔ یہ صرف آپ کی قدردانی ہے جس کی بدولت انھیں یہ دن نصیب ہوا۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ علاوہ دوسرے کاموں کے لغات کا کام ایسا کٹھن ہے کہ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ اگرچہ مدد کے لیے پورا اسٹاف موجود ہے۔ لیکن اس کی دشواریاں ایسی ہیں کہ بعض وقت ہمت جواب دے دیتی ہے۔ وقت کم ہے اور کام بہت، اس لئے میں گوشہ نشین ہو گیا ہوں اور گذشتہ غفلت کی تلافی کرنا چاہتا ہوں اور ایک ایک منٹ کو بڑی کفایت شعاری سے صرف کرتا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا ممنون
عبدالحق

---

میں نے ان مقدمات کی فراہمی میں اپنی سی پوری کوشش کی ہے مرزا محمد بیگ صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے بھی اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا ہے اور اسی لئے میں اس مجموعے میں مولوی صاحب کے لکھے ہوئے تمام مقدمات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ اب کوئی مقدمہ ایسا نہیں ہے جو اس مجموعے میں شامل نہ ہو۔ ان مقدمات کو میں نے موضوعات کے اعتبار سے مرتب کیا ہے اور اپنے مقدمے کے ساتھ

مرزا محمد بیگ صاحب اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے لکھے ہوئے وہ مقدمے بھی اس میں شامل کر دیئے ہیں جو اس سے قبل پہلے اڈیشن میں شائع ہوئے تھے۔

عبادت

شعبۂ اردو و ثقافتِ پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن
۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

# مقدمہ

## مقدماتِ عبدالحق

اُردو ادب میں "مقدماتِ عبدالحق" کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے ان کی اہمیّت مسلّم ہے۔ وہ اُردو ادب میں کئی لحاظ سے اضافہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے موضوعات بھی مختلف اور متنوّع ہیں۔ ان میں خیالات و نظریات کی رنگا رنگی اور افکار و تصوّرات کی بوقلمونی ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر وحدت اور ہم آہنگی بھی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود زندگی اور ادب دونوں کے پرستاروں کے لیے ان میں دل چسپی کا بڑا سامان ہے۔ ان میں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بہت سے اسرار اور رموز کُھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زبان و لسان کے بعض اہم اور پیچیدہ معاملات و مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور شعر و ادب کے اَن گنت رموز و نکات کی تہوں کے کُھلنے کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں بڑی وسعتیں ہیں۔ بڑی ہی گہرائی اور گیرائی ہے۔ کہنے کو تو یہ مقدمے ہیں لیکن ان میں سوانح اور سیرت نگاری کے بھی بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ادبی اور لسانی تحقیق و تفتیش کا بھی ان میں کمال نظر آتا ہے۔ ادبی تنقید اور تبصرہ نگاری بھی ان میں اپنے شباب پر دکھائی دیتی ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ خود لکھنے والے کی عظیم شخصیت کا عکس بھی اپنا جلوہ دکھاتا ہے؛ اور یہ ان مقدمات کی شاید سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان میں ایک عظیم انسان، ایک عظیم محقّق، ایک عظیم ماہرِ لسان، ایک عظیم نقّاد اور ایک عظیم قومی رہنما کے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ مقدمات جن مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھے گئے ہیں، ان پر اردو زبان میں خاصا کام ہو چکا ہے، اور آج بھی اس کام کا سلسلہ جاری ہے لیکن یہ مقدمات ان موضوعات کو جس طرح پیش کرتے ہیں، اور ان کے مختلف پہلوؤں پر جس طرح روشنی ڈالتے ہیں اس کی مثال اُرْدُو میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اُرْدُو تو کیا، کسی اور زبان میں بھی، کسی ایک شخص نے، اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر اتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ ایسے بلند پایہ مقدمے نہیں لکھے، بابائے اُرْدُو کے مقدمات اس اعتبار سے منفرد ہیں اور ان میں واقعی ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔

مقدمہ نگاری ایک فن ضرور ہے۔ اس کے کچھ بنیادی اصول بھی ہیں۔ ان اصولوں کا اس میں خیال بھی رکھا جاتا ہے بعض لوازم و عناصر کے مجموعی امتزاج سے اس فن کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے اور یہ لوازم و عناصر بہر صورت اس میں پیشِ نظر رکھے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقدمہ نگاری کی حیثیت کسی مستقل صنفِ ادب کی نہیں ہے۔ کسی زبان کے ادب میں بھی اس کو ادب کی ایک باقاعدہ شاخ نہیں سمجھا گیا ہے۔ کیوں کہ مقدمے تو کسی مصنف یا کسی کتاب کے بارے میں محض تعارف کے طور پر لکھے جاتے ہیں اور عام طور پر ان کا انداز کچھ رسمی سا ہوتا ہے۔ اکثر تو وہ کسی کے کہنے سے یا کسی کی فرمائش پر لکھے جاتے ہیں، اسی لیے ان میں وہ بات نہیں ہوتی جو کسی ادبی تصنیف کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ بابائے اُرْدُو کے مقدمات

میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ کسی کی فرمائش پر محض رسمی انداز میں نہیں لکھے گئے ہیں۔ ایک لگن اور ایک دھن نے یہ مقدمات ان سے لکھوائے ہیں اور ان کا ایک والہانہ جذب و شوق ان مقدمات کی تخلیق کا محرک ہوا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحبؒ اُردو زبان و ادب کے عالم ہی نہیں، عاشق بھی ہیں، اس زبان اور ادب میں جو بھی اہم کام ہوتا ہے اس کو وہ تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے مرتبے کو متعین کرنے میں انھیں خاص طور پر خوشی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ان موضوعات پر اپنے مقدمات میں دل کھول کر اظہار خیال کرتے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے بیشتر مقدمات اردو زبان اور ادب ہی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہیں، اور ان پہلوؤں سے غیر معمولی دلچسپی ہی نے ان کے یہاں ان مقدمات کو لکھنے کا خیال پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیشتر مقدمات زبان و ادب کے انھیں پہلوؤں سے متعلق ہیں اور ان میں بڑی ہی بصیرت افروز باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُردو زبان اور ادب کے علاوہ اُنھوں نے جن موضوعات پر مقدمات لکھے ہیں، اس کا محرک ان کا علمی میلان ہے لیکن یہ علمی میلان محض کتابی نہیں ہے وہ انسانی زندگی کو دیکھنا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہی خواہش ان کے یہاں ایسے مقدمات کی تخلیق کا باعث بنی ہے جن کا موضوع اُردو زبان اور ادب نہیں ہے، بلکہ انسانی زندگی کے عام معاملات ہیں چوں کہ وہ ان معاملات کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں اس لیے اُنھوں نے ان موضوعات پر مقدمات میں اظہار خیال کو ضروری سمجھا ہے، اور اس سلسلے میں بڑی ہی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ غرض یہ مقدمات چاہے، ان کے موضوعات کچھ بھی ہوں محض لکھنے کی خاطر نہیں لکھے گئے۔ کسی نے زور دے کر انھیں نہیں لکھوایا ہے۔ ان میں فرمائش اور اثر و رسوخ کو مطلق دخل نہیں ہے۔ اسی لیے ان میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو

مقدمہ نگاری کے فن کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں لگی لپٹی باتیں نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے دو ٹوک بات کہنے کا انداز ہے۔ زیرِ نظر موضوع پر متوازن طریقے سے اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ جذبات کو اظہارِ خیال میں ذرا بھی دخل نہیں۔ برخلاف اس کے عقل و شعور پر ان کی بنیادیں استوار نظر آتی ہیں۔ اسی لیے ان میں ہر جگہ ایک منطقی زاویۂ نظر ملتا ہے۔ ان پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے وہ تفصیل اور جزئیات میں ضرور جاتے ہیں لیکن اس تفصیل و جزئیات میں دلچسپی کا بڑا سامان ہوتا ہے اور اس سے پڑھنے والے کو بڑی روشنی ملتی ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مقدمات میں جو انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ حد درجہ شگفتہ اور شاداب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقدمات دماغ ہی کو متاثر نہیں کرتے، دل پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے اور اس طرح ان تمام خصوصیات کے مجموعی امتزاج سے ان مقدمات میں وہ لوازم اور عناصر رونما ہو جاتے ہیں جن کے ہاتھوں مقدمہ نگاری کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ بابائے اُردو نے یہ مقدمے لکھ کر واقعی مقدمہ نگاری کو ایک فن بنا دیا ہے اور اس طرح اسے ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت دے دی ہے۔

یہ مقدمات تعداد میں بھی خاصے ہیں۔ ان کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق بیسویں صدی کے اُردو ادب کی عظیم شخصیت ہیں۔ اس عظیم شخصیت نے اُردو زبان اور ادب پر جتنا کام گزشتہ نصف صدی میں کیا ہے کئی شخصیتیں مل کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتیں۔ اُنھوں نے لسانی معاملات پر تحقیق کی ہے۔ زبان کے اصول و قواعد مرتب کیے ہیں۔ لغات لکھی ہیں۔ قدیم ادب کا سراغ لگایا ہے۔ پُرانے شعراء کے دیوان مرتب کیے ہیں شعراء کے

تذکروں کو ترتیب دیا ہے۔ نثر کی قدیم سے قدیم کتابیں تلاش کی ہیں اور ان کا صحیح متن تیار کیا ہے۔ اور چھپتے وقت ان سب پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان مقدمات کا اصل مقصد تو تعارف تھا لیکن اس میں تحقیق اور تنقید کے پہلو بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس تحقیقی اور تنقیدی کام نے بابائے اُردو کو زبان و ادب کا سب سے بڑا عالم اور محقق ثابت کر دیا اور ان کی یہ عظمت تسلیم کر لی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام کرنے والوں نے جب بھی کوئی کام کیا تو ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا کام مولوی عبدالحق صاحب کے تعارف کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ چنانچہ انھوں نے ان کاموں میں سے جن کو اہم سمجھا ان پر مقدمات کی صورت میں اظہار خیال کیا اور اس طرح ایسے مقدمات بھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے جو انھیں اپنے بعض ہم عصروں کی کتابوں پر لکھنے پڑے۔ اس زمانے میں زبان اور ادب میں جو رجحانات پیدا ہوئے اور علمی و تعلیمی اداروں میں جو تحریکیں شروع ہوئیں انھوں نے بھی بعض تصانیف کو جنم دیا۔ ظاہر ہے کہ ان پر بھی مولوی عبدالحق صاحب ہی کو مقدمے لکھنے پڑے۔ اس طرح گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں مختلف موضوعات پر بابائے اُردو کے مقدمات کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ اور ان مقدمات نے بہت تھوڑے عرصے میں نہ صرف اپنی اہمیت تسلیم کرا لی بلکہ اُردو کے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔

ان میں سب سے اہم تو وہ مقدمے ہیں جو خود ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ کتابیں اُردو کے قدیم کلاسیکی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ان کتابوں پر مقدمے لکھ کر نہ صرف ان کا تعارف کرایا ہے بلکہ تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے ان پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ جن مصنفوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں ان کے حالات، شخصیت، ماحول اور ادبی مرتبے کے تمام خط و خال

واضح ہو جاتے ہیں۔ ان مصنفوں کے بارے میں جتنا مواد مولوی صاحب نے فراہم کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اس مواد سے نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بعض اہم انکشافات ہوتے ہیں۔ مصنف کے صحیح حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ماحول کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں اور اس کی تصانیف کی ادبی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا سادہ لیکن پُرکار اسلوب اس بیان میں بڑی دل کشی اور دل آویزی پیدا کر دیتا ہے ان کے یہ بیانات نہ صرف عالموں، ادیبوں اور ادب کے طالب علموں کے لیے دل چسپ ہو جاتے ہیں بلکہ عام آدمی بھی ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بابائے اُرْدُو اس سلسلے کی تمام تفصیل و جزئیات کو زندگی کا جز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں خالص تحقیقی باتیں بھی دل چسپ بن جاتی ہیں۔ نام نہاد محققوں کا یہ عام انداز ہوتا ہے کہ وہ بے شمار حوالوں سے پڑھنے والے کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ سیدھی سادی باتوں پر بھی اسی طرح حاشیے لکھتے ہیں کہ اصل موضوع پس منظر میں جا پڑتا ہے اور اس طرح ان کی تحریر جس کو وہ خود تحقیق کا شاہکار سمجھتے ہیں پڑھنے والے کے لیے گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔

بابائے اُرْدُو کے ان مقدمات میں تحقیقی پہلوؤں پر بہت زور ہے لیکن یہ عام تحقیقی تحریروں کی طرح اُلجھی ہوئی خشک، بے مزہ اور پراگندہ نہیں ہیں، ان میں تو ان کا سیدھا سادہ لیکن دل موہ لینے والا انداز جادو جگاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُرْدُو زبان کے سب سے بڑے غزل گو شاعر میر تقی میر پر دو معرکہ آرا مقدمے لکھے ہیں۔ ایک تو ان کے انتخاب کلام پر ہے۔ اور دوسرا میر کی خود نوشت سوانح حیات ذکر میر پر۔ یہ مقدمے آج سے برسوں پہلے لکھے گئے تھے لیکن ان میں میر کی زندگی اور شاعری کے بارے میں جو بصیرت افروز

باتیں ہیں ان پر آج تک کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ میرؔ پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور بعض لوگوں نے بزعمِ خود میر صاحب کے بارے میں بڑا کام کیا ہے لیکن بابائے اُردو نے اپنے مقدمات میں میرؔ پر جو کچھ لکھا ہے اس کے سامنے ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں رہ جاتی۔ اس آفتابِ عالم تاب کے سامنے وہ محض ٹمٹماتے ہوئے چراغ معلوم ہوتے ہیں۔

میرؔ کے انتخابِ کلام پر جو مقدمہ بابائے اُردو نے لکھا ہے اس کا آغاز میرؔ کے تعارف سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں۔

"میرؔ تقی میر سرتاج شعرائے اُردو ہیں، ان کا کلام اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدیؔ کا کلام فارسی میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میرؔ کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا، یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے موزونیٔ طبع کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے لیے شعر کہے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے کمال سے اُردو کی فصاحت کو چمکا دیا، اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری میر صاحب کی زندگی کا جز تھی۔ گویا فطرت نے انھیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ ان کا احسان اُردو زبان پر تا قیامت رہے گا اور ان کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا کیوں کہ اس میں وہ عالمگیر حسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں۔"

اس مختصر بیان سے میر صاحب کی شاعرانہ شخصیت کی ایک مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اس کے قد و قامت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور ان کی شخصیت کے ساتھ ایک طرح کی موانست پیدا ہو جاتی ہے۔ بابائے اردو اس موانست کو پیدا

کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے ایک بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخ کی ورق گردانی کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے اور کچھ کیا بھی ہے اپنی آپ بیتی لکھ جایا کرے تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہوں

"ذکر میر" ایسا ہی انمول موتی ہے، کیوں کہ اس سے میر کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور بہت سی باتیں جن کا لوگوں کو مطلق علم نہیں تھا ذکر میر سے واضح ہو گئی ہیں، اس کتاب میں اس زمانے کے جو تاریخی اور سیاسی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی اہمیت کو خاص طور پر بابائے اردو نے واضح کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ

"اس زمانے کی تاریخ کے لیے یہ کتاب ایک اہم حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ میر نے اس زمانے کی تباہی اور بربادی، ہنگاموں اور پریشانیوں کا چشم دید حال لکھا ہے اور ذکر میر میں نجی حالات سے زیادہ ان پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔"

بابائے اردو نے میر صاحب کے تاریخی شعور پر اپنے مقدمے میں خاص طور پر بحث کی ہے اور انھیں ایک اعلیٰ درجے کا مؤرخ ثابت کیا ہے، اس کے بعد ایک ایک کر کے ان نئی باتوں کی وضاحت کی ہے جو ذکر میر سے معلوم ہوتی ہیں۔ مقدمے کا یہ حصہ تحقیقی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے ذکر میر کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر کے والد کا نام میر عبداللہ نہیں بلکہ میر علی متقی ہے، کیونکہ ذکر میر میں ہر جگہ یہی نام لکھا ہے۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ میر صاحب نجیب الطرفین سید تھے، خان آرزو سے میر صاحب کے تعلقات کی کشیدگی کا اصل سبب بھی انھوں نے معلوم کر لیا ہے۔ نکات الشعرا میں میر نے خان آرزو کی جو تعریف کی ہے اور ذکر میر میں انھیں جو برا بھلا کہا ہے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ نکات الشعرا کی نوعیت چوں کہ ذاتی نہیں تھی اور خیال یہ تھا کہ وہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں جائے گا، اس لیے وہاں اس قضیے کو چھیڑنا انھوں نے مناسب

نہیں سمجھا لیکن ذکرِ میر چوں کہ آپ بیتی تھی اس لیے وہاں اس کو لکھ کر خوب خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ میر صاحب کے لکھنؤ جانے پر جو روشنی اس کتاب سے پڑتی ہے، اس کی اہمیت کو بھی بابائے اُردو نے اس مقدمے میں واضح کیا ہے اور آزاد نے آبِ حیات میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید کی ہے۔ ان کی بد دماغی کو جس طرح بعض لوگوں نے مبالغے سے بیان کیا ہے اس کی اصل حقیقت بھی واضح کی ہے، اور ذکرِ میر کے بعض حصّوں سے جس طرح میر کی بعض نظموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ غرض اس کتاب کے جتنے اہم پہلو ہیں۔ ان میں کوئی بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ ایک ایک کر کے سب پر اُنھوں نے تحقیقی اور تنقیدی زاویہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقدمے کو پڑھ کر نہ صرف اس کتاب کی اہمیّت کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ میر کی زندگی اور شخصیّت کے تقریباً تمام پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی مقصد سے یہ مقدمہ لکھا گیا ہے۔

تحقیقی اعتبار سے بابائے اردو کا شاید سب سے اہم مقدمہ وہ ہے جو اُنھوں نے میر امن دہلوی کی باغ و بہار پر لکھا ہے۔ اس میں اُردو کی اس مشہور داستان کے ماخذ پر اُنھوں نے بڑی ہی بصیرت افروز بحث کی ہے اور بحث کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، وہ آج بھی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ باغ و بہار کا قصہ امیر خسرو کی چہار درویش سے ماخوذ ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ وہ تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باغ و بہار کا ماخذ فارسی کی کتاب چہار درویش نہیں بلکہ نو طرزِ مرصع ہے۔ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ قصہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اُردو کی کتاب نو طرزِ مرصع ہے، اس کے مؤلف

میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسین اٹاوے کے رہنے والے تھے۔ میر امن نے فارسی کتاب اور اُس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر نو طرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے

اور اس کے بعد تینوں کتابوں کے بعض مقامات کا مقابلہ کر کے اپنے اس خیال کو صحیح ثابت کیا ہے۔ اس سے باغ و بہار کے ماخذ کے بارے میں جو ایک غلط فہمی عام ہو گئی تھی، وہ دور ہو گئی ہے۔ اس مقدمے میں وہ زیادہ تر تحقیقی پہلو کی طرف متوجہ رہے ہیں اس لیے اس میں تنقیدی پہلو زیادہ نمایاں نہیں ہو سکا ہے البتہ بعض لسانی پہلوؤں کی وضاحت اُنھوں نے ضرور کی ہے۔ اسی میں ضمنی طور پر میر امن کے اسلوب اور ان کی زبان کا بھی ذکر آگیا ہے۔

شعرائے اُردو کے بیشتر تذکرے خود بابائے اُردو نے مرتب کر کے شایع کیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر ان کا مقدمہ بھی ہے۔ ان مقدمات میں اُنھوں نے صرف ان تذکروں ہی کی اہمیت کو واضح نہیں کیا ہے ان کے لکھنے والوں پر بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقدمے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں میر کے تذکرے نکات الشعرا، شفیق کے تذکرہ چمنستانِ شعرا، قائم کے تذکرہ مخزنِ نکات، گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں، لطف کے تذکرہ گلشنِ ہند، مصحفی کے تذکرہ ہندی گویاں اور ریاض الفصحا، وغیرہ پر جو مقدمے اُنھوں نے لکھے ہیں وہ ادبی تحقیق کے شاہ کار ہیں، ان سے اردو شاعری اور اردو شعرا کے بارے میں بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جن تک ان سے قبل کبھی کسی کی نظر پہنچی ہی نہیں تھی۔ نکات الشعرا کا مقدمہ مختصر ہے لیکن اختصار کے باوجود اس میں بعض نئی اور دل چسپ باتیں ملتی ہیں۔ یہ تذکرہ چوں کہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس لیے وہ اس کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں کہ تقریباً تمام تذکروں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

> اس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں ان میں نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے۔ میر صاحب کے علاوہ بعض اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مدعی ہیں

کہ سب سے پہلے ریختہ گو شعرا کا تذکرہ انھوں نے لکھا ہو۔ مثلاً قائم جس کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۸ ہجری ہو یا خاکسار جس نے ۱۱۶۵ ہجری میں "معشوق چہل سالہ خود" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ گارساں دتاسی نے غلطی سے یہ خیال کر لیا ہو کہ گردیزی کو بھی یہ دعویٰ ہو کہ اس کا تذکرہ سب سے پہلا ہو، حالاں کہ اس نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے میں ان تذکروں کی ناانصافی اور کم تحقیقی کی شکایت کی ہو جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے اپنا تذکرہ میر صاحب کے جواب میں لکھا ہو۔ خاکسار کے تذکرے کے متعلق میر صاحب فرماتے ہیں کہ "علی الرغم ایں تذکرہ تذکرہ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالہ خود، احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ" اس کی حقیقت ان چند سطروں سے صاف ظاہر ہو۔ تذکرہ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۶ ہجری ہو اور قائم کا ۱۱۶۸ ہجری۔"

اس بیان سے نکات الشعرا کی نہ صرف اولیت ظاہر ہوتی ہو بلکہ شعرائے اردو کے بعض دوسرے تذکروں کا حال بھی معلوم ہوتا ہو۔ اس میں میر کے حالات پر انھوں نے روشنی نہیں ڈالی ہو۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کے بارے میں مقدمہ "ذکر میر" اور مقدمہ انتخاب کلام میر میں اس سے قبل لکھ چکے تھے صرف سراج الدین علی خاں آرزو سے ان کے تعلقات کی کشیدگی کو واضح کیا ہو۔ چمنستان شعرا کے مقدمے میں انھوں نے اس تذکرے کے مؤلف لچھمی نرائن شفیق کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں اس لیے کہ ان کے حالات کہیں اور نہیں ملتے، ساتھ ہی اس تذکرے کی حقیقت بھی واضح کی ہو۔ لکھا ہو:-

"اگرچہ شفیق نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح کے تذکروں پر رکھی ہو، لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو حالات مل گئے ہیں حوالے کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر دیا ہو۔ چنانچہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم حاکم

کے تذکرہ مردم دیدہ اور اور تذکرہ مجمع النفائس تالیف سراج الدین علی خاں آرزو و سروِ آزاد اور حاجی علی اکبر وصال اور رضا خاں انوار کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا۔"

اس سے اس تذکرے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کون کون سی کتابوں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اسی طرح مخزن نکات کے مقدمے میں پہلے تو انھوں نے قائم چاندپوری کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہیں اور پھر اس کے تذکرے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور تذکرے کے بارے میں اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں

"قائم کا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسینی گردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم کو ان تذکروں کی اطلاع نہ تھی لیکن ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دیے ہیں وہ وہی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں صحیح نہیں ہے دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں، اشعار کے انتخاب اور حالات دونوں مختلف ہیں"

اس بیان نے قائم کے تذکرے کی صحیح حیثیت کو واضح کر دیا ہے۔ اسی طرح گردیزی کے تذکرے پر جو چند صفحات کا مقدمہ لکھا ہے اس میں اس کی قلعی کھول دی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے بعد کہ یہ تذکرہ میر کے نکات الشعرا کے جواب میں لکھا گیا ہے اور اس میں میر کو گرانے کی کوشش کی گئی ہے، اصل تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"گردیزی نے جس دعوے کے ساتھ اس تذکرے کے لکھنے کا قصد کیا ہے اس کا کتاب میں کہیں نشان نہیں ملتا، اس میں کہیں غلط حالات کی تصحیح کی گئی ہے، نہ مظلوم ہمسروں اور ہم عصروں کی بے جا خوردہ گیری کا جواب دیا گیا ہے۔

نہ ان نازک خیال رنگین نگار شعرا، کے حالات کا اضافہ کیا گیا ہے جو دوسروں کی بے اعتنائی کے شکار ہو گئے تھے اور نہ ان حقائق کو آشکار کیا جو دوسرے تذکرہ نویسوں کے ایجاز کی وجہ سے نظروں سے پوشیدہ تھے، ایسی صورت میں ان کا دعویٰ بے دلیل اور اس کا الزام بے بنیاد ہے۔"

اس بیان سے گردیزی کے تذکرے کی خصوصیات کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے اور حقیقت حال سامنے آجاتی ہے۔ مرزا علی لطف کے گلشن ہند کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :-

"حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد اور امیر الممالک لارڈ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے زمانے میں علی ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا، کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۴ عیسوی میں جا کر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدر دان اور محسن مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا، اُنھوں نے مؤلف تذکرہ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ ان کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور ان میں اردو زبان اور اردو شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے حالات میں بھی اور کلام میں بھی جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے۔"

اس سے بھی پڑھنے والا اس تذکرے سے پوری طرح واقف ہو جاتا ہے اور اس کی شانِ نزول اس پر روشن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مصحفی کے تینوں تذکروں کی حقیقت

صرف چند جملوں میں واضح کر دیتے ہیں لکھتے ہیں :-

"تین تذکرے بھی ان کی بڑی یادگار ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے تھے، سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے جس کا نام عقد ثریا ہے۔ اس میں تین قسم کے شعراء کا ذکر ہے۔ اول شعراء ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر۔ دوسرا تذکرہ اردو لکھنے والے شاعروں کا ہے تیسرے تذکرے کا نام ریاض الفصحا ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے ان کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔"

اس بیان سے ان تمام باتوں کا علم ہو جاتا ہے کہ مصحفی نے اپنے تینوں تذکرے کیوں لکھے، کس طرح لکھے اور یہ کہ ان کو اس طرح تین ناموں سے لکھنے کا کیا مقصد تھا۔

یہ تفصیل صرف اس خیال سے پیش کی گئی ہے اور اس کو پیش کرتے ہوئے مختلف مقدمات کے اقتباسات صرف اس خیال سے دیے گئے ہیں کہ ان سے بابائے اردو کے ان مقدمات کا صحیح انداز معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے قدیم ادب کی کتابوں پر لکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔

مقدمات میں وہ ہمیشہ تحقیق اور تنقید دونوں کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں لیکن تحقیق کو خشک اور بوجھل نہیں بناتے۔ بلکہ کچھ ایسی سادگی سے ضروری باتوں کی وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی تحقیق پڑھنے والے کے لیے حد درجہ دل چسپ بن جاتی ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی تمام ضروری معلومات اُسے حاصل ہو جاتی ہیں اور موضوع کے تمام نشیب و فراز اُس پر روشن ہو جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب اس ضمن میں کبھی غیر ضروری باتیں نہیں کرتے وہ تو صرف ایسی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں جن سے اصل موضوع پر روشنی پڑتی ہے اور اُس کے خط و خال پوری طرح واضح

ہوجاتے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ کتاب کے مصنف کا حال بھی بیان کردیتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اُن کی توجہ اصل موضوع ہی کی طرف رہتی ہے۔ مثلاً جب کسی تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں تو تذکرہ ہی اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور وہ اسی کی تفصیل کو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ باتیں معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ اصل تفصیل و جزئیات کو پیش کرتے ہوئے وہ تمام تحقیقی پہلوؤں کی طرف متوجہ رہتے ہیں لیکن ان سے ملی جلی تنقید بھی اُن کے یہاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان مقدمات میں انھوں نے تحقیق و تنقید کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ جن کتابوں پر وہ مقدمات لکھتے ہیں، اُن کی لسانی اور ادبی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے وہ تنقید سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس لیے تحقیق اور تنقید دونوں ان کے یہاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اور اس طرح تحقیق و تنقید میں ایک توازن پیدا ہوجاتا ہے اور ایک ہم آہنگی نظر آنے لگتی ہے۔ تحقیق اور تنقید دونوں کا ان مقدمات میں کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ جس کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں، اُس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اُن کے یہاں موڑ لیے ہیں، مقصد نہیں، اور یہ خصوصیت اُن کے اُن مقدمات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو ادبی کتابوں پر لکھے گئے ہیں اور جن میں شعرائے اردو کے تذکروں پر لکھے جانے والے مقدمات خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

زبان و بیان کے مختلف معاملات و مسائل سے مولوی عبدالحق صاحب کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقدمات میں بھی جو ادبی کتابوں پر لکھے گئے ہیں وہ اردو زبان اور اُس کے لسانی پہلوؤں پر جگہ جگہ بعض بہت ہی بلیغ اشارے کرتے ہیں۔ مثلاً نکات الشعراء کے مقدمے میں انھوں نے میر کے حوالے سے اردو زبان

کے ابتدائی نام ریختہ پر اظہارِ خیال کیا ہو۔ اور مصحفی کے تذکروں پر جو مقدمہ لکھا ہو اُس میں بھی لسانی معاملات و مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے ادبی مقدمات میں لسانی معاملات و مسائل پر جو اظہار خیال کیا ہو وہ محض اشارے ہیں، اس پر مفصل بحث تو اُنھوں نے ان مقدمات میں کی ہو جو ایسی کتابوں پر لکھے گئے ہیں جن کا موضوع زبان و لسان کے مختلف پہلو ہیں، ان مقدمات میں سید انشا کی دریائے لطافت کا مقدمہ، مقدمہ قواعد اردو، مقدمہ فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ اور مقدمہ مطبوعات دارالترجمہ عثمانیہ وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

قواعد اُردو خود مولوی صاحب کی قابل قدر تالیف ہو، اس پر اُنھوں نے جو مقدمہ لکھا ہو، اُس میں سب سے پہلے علم اللسان کا یہ اصول بیان کیا ہو کہ:-

"زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہو اور نہ کوئی اُسے ایجاد کر سکتا ہو، جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہو، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتیں، پھولتی ہیں اور وہی ایک ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہو، اُسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہو۔"

اور پھر اس اصول کی روشنی میں اُردو کی پیدائش اور اُس کے آغاز کا ذکر کیا ہو، لکھتے ہیں:-

"اُردو اُس زمانے کی یادگار ہو، جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے اور اہلِ ہند سے اُن کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا، اُس وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہوتا گیا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی، جس کا اُن میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا، مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانے تک اُن کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں بھی اُسی کا سکہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اُسے شوق سے سیکھا۔ اس

زمانے میں، فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ فضیلت کا ملنا عربی زبان کی تحصیل کے بغیر ناممکن تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے علوم و فنون کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ اِدھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی، اُسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ عوام وہ ہی زبان بولتے تھے۔ چناں چہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے۔ مسلمان شاہی درباریوں اور علماء و شعراء نے بھی یہ زبان سیکھی، اور اس میں تالیف و تصنیف (جو زیادہ تر نظم تھی) بھی کی۔ غرض ہندو مسلمانوں کے اس میل جول اور خلا ملا سے ایک نئی زبان نے جنم لیا، جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہے یعنی آدھا تیتر اور آدھا بیٹر۔ اس لیے اوّل اوّل ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے اور اُس کے لکھنے کو عار سمجھتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے قدم جمتے چلے گئے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ اور پال پوس کر بڑا کیا، بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندوستان پر مسلط ہوئی جو مسلمانوں سے بالکل غیر تھی۔ اُس قوم نے اُس کی اُنگلی پکڑی؛ اُس نے انگلی پکڑ کر اُن کا پہنچا پکڑا، اور دربار میں اُس کی رسائی ہوگئی، اور رفتہ رفتہ دفاتر سے اُس کو نکال باہر کیا اور خود اُس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی، آخر ہندوستان کی قدیم راج دہانی اُس کا جنم بھوم اور دوآبہ اس کا وطن ہوا۔ اب دور دور پھیل چکی ہے اور ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک چلے جایئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔"

ان چند جملوں میں مولوی صاحب نے اُردو زبان کی تاریخ اور اُس کے لسانی ارتقا کو

پوری طرح واضح کر دیا ہے، اپنے ارتقائی سفر میں وہ جن حالات سے دوچار ہوئی ہے، اُس کی تصویر بھی کھینچ دی ہے اور ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ نے اِس زبان کو جس مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے اُس کا پورا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور اُس کے لسانی پہلوؤں پر بابائے اُردو کی نظر کتنی گہری ہے اور وہ اس موضوع پر کتنے اعتماد کے ساتھ کیسی بصیرت افروز گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس مقدمے میں انھوں نے اردو زبان کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اُس کی صرف و نحو پر بھی بحث کی ہے، اور یہ بحث بھی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہ اردو زبان کے نہ صرف بڑے عالم بلکہ مزاج داں ہیں۔

زبان کی مزاج دانی کا یہ شعور ان کے اُس مقدمے میں بھی نظر آتا ہے جو اُنھوں نے سید انشا کی کتاب "دریائے لطافت" پر لکھا ہے۔ اس میں سید انشا کے حالات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے اور اُن کے لسانی شعور کی وضاحت کرنے کے بعد اُنھوں نے جہاں اس کتاب کی اہمیت کی طرف اشارے کیے ہیں وہاں زبان کی مزاج دانی کا یہ شعور نظر آتا ہے، لکھتے ہیں :-

> سید انشاء اللہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اُس کے قواعد وضع کیے۔ اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہ بھولے، علاوہ اس کے الفاظ و محاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور اُن کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفظ، مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا ان سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کیے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنھیں زبان کا ذوق ہے۔"

اور پھر ان نکات پر مفصل بحث کی ہے جس سے زبان کے بارے میں اُن کے صاحبِ ذوق

ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس مقدمے میں لسانی تحقیق کے ساتھ زبان کے ذوق و شعور کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے اردو نہ صرف اُردو زبان کے سب سے بڑے محقق ہیں بلکہ مزاج داں بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مزاج دانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی اور زبان کا یہ ذوق و شعور آسانی سے عام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو زبان سے عشق کرنے کی ضرورت ہے بابائے اردو کو اس زبان سے محبت تھی، اور ان کی یہ محبت عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی، چناں چہ ان کے مقدمات میں جگہ جگہ اُردو زبان سے والہانہ وابستگی کا اظہار نظر آتا ہے۔ اسی لیے ان کی تحقیق محض تحقیق نہیں رہ جاتی، بلکہ اُس میں زبان کی یہ محبت رس پیدا کر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لسانی تحقیق کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور خشک سے خشک موضوع کو بھی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے۔ ادبی و لسانی موضوعات کے ساتھ ساتھ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے بعض مقدمات ایسے موضوعات پر ہیں جو اُن کا خاص میدان نہیں ہے لیکن جن پر اُنھوں نے بڑے ہی عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں بہت ہی سلیقے سے اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً اُنھوں نے ایسی کتابوں پر بھی مقدمے لکھے ہیں جن کا موضوع اسلام اور اس کے مختلف معاملات و مسائل ہیں۔ ان مقدمات میں مقدمۂ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مقدمۂ تحقیق الجہاد اور معرکۂ مذہب و سائنس بہت اہم ہیں۔ ان مقدمات میں جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُس سے دینی اور دنیاوی پہلوؤں کے متعلق اُن کے خیالات و نظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام: مولوی چراغ علی کا رسالہ تھا جو اُنھوں نے پادری کینن میلکم میکال کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا تھا، اس مضمون میں پادری صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو موجودہ حالت میں چل نہیں سکتا۔ اور اگر مسلمان اس پر عامل رہے تو کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ مولوی چراغ علی نے اپنے

رسالے میں انھیں اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور بقول مولوی صاحب بہت پُرزور اور جامع کتاب لکھی ہے جس میں اُن تمام بڑے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو عموماً اور اکثر اسلام پر ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہوتے ہیں، اب تک کسی شخص نے ان اعتراضات کا جواب اس طرز سے اور اس جامعیت کے ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس کے پہلے حصّے میں سیاسی حالات پر اور دوسرے حصّے میں معاشرتی اور تمدنی حالات پر بحث ہے۔ کتاب کے مقدمے میں فقہ اور اصولِ فقہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور قرآن و حدیث پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے بابائے اُردو مولوی چراغ علی کے بیشتر خیالات سے اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً اسلامی فقہ کے بارے میں اُنھوں نے مولوی چراغ علی سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"اگرچہ اسلامی فقہ کے بعض ضابطے اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت مناسب اور معقول تھے لیکن موجودہ ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ کوئی شے سوائے قرآن پاک کے قطعی اور ناقابل تبدیل نہیں۔ لہٰذا اِس زمانے میں بھی اجتہاد کو وہی حق حاصل ہے جو پہلے زمانے میں تھا بشرطیکہ وہ احکامِ قرآنی سے مطابق ہوں۔"

مولوی صاحب کے مقدمے میں اس کتاب پر تنقید نہیں ہے، اُس کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے اور اس کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مولوی چراغ علی کے خیالات سے متفق ہیں۔ یہ مقدمہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس کے پہلے حِصّے میں مولوی چراغ علی کا حال بہت تفصیل سے درج کیا گیا ہے اور ان کی شخصیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بابائے اُردو ان سے متاثر ہیں اور ان کے مذہبی اور دینی خیالات و نظریات کا اُن پر گہرا اثر ہے۔ اُن کے رسالے تحقیق الجہاد پر بھی اُنھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

"مولوی چراغ علی مرحوم کی کتابیں پیاسے کے لیے آبِ حیات، مریض کے لیے نوشدارو مارگزیدہ کے لیے تریاق کا کام دیں گی۔ مرحوم اس ضرورت کو بہت پہلے سمجھ چکے

تھے، اور جب کہ مقلد اور غیر مقلد، سنی و شیعہ، تو تو میں میں میں مصروف تھے وہ ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے دین و ملت کی ادا کر رہے تھے کہ اُس کی نظیر ان کے بعد پھر نظر نہ آئی۔ بعض داعیان حمایت دین کی آنکھیں اب کھلی ہیں اور دن ڈھلے پر ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اور اُس کے متعلق مشورے اور کمیٹیاں ہو رہی ہیں لیکن انھیں خبر نہیں کہ مدت ہوئی اس کی بنیاد سر سید ڈال چکے اور مولوی چراغ علی مرحوم اُس کی تکمیل بھی کر چکے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کو سر سید اور چراغ علی کے مذہبی تصورات سے پوری طرح اتفاق ہے اور وہ انھیں کے نظریات و خیالات کے قائل ہیں، کیوں کہ اُن میں انھیں عقلیت اور روشن خیالی نظر آتی ہے۔

"معرکۂ مذہب و سائنس" پر مولوی صاحب نے نہایت معرکہ آرا مقدمہ لکھا ہے اور اِن دونوں کے مختلف پہلوؤں پر اس میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب پر ہے جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کیا تھا۔ اس مقدمے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مذہب کی اہمیت واضح کی ہے، اور اس کو انسانی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اُن کے خیال میں مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اُس کی فطرت میں ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود و قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقات ہوتی رہیں گی، جد و جہد قائم رہے گی اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔ سائنس بھی مذہب کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کیوں کہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ وہ صرف مادّے سے تعلق رکھتا ہے لیکن مذہب کی حکمرانی روح پر ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :۔

"سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ

مذہب کہتا ہے کیوں کہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے اور وہ مادی اور غیر مادی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی میں مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں اور سائنس کے مقابلے میں اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہیں لیکن تمام مذہبوں میں اُن کے نزدیک مذہبِ اسلام زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ اس نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ غرض اس مقدمے میں مولوی صاحب نے بڑی ہی فلسفیانہ بحث کی ہے اور اس موضوع پر بہت سلجھے ہوئے خیالات پیش کیے ہیں۔

ان مقدمات کے علاوہ بابائے اردو کے بعض مقدمات ایسے بھی ہیں جن سے ان کے معاشرتی تصورات اور نفسیاتی نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سب سے اہم تو مقدمۂ تجرد و ازدواج ہے جس میں اُنھوں نے شادی شدہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُنھوں نے اس مقدمے کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ خود اس نازک مسئلے کی اونچ نیچ سے واقف نہیں لیکن اس موضوع پر جو خیالات اُنھوں نے پیش کیے ہیں، ان میں گہرے معاشرتی اور نفسیاتی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اُن کے خیال میں شادی اور شادی شدہ زندگی کی بنیاد محبت پر استوار ہونی چاہیے۔ کسی اور ذریعے سے اس میں کامیابی ناممکن ہے۔ شادی کے معاملے میں آزادیِ انتخاب کے بھی وہ قائل ہیں اور ایسی رسموں کو وہ اچھا نہیں سمجھتے جن سے یہ آزادی سلب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ چوں کہ شادی کا بوجھ لڑکے اور لڑکی کو اُٹھانا پڑتا ہے اس لیے اس کی تمام تر ذمہ داری انھیں دونوں پر ہونی چاہیے، ماں باپ کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ:-

"شادی کی ابتدا جبر سے شروع ہوئی، قدیم زمانے میں دلہن کا اڑا لے جانا ایسا ہی تھا جیسے مال و اسباب اور مویشی کا لوٹ مار کرلے جانا جس کے آثار اب بھی شادی کی مختلف رسوم اور ماں باپ کی زبردستی میں پائے جاتے ہیں اور اسی لکیر کو پیٹتے چلے آرہے ہیں۔ دو شخصوں کو مجبور کرنا کہ آپس میں محبت کرو ایک لایعنی بات ہے، جہاں جبر ہو وہاں محبت کہاں اور جہاں جبر ہے وہاں محبت کی حاجت نہیں۔ ممکن ہے کہ بعضے یہ کہیں کہ اکثر بعد میں محبت پیدا ہو جاتی ہے، مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں اور اتفاقات پر بھروسہ کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔"

اس سے مولوی صاحب کی روشن خیالی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ وہ ان معاملات کو عقلی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے بابائے اردو کے معاشرتی تصورات کی وضاحت ہوتی ہے اور اُن کے نفسیاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

غرض مولوی صاحب نے مختلف اور متنوع موضوعات سے متعلق کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان کے موضوعات علمی بھی ہیں ادبی بھی، معاشرتی بھی ہیں تہذیبی بھی ان مقدمات میں انھوں نے فلسفہ و سائنس کے اسرار و رموز بھی کھولے ہیں، دین اور مذہب کے حقائق کے چہرے سے پردہ بھی اُٹھایا ہے۔ ادب و شعر کے نکتے بھی بیان کیے ہیں، معاشرت و تہذیب کی کتھیاں بھی سلجھائی ہیں، تاریخی اور سیاسی حقیقتوں کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔ غرض ان مقدمات میں زندگی اور ادب کے ان گنت پہلوؤں پر اظہار خیال ہے اور ان تمام موضوعات پر بابائے اردو کے خیالات و نظریات ان مقدمات سے پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کی شخصیت پوری طرح سامنے آجاتی ہے، حالاں کہ وہ ان مقدمات میں براہِ راست اپنی بات بہت کم کہتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت کم نمایاں کرتے ہیں لیکن اسی میں اُن کی بڑائی ہے، اُن کے خیالات و نظریات کی وضاحت ان مقدمات میں بالواسطہ

طور پر ہوتی ہے جب وہ دوسروں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ایک خاص اسلوب سے اپنی بات کی پوری طرح وضاحت کر دیتے ہیں۔ اسی انداز کی بدولت ان کی بات اثر کرتی ہے اور اُن کے خیالات و نظریات دل چسپی کا باعث بنتے ہیں۔ ان خیالات و نظریات میں گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وسیع مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ایک تحقیقی مزاج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایک روشن خیال طبیعت کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک انسانیت پرست اور انسانیت دوست شخص کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں، ایک قوم پرست شخص کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی آزادی کے ایک بہت بڑے پرستار کی جنوں سامانیاں نظر آتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان خیالات و نظریات میں ایک زندگی اور جولانی کا پتہ چلتا ہے اور یہ درحقیقت اُس شخصیت کا عکس ہے جو شروع سے آخر تک زندگی ہی زندگی اور جولانی ہی جولانی ہے جو ہیم رواں دواں اور ہر دم جواں ہے، جس کو کسی مقام پر رُکنا نہیں آتا اور جس کی منزل آسمانوں سے بھی پرے ہے۔

ان مقدمات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی عظیم شخصیت کے صحیح آئینہ دار ہیں ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا سب سے بڑا مقصد اُردو زبان کی خدمت ہے۔ وہ اس کو فروغ دینا چاہتے ہیں اُس سے والہانہ محبت اُن کا نصب العین ہے، اس لیے ان مقدمات میں جگہ جگہ وہ اُردو زبان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے ہیں اور اُس کی ترقی کی باتیں بڑی اخلاص مندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، انھیں اردو ادب کے ساتھ گہری دل چسپی ہے اور وہ اُس کو بھی ترقی کے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اُردو ادب کے قدیم سے قدیم شاہ کاروں کا سراغ لگانے میں پیش پیش رہتے تھے، جدید ادب کے علم برداروں کی ہمت افزائی بھی اُن کے نزدیک ضروری ہے تاکہ اردو ادب کا ارتقائی تسلسل قائم رہے اور ادب

کا قافلہ آگے بڑھتا رہے۔ اسی خیال سے وہ بعض نوجوانوں کی کتابوں پر بھی مقدمے لکھنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور اُن کے کاموں کی دل کھول کر داد دی ہے۔ بابائے اردو اس معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ وہ نوجوانوں اور جدت پسندوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہیں۔ اس میں ان کی روشن خیالی اور کشادہ دلی کو بھی خاصا دخل ہے۔ تنگ نظری ان کے مزاج میں نہیں ہے، قدامت پسندی سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان مقدمات میں جگہ جگہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے، ساتھ ہی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دھن کے پکّے ہیں، انھیں کام کرنے کی لگن ہے، اُن کے سامنے ایک بلند نصب العین ہے، اس نصب العین کی نوعیت قومی اور ملّی معاشرتی اور تہذیبی ہے، اور اردو زبان و ادب کی خدمت کا خیال بھی درحقیقت اُن کے اسی نصب العین کا جزو ہے۔ برعظیم کے مسلمانوں کے جو قومی اور ملی مسائل ہیں اُن سے انھیں گہری دل چسپی ہے، وہ انھیں اجتماعی طور پر تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اسی لیے اُن کا نقطۂ نظر ہر جگہ قومی اور اجتماعی ہوتا ہے۔ انفرادی معاملات کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اُن کے نزدیک وہی افراد زیادہ قابلِ قدر اور لائقِ ستائش ہیں جن کا زاویہ نظر قومی ہوتا ہے اور جو انفرادی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کر دیتے ہیں۔ مذہب سے بھی انھیں دل چسپی ہے۔ اُن کے نزدیک وہ انسانی فطرت اور مزاج میں داخل ہے۔ مذہب اُن کے نزدیک خیر کی قدروں کا علم بردار ہوتا ہے، اور کوئی قوم اُس کے سہارے صحیح راستے پر گام زن ہوتی ہے۔ سائنس کی ترقی اور عقلیت کے فروغ سے بھی مذہب کی روشنی ماند نہیں پڑ سکتی لیکن ان کے خیال میں سائنس کی ترقی بھی انسانی زندگی کے ارتقا کے لیے لازمی ہے اس لیے مذہب اور سائنس کو بہ یک وقت فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کی حیثیت ایک میان میں دو تلواروں کی نہیں ہے۔ مذہب تہذیبِ نفس کے لیے ضروری ہے اور اس اعتبار سے تمام مذاہب میں اسلام

کو فوقیت حاصل ہی لیکن مذہب کو انسانی زندگی کے لیے ضروری سمجھنے اور خود مذہبی ہونے کے باوجود وہ طبیعت اور مزاج کے خشک نہیں ہیں، ان کے یہاں تو بڑی شگفتگی اور شادابی ہی اور وہ غضب کا احساسِ مزاح رکھتے ہیں، اُن کے پاس ایک رچا ہوا ذوقِ جمال ہی اور وہ حسن کے پرستار ہیں، اس حسن کی تلاش ان کے یہاں برابر جاری رہتی ہی، زندگی اور ادب دونوں میں وہ حسن کو تلاش کرتے ہیں، اس کا اثر اُن کے مزاج اور طبیعت پر بھی ہوتا ہی اور اسی لیے اُس میں اس حسن کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے شگفتگی سب سے زیادہ نمایاں ہی، اُن کی شگفتہ مزاجی کی مثالیں اُن مقدمات میں جگہ جگہ بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

ان مقدمات سے ان کی ذہانت کا بھی اندازہ ہوتا ہی۔ یہ ذہانت اُن کی ایک ایک بات میں معنویت کی تجلیاں بھر دیتی ہی۔ اسی ذہانت کی بدولت وہ ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقتِ حال اُن پر بغیر کسی کوشش و کاوش کے روشن ہو جاتی ہی، اس ذہانت کو اُن کا عالمانہ رنگِ طبیعت چار چاند لگا دیتا ہی، اور وہ اس کے لیے سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہی۔ ذہانت کے ساتھ علمیت کا یہ امتزاج جو مولوی صاحب کی شخصیت میں اتنا نمایاں ہی اُس کی مثال کہیں اور ذرا مشکل ہی سے ملتی ہی۔ ان دونوں کے امتزاج ہی نے بابائے اردو کی شخصیت میں تنقیدی شعور کو اُبھارا ہی اور اسی لیے وہ زندگی و ادب دونوں کے بہت اچھے نقاد نظر آتے ہیں۔ غرض مولوی صاحب کی شخصیت کے اُن تمام پہلوؤں کی جھلکیاں اُن کے ان مقدمات میں جگہ جگہ نمایاں ہیں اور اس آئینے میں اس شخصیت کی عظمت کو پوری طرح بے نقاب دیکھا جا سکتا ہی۔

یہ مقدمات اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں مقدمہ نگاری ایک مستقل فن کا روپ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہی اور اس کو ایک فن بنا دینا مولوی عبدالحق صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہی، اس کی وجہ یہ ہی کہ یہ مقدمات بڑے شوق اور انہماک

کے ساتھ لکھے گئے ہیں، ان کا مقصد محض کسی مصنف یا کتاب کا معمولی سا تعارف نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت کا مکمل اظہار ہے۔ اسی لیے بابائے اردو کے بیشتر مقدمات مفصل ہیں، اُن میں تفصیل و جزئیات ہے، وسعت اور پھیلاؤ ہے، گہرائی اور گیرائی ہے یہ خصوصیات ان مقدمات نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اور انھیں کی بدولت یہ مقدمات ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بابائے اردو کے ذہن میں مقدمہ نگاری کا ایک واضح تصور ہے اور وہ مقدمے لکھتے وقت اس تصور کو بہر صورت اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اس تصور کو عملی صورت دینا ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور اپنے مقدمات میں اُس کو عملی صورت دیتے ہیں، اُن کے مقدمات کی تکنیک یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تو کتاب کے مصنف یا مؤلف کا تعارف کراتے ہیں۔ اس تعارف میں اُس کی زندگی کے حالات کا بیان اور اُس کے کردار کی تصویر کشی اُن کے پیش نظر رہتی ہے، اسی ضمن میں وہ اُس کی مختلف تصانیف پر اختصار کے روشنی ڈالتے ہیں اور اس طرح کتاب کے مصنف یا مؤلف سے پڑھنے والے کو پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ حالات، سیرت اور تصانیف کے اس بیان میں وہ صرف عام باتوں ہی کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ اس سلسلے میں تلاش و جستجو کے بعد نئے مواد کو پیش کرتے اور اس میں نئے نکتے پیش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کے مقدمات میں بعض مصنفین کے متعلق ایسی معلومات ملتی ہیں جو کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ بڑی خوبی اُن کی یہ ہے کہ حالات کے بیان کو وہ سیرت نگاری کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ سیرت نگاری میں بابائے اُردو کو کمال حاصل ہے۔ اس لیے حالات اور سیرت کی یہ ہم آہنگی اُن کے مقدمات کے اس حصّے کو بلا کا دل چسپ بنا دیتی ہے اور پڑھنے والے کو اس میں ہلکے پھلکے ادب کا سا لطف آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مقامات پر اُن کے مقدمات میں جذبے اور تخئیل کی آمیزش ایک تخلیقی رنگ و آہنگ کو نمایاں کرتی ہے۔

حالات اور سیرت پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ زیرِ نظر تصنیف یا تالیف کا تعارف کراتے ہیں اور اس سلسلے میں پہلے تو یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ کیوں اور کس طرح لکھی گئی اور پھر اُس کے موضوع کا خاکہ پیش کر دیتے ہیں، چناں چہ اس خاکے سے کتاب کا ایک خلاصہ سامنے آجاتا ہے اور اُس کے موضوع سے پوری طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس کی ادبی، فنی اور لسانی حیثیت پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اس بحث میں اُن کا زاویۂ نظر ہمیشہ تحقیقی اور تنقیدی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس بحث سے کتاب کے فنی اور جمالیاتی پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں اور آخر میں وہ ان مباحث سے بعض نتائج نکال کر علم و ادب میں اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کا مقدمہ کتاب کا ایک مکمل تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بن جاتا ہے اور پڑھنے والے کو اس سے بڑی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ وہ کتاب سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیتا ہے، اور پھر کتاب کو پڑھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا بلکہ ایسی موانست پیدا ہو جاتی ہے جس سے اجنبیت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ اور رجحانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسی مقصد سے یہ مقدمات لکھے بھی گئے ہیں۔ ان کا مقصد محض تحقیق اور علمیت کا اظہار نہیں ہے، صرف تنقید اور تبصرے کا خیال ہی ان کا محرک نہیں ہوا۔ بلکہ مصنف، مؤلف اور کتاب کا ایک مکمل تعارف، جس سے لکھنے اور پڑھنے والے کے درمیان ایک موانست پیدا ہو جائے تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح آشنا ہو جائیں۔ اسی بنیادی خیال نے مقدماتِ عبدالحق میں وہ تکنیک پیدا کی ہے جس نے ان کی مقدمہ نگاری کو ایک فن بنا دیا ہے۔

مقدمہ نگاری کے اس فن میں مولوی صاحب کے اسلوبِ بیان اور اندازِ نگارش کو بھی نمایاں مرتبہ حاصل ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اس اسلوب نے ان مقدمات کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔

یہ مقدمات جو اتنے دلچسپ نظر آتے ہیں اور اس قدر دل کشی کا احساس ہوتا ہے، اس کا سبب ان کا اسلوب ہے۔ اسی اسلوب نے ان میں وہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو تخلیقی ادب میں پائی جاتی ہیں۔ مولوی صاحب کا اسلوب صاف اور سادہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے انداز میں سوچتے ہیں، ان کے افکار و خیالات میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے، اسی لیے اسلوب میں بھی کوئی پرپیچ کیفیت نظر نہیں آتی وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اور جو کچھ سوچتے ہیں، اس کو سادہ اور آسان زبان میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں ایک فطری روانی اور بہاؤ اس کی نمایاں ترین خصوصیت ہے، اُس میں کسی قسم کی کاوش کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیتے، کیوں کہ تکلف اور تصنع تو اُن کے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اسلوب میں آرائش و زیبائش کا شائبہ تک نہیں ہوتا، وہ سجا سجایا نہیں ہے لیکن اُس میں باقاعدگی اور سلیقہ ضرور ہے اور اسی باقاعدگی اور خوش سلیقگی ہی میں اس کا حسن ہے۔ اس حسن کا زیور سادگی ہے اور اسی سادگی میں اُن کے یہاں ایک پُرکاری نظر آتی ہے۔ موضوع اور خیال کی مناسبت سے زبان کے استعمال اور الفاظ کی دروبست کو انھوں نے ایک فن بنا دیا ہے اور اُن کے اسلوب کی یہ نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ مقدمات کی یہ چند عبارتیں اُن کے اسلوب اور اندازِ نگارش کی بنیادی خصوصیات کو پوری طرح واضح کرتی ہیں :۔

"جن ملکوں میں انتہا سے زیادہ آزادی ہے اور جہاں انتہا سے زیادہ پابندی ہے اُس کا رونا دونوں جگہ یکساں ہے مگر ہمارے ملک میں تو غضب یہ ہے کہ ماں باپ لڑکے کی کچھ پیش نہیں جانے دیتے، وہ آنکھ بند کر کے انھیں کنویں میں دھکیل دیتے ہیں اور جب گرنے کی دھم سے آواز آتی ہے تو اس پر تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے اور خوشی مناتے ہیں اور اس قدر غل غپاڑہ

مچاتے ہیں کہ اُن کشتگانِ خنجرِ تسلیم کی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔"

(مقدمہ تجرد وازدواج)

"شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہو، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا۔ ایک آدھ محاورہ آگیا۔ کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی۔ کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا، رہا مضمون سو خدا کے فضل سے اُس میں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی وہی حال ہے۔" (مقدمہ گلشنِ ہند)

"خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیٹکل حیثیت سے عالم پر چھاگئے اسی طرح انھوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کردیا اور صلح جوئی، آزادی، بے تعصبی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کررہا ہے۔" (مقدمہ معرکہ مذہب و سائنس)

ان عبارتوں میں کیسی شگفتگی اور شادابی ہے، کس غضب کی سادگی اور صفائی ہے؛ یوں تو یہ عبارتیں سیدھی سادی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں ایک حسن نظر آتا ہے اور یہ حسن اُن کی سادگی اور صفائی، روانی اور بہاؤ، ترنم اور نغمگی، بے ساختگی اور برجستگی، زبان اور الفاظ کے استعمال کی خوش سلیقگی میں ہے۔ ان عبارتوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔ ان میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں، ان میں گہرائی ہے لیکن اس سنجیدگی اور گہرائی کے باوجود یہ شگفتہ اور شاداب ہیں، ان میں لکھنے والے کی ذہانت جگہ جگہ گل بوٹے سے کھلاتی ہے اور اس کے مزاج کی لطافت اور طبیعت کی شگفتگی کہیں بجلیاں سی چمکاتی ہے، اسی لیے ان کا اثر ہوتا ہے، یہ دلوں میں جگہ بناتی ہیں — بابائے اُردو کے مقدمات اس قسم کی شگفتہ اور شاداب عبارتوں سے بھرے پڑے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ

ان مقدمات میں شروع سے آخر تک یہی اسلوب پایا جاتا ہے جس کی جھلک یہ عبارتیں دکھاتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اسی اسلوب نے ان مقدمات کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اردو ادب میں یہ مقدمات ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان سے قبل اردو میں مقدمہ نویسی کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ کتابوں پر صرف تقریظیں لکھنے کا رواج تھا۔ ان تقریظوں میں صرف مداحی ہوتی تھی اور لکھنے والے الفاظ کے ساتھ کھیلتے تھے۔ صداقت ان میں ناپید تھی خلوص نام کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ ان حالات میں یہ مقدمات لکھے گئے اور مولوی صاحب نے ان کی طرف ایسے خلوص، انہماک اور جذب و شوق کے ساتھ توجہ کی کہ انھیں ایک مستقل فن بنا دیا، اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی کیوں کہ بہرحال یہ مقدمے مقصد نہیں، ذریعہ تھے۔ چناں چہ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ مسلم ہو گیا اور فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی انھوں نے اپنی جگہ بنالی۔

کہنے کو تو یہ مقدمے ہیں جن سے صرف کسی مصنف، مؤلف یا کتاب کے تعارف کی توقع کی جاتی ہے لیکن درحقیقت یہ اعلیٰ درجے کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے ہیں، جن میں تاریخی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، لسانی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر بڑی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس بحث سے ان موضوعات کے تقریباً تمام اہم اور پیچیدہ پہلو روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان میں نئی معلومات ہیں۔ نیا تحقیقی شعور ہے، نئی تنقیدی بصیرت ہے۔ اسلوب کی نئی جمالیاتی شان ہے اور ان سب کے مجموعی امتزاج نے ان مقدمات کو اس رنگ و آہنگ سے آشنا کردیا ہے جس میں ان کی فنی انفرادیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

عبادت بریلوی

# دیباچہ

## از محمد بیگ (مرتب اوّل مقدمات)

کوئی چھ سات برس پہلے کی بات ہو کہ میں کسی کتاب پر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ پڑھ رہا تھا۔ اس سے قبل بھی میں نے دو تین مقدمات پڑھے تھے، مولوی صاحب کے مقدمات خاص انداز کے ہوتے ہیں جن میں نہ صرف ادبیت ہوتی ہو بلکہ وہ ہر کتاب کے مضامین پر بھی گہری نظر ڈالتے ہیں اور اس طرح نقد و بحث فرماتے ہیں کہ ہر مقدمہ بجائے خود تنقیدات کا موضوع بن جاتا ہو۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر تمام مقدمات یکجا جمع کر دیے جائیں تو ادب کا اور مفید ترین معلومات کا ذخیرہ ہو جانے کے علاوہ تنقیدی اصولوں پر غور کرنے والوں کے لیے بھی بے حد معاون ہو گا۔ چنانچہ میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں جس زمانے میں کہ وہ اورنگ آباد میں تشریف رکھتے تھے ایک نیاز نامہ ارسال کر کے استدعا کی کہ وہ اپنے جملہ مقدمات کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع فرما دیں، انھوں نے جواباً ارقام فرمایا کہ وہ خود اس کام کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہو۔

کسی کو مقدمات کے اجتماع اور اشاعت پر آمادہ کرنے کے بجائے بوجہ اس کے کہ محرک میں ہی تھا میں نے خود ہی اس کام کو انجام دینے کا ارادہ کیا اور

مولوی صاحب کی خدمت میں اپنے ارادہ کی اطلاع دیتے ہوئے استدعا کی کہ وہ ان تمام مقدمات کے مسودات ارسال فرمائیں جو مختلف کتابوں پر لکھے گئے ہیں

مولوی صاحب نے میرے خط کے جواب میں یہ مشورہ دیا کہ میں خود اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری نہ لوں اور نہ یہ ایسا کوئی ضروری کام ہے اور یہ کہ ان کے مقدمات کے مسودات موجود نہیں ہیں۔

لیکن میں نے پھر اصرار کیا اور یہ خواہش بھی کی کہ اول درجہ ان کتب کی فہرست عنایت فرمائیں جن پر مقدمات لکھے گئے ہیں آخر کار مولوی صاحب نے صرف چند کتابوں کے نام تحریر فرمائے اور بقیہ کے متعلق تلاش و جستجو کی ہدایت فرمائی۔

میں نے اپنی تلاش اور احباب کی مدد سے مقدمات کی ایک فہرست بنالی مگر یہ ناکافی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جناب ہاشمی مولوی صاحب کے مقدمات سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، جناب موصوف نے بڑی مہربانی کے ساتھ متعدد مقدمات کی یادداشتیں لکھوادیں جن سے مجھے بڑی قیمتی مدد ملی۔

یکے بعد دیگران کتب کو فراہم کیا گیا، جن پر مقدمات لکھے گئے ہیں اور ان کی نقلیں بھی کرلی گئیں۔ کتابوں کو فراہم اور نقول کے تیار کرنے میں میرے کرم فرما مولوی عبدالغفور صاحب عابدی نے زیادہ محنت اُٹھائی جس کے لیے میں ان کا مشکور رہوں نقول تیار ہو جانے کے بعد میں نے ان کو مولوی صاحب کی خدمت میں اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ ایک نظر ملاحظہ فرمالیں، اُنھوں نے مسودات کو واپس کرتے ہوئے بعض مقدمات کو (جو اس میرے حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں) حذف کردینے کا مشورہ دیا لیکن جو سرمایہ کہ جمع کیا گیا تھا اس میں کوئی کمی کرنے کے لیے جی نہ چاہا کیوں کہ ہر مقدمہ پڑھنے، سمجھنے اور قدر کرنے کے قابل ہے۔ چناں چہ میں نے مشورہ کے خلاف عمل کرنے کی

جسارت کی ہے جس کو امید ہے کہ مولوی صاحب از راہِ عنایت معاف فرمائیں گے

مقدمات جمع ہو گئے اب طباعت کا مرحلہ پیش آیا۔ حیدرآباد میں یہ کام کچھ آسان نہیں ہے۔ اس میں مجھ سے مختلف وجوہ کی بنا پر ناقابل معافی تساہل بھی واقع ہوا، بعد ازاں میں نے مہتمم صاحب انجمن مکتبہ ابراہیمیہ کو کتاب کی طباعت و اشاعت پر آمادہ کیا اور انھوں نے اپنی علم دوستی کے ثبوت میں اس کا ذمہ لے لیا مگر انھیں کاپی کے تیار کرانے میں بہت سی دشواریاں لاحق ہوئیں اور ایک طویل زمانہ نکل گیا۔

مقدمات پر ایک مقدمہ بھی ضروری تھا اور مولوی کے مقدمات پر مقدمہ لکھنے کے لیے کسی بڑی ہستی کی تلاش رہی۔ ایک مرتبہ مولانا مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور سلطنتِ آصفیہ خلد اللہ ملکہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر التماس کی۔ مولانا ممدوح ان دنوں حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے بڑی عنایت کے ساتھ میری ہمت افزائی فرمائی اور مقدمہ تحریر فرما دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مولانا ممدوح نے حج بیت اللہ کا قصد فرمایا، مراجعت فرمائی کے بعد بعض اہم مصروفیتوں نیز حیدرآباد سے جدا ہونے کے باعث مقدمہ نویسی کا کام انجام نہ پا سکا

مولانا کے وطن تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد میں نے عریضہ ارسال کر کے یاد دہی کی اور مولانا نے بکمال شفقت بزرگانہ ایک بہترین مقدمہ تحریر فرما کر ارسال فرمایا مقدمہ کے ملاحظہ سے معلوم ہو جائے گا کہ مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات پر کس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کس عالمانہ شان سے نقد و بحث فرمائی گئی ہے یہاں دونوں بزرگوں کے علم و فضل کی جولانگاہ الگ الگ ہے مگر مقاصد دونوں کے ایک ہیں اور ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں لہٰذا ناظرین لطف اندوز ہوں گے اور اپنی اپنی

رائے قائم فرمائیں گے۔

ہر کتاب کے موضوع بحث کے اعتبار سے اس پر مقدمہ بھی مرتب ہوتا رہا ہے۔ مثلاً اسلامیات، سائنس و فلسفہ، تاریخ و تذکرہ وغیرہ ان میں سے جس موضوع پر جتنے مقدمات ملے ان کو اسی عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہر ایک سلسلہ تنقیدات کا ایک مستقل باب بن گیا ہے۔ اس سے ناظرین کتاب کو یہ بڑی سہولت حاصل ہو جائے گی کہ وہ ہر باب کے تحت اس کے تنقیدی اصولوں کو بآسانی ذہن نشین کر سکیں گے۔ اس کا بڑا افسوس ہے کہ کتاب میں بہت سے غلط الفاظ چھپ گئے ہیں اس لیے ایک صحت نامہ بھی شامل کرنا پڑا۔ کتاب ظاہری حسن و خوبی کے اعتبار سے بھی چنداں خصوصیت نہیں رکھتی۔ مالک مطبع سے اس کی شکایت ناواجبی ہو گی۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ خود اہتمام یا انتظام عمل میں لا نہ سکا، بہر حال میرے لیے یہی غنیمت ہے کہ کسی طرح مقدمات جمع ہو گئے اور وہ اب شائع ہو رہے ہیں یقین ہے کہ مہتمم صاحب انجمن مکتبہ ابراہیمیہ مصداق ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

بہت جلد اشاعتِ ثانیہ زیادہ صحت و پاکیزگی کے ساتھ عمل میں لا سکیں گے۔

مولوی عبدالحق صاحب اور اُن کے مصنفہ مقدمات کے متعلق کچھ عرض کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے تو کسی قابل شخص کی ضرورت ہے میرا حال تو یہ ہے کہ گزشتہ بارہ چودہ برس سے دفتری مشاغل میں پھنس گیا ہوں۔ دفتری مذاق رچ گیا ہے۔ خیالات کو جمع کرنا چاہتا ہوں مگر ہو نہیں سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب کسی تعارف مزید کے محتاج بھی نہیں ہیں۔ ان کے علمی کارناموں اور زبان اردو کی مہتم بالشان خدمات سے کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہو گا جو واقفیت نہ رکھتا ہو، اور یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں ہے کہ مولوی صاحب ان بزرگوں میں سے ہیں جو صفِ اولین

ہیں شمار کیے جاتے ہیں، اُنھوں نے زبان اُردو پر وہ احسانات کیے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے، جب تک کہ زبان اُردو زندہ رہے گی، مولوی صاحب کا نام بھی زندہ رہے گا۔ یہ وہ حیات جاوید ہے جو صرف علم کی سیوا کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ تعلیم سے بہرہ ور ہیں اور بہت سے علم و فضل میں بھی ممتاز ہیں مگر بڑی فضیلت تو اس میں ہے کہ علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے عوام کی بصیرتوں کو بڑھایا جائے ورنہ ایسے علم و فضل کا کوئی مفاد نہیں جو اس کے حاملوں کے سینوں کو تو منور رکھتا ہو مگر ہزاروں تشنگان علم پر اس کا پرتو نہ پڑتا ہو میرا حافظہ قصور نہ کرتا ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً ۳۰، ۳۲ برس پہلے جب کہ مولوی عبدالحق صاحب کا تعلق مدرسہ آصفیہ سے تھا، میں نے مولوی صاحب کی علمی خدمات اور تجسس و تلاش علم سے واقفیت حاصل کی۔ حیدرآباد بھی عجیب مقام ہے جہاں جاہ و مرتبت کو پیدا کرنے کے لئے کبھی کسی کو کوئی تنگی نہ رہی، ہر وہ شخص اس میں کامیاب ہوا جس نے تھوڑی بہت خصوصیت پیدا کرلی۔ اگر حیدرآباد کی گزشتہ چند سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی یہی وہ وسعت آغوش ہے جس کی وجہ سے حیدرآباد نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک غیر میں بھی پوری شہرت رکھتا ہے اور بڑی عظمت و وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے ملک میں مولوی عبدالحق صاحب کے لیے اپنے کو کسی بڑے عہدے کا امیدوار بنا لینا اور اس کے حصول کی جد و جہد میں مصروف ہو جانا کوئی مشکل کام نہ تھا، اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً کامیاب ہوتے اور آج سر فہرست کے لوگوں میں سے ہوتے۔ مگر وہ سچا علمی ذوق رکھتے تھے، علم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور عمر بھر متعلم بن کر رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے اس ولولے اور اس جوش میں اپنی تمام خواہشات اور تمناؤں کو خیرباد کہا اور بڑی ہمت و مردانگی کے ساتھ اپنے لیے صرف صیغۂ تعلیمات کو پسند کیا جہاں وہ اب تک علم کی خدمتوں میں مصروف ہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے بہت سے موافق اور ناموافق

زمانے گزرے، متعدد وہمت شکن واقعات پیش آئے مگر انھوں نے کسی بات کی کوئی پروا نہیں کی، اور اگر کوئی پروا کی بھی تو خدمتِ علم ہی کی، خود پڑھتے رہے، دوسروں کو پڑھایا کیے پھر پڑھنے اور پڑھانے کا عظیم الشان سرمایہ فراہم کیا، غرض یہ کہ وہ میدان علم میں ہمیشہ جمے رہے، اپنا فائدہ دیکھا تو خدمتِ علم کے لیے دیکھا، دوسروں کا فائدہ کیا تو خدمتِ علم کے لیے کیا اور کبھی کسی کا نقصان کیا بھی تو خدمتِ علم کی خاطر سے کیا۔ بہر حال اپنے مسلسل علمی ذوق کا ایک ایسا نقش قائم کر کے چھوڑا جو نہ صرف سلطنتِ آصفیہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا اور جس پر چلنا باعثِ فخر و مباہات سمجھا جائے گا۔

مولوی صاحب کا ہر وہ مقدمہ جو عموماً ہر لسانی کتاب پر مرتب ہوا ہی اپنا مرتبہ آپ حاصل کر چکا ہی بقول مولوی صاحب کے وہ "مقدمہ باز" مشہور ہو چکے ہیں یہ لقب علمی معنی میں ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہی کہ اردو مقدمہ نویسی کے فن میں مولوی صاحب کو زمانہ ہمیشہ معلم اول سمجھتا رہے گا، مجتمع مقدمات کو ایک جگہ دیکھ لینے کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ بہ حیثیت مجموعی ایک ایسی مستقل تصنیف ہی جس میں نہ صرف ادبی لذتیں ہیں بلکہ طریقۂ نقد و بحث کے بے شمار اسلوب بیان مذکور ہیں اور معلومات کے انبار لگے ہوئے ہیں جن سے ہر ذی علم اور صاحبِ ذوق لطف اندوز ہو سکتا ہی۔ اور بصیرتیں حاصل کر سکتا ہی۔

ہر ایک مقدمہ ایسا ہی کہ اس کے پڑھنے سے لکھنے والے کے تبحر علمی اور محنت و جاں کاہی کا اندازہ ہو سکتا ہی اور جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ کام کیا گیا ہی۔ حق تو یہ ہی کہ مولوی صاحب کا حصہ تھا۔ تمدن ہند، معرکہ مذہب و سائنس، اعظم الکلام کے مقدمات کو پڑھیے اور غور فرمائیے کہ کیسی باریک بینی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان کتابوں پر تنقیدیں فرمائی ہیں اور کیسے کیسے معرکۃ الآرا مسائل پر بحث و تمحیص کی ہی شبلی مرحوم اور عطیہ بیگم صاحبہ کی باہمی مراسلت پر جس خوبی کے ساتھ اور جس انداز

میں مقدمہ لکھا گیا ہے اس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ تذکرات شعرائے قدیم پر جتنے مقدمات لکھے گئے کیسے پُر لطف اور کتنے قیمتی معلومات کے حامل ہیں۔

غرض یہ کہ ہر ایک مقدمہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے اور مصنف کے مرتبہ کو بھی منوا لیتا ہے۔ مجھ میں نہ استعداد ہے کہ شرح و بسط کے ساتھ عرض کروں اور نہ اتنی فرصت ہے کہ ایسی کوشش کروں جن چند سطور کو میں نے لکھا ہے سمجھتا ہوں کہ وہ دیباچہ کی تقریب میں ناکافی ہیں اور اس سے زیادہ لکھنا چاہیئے تھا لیکن میری معذوری بھی قابل معافی ہے اور امید کرتا ہوں کہ مقدمات کو پڑھ کر استفادہ اور مصنف کی مزید قدر و منزلت کی جائے گی۔

کیپ بورلم ۱۹ ربہمن ۱۳۴۱ ف		محمد بیگ

# مقدمہ

از جناب مولانا مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور سلطنتِ آصفیہ

حیدر آباد دکن

مرزا محمد بیگ صاحب دکن کے ان جواں مردوں میں ہیں جو اپنے سینے میں دل اور دل میں علم و ادب اور وطن کی خدمت کا ذوق رکھتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ باوجود ملازمت کے فرائض کو خوبی سے انجام دینے کے اہتمام کے ساتھ علم و وطن کی خدمت بھی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے قیام حیدر آباد میں مرزا صاحب کو وطنی و علمی خدمت کے لیے ہمیشہ مستعد پایا۔ اس مستعدی کی بنا پر میرے دل میں ان کی عزت ہے۔ اسی پاسِ عزت کا اثر تھا کہ جب میرے قیام حیدر آباد کے آخری ایام میں مرزا صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال ظاہر کر کے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے بے تامل اس کو قبول کر لیا۔ اس قبول میں ایک اور گہرا خیال بھی معین ہوا اور وہ ایک ممنونی کے اظہار کا موقع ہاتھ آنا ہے اگرچہ میں منت پذیری کا اعتراف ذاتی طور پر کر چکا ہوں۔ تاہم دل اعلان کے موقع کا جویا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ سب سے اول جس مقدمہ کو پڑھ کر میں متاثر ہوا وہ عبدالحق صاحب کا نوشتہ تھا۔ یہ یقینی ہے، البتہ یہ ظنی ہے کہ وہ مقدمۂ ارتقاء الاسلام“

پر لکھا گیا تھا۔ شبہ ہے کہ کوئی اور مقدمہ ہو، بہر حال وہ کوئی سا ہو مقدمہ نگار مولوی عبدالحق صاحب ہی تھے۔ اس مقدمہ کے پڑھنے کے بعد مجھ کو بہت سے مقدمے لکھنے پڑے ہیں جن کو لکھوانے میں خود مولوی عبدالحق صاحب کی فرمائش کا زور کارفرما رہا ہے، جو اعتراف علی الاعلان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ان مقدمات میں کوئی خوبی پیدا ہو سکی ہے تو دل میں اس کا نقش اول مقدمہ بالا کے پڑھنے سے قائم ہوا تھا۔ دعویٰ تلمذ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ پیروی کی سعی لنگ کا دعویٰ البتہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی مدعی کمال بننے کے لیے نہیں ادائی شکر و سپاس کے لیے۔

## مقدمہ کیا ہے

اس دور عجیب میں جہاں مؤلفین اور مصنفین کی کثرت ہے وہاں مقدمہ نگار بھی روز افزوں ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ کمتر مقدمے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ بہت کم مقدمے مقدمے ہوتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریظ اور مقدمے میں امتیاز نہیں کیا جاتا کہ اصل میں تو مقدمہ لیا گیا ہے مقدمہ الجیش سے جب ہم صاحب جیش تھے تو مقدمہ الجیش کو خوب سمجھتے تھے کہ کیا ہے، اب نہ جیش نہ مقدمہ الجیش۔ روزمرہ کے مشاہدے سے مدد لیجیے، آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گزریں گے تو دیکھیں گے کہ دوکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دل فریب طریقے سے آراستہ سب سے اوّل دیدہ نواز ہوگا۔ یہ اپنی دل فریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کرے گا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو وہ بتائے گا کہ آپ کو جو جنس دوکان میں ملے گی وہ کیا ہے بعینہ یہی حال ایک کتاب کے مقدمہ کا ہے کہ وہ آپ کو دل کش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔

پیش طاق کے واسطے دو شرطیں تھیں سلیقہ اور تفصیل، بعینہ یہ دو شرطیں ایک مقدمہ کے واسطے ہیں، لکھنے میں اس کا سلیقہ ہو کہ دل کش پیرایے میں کیا لکھا جائے، اور کیا نہ لکھا جائے، کتاب کا کونسا حصہ نمایاں کیا جائے اور کونسا مخفی رہے تفصیل

ایسی ہو کہ کتاب پڑھنے کے بعد مایوسی نہ ہو بلکہ یہ اعتراف ہو کہ مقدمہ نگار احسان گزار تھا۔ اگر مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کر سکے اور پڑھنے والوں کے لیے مناسب موقع مزید معلومات بہم پہنچا دے اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھ رہا ہے تو اس کو کمال مقدمہ نگاری ماننا چاہیے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات اس معیار پر کامل اترتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنے موضوع پر قلم اس وقت اٹھاتے ہیں جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنف پر اور موضوع کتاب پر اس لیے ان کے مقدمات میں یہ سہ گانہ پہلو روز روشن کی طرح عیاں نظر آتے ہیں جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے اس کے موضوع پر، اس کے مطالب پر ایسی محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلہ موضوع کر گیا ہے۔ ہاں یہ خیال رہے کہ تقریظ نہیں لکھتے مقدمہ لکھتے ہیں۔ مالہ وماعلیہ دونوں سے بحث کرتے ہیں۔ خوبی بھی دکھاتے ہیں عیب بھی جتاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ کے لیے رائے قائم کرنے کا موقع بھی چھوڑتے ہیں۔ بیان وہ ہے جس میں صفائی ہے، محاورہ ہے، ادب ہے، زور ہے۔ ہاں کہیں ادب نہیں بھی ہے اور زور تو ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے مقدمہ لکھتے نہیں لڑاتے ہیں ان تمام اوصاف کی وجہ سے بیان دلآویز بھی ہے اور غور آفریں بھی۔

**تفصیل مقدمات** مقدمات کا حصہ اول جو ہمارے سامنے ہے، اس میں ۱۴ مقدمے ہیں، تین حصوں پر ۱۴ مقدمے تقسیم کئے گئے ہیں، اسلامیات سائنس و فلسفہ، تاریخ و تذکرہ۔ اسلامیات میں اعظم الکلام، تحقیق الجہاد، معراج العاشقین پر مقدمے ہیں۔ دونوں اول الذکر نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم کی مصنفہ ہیں۔ تیسری حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کی،

مولوی چراغ علی مرحوم سرسید مرحوم کے پیروؤں میں باعتبار اپنے خاص

اوصاف کے درخشندہ گوہر تھے۔ حیدرآباد کی حاضری کے زمانے میں یہ مسلسل کوشش میں نے کی کہ ان کی حیات ان کی شان کے مطابق لکھی جائے، کامیابی نہ ہوئی، اگرچہ مرحوم کے بعض اعزہ نے وعدہ اور ارادہ بھی کیا۔ مولوی صاحب مرحوم کے مذہبی خیالات وہی ہیں جو سرسید مرحوم کے تھے۔ سرسید مرحوم کا دل جب مسلمانوں کی پسماندگی بلکہ درماندگی دیکھ کر دُکھا تو انھوں نے کمرِ ہمت اصلاح پر مضبوط باندھی اور خدا کا نام لے کر کام کرنے کو کھڑے ہو گئے۔ علی گڑھ کے لیے یہ فخر ہے اور رہے گا کہ سرسید کی محنتوں اور جاں فشانیوں کی رزم گاہ یہی ہے۔ قدرتاً علی گڑھ والوں کو سرسید کے دیکھنے اور اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع سب سے زیادہ ملا۔ میرے بزرگوں نے ان کے ساتھ کام کیے میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق بزرگوں کی نقل کی۔ یہ ہماری خاندانی روایت ہو کہ سرسید کی صداقت اور نیک نیتی میں شبہ نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ رائے بھی تھی کہ سرسید کا مذہبی خیال صحیح نقطے سے ہٹا ہوا تھا۔ اور یہ رائے ایسی کھلی ہوئی تھی کہ سرسید بھی اس سے خوب واقف تھے اور باوجود مخالفت کے وقعت کرتے تھے۔ تفصیل کی ضرورت ہے نہ موقع مختصراً وہ رائے نتیجہ تھی یورپ اور سائنس سے مرعوبیت کا یعنی خیال یہ تھا کہ یورپ میں کمال ہی کمال ہے۔ سائنس کی صداقت شبہ سے ماوراء تھی۔ مسلمانوں کو الحاد سے روکنے کے لیے اُنھوں نے تطبیق کی کوشش کی۔ چوں کہ سائنس پر حاوی نہ تھے، اس کو مذہب تک نہ لا سکے، مذہب کو سائنس کی سطح پر لانے کی کوشش فرمائی، یہیں غلطی کی۔ اگر آج سرسید زندہ ہوتے اور آج تفسیر لکھتے تو یقیناً یورپ اور سائنس سے اتنے مرعوب نہ ہوتے جتنے انیسویں صدی کے وسط میں ہوئے، حال ہی میں جو عظیم الشان کانفرنس سائنس کے علماء کی لندن میں ہوئی اس کے پریسیڈنٹ کا ایڈریس بتاتا ہے کہ بیسویں صدی کی سائنس انیسویں صدی کی سائنس سے بہت مختلف ہے۔ اس کے اندر اتنا انقلاب ہو گیا ہے کہ رفتہ رفتہ ان باتوں کا اقرار کرنے لگی جس کو گزشتہ صدی میں محالات میں سے

کہہ چکی تھی۔ مادہ اپنی ساری ہیئت کے ساتھ فنا ہو چکا ہے۔ زمان و مکان کا نظریہ پچھلے نظریوں کو تہ و بالا کر رہا ہے۔ مادہ سے ماورا، اس دنیا کے سوا کچھ اور نظر آجانے کے آثار ہیں۔ آمدم بر سرِ مطلب۔ سر سید کے رفقا نے بھی مذہب کی خدمت کا وہی پہلو اختیار کیا جو سر سید نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایک سے زیادہ مقدمے بتلاتے ہیں کہ مقدمہ نگار بھی انھیں خیالات کے قدر دان ہیں اس لیے ان دونوں مقدموں میں دل کھول کر اعظم یار جنگ بہادر کے خیالات کی پُر زور تائید کی ہے اور مخالفین کی پوری قوت سے دار و گیر۔ یہ ضروری ہے کہ یہ خیالات ایک طبقے کو گراں گزریں گے اور شاید وہ دار و گیر کو قابل معافی نہ سمجھیں اور بے دینی کا ملزم قرار دینے پر آمادہ ہو جائیں مگر ان کو فیصلہ کرنے سے پہلے یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ سر سید کے مخالفین نے بھی جو کچھ لکھا یا کہا وہ بھی سب کا سب تہذیب اسلام کے دائرے کے اندر یا حکمت و موعظت حسنہ کا مصداق نہ تھا۔ اگر اس طرف سے یہ روش اختیار نہ ہوتی تو ان کے مخالف بھی قلم کی باگ ڈھیلی نہ کرتے۔ انصاف یہ ہے کہ اب بھی پلّہ ادھر ہی جھکا رہے گا۔

اس موقع پر یہ نہ لکھنا حق پوشی ہوگا کہ زیادہ محتاط علما نے اس وقت بھی سر سید کی تکفیر سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا۔ میرے ذاتی علم میں حضرات مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد لطف اللہ صاحب، مولانا سید محمد علی صاحب اسی طبقۂ علما میں شامل تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم نے مکہ مکرمہ میں اپنے مدرسہ صولتیہ کے علما کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کبھی کسی تکفیر پر یا اخلاقی مسئلہ پر فتویٰ نہ دیا جائے۔

اعظم الکلام کا مقدمہ مجھ کو یوں بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے اس میں مولوی چراغ علی مرحوم کے حالات اور علمی اوصاف پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ علمی اوصاف ایسے ہیں کہ قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اہل علم ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں، جن اصحاب کو

مولوی عبدالحق صاحب کے خیالات بالا سے غصہ آئے وہ ان کے ملحد بنانے میں جلدی نہ کریں اور مرے اوپر کرم فرماکر معرکۂ مذہب و سائنس کا مقدمہ غور سے حرف بہ حرف پڑھ لیں اس سے واضح ہو جائے گا کہ مولوی صاحب کے دل میں مذہب کا کتنا گہرا عقیدہ اور ادب ہے۔ اس کا اخیر حصہ پڑھ کر میری آنکھیں تو پرنم ہوگئیں، مقدمہ مذکور اس قابل ہے کہ وہ خوش نما تقطیع پر بہت عمدہ طبع کرا کے خصوصاً طلبہ میں بکثرت تقسیم کیا جائے میرا مضبوط یقین ہے کہ بہت سے بڑے بڑے رسالوں سے زیادہ یہ مقدمہ مذہب کی تائید بمقابلہ سائنس کے کرنے میں کامیاب تر ثابت ہوگا، میرے خیال میں یہ مقدمہ تمام مقدمات میں بلند پایہ ہے۔ تمدنِ ہند کا مقدمہ بھی بہت مفید اور علم آموز ہے مجھ کو بڑی دل چسپی اس حصہ سے ہوئی جس میں سید علی مرحوم کے حالات ہیں۔ یہ حالات نمونہ ہیں کہ کسی ممتاز آدمی کے اوصاف پر مخالف موافق رائے کس طرح ظاہر کی جائے۔ نادر بات یہ ہے کہ مترجم تمدن ہند کے ایسے ضروری حالات یکجا کر دیئے ہیں کہ ان سے بہتر دوسری جگہ شاید ہی ملیں اس پر جتنا افسوس ہو کم ہے کہ ہم اس طبقے کو ابھی سے فراموش کر چکے جو سر سید سے شروع ہو کر وقار الملک پر ختم ہوا تھا حالاں کہ ان کی حیات میں ایسے جواں مردانہ کارنامے ہیں جو ہمت آفرینی میں اکسیر کا کام دے سکتے ہیں، کیسا ہی عبرت ناک یہ بیان ہو مگر واقعہ ہے کہ آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سب سے زیادہ گم ہستی سر سید احمد خاں مرحوم کی ہے۔ نام جاننے والے یا لینے والے بہت نکلیں گے مگر ان کے حالات جاننے والا، ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر پیروی کا شوق رکھنے والا مجھ کو تو کوئی نظر نہیں آتا۔ کیا یہ علامت کسی قوم کی زندگی کی ہے۔ پس مولوی عبدالحق صاحب کی وہ سعی جو انھوں نے اس طبقے کے کارنامے یاد دلانے کے لیے کی ہے ہمارے شکر کی مستحق ہے۔ نیز اس جامع کی جس کی کوشش سے یہ مقدمات یکجا طبع ہو کر ملک و ملت کے سامنے آرہے ہیں۔ کاش ایک بات میری مولوی عبدالحق صاحب سن لیتے، اگرچہ

اب تک نہیں سنی ہے۔ عبداللہ خاں مرحوم جن کا ذکر بار بار متعدد مقدموں میں آیا ہے ضرور اس کے مستحق تھے کہ ان کے حالات پبلک کے سامنے لائے جاتے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ حالات ایک ایسا نقشہ دکھاتے جس کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ جاتی۔ کم سے کم یہ ہو کہ رسالہ اردو میں ایک بسیط مضمون چھپ جائے۔ یہ بھی کہہ دوں کہ اگر مولوی صاحب نے یہ حالات نہ لکھے تو پھر دوسرا لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ حیات النذیر کے مقدمہ کے متعلق ایک واقعہ کا اظہار ضروری ہے، مولوی نذیر احمد خاں صاحب مرحوم کے رسالہ امہات الامہ جلائے جانے کے واقعہ کو مولوی صاحب نے بڑی دل سوزی سے بیان کیا ہے ایسا کہ دل سوزی نے اس میں کباب کا چٹ پٹا پن پیدا کر دیا ہے۔ یاجب الاظہار واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء اس کے جلانے پر آخر تک آمادہ نہ تھے، خود مولوی صاحب مرحوم کی تحریک تھی، اس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار سے بدل دیا، اصرار نے شدت اختیار کی بلکہ دھمکی کی صورت جیسی کہ مولوی صاحب مرحوم کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی۔ مسیح الملک مرحوم نے (جو واسطہ تھے) بالآخر کہا کہ میں نے شیر کو کٹھرہ میں بند کر دیا ہے۔ آپ نکالتے ہیں۔ اس پر جلسہ کر کے غور کیا گیا اور مؤلف مرحوم کی رائے کی تائید ہوئی، چناں چہ رسالے جلائے گئے۔ مٹی کا تیل لاکر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا، وہ میں ہی تھا۔ اتفاق یہ کہ جلانے کے بعد آندھی نے خاکستر اڑا دی، بارش نے جگہ صاف کر دی، اس طرح ''ہلاس'' سونگھنے کا موقع کسی کو نہ مل سکا۔

اب تحفیت تصدیقہ مقدمات کی جانب توجہ کیجیے

حبیب گنج ضلع علی گڑھ

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء

# تذکرے

# مقدمۂ 'نکات الشعرا'

میر صاحب کے حالات اس زمانے میں کافی طور پر شایع ہو چکے ہیں اور خصوصاً 'ذکرِ میر' کی اشاعت سے اُن حالات اور واقعات کا انکشاف ہوا ہی جو اس سے قبل کسی تذکرے وغیرہ میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ لکھنا لاحاصل ہی۔ البتّہ تذکرے کے متعلّق چند باتیں بہ طور مقدمے کے لکھنی ضرور معلوم ہوتی ہیں ؛

اس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں 'نکات الشعرا' کو ان تمام پر تقدّم حاصل ہی۔ میر صاحب کے علاوہ بعض اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مدّعی ہیں کہ سب سے پہلے ریختہ گو شعرا کا تذکرہ انھوں نے لکھا ہی۔ مثلاً قائم جس کے تذکرے کا سنِ تالیف ۱۱۶۸ھ ہی یا خاکسار جس نے سنہ ۱۱۶۵ھ میں 'معشوقِ چہل سالہ خود' کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ گارساں دتاسی نے غلطی سے یہ خیال کر لیا ہی کہ گردیزی کو بھی یہ دعویٰ ہی کہ اس کا تذکرہ سب سے پہلا ہی۔ حال آں کہ اس نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے میں اُن تذکروں کی ناانصافی اور کم تحقیقی کی شکایت کی ہی جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہی۔ خاکسار کے تذکرے کے متعلّق میر صاحب فرماتے ہیں کہ "علی الرّغم ایں تذکرہ تذکرہ نوشتہ است بہ نام

'معشوق چہل سالۂ خود'۔ احوال خود را اوّل از ہمہ نگاشتہ وخطاب خود سیّد الشعرا پیش خود قرار دادہ" اس کی حقیقت ان چند سطروں سے ظاہر ہے۔ 'تذکرۂ گردیزی' کا سنِ تالیف ۱۱۶۶ھ ہے اور قائم کا سنہ ۱۱۶۸ھ ہ

میر صاحب نے اپنے تذکرے کے سنِ تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی۔ البتہ انندرام مخلص کے حال میں یہ فقرہ اُن کی قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے اس کی نسبت قیاس قایم ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "قریب یک سال است کہ درگزشت"۔ یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیرِ تالیف تھا مخلص کو مرے ایک سال ہوا تھا۔ مخلص کا سنِ وفات ۱۱۶۴ھ ہے۔ (ملاحظہ ہو 'خزانۂ عامرہ'، مطبوعہ نول کشور صفحہ ۴۲۵) لہٰذا یہ قیاس بالکل بجا ہے کہ اس کا سنِ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ اور چوں کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے جس کے متعلق میں 'تذکرۂ ریختہ گویاں'، مؤلفہ گردیزی کے مقدمے میں مفصّل بحث کر چکا ہوں۔ اس لیے اس سن کی صحت کی پوری تصدیق کی جاتی ہے۔ البتہ اسی سن میں دو تذکرے اور تالیف ہوئے تھے ایک 'تحفۃ الشعرا'، مؤلفہ افضل بیگ قاق سال اورنگ آبادی اور دوسرا 'گلشنِ گفتار' مؤلفہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔ لیکن ان کا علم میر صاحب کو مطلق نہیں۔ بلکہ میر صاحب کے بعد بھی جس قدر مشہور تذکرہ نویس ہوئے ہیں مثلاً قائم، میر حسن، مصحفی، قاسم، شوق وغیرہ وہ سب ان سے لاعلم تھے ہ

چند تذکرے میر صاحب سے بھی لکھے گئے تھے مثلاً تذکرہ سیّد امام الدین خاں، بہ عہد محمد شاہ جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے۔[1] 'تذکرۂ خان آرزو' مگر یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے۔ 'تذکرۂ سودا'، اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم

---

[1] دیکھو 'تذکرۂ میر حسن'، مطبوعہ انجمنِ ترقّیٔ اُردو

نے اپنے تذکرے مجموعۂ نغز[۱] میں دیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ غالباً وہ قایم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے۔ بہرحال میر صاحب کے سامنے ان میں سے کوئی تذکرہ نہ تھا اور نہ اب تک یہ دست یاب ہوئے ہیں ⁂

یہ تذکرہ اُس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی میں ہے اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں عموماً اور اکثر شعرا کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ یہ بات دوسرے تذکروں میں نظر نہیں آئے گی۔ دوسرے ایجاز کے ساتھ اس کی عبارت کے ساتھ شگفتگی اور پختگی بھی ہے ⁂

بعض باتیں پہلے پہل اسی تذکرے سے معلوم ہوئی ہیں۔ مثلاً جو ریختہ شیخ سعدی شیرازی سے منسوب چلا آ رہا تھا سب سے پہلے اس کی تردید میر صاحب ہی نے کی اور یہ بتایا ہے کہ یہ شاعر سعدی دکھنی تھا۔ یا میرزا جان جاناں کا نام جو عام طور پر مشہور ہے وہ اصل میں میرزا جانِ جاں ہے۔ اسی طرح ولی کو سب سے پہلے اورنگ آبادی میر صاحب ہی نے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ امر متنازعہ فیہ ہے اور کوئی قطعی ثبوت اب تک بہم نہیں پہنچا کہ ولی اورنگ آبادی تھا یا احمد آبادی ⁂

میر صاحب نے ہر جگہ ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے البتہ دیباچے میں ایک جگہ ریختے کی تعریف کرتے ہوئے اُردو کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن وہ بھی نسبت کے ساتھ :-

"ریختہ کہ شعریست بہ طور شعر فارسی بہ زبان اُردوئے معلّٰی شاہ جہان آباد دہلی"

ذکرِ میر، میں بھی ریختے کی یہی تعریف کی ہے۔ صرف آخری لفظ بدل دیے ہیں:-

"ریختہ کہ شعریست بہ طور شعر فارسی بہ زبان اُردوئے معلّٰی بادشاہِ ہندستان"

---

[۱] "مجموعۂ نغز" صفحات ۲۵، ۲۹۸ جلد اوّل۔

تنہا 'اردو' کا لفظ زبان کے معنوں میں کہیں استعمال نہیں کیا۔ ایک جگہ کم ترین کے حال میں مراختہ کا لفظ بھی لکھا ہی۔ یہ لفظ اُس زمانے میں فارسی مشاعروں کے مقابلے میں رائج ہو گیا تھا :-

"گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ ایں لفظ بہ وزنِ مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود۔" (صفحہ ۱۴۷)

یہ بات آج کل عجیب معلوم ہوگی کہ میر صاحب ہندُستان سے دلّی مراد لیتے ہیں۔ چناں چہ میر عزلت کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

"تازہ وارد ہندُستان کہ عبارت از شاہ جہاں آباد است۔"

اُس وقت درحقیقت دلّی سارے ہندُستان کا دل تھی۔ یہاں کی ہر بات دُوسروں کے لیے سند تھی خصوصاً زبان کے معاملے میں یہ فضیلت کبھی کسی شہر کو حاصل نہ ہوئی ہوگی ؛

ایک معاملہ البتّہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میر صاحب نے اس تذکرے میں اپنے ماموں سراج الدّین علی خاں آرزوؔ کا بڑے ادب اور احترام سے ذِکر کیا ہی اور معز فطرت کے حال میں "اُستاد و پیرو مرشد بندہ" کے الفاظ سے یاد فرمایا ہی۔ لیکن 'ذِکرِ میر' میں انھوں نے خان آرزوؔ کی بدسلوکی، بے مروّتی اور دِل آزاری کی، ایک ایسی درد انگیز داستان لکھی ہی کہ جسے پڑھ کر نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہی۔ ان دو متضاد بیانات کو پڑھ کر آدمی گومگو میں پڑ جاتا ہی۔ میرا خیال یہ ہی کہ 'تذکرہ'، عام تالیف تھی جو ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جانے والا تھا اور 'ذِکرِ میر' آپ بیتی ہی جس میں مصنّف نے اپنے حالات بے کم و کاست بیان کر دیے ہیں۔ گویا یہ ایک قسم کا روزنامچہ ہی۔ 'تذکرے' کو انھوں نے تذکرے ہی کی حیثیت تک رکھا ہی اور اس میں اپنے ذاتی حالات اور خانگی قضیوں کا

نام تک نہیں آنے دیا۔ اس سے میر صاحب کی سلامتِ طبع اور سلامتِ ذوق کا پتا لگتا ہے ؎

میر صاحب کی شہرت ان کے شعر و سخن بلکہ غزل کی وجہ سے ہے۔ لیکن ان کی نثر کی یہ دو کتابیں یعنی 'نکات الشعرا' اور 'ذکرِ میر' بھی اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ اس سے ان کی پاکیزہ فارسی نثر نگاری ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ ان دو کتابوں کا اُردو ادب سے بھی گہرا تعلق ہے اور ان کی بدولت ایسی معلومات تک دسترس ہوتی ہے جو کہیں اور نہیں ملتیں اور بعض ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے جو ایک مدت سے چلی آ رہی تھیں۔ 'نکات الشعرا' شرُوع سے آخر تک دلی میں لکھا گیا ہے اور سوائے دکن کے چند شعرا اور بعض قدیم ریختہ گو شعرا کے باقی سب کے سب دلی کے شاعر ہیں اور ان میں بھی اکثر ایسے ہیں جن سے میر صاحب بہ ذاتِ خود واقف تھے۔ یہ میر صاحب کی ابتدائی تصنیف اور عالمِ جوانی کی مشق ہے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۹ برس کی ہوگی لیکن عبارت کی متانت اور شگفتگی تنقیدی نظر اور نکتہ رسی سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا ذوقِ ادب اور ذوقِ سخن ابتدا سے بہت صحیح اور سلیم تھا ؎

ہم نے یہ تذکرہ ایک مستند قلمی نسخے سے طبع کیا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے ترقیمے سے معلوم ہوگا۔ یہ سیّد عبدالولی عزلت کے لیے لکھا گیا تھا۔ میر صاحب' عزلت کے علم و فضل اور بزرگی اور ان کے کلام کی خوبی کے قائل ہیں اور عزلت بھی میر صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں سید صاحب کی بیاض سے استفادہ بھی کیا ہے۔ تذکرے کی کتابت سنہ ۱۱۷۲ھ کی ہے۔ یعنی تصنیف سے سات سال بعد لکھا گیا ہے۔ خط بھی صاف اور شیریں ہے ؎

---

# مقدمۂ تذکرۂ ریختہ گویاں

یہ تذکرہ سیّد فتح علی حسینی الرضوی الگردیزی کی تالیف ہے۔ سیّد فتح علی ساداتِ گردیز میں سے تھے۔ ان کے والد سیّد عوض خاں محمّد شاہ بادشاہ کے عہد میں لشکرِ بادشاہی کے بخشی تھے اور امیرانہ بسر کرتے تھے۔ محمّد شاہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند اور جانشین احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں کچھ عرصے کے لیے نیابت صوبہ دار لاہور کی خدمت پر سرفراز ہو گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب دلّی پر حملہ کیا تو سیّد صاحب مردانہ وار لڑتے لڑتے شہید ہو گئے؛

ان کے بڑے فرزند سیّد فتح علی حسینی اپنے وقت کے مشائخ اور صوفیا میں شمار کیے جاتے تھے اور جو شجرہ ان کا تجویز کیا ہوا مجھے ملا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے وہ مخدوم میر جہاں (خلیفۂ مخدوم شاہ عالم محمّدی خلیفۂ میر سیّد محمّد کبیر خلیفۂ شیخ محبّ اللہ الہ آبادی) سے بیعت تھے اور ان کے خلفاء میں سے تھے؛

اس امر کا ثبوت کہ ان کا شمار اپنے وقت کے بزرگانِ دین اور شیوخ میں تھا۔ میر قدرت اللہ قاسم (صاحبِ تذکرہ و دیوان) کے کلام سے بھی ملتا ہے۔ وہ انھیں اپنا پیر و مرشد کہتا ہے اور اپنے کلام میں جگہ جگہ ان کی مدح و ثنا کرتا ہے۔ چناں چہ اپنی مثنوی 'کراماتِ پیرانِ پیر[1]' میں یہ اشعار ان کی

---

[1] کتاب خانہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (حبیب گنج)

نسبت لکھے ہیں ؎

گیا جب جہاں سے وہ ناصح کریم[1] ہوا اور برس آٹھویں یہ یتیم
پس از رحلتِ والدِ خوش یقیں بہ سہ سال ای مردِ نیک دیں؟
ہدایت سے ایک سیدِ پاک کی گزیں نخلۂ باغ لولاک کی
کہ ہے میر فتح علی خاں لقب حسینی تخلص حسینی نسب
حسب اور نسب اس کی ہے آفتاب ہے مستغنی الذکر درجِ کتاب
نہایت ہی عالی نسب وہ بزرگ بہ غایت ہے والا حسب وہ بزرگ
وہ ہے آج شیخ الشیوخِ زماں غریقِ شریعت کراں تا کراں
وہ توحید کا بحرِ اخضر ہے آج وہ اس علم میں شیخ اکبر ہے آج
وہ ہے ہادئ رہ روانِ خدا دلیلِ بزرگانِ صاحب صفا
وہ ہے آج میاں شیخ مردم تراش فقیر اس سے لازم ہے سیکھیں معاش
کہ ہے آج وہ پیرِ روشن ضمیر امیرِ و فقیر و فقیر و امیر
توکل ہے اس کا وہ چست و درست کہ ابرِ سیاہ دل جو ہو کہر سست
نہ یک سال بل سال ہائے دراز ٹلے اپنی جا سے نہ وہ سرفراز

غرض اس طرح وہ ان کی مدح میں برابر لکھتا چلا گیا ہے۔ علاوہ اس کے قاسم نے اولیا اور صوفیا کے کئی سلسلوں کے بزرگوں کے نام نظم کیے ہیں جو اس کے کلیات میں پائے جاتے ہیں۔ ان سلسلوں میں کئی جگہ فتح علی کا نام آیا ہے۔ مثلاً سلسلۂ علیہ حضراتِ قادریہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں ؎

حالیا یعنی دعا سر می کنم شعلۂ از داغِ دلے بر می کنم
یا الٰہی تو بہ آں عالی نسب آں کہ شد فتح علی خانش لقب

---

[1] اپنے والد سے مراد ہے ؂

انھیں حضرات کے سلسلے میں ایک دُوسری جگہ یوں ذِکر کیا ہی ؎

مناجاتے از سینہ سر می کنم    زسوزِ دروں شعلہ بر می کنم
الٰہی بہ شیخے حسینی لقب    دِل آگاہ و فتح علی خاں لقب

شجرۂ طیّبہ حضراتِ چشتیہ نظامیہ صابریہ کے ذیل میں اس طرح بیان کیا ہی ؎

بہ دست آویز ایں رنگیں فسانہ    مناجاتے کنم سر عاشقانہ
خداوندا بہ آں فتح علی خاں    حسینی انتساب و قبلۂ جاں

حضراتِ صابریہ و نظامیہ کے سلسلے میں پھر ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

بہرِ الحاج عمدۂ حاجات    شوریدہ کنم سر مناجات
یارب تو بہ شیخ پاک مذہب    آں فتح علی حسینی الہذب
یارب تو بہ شیخ دین داراں    آں میر جہان و پیرِ دوراں

قاسم نے اپنے تذکرہ 'مجموعۂ نغز' میں بھی ضمناً تین چار جگہ ان کا ذِکر ایک مرشد وہادی کی حیثیت سے کیا ہی۔ سید غالب علی خاں برادر فتح علی حسینی کے ذِکر میں لکھا ہی :-

"سیّد فتح علی حسینی سلمہم الرحمٰن علایقِ دنیا را خیر باد گفتہ بہ مسندِ ارشاد پائے تمکین استوار کردہ زہد و توکل را کار بستہ"۔

مرزا مسیح اللہ بیگ مسیح کے متعلق لکھا ہی :-

"تصحیح نسخۂ آدمیت از جناب فیض مآب ہادیٔ سالکان میر فتح علی حسینی مدظلہ نمود"۔

میر یوسف علی یوسف کے متعلق لکھا ہی :-

"دستِ بیعت بہ دستِ حق پرست آگاہ رموزاتِ صنعتی وعینی سیّد فتح علی حسینی دادہ مدظلہٗ وسلمہٗ ربہٗ واز خدمتِ سراپا برکت جناب

ہدایت انتساب حضرات ای شاں فیوضاتِ دنیوی واخروی می رباید و
کسب سعادات کونینی می نماید ٭

سید صاحب کے ایک مرید شاہ محمد اسحاق حسینی نے سنہ ۱۲۰۴ء میں اپنے مرشد کے بعض مکتوبات وکلمات جو انھوں نے بعض درویشوں اور طالبوں کے نام تحریر فرمائے تھے اور انھیں صاحب کے قلم سے لکھے گئے تھے نیز بعض نکات و مقالات جو مختلف اوقات میں اپنے احباب اور عزیزوں سے بیان فرمائے ایک جگہ جمع کر دیے اور اس مجموعے کا نام 'ارشادات' رکھا ٭

ان مکتوبات اور رسائل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ سید صاحب ایک باخبر صوفی اور صاحبِ علم وفضل تھے۔ اس مجموعے میں علاوہ دیگر مکتوبات کے خاص خاص رسائل یہ ہیں :-

## ۱۔ 'کشف الاستار فی معرفۃ الاسرار'

یہ رسالہ وحدت الوجود کی تحقیق میں ہی ٭

## ۲۔ 'مراۃ العرفان'

یہ رسالہ حصولِ معرفت وعرفان میں ہی اور بعض صوفی شعرا اور عرفا کے اقوال سے رسالے کو زینت دی ہی ٭

اس رسالے کے خاتمے پر جو عبارت انھوں نے لکھی ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کا تعلق ایک امیر منعم الدولہ محمد بلند خاں سے تھا، وہ ان کے ساتھ دوآبے کے سفر میں تھے۔ اس وقت باوجود ناسازئ طبع کے یہ رسالہ تحریر فرمایا۔ اور وعدہ کیا ہی کہ بہ شرطِ حیات وجمعیتِ خاطر جو خیالات اس بارے میں میرے دل میں ہیں انھیں پھر لکھوں گا ٭

## ۳- ابطال الباطل

اس زمانے میں بعض صاحبوں نے شیخ محمد علی حزیں کے کلام پر اعتراضات کیے تھے۔ ان سب کے مڈھ اور پیشوا خان آرزو تھے۔ سید صاحب نے اس رسالے میں بعض اعتراضات کی تردید کی ہے اور تائید میں اساتذہ کا کلام پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی وسعتِ نظر اور ذوقِ سخن کا اندازہ ہوتا ہے ⁂

## ۴- 'نورِ ہدایت'

باقر خاں مرحوم کی طرف سے یہ سوال پیش ہوا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی تھیں اور جانبین سے جو لوگ قتل ہوئے تھے تو کیا دونوں طرف کے مقتولین "شہید" ہوئے یا صرف ایک طرف کے۔ اس کا جواب قاضی محمد مبارک گوپاموی نے دیا تھا۔ اس پر مولوی مجداللہ راج گیری نے شبہہ وارد کیا، اس شبہے کے جواب میں یہ رسالہ تحریر ہوا ⁂

## ۵- 'معرفۃ الفقر'

یہ رسالہ جیسا کہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں ان کی زندگی کے آخری زمانے کی تالیف ہے اور نام بھی تاریخی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"ایں ذخیرۂ قصیرہ کہ از تالیفات اواخر عمر بے حاصل عاطل ایں تہی کیسہ بے سرمایہ با متاع کاسد گراں مایہ است ....... بہ معرفۃ الفقر کہ سال اتمام و اختتام ایں اوراق است، مخاطب و موسوم گردد، انسب می نماید۔"

ایں نسخۂ عرفاں کہ پذیرفت انجام — تاریخ شدہ ثبت بہ سالِ اتمام
درگوشِ خود دوش حسینی گفتہ — کامد بہ رقم 'معرفۃ الفقر' الہام

اس سے سنہ ۱۲۰۱ھ نکلتا ہے۔ اس رسالے میں بھی 'وحدۃ الوجود' کا بیان ہے:
اِن رسالوں سے نیز قاسم کے کلام سے جو شروع میں لکھا گیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب شاعر بھی تھے اور حسینی تخلّص کرتے تھے۔ اپنے ذوقِ شعر کا ذکر اس تذکرے کے دیباچے میں بھی بڑی حسرت سے کیا ہے۔ افسوس کہ ان کا کلام دست یاب نہیں ہوا۔ ان رسالوں میں جو ایک دو جگہ ان کے اشعار ضمناً آگئے ہیں وہ یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

رسالہ 'مراۃ العرفان' میں انھوں نے اپنے دو شعر لکھے ہیں جو یہ ہیں:۔

قایم وجہ را خوانیم در کلامش
در شش جہت حسینی حیراں آں لقائیم

---

چشمِ وحدت بہ کشا مسجد و مے خانہ یکیست
کفر و اسلام یکے، کعبہ و بت خانہ یکیست

اپنے ایک مکتوب میں جس میں مشاہدہ و مراقبہ پر بحث کی ہے اپنی ایک غزل بھی لکھی ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے:۔

حسنِ او را در لباس زشت و زیبا بنگرم
یک حقیقت درمیانِ لعل و خارا بنگرم

کثرتِ موہوم کی گردد حجابِ وحدتم
من کہ در ہر ذرہ آں خورشید سیما بنگرم

صورت و معنی بہم ہر دو گہے بینم عیاں
گاہ در صورت بہ بینم گاہ معنی بنگرم

عاشقِ بے باکم و بے پردہ می گویم سخن
بے جہت اشش جہت من آشکارا بنگرم

حسن او بے پردہ امروز است در چشمِ عیاں
من نہ آں باشم کہ روئے یار فردا بنگرم

وحدۂ صرفت در عیب و شہود و اہلِ دید
من نہ لا چوں شیخ می دانم نہ الآ بنگرم

چشمِ وحدت بیں حسینی نہ نگرد جز آبِ صاف
گر حباب و قطرہ دگر موج و دریا بنگرم

معلوم ہوتا ہی کہ اُردو میں شعر کہنے کا شوق نہ تھا۔ ان رسالوں میں تو اُردو شعر لکھنے کا کوئی موقع نہ تھا کیوں کہ یہ سب کے سب فارسی میں ہیں۔ لیکن تذکرے میں بھی کہیں اس کا پتا نہیں لگتا۔ اگر ریختے سے شوق ہوتا تو وہ ضرور تذکرہ نویسوں کے دستور کے مطابق اپنا نام بھی درج کرتے۔ قاسم کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہی کہ بعض شاعروں کو شعر و سخن میں اصلاح دیتے تھے۔ مسبح کے ذکر میں ہی :-

"شعر خود ہم بہ اصلاح حضرت ای شان (فتح علی حسینی) درست می فرمود"

ثناء اللہ خاں فراق نے سید صاحب کے انتقال کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی ہی : ؎

کہا ہاتف نے انتخاب سلف[1]

اس سے سنہ ۱۲۲۴ھ نکلتا ہی ؛

گردیزی نے اپنا تذکرہ ایسے زمانے میں لکھا جب کہ ریختہ گو شعرا کے صرف چند ہی تذکرے لکھے گئے تھے۔ ان تذکروں سے وہ اپنی بے زاری ظاہر کرتے ہیں اور تذکرہ نویسوں کو یہ الزام دیتے ہیں کہ ان عزیزوں نے اپنی تالیف کی

---

[1] دیباچۂ ارشادات (قلمی)

علتِ غائی معاصرین سے ستم ظریفی اور اپنے ہم عصروں کی خوردہ گیری قرار دی ہے۔ اصل حقیقت کے اظہار میں اختصار سے کام لیا ہے اور بے اعتنائی کی وجہ سے اکثر "نازک خیال، رنگین نگار" شعرا کے حالات نظر انداز کر دیے ہیں۔ اور حالات و اخبار کے بیان میں صریح غلطیاں کی ہیں۔ یہ رنگ دیکھ کر خود ایک تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا جس میں نام ور شعرا کے حالات بے رُو رعایت از روئے انصاف درج کیے ہیں اور ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھی ہے۔

گردیزی نے ان تذکروں کے نام نہیں لکھے لیکن جہاں تک تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے گردیزی کی تالیف کے زمانے میں یا اس سے کچھ قبل یہ چند تذکرے لکھے گئے ہیں:۔

(۱) 'تذکرۂ سید امام الدین خاں' بہ عہد محمد شاہ (۲) 'تذکرۂ خان آرزو' (۳) 'تذکرۂ میر' نکات الشعرا، سنہ ۱۱۵۶ھ (۴) 'تذکرۂ سودا' (۵) 'معشوق چہل سالہ خود نوشتہ خاکسار سنہ ۱۱۶۵ھ (۶) 'تحفۃ الشعرا' مؤلفہ افضل بیگ قاق شال اورنگ آبادی سنہ ۱۱۶۵ھ (۷) 'گلشنِ گفتار' مؤلفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی سنہ ۱۱۶۵ھ۔

ممکن ہے کہ دو ایک اور بھی تذکرے ہوں جن کا پتا اب تک نہیں لگا سید امام الدین خاں آرزو، سودا اور خاکسار کے تذکرے اب تک دست یاب نہیں ہوئے، البتہ بعض کتابوں اور تذکروں میں ان کا حوالہ ملتا ہے۔ باقی شاید ہی گردیزی کی نظر سے گزرے ہوں کیوں کہ یہ ایسے مقامات میں لکھے گئے تھے جہاں سے ان کا گردیزی تک پہنچنا قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے اپنے سارے تذکرے میں کہیں کسی تذکرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ

اشارہ تک نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خان آرزو، میر، خاکسار اور سودا کے حالات میں اِن کے تذکروں کا مطلق ذِکر نہیں کیا۔ البتہ قرائن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کا تذکرہ اس کی نظر سے ضرور گزرا ہے۔ اور دیباچے میں جو اس نے تذکرہ نویسوں کے خلاف زہر اُگلا ہے اس کا ہدف 'نکات الشعرا' ہی ہے۔ میر صاحب پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے بے رُو و رعایت اس کا اظہار کر دیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق جو ان کی رائے ہے اس کے ظاہر کرنے میں انھوں نے مطلق تامّل نہیں کیا۔ یہ بات ہمارے تذکرہ نویسوں میں عام طور سے مفقود ہے۔ وہ اپنے گروہ کے شاعروں کی جا و بے جا تعریف کرتے ہیں اور حریف گروہ والوں کی تعریف اوّل تو کرتے نہیں اور جو کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے اور اس میں بھی کوئی چوٹ ضرور کر جاتے ہیں۔ میر صاحب کی شان اس سے بہت ارفع تھی۔ وہ کسی جتھے سے تعلّق نہیں رکھتے۔ علاوہ اس کے میر صاحب نے حالات بیان کرنے میں بھی تا مقدور صحت سے کام لیا ہے اور بعض غلط فہمیوں کو سب سے اوّل انھوں نے رفع کیا ہے ؎

بعض اور اصحاب کی طرح گردیزی کو بھی یہ بات ناگوار گزری کہ اس کے بعض دوستوں پر میر صاحب نے بے باکی سے نکتہ چینی کی یا ان کی طرف سے بے التفاتی کی۔ لہٰذا حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے اس نے خود ایک تذکرہ لکھا جسے افسوس ہے کہ فروغ نہ ہُوا ؎

دُوسرا ثبوت اس بات کا کہ میر صاحب کا تذکرہ گردیزی کی نظر سے گزر چکا تھا، یہ ہے کہ میر صاحب نے ریختے کی فصاحت وغیرہ کے متعلّق جو خیالات اپنے تذکرے کے آخر میں ظاہر فرمائے ہیں، ہُو بہ ہُو وہی گردیزی نے اپنے تذکرے

کے دیباچے میں نقل کر دیے ہیں، البتہ کہیں کہیں الفاظ کا تغیر ضرور پایا جاتا ہے ؎

ہمارے اس قیاس کی تائید میں ایک پُر لطف بات یہ ہے کہ میر صاحب کے حالات میں صرف دو تین ہی سطریں لکھی ہیں جس سے صاف بے اعتنائی ٹپکتی ہے اور طرفہ یہ ہے کہ ان کے کلام کی تعریف میں وہی چند لفظ لکھے ہیں جو اس سے قبل حشمت کے کلام کی توصیف میں لکھ آیا ہے ؎

حشمت کی نسبت لکھا ہے :-

"دیوانش فقیر سیر کردہ و چشمے آب دادہ، حقاکہ دراں تلاش معنی تازہ کردہ والفاظ رنگین بہ روئے کار آوردہ"

میر صاحب کی نسبت فرماتے ہیں :-

"فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ، حقاکہ دراں تلاش معنئ بے گانہ کردہ است و حرف آشنا را بہ روئے کار آوردہ"

کہاں حشمت اور کہاں میر صاحب! اور یہ رُوکھی پھیکی تعریف بھی جس بے دلی سے کی ہے وہ ظاہر ہے خصوصاً جب ہم اس کا مقابلہ دُوسرے معمولی شاعروں کے ذکر سے کرتے ہیں جو گردیزی نے اپنی کتاب میں کیے ہیں تو اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ حالات کے بعد میر صاحب کے کلام میں سے صرف ایک شعر نقل کیا ہے اور وہ بھی بہت ہی معمولی۔ حال آں کہ معمولی سے معمولی اور گُم نام شاعروں کا کلام بھی (جب مِل گیا ہے تو) صفحے دو صفحے ضرور نقل کر دیے ہیں ؎

یہ گویا اس نے انتقام لیا ہے، لیکن انتقام لینے والا اکثر گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھا ہوگا کہ اس کے بعد میر صاحب کا کلام نظروں سے گِر جائے گا اور کوئی اس کا پڑھنے والا نہ ملے گا۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میر صاحب کی

قدر اب بھی ویسی ہی ہو جیسی ان کے زمانے میں تھی اور گردیزی کے تذکرے کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

گردیزی نے جس دعوے کے ساتھ اس تذکرے کے لکھنے کا قصد کیا ہو اس کا کتاب میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ اس میں کہیں غلط حالات کی تصحیح کی گئی ہو نہ مظلوم ہم سروں اور ہم عصروں کی بے جا خوردہ گیری کا جواب دیا گیا ہو نہ اُن نازک خیال رنگین نگار شعرا کے حالات کا اضافہ کیا گیا ہو جو دُوسروں کی بے اعتنائی کے شکار ہو گئے تھے اور نہ ان حقایق کو آشکارا کیا جو دُوسرے تذکرہ نویسوں کے ایجاز کی وجہ سے نظروں سے پوشیدہ تھے۔ ایسی صورت میں اس کا دعویٰ بے دلیل اور اس کا الزام بے بنیاد ہو۔

گردیزی نے کُل اٹھانوے شعرا کا تذکرہ لکھا ہو جن میں تقریباً اڑسٹھ ایسے ہیں جن کے حالات ایک ایک دو دو سطروں سے زیادہ نہیں۔ باقی کو تین تین چار چار سطروں میں بھگتا دیا ہو البتہ مظہر جان جاناں اور خان آرزوؔ پر آدھ آدھ صفحہ لکھا ہو اور یقین کے لیے صرف آٹھ نو سطریں' اگرچہ وہ اس کے بہت مدّاح ہیں، اس پر بھی حالات کچھ نہیں۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو طویل انتخابات وغیرہ ملا کر فی شاعر ایک صفحے سے کچھ ہی زیادہ کا اوسط پڑتا ہو۔ ایسی حالت میں دُوسروں کو ایجاز و اختصار کا الزام کس منہ سے دے سکتے ہیں۔

مؤلف نے انھیں شاعروں کا تذکرہ لکھا ہو جو اس کے ہم عصر تھے اور ان میں اکثر سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی ملاقات تھی، جس کا اظہار اس نے موقع موقع سے کر دیا ہو۔ کلام پر رائے معمولی اور شاعرانہ انداز میں ہو، کہیں ان کی طبع نقّاد کی جودت یا ذوقِ سخن کی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ البتہ دو مقام ایسے

آئے ہیں جہاں انھوں نے اپنی معمولی چال چھوڑ کر سخن گسترانہ قدم اُٹھایا ہی۔ پہلا مقام وہ ہی جہاں حزیں کے شعر پر اعتراض کیا ہی (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۷۔۳۸) اور وہ اعتراض بھی بے جوڑ سا ہی۔ دُوسرا مقام خاکسار کے حالات میں آتا ہی۔ اگرچہ وہ اس شخص کے قائل نہیں۔ لیکن اس بات پر بہت خفا ہیں کہ بعض صاحبوں نے اس کے اشعار کو ناموزوں کہا ہی اور زمرۂ شعرا سے خارج کردیا ہی۔ یہ بھی میر صاحب پر چوٹ ہی[1]۔

گردیزی نے کُل اٹھانوے شعرا کا تذکرہ لکھا ہی۔ میر صاحب کے ہاں ایک سو دو شعرا کا ذکر ہی۔ میر صاحب کے تذکرے میں ایسے انتیس شاعروں کا ذکر ہی جو گردیزی کے تذکرے میں نہیں اور گردیزی کے ہاں پچیس ایسے شاعر ہیں جو میر صاحب کے تذکرے میں نہیں پائے جاتے۔

یہ تذکرہ سنہ ۱۱۶۶ھ میں تصنیف ہوا جیسا کہ خاتمے پر خود مؤلّف نے تحریر کیا۔ یعنی اس کی وفات سے اٹھاون سال پہلے کی تالیف ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ یہ مؤلف کے ابتدائی زمانے کی مشق ہی۔

ہمارے شعرا کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ضمنی طور پر ان میں بہت سی کام کی باتیں مِل جاتی ہیں جو ایک ادیب اور محقّق کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں ہوتیں۔ اسی لیے انجمنِ ترقّیٔ اُردوٗ نے قدیم تذکروں کے شایع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہی اور یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہی۔

یہ تذکرہ ہم نے تین مختلف نسخوں سے مرتّب کیا ہی۔ ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہی جیسا کہ کاتبِ تذکرہ کی عبارت سے معلوم ہوگا کہ وہ حیدرآباد میں سیّد عبدالولی عزلت کے لیے سنہ ۱۱۷۲ھ میں تصنیف سے چھی سال بعد لکھا گیا تھا۔

---

[1] نکات الشعرا، ص ۱۲۲ (مطبوعہ انجمنِ ترقّیٔ اُردوٗ)

# مقدّمۂ مخزنِ نکات

شیخ محمّد قیام الدّین قائم چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مختلف تذکرہ نویسوں نے کسی قدر اختلاف سے لکھا ہے۔ مثلاً میر صاحب اپنی "نکات الشعرا" میں اور میر حسن اپنے تذکرے میں محمّد قائم لکھتے ہیں۔ علی ابراہیم اور لطف نے بھی انھی کی تقلید کی ہے۔ مصحفی نے قیام الدّین علی لکھا ہے۔ گردیزی بھی محمّد قائم ہی لکھتا ہے۔ کمال اور گارساں دتاسی قائم الدّین بتاتے ہیں۔ لیکن اصل نام محمّد قائم الدّین ہی ہے جیسا کہ خود انھوں نے اس تذکرے کے شروع میں لکھا ہے۔ میر صاحب اور مصحفی ان سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

اگرچہ قائم چاند پور کے رہنے والے تھے، لیکن ملازمت کے سلسلے میں "بدوِ شعور" سے اُن کا رہنا دلّی میں ہوا۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں وہ شاہی توپ خانے کے داروغہ ہو گئے۔ چناں چہ یہ تذکرہ بھی اسی زمانے میں لکھنا شروع کر دیا تھا جب کہ ان کا قیام دلّی میں تھا۔ جب وہ دلّی پہنچے ہیں تو میر تقی، خواجہ میر درد، سودا وغیرہ جیسے باکمال اُستاد وہاں موجود تھے اور اردو شاعری شباب پر تھی۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں خواجہ میر درد

سے اصلاح لی مگر کچھ دنوں بعد مرزا رفیع السودا کے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ آزاد 'آبِ حیات' میں لکھتے ہیں کہ یہ اوّل شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے ان سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ ہی کہ شاہ موصوف باوجودے کہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت رکھتے تھے مگر انھوں نے بھی ایک قطعہ اُن کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے، ان کے حق میں بھی کہ سُن کے الگ ہوئے، پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور ان سے پھرے مرزا تو مرزا تھے، انھوں نے سیدھا کیا۔ اگرچہ اس تذکرے میں انھوں نے میاں ہدایت اللہ ہدایت اور خواجہ میر درد دونوں کی بہت تعریف کی ہی اور کہیں ملال کا اظہار نہیں کیا، لیکن اپنی شاگردی اور مشورے کا بھی ذکر نہیں کیا۔ البتہ ان کا دیوان دیکھنے پر ایک غزل میں یہ اشعار نظر آئے جن سے آزاد کے قول کی تصدیق ہوتی ہی :ے

حضرتِ درد کی خدمت میں جب اُٹّے	عرض کی کہ ای اُستادِ زماں سُنتے ہو
امر ہو وے تو ہدایت کروں میں سیدھا	وہاں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سُنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسو سے بھی کبھی کج طینت	تیر بنتے بھی کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

مرزا کے حال میں بھی اگرچہ اپنی شاگردی کا اشارہ نہیں کرتے مگر ذکر اس طرح سے کیا ہی جو ایک سعادت مند شاگرد کے شایاں ہی اور اپنی غزل کے ایک مقطع میں تو صاف صاف اس کا اقرار کیا ہی :ے

قائمؔ یہ فیض حضرتِ سودا ہی ورنہ مَیں	طرحی غزل سے میر کے آتا تھا بر کہیں

لیکن کچھ عرصے بعد جب امورِ سلطنت میں اختلال پیدا ہوا اور امن و امان اور فارغ البالی جاتی رہی تو وہ باکمال بھی جن کی بدولت دلّی دلّی تھی، ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور وہ صحبتیں جو شعر و سخن کی جان تھیں،

خواب وخیال ہوگئیں۔ قائم بھی دل برداشتہ ہوکر وطن چلے آئے اور کچھ دنوں ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں کی سرکار میں بسر کی۔ مصحفی بھی اُن دنوں اسی سرکار کے متوسّل تھے۔ دونوں کی ملاقات یہیں ہوئی۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ اس وقت وہ لباسِ درویشی میں تھے۔ نواب بڑی فیاضی سے اہلِ علم کی سرپرستی کرتے تھے اور شعروسخن سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ چناں چہ قائم نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا ای امیر
مجتمع سایے میں ہیں جس کے سخن داں اتنے

امیر، نواب محمد یار خاں کا تخلّص تھا۔ تین ماہ سے زیادہ نہ رہنے پائے تھے کہ یہاں وُہی انقلاب رونما ہوا جو ہندُستان میں اس وقت ہر جگہ بپا تھا۔ قائم مجبور ہوکر رام پور چلے گئے اور نواب فیض اللہ خاں والیٔ رام پور کے بیٹے احمد یار خاں نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کردی اور فوجی خدمت انجام دیتے رہے۔ لیکن اس تنخواہ میں ان کی بسر نہ ہوتی تھی۔ جب زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ پہنچے اور راجہ ٹکیت رائے سے اپنے وطن کے عامل کے نام شقّے اور پروانے حاصل کیے تاکہ اپنی قدیمی مِلک اور یومیہ بحال کرائیں۔ اس میں انھیں کام یابی ہوئی مگر رام پور پہنچتے ہی اجل نے آلیا اور سنہ ۱۲۰۸ھ میں انتقال کر گئے ؛

ان کے سنِ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ مصحفی نے وفات کا کوئی سَن نہیں لکھا صرف اتنا لکھا ہے کہ رام پور سے انتقال کی خبر پہنچی۔ مصحفی کا تذکرہ ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ علی ابراہیم (اور لطف) فیلن اور کریم الدّین نے سنہ ۱۲۱۰ھ میں بتایا ہے۔ شیفتہ اور بعض اور تذکرہ نویسوں

نے بھی اسی کو نقل کر دیا ہے۔ گارساں دتاسی نے سنہ ۱۲۰۷ھ لکھا ہے۔ جرأت نے قائم کے انتقال کی تاریخ اس شعر سے نکالی ہے ؎

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخِ وفات یکتائی کے ساتھ
قائم، بنیادِ شعرِ ہندی نہ رہی کیا کہیے اب آہ

اِس مصرع سے سنہ ۱۲۰۸ھ ہی نکلتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔

قائم کی شاعری کی سب تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے اور اکثر نے میر و مرزا کے بعد اُسی کو مانا ہے۔ بعض تو اسے سودا سے بھی بڑھ کر مانتے ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں :-

" در پختگیٔ کلام وچستیٔ مصراع غزل و رو بہ قصیدہ ومثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بہ دوش استاد راہ می رود، بلکہ در بعضے مقام غلبہ می جوید "

علی ابراہیم یا لطف کہتے ہیں :-

" سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے۔"

آزاد کی رائے ہے کہ :-

" ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے مگر کیا کیجیے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے، شہرت نہ پائی۔"

میر حسن فرماتے ہیں کہ :-

" طرزش بہ طرز طالب آملی می ماند۔ مثنوی ہا بسیار گفتہ وبسے دُرہائے معانی سفتہ کہ کسے کم گفتہ۔"

کریم الدین (فیلن) کی رائے ہے کہ :-

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار، بلند مرتبہ، موزوں طبع، عالی مقدار ہی کہ اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے۔ بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں، حق یہ ہی کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ اور بے استعداد جو اس کو برابر سودا کے گنتے ہیں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں۔"

بہ خلاف اس کے شیفتہ کی رائے میں انھیں سودا کا ہم پلّہ سمجھنا سودا ہی۔ البتّہ وہ اُن کے قطعات و رباعیات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہی لیکن اسے میر و مرزا کا ہم رتبہ کہنا سراسر ناانصافی ہی۔ اس کا کلام ہر صنف میں موجود ہی۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، تاریخ سب کچھ کہا ہی۔ ہجو کہنے اور فحش بکنے میں وہ اپنے اُستاد کے ہم پلّہ ہی۔ متعدّد مثنویاں لکھی ہیں، جن میں بعض قصّے سلیقے سے نظم کیے ہیں۔ قصیدوں میں بھی زور پایا جاتا ہی۔

اکثر تذکرہ نویسوں نے اُن کے 'تذکرۂ شعرا' کا ذکر کیا ہی، جو اب تک نایاب تھا اور اب شایع کیا جاتا ہی۔ قائم کا دعویٰ ہی کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسینی الگردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہی کہ قائم کو ان تذکروں کی اطّلاع نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر شبر نگر کا یہ کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دیے ہیں وہ وہی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہی۔ دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں، اشعار کے انتخابات اور

حالات دونوں مختلف ہیں:

خواجہ اکرم نے اس تذکرے کے لیے ایک قطعہ تاریخی لکھا تھا جس میں مادۂ تاریخ 'مخزنِ نکات' تھا۔ قائم کو یہ مادّہ پسند آیا اور تذکرے کا یہی نام رکھ دیا۔ اس سے سنِ تالیف ۱۱۶۸ھ نکلتا ہے۔ اس میں قائم سمیت ۱۱۴ شعرا کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ تذکرہ مختصر ہے، مگر بعض حالات کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے۔ قائم نے اُسے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اوّل میں متقدّمین کا، طبقۂ دوم میں متوسّطین کا اور طبقۂ سوم میں متاخرین کا ذِکر ہے۔ اگرچہ میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرۂ 'نکات الشّعرا' میں دکن کے شعرا کا ذِکر کیا ہے لیکن قائم نے اس کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"باید دانست کہ چوں فنِ ریختہ درآں وقت از محلِ اعتبار ساقط بود بناعلیہ ہیچ کس بر توغل آں اقدام نہ می نمود ایں دو سہ چہار بیت کذائی کہ بہ نام اساتذہ معتبر مرقوم است اغلب کہ منشائے نظمش ہزلے بیش نہ باشد اما بعد ازیں بہ سمت بلادِ دکن در عہد عبداللہ قطب شاہ کہ باسخن دراں بہ محبت و مواسا پیش می آمد، ریختہ گفتن بر زبانِ دکھنی بسیار رواج گرفت۔"

اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد سے اس کی ابتدا قرار دینا صحیح نہیں کیوں کہ اس سے قبل سلطان قلی قطب شاہ اور محمّد قلی قطب شاہ خود بڑے شاعر گزرے ہیں۔ تاہم قائم نے دکھنی ریختے کو خاص اہمیت دی ہے۔ اگرچہ وہ اس شاعری کے زیادہ قائل نہ تھے۔ چناں چہ ان کا شعر مشہور ہے:-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ایک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

قائم نے طبقۂ اوّل کی ابتدا شیخ سعدی شیرازی سے کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس پر جمہور کا اتفاق ہے کہ جب شیخ سعدی گجرات میں تشریف لائے اور جیسا کہ 'بوستاں' میں مذکور ہے۔ سومنات کی مجاوری کی یہاں زبان سے واقفیت حاصل کر کے ایک دو غزلیں ریختے میں لکھیں۔ اگرچہ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا لیکن سعدی کے نام سے جو ایک مشہور غزل فارسی اُردو کی ملی جلی چلی آرہی ہے، اس کی نسبت عام طور پر یہی خیال تھا کہ شیخ سعدی شیرازی کی تصنیف ہے۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں اس خیال کی تردید کی ہے۔ سعدی کے بعد امیر خسرو کا ذِکر کیا ہے اور پھر دُوسرے قدیم شعرا کا۔

ہر طبقے کے شروع میں اس طبقے کے شعرا کی خصوصیات کا مختصر ذِکر کر دیا ہے۔ اور ان کی رائے اس بارے میں بہت خوب اور صائب ہے۔ بعض بعض شعرا کے کلام کے متعلق بھی رائے کا اظہار کیا ہے لیکن یہ بہت کم ہے۔ اس خصوص میں میر صاحب کے تذکرے کو فوقیت حاصل ہے۔ بیان صاف اور سیدھا ہے۔ عبارت آرائی اور تشبیہ و استعارہ سے کام لیا ہے۔ تذکرے کے آخر میں قائم نے اپنا ذِکر بھی مختصر طور پر کیا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہر چند از باشندگانِ قصبہ چاندپور است اما از بدوِ شعور تا بہ ایں حال بہ توسّل نوکری بادشاہی بہ دار الخلافت شاہ جہاں آباد گزرانده" اس سے زیادہ اس تذکرے میں ان کے حالات کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ اس سے اِتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے رخصت ہونے سے قبل ہی یہ تذکرہ تحریر میں آگیا تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی وہ لکھتے ہیں کہ شاہی انتظام

میں خلل آجانے کی وجہ سے میں نے سفر کا ارادہ مصمّم کر لیا تھا، لہٰذا فرصت کو غنیمت سمجھ کر ان حالات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا ؎

قائم کی شاعری کے ساتھ یہ تذکرہ بھی بلاشبہ قابلِ قدر ہی اور اس سے اُردو شعرا کے حالات اور کلام کے متعلق بصیرت حاصل ہوتی ہی ؎

قائم نے اپنے تذکرے کے ساتھ اپنے کلام کا انتخاب بھی دیا ہی۔ لیکن یہ انتخاب بہت ہی کم ہی اور وہ بھی الف کے چند شعر ہیں۔ اس لیے ہم یہاں اس کے کلام سے کچھ اور اشعار بھی درج کرتے ہیں تاکہ سخن فہم اُس کے کلام کی خوبی کا اندازہ کر سکیں ؎

لیکن انتخاب سے قبل ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہی کہ بعض نظمیں سودا اور قائم دونوں کے کلیات میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً موسمِ سرما کے ہجو میں جو مثنوی ہی اور جس کا مطلع یہ ہی ؎

سردی اب کے برس ہی اتنی شدید		صبح نکلے ہی کانپتا خورشید

دونوں کے کلیات میں بے کم وکاست درج ہی لیکن نظم غالباً سودا کی ہی کیوں کہ اسی کے ساتھ کی دوسری مثنوی موسمِ گرما کے ہجو میں موجود ہی۔ لیکن میر حسن کے تذکرے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اسے قائم ہی کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ ایک اور طویل عشقیہ مثنوی جس کا پہلا شعر یہ ہی ؎

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل		تب دل دے بہ قدر خواہشِ دل

لطف یہ ہی کہ مثنویوں کے آخر میں سودا کے کلیات میں سودا کا اور قائم کے کلیات میں قائم کا تخلص موجود ہی۔ اس سے صحیح فیصلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہی۔ مگر ہمارا قیاس یہ ہی کہ یہ مثنوی قائم ہی کی ہی۔

جو غلطی سے سودا کے کلیات میں درج ہوگئی ہے۔ اسی طرح اور کئی مثنویاں جن میں چھوٹے چھوٹے قصے اور حکایتیں منظوم کی ہیں۔ دونوں کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں ؛

**انتخاب** :-

قائم کے پہلے تین شعر عام طور پر مشہور ہیں اور بہت مقبول ہوئے ہیں سہ

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ چُپ بھی رہا نہیں جاتا
کعبہ[1] اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

---

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند کچھ دُور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
نَے تجھ پہ وہ بہار رہی اور نہ یہاں وہ دل کہنے کو نیک و بد کے اک الزام رہ گیا

---

اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا دریا ہی پھر تو نام ہے ہر ایک حباب کا
کیوں چھوڑتے ہو دُردِ تہِ جام مے کشو ذرّہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا
ایسی ہَوا میں پاس نہ ساقی نہ جامِ مے رونا بجا ہے حال پہ تیرے سحاب کا
اس دشت پُر سراب میں بھٹکے بہت پہ حیف دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانا تھا آب کا

---

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا تیر سا کچھ دل سے گزر کر گیا
خاک کا سا ڈھیر سرِ رہ ہوں مَیں قافلۂ عمر سفر کر گیا
چُھپ کے ترے کوچے سے گزرا ہیں لیک نالہ ایک عالم کو خبر کر گیا
تا بہ فلک نالہ تو پہنچا تھا رات مَیں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

---

[1] دن) ٹوٹا جو کعبہ کون یہ

پوچھ نہ قائمؔ کٹی کیوں کر عمر		جوں ہوا یک چند بسر کر گیا

---

فلک جو دے تو خدائی تو لے نہ اب قائمؔ		وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

---

بے دماغی سے نہ اس تنگ دِل رنجور گیا		مرتبہ عشق کا یاں حُسن سے بھی دُور گیا

---

بہ رنگِ طائرِ نوہم اسیر ای صیّاد		وہ ہیں کہ جن کا گُلوں بیچ آشیانا تھا
معاملہ یہ ہی دل کا اسے کہے گا وہ کیا		پیام بر کے ہیں آپ ساتھ جانا تھا
یہ سچ کہ جھوٹ ہی دعوائے دوستی لیکن		کبھی ہمیں بھی تو اک بار آزمانا تھا

---

رہ برِ فرقۂ اسلام رہا ساری عمر		حیف پر یہ ہی کہ مَیں آپ مسلماں نہ ہُوا
دیکھ مجھ کو کہ سلیماں کا دیا زور مجھے		ایک چیونٹی سے پہ مَیں دستِ گریباں نہ ہُوا
تھا گُلِ تازہ مَیں پر حیف کہ بختِ بد سے		زینتِ گوشۂ دستارِ عزیزاں نہ ہُوا

---

ظالم تو، میری سادہ دلی پر تو رحم کر		رُوٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی مَن گیا

---

کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہی صیّاد		ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہی صیّاد
گرفتہ طبع جو مجھ سا چھٹا قفس سے تو کیا		رہائی جس کی اسیری کا ننگ ہی صیّاد
نہ گُل بجا ہی نہ بُلبُل چمن میں نغمہ سرا		مری خلاصی میں اب کیا درنگ ہی صیّاد
قفس کی تنگی سے مَیں ہی نہ تنگ ہوں قائمؔ		مری بھی تنگیٔ حالت سے تنگ ہی صیّاد

---

کی کس کی نگاہوں نے یہ تاثیر ہوا پر
چلتی ہی جو یہ برق سی شمشیر ہوا پر

جی میں ہی، میاں آج نگہ کی تری ٹڑبھن
کھینچے قلمِ برق سے تحریر ہوا پر

مت قصر کو ہستی کے گِرا، دیکھ کہ غافل
مانندِ حباب اُس کی ہی تعمیر ہوا پر

کب بند ہوں یہ رنگِ تعلق میں سبک روح
کھنچتی ہی کوئی رنگ سے تصویر ہوا پر

---

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

دے طولِ امل نہ وقتِ پیری
ہوئی صبح فسانہ مختصر کر

کچھ طرفہ مرضی ہی زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

---

نہیں کہتا میں دل ترکِ تمنّا
پہ جتنی ہو سکے اتنی ہوس کر

فریبِ باغباں پہ ہو کے غافل
نہ ای بُلبُل اکٹھے خار و خس کر

بہارِ عمر ہی، قائم، کوئی دن
اسے جوں گُل پیارے کاٹ ہنس کر

---

ہی بے اثر ایسی ہی جو اپنی کششِ دل
جی لے ہی کے چھوڑے گی یہ ایک دن خلشِ دل

تھا نہو مجھے آمد میں کوئی اس کی کہ ناگاہ
لے جائے نہ گھر سے کہیں باہر طپشِ دل

زہر آب و ہلاہل سے جو کچھ کام نہ نکلا
دے کر کے میں کی خونِ جگر پرورشِ دل

کس طرح کوئی گزرے ترے رہ سے پیارے
ہر گام پر اس کوچے میں ہی چپقلشِ دل

ہاتھوں سے دلِ دیدہ کے آیا ہوں بہت تنگ
آنکھوں کو روؤں یا میں کروں سرزنشِ دل

---

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھ کو نہ منھ دکھائیں گے ہم

مشکل ہی نہ آنا تجھ گلی میں
پر یہ بھی سہی نہ آئیں گے ہم

جو آکے کہا کیسے ہیں تجھ سے　　سو اب کے وہ کر دکھائیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا　　ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
آزردہ ہو غیر سے، لڑو یاں　　اس عہدے سے بر نہ آئیں گے ہم
گر زیست ہی تجھ تلک تو پھر کیا　　صدقے ترے مر ہی جائیں گے ہم
جوں چاہیے چاہ کا سرشتہ　　جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم
اس پر بھی اگر ملیں گے تو خیر　　قائمؔ ہی نہ پھر کہائیں گے ہم

---

قائمؔ، جگہ ہی رونے کی یہ حالتِ تباہ　　اس صحنِ گلستاں کے وہ ہیں دل فگار ہم
کھٹکا صبا کے پاؤں کا سُن کر بہ رنگِ بُو　　آغوشِ گُل میں ہوتے تھے بَنت بے قرار ہم
کیا جانتے تھے ہم کہ یہ ایک دن بہے گی یاد　　اس مرتبہ کو ہوئیں گے بے اقتدار ہم

---

میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغِ چمن میں　　گُل کترو ہوں سو رنگ کے ئیں طرزِ سخن میں
غربت میں مرا حال جو دیکھے ہی تو قاصد　　زنہار نہ کہیو اسے یارانِ وطن میں

---

ایک جا گہ پہ نہیں ہی مجھے آرام کہیں　　ہی عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں
پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اُٹھا　　جس نے دیکھا تجھے یک بار سرِ بام کہیں
عذرِ تقصیر بھی چاہوں گا میں اس سے ای دل　　ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں
عزم کعبے کا تو قائمؔ تو کیا ہی لیکن　　رہن کیجو نہ وہاں جامۂ احرام کہیں،

---

ایک آب و تاب مہ و آفتاب رکھتے ہیں　　یہ رو کشی کی تری کب وہ تاب رکھتے ہیں
زبانِ عشق شکایت سے لال ہی ورنہ　　ہم ایک گلے کے ترے سو جواب رکھتے ہیں

حُسنِ معنی چاہیے تزئینِ ظاہر ہیچ ہی
کیا کرے اس گُل کو لے کے کوئی جس میں بُو نہیں

مدّتوں اہلِ حرم پر حکمرانی کی ہی یاں
کیا ہُوا گر مے کدے میں آج ہم کو رُو نہیں

خوب رُو دو دن کسی کے ساتھ کرلیں اختلاط
پر جو یہ چاہو کہ یہ ہو دیں کسو کے سو نہیں

وضعِ دوراں کو خوشامد دوست ہی قائمؔ تو ہو
ہر کس و ناکس سے دب چلنا یہ اپنی خو نہیں

---

ہم سری اس قدِ رعنا سے ہی ای سرو غلط
تو بھی ہر چند ہی موزوں پہ یہ انداز کہاں

دل سے رخصت ہو بس ای خواہشِ گل گشت کہ اب
تابِ رفتار کدھر، طاقتِ پرواز کہاں

ہمّتِ عشق نہ ہو حُسنِ خط و خال میں بند
صیدِ ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہاں

قائمؔ اس باغ میں بُلبُل تو بہت ہیں لیکن
دِل کھُلے نالے سے جس کے وہ ہم آواز کہاں

---

غیر اس کے کہ خوب رویے اور — غمِ دل کا کوئی علاج نہیں
اب بھی قیمت ہی دل کی گوشۂ چشم — اتنی یہ جنس بے رواج نہیں
کر نہ جرأت تو، ای طبیب کہ یہ — دل کا دھڑکا ہی اختلاج نہیں

وہ جہاں بھی ملے تو بس ہی ہیں　　یاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں

---

مجلسِ مے سے مشابہ ہے خراباتِ جہاں　　جان کر یاں جو نہ ہو مست وہ ہشیار نہیں
مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن　　بے طلب اب بھی جو مِل جائے تو انکار نہیں

---

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں　　دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں
جوں نمِ اشک، تو کس سے ہے خفا　　یاں کوئی پل میں گِرے بیٹھے ہیں
دردِ دل کیوں کہ کہوں میں اس سے　　ہر طرف لوگ گِھرے بیٹھے ہیں

---

کہاں کا غرّۂ شوال کیسا عشرہ ذی حج کا
ہمیں ہاتھ آئے مے جس دن ہم اس دن عید کرتے ہیں

مزاجِ خس ہے اہلِ عشق کا جلنے کے عالم میں
جلاتا ہے جو اُن کو اس کی یہ تائید کرتے ہیں

یہ کاسہ سر تلے رکھے جو مے خانوں میں سوتے ہیں
جسے چاہیں اُسے اک جام میں جمشید کرتے ہیں

جنھیں کچھ سلسلے میں عشق کے تحقیق حاصل ہے
وہ کب مجنوں سے ہر گم راہ کی تقلید کرتے ہیں

نہ جانے کہیے کس قالب میں قائم، دردِ دل اس سے
نہیں بنتی زباں سے دل میں جو تمہید کرتے ہیں

---

نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں　　کبھو جو روئے ہیں خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

ئیں مرچکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لیے حباب وار تنک دم رہا ہو آنکھوں ہیں
وہ محو ہوں کہ مثالِ حبابِ آئینہ جگر سے اشک نکل تھم رہا ہو آنکھوں ہیں

---

جوں شمع دمِ صبح ئیں یاں سے سفری ہوں
ٹک منتظرِ جنبشِ بادِ سحری ہوں
جاتا ہوں ئیں جیدھر کو وہ منھ پھیرے ہی مجھ سے
گویا کہ ئیں گردِ قدمِ رہ گزری ہوں
نی گریۂ شب ہوں ئیں نہ آہِ سحری ہوں
جوں بانگِ جرس نیم نفس بے اثری ہوں
دیکھا نہ ئیں جز سایۂ بازوئے شکستہ
حرماں نہ وہ جوں حسرتِ بے بال و پری ہوں
ئیں پیرہن اپنے میں سماتا نہیں جوں گُل
جس وقت سے آمادہ پۓ جامہ دری ہوں
سو خضر سے کم حوصلہ واں جی سے گئے ہیں
جس دشتِ خطرناک کا میں رہ گزری ہوں
جوں سرو رکھا سنگِ جفا سے مجھے آزاد
مرہون تیرا جی سے ئیں ای بے ثمری ہوں

---

خوش رہ ای دل اگر تو شاد نہیں یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
تا کجا امتحانِ صبر کہ شوخ دل ہی آخر یہ کچھ جماد نہیں
سچ ہیں سارے کمالِ حضرتِ شیخ لیک دِل کو کچھ اعتقاد نہیں

میں کہا عہد کیا کیا تھا رات                ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں
ہو جیے کس کے داد خواہِ بُتاں                اس ستم کی جہاں میں داد نہیں
یار اگر چاہتا ہے دے قائم                جان کچھ دل سے تو زیاد نہیں

---

جوں شیشہ بھرا ہوں مے سے لیکن                مستی سے میں اپنی بے خبر ہوں
جو کہیے سو یاں سے ہے فروتر                کیا جانے میں کس مقام پر ہوں

---

کون سا دن کہ مجھے اس سے ملاقات نہیں                لیک جی چاہے ہے جوں ملنے کو وہ بات نہیں

---

ہوس ہی عشق کی اہلِ ہوا کو ہم تو میاں                سُننے سے نام محبّت کا زرد ہوتے ہیں

---

عبث ہیں ناصحا ہم سے ز خود رفتوں کی تدبیریں
رُکے ہے بحر کب گو موج سے ہوں لاکھ زنجیریں
ہماری آہ سے آگے تو پتھّر موم ہوتے تھے
یہ کیا جانے وہ اب کیدھر گئیں نالے کی تاثیریں
گریباں کی تو قائم مدّتوں دھجیں اُڑائی ہیں
یہ خاطر جمع اس دن ہوئے جب سینے کو ہم چیریں

---

آدے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں                غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں
قائم یہ جی میں ہے کہ تقلید سے شیخ کی                اب کے جو میں نماز کروں بے وضو کروں

---

یوُہیں رنجش ہو اور گلا بھی یوُہیں ہو جے ہر بات پر خفا بھی یوُہیں
کچھ نہ ہم کو ہی بھا گیا یہ طور واقعی یہ کہ ہی مزا بھی یوُہیں
صیدِ کنجشک سے نہ ہاتھ اُٹھا آ کے پھنس جائے ہی ہما بھی یوُہیں
کیوں نہ روؤں مَیں دیکھ خندۂ گُل کہ ہنسے تھا وہ بے وفا بھی یوُہیں

---

نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں
یکایک کھِل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں[1]

---

کمال جگ میں سزاوارِ ناز ہی یہ سچ پہ ناز کرنے کو انساں میں کچھ کمال بھی ہو

---

عاشق نہ تھا مَیں بلبل کچھ گُل کے رنگ و بُو کا
ایک انس ہو گیا تھا اس گلستاں سے مجھ کو

---

ٹک تو خاموش رکھو مُنھ میں زباں سنتے ہو
اپنی ہی کہتے ہو میری بھی میاں سُنتے ہو
سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہی کہ کہاں سنتے ہو
خشک و تر پھونکتی پھرتی ہی سوا آتشِ عشق
بچیو اس آنچ سے اے پیر و جواں سُنتے ہو

---

[1] دن ، گُل چھڑیاں

کیا لکھوں سوزِ دل اپنے سے اسے ای قاصد
جائے کاغذ ہو اگر بالِ دپرِ پروانہ
شمع تک جاتے تو دیکھا تھا کئیں اس کو قائمؔ
پھر نہ معلوم ہوئی کچھ خبرِ پروانہ

---

قائمؔ سمجھ کے بولیو تو آپ کے حضور
پیارے معاملت ہی سخن آشنا کے ساتھ

---

یک شب دیکھی جن نے وہ زلف
لاکھوں دیکھے روزِ سیاہ
اتنی تو، مت ہو جلد نسیم
ہم بھی چمن تک ہیں ہم راہ
کوندی ہی دل پر برق سی آج
پیشِ نظر ہی کس کی نگاہ
وعدہ کر کے رات کا تم
خوب ہی آئے واہ جی واہ
قائمؔ سے کوئی ہوئے خفا
بندۂ خادم دولت خواہ

---

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی
رو دیے اس غم کدے میں آج کس کس کو یہاں
دیکھتے نظروں کے اپنے اک خدائی کیا ہوئی
گو کسی حالت میں ہوئیں پھر بھی سمجھوں ہوں تجھے
ہی تو تو وہی پہ تیری کبریائی کیا ہوئی

---

جوں موج مرا قافلہ غافل ہی سفر سے
کیا جانے کہاں جائے گا آیا ہی کدھر سے

کس رات میں جوں گُل نہ ہوا غرق لہو میں　　کس دن نہ بھری گو دمیری لختِ جگر سے
وہ خارِ یتیمی زدہ اس دشت میں مَیں ہوں　　پالا ہی جسے آبلے نے خونِ جگر سے

---

دم بہ دم اس بخششِ بے جا کو کیا کہتے ہیں شوخ
دل دیا تجکو تو ہم نے کچھ گنہگاری نہ کی

---

اگرچہ صبح تلک ہم دگر تھے گرمِ سخن　　یہ کہ سکا نہ کچھ اس سے مَیں بات مطلب کی
سوائے دل شکنی سب مباح ہی یہاں شیخ　　خبر نہیں تجھے رندوں کے دین و مذہب کی
سوالِ بوسہ جو قائم کیا مَیں شب تو کہا　　کہ کیجے چھیڑ کہیں اور جا کے اس ڈھب کی

---

دم قدم تک ہی ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سُنتے ہو

مَیں کہا خلق تمھاری جو کمر کہتے ہیں
تم بھی اس کا کہیں کچھ ذِکر و بیاں سُنتے ہو

ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہی یوں بات
ہوئے گی ویسی ہی جیسی کہ وہاں سُنتے ہو

---

نہ ہجر چاہتا ہوں نہ وصلِ حبیب کو　　یارب کہیں ہو صبر دلِ ناشکیب کو
وے بھی تو آدمی ہیں کہ جن سے ہی تم کو ربط　　کیا شکوہ تم سے، رو بیے اپنے نصیب کو

---

بھول کر بھی وہ نہیں یاد سے جاتا اپنی　　جان کر یاد سے جس نے کہ بھلایا مجھ کو
کچھ تو تھی بات خلل کی کہ شب اس نے محرم　　غیر کے آتے ہی مجلس سے اُٹھایا مجھ کو

جی میں حُچھلیں تھیں جو کچھ سوگئیں وہ یار کے ساتھ
سر پٹکنا ہی پڑا اب درو دیوار کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کے سو چلے
بُلبُلو خوش رہو اب تم گُل و گلزار کے ساتھ

مَیں دِوانا ہوں سدا کا مجھے مت قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

یارو کہتے تھے جو تم لالہ و گُل ہو سو کہاں
سر پٹکنے تو نہ آیا تھا مَیں کُہسار کے ساتھ

ہائے صیّاد یہ انصاف سے تیرے ہو بعید
یاں تلک کیجے ستم اپنے گرفتار کے ساتھ

گرچہ بُلبُل ہوں مَیں قائم ولے اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گُل کو جہاں خار کے ساتھ

---

آج اگر بزم میں ہی کچھ اثرِ پروانہ　　اُڑتے ہیں پائے لگن چند پرِ پروانہ
آتشِ عشق میں چلنا نہیں کارِ آساں　　نرگس سے نہ طلب کر جگرِ پروانہ
وضع پر اپنے ہیں یاں شادی و غم ہر اک کا　　شامِ ماتم سے ہی گیا کم سحرِ پروانہ

---

ہم نشیں ذِکرِ یار کر کچھ آج　　اس حکایت سے جی بہلتا ہی
دل مژہ تک پہنچ چکا جوں اشک　　اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہی
آج قائم کے شعر ہم نے سُنے　　ہاں اِک انداز تو نکلتا ہی

---

جوں طفل سرشکِ ارغوانی پامال ہوئی مری جوانی
ہر سانس گراں ہی تن پہ میرے اللہ رے ضعف و ناتوانی
دو چیز ہیں یادگارِ دوراں تیرا ستم اپنی جاں فشانی
ہی رشک مجھے پیام بر تک گو تجھ سے کہے مری زبانی

---

وہ دِن گئے کہ لوہو آتا تھا چشمِ تر سے
اب لختِ دل ہی کوئی یا پارۂ جگر ہی
غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کریاں
ہر سنگِ رہ گزر کا دوکانِ شیشہ گر ہی

---

کب نالہ بلائے جاں نہیں ہی کب آفتِ دل فغاں نہیں ہی
کب چشم پہ ناگوار نہیں خواب کب دل پہ نفس گراں نہیں ہی
ہی کون سا دم کہ تازہ نوحہ سر جوشِ لب و دہاں نہیں ہی
کس دن نہ دل بہ رنگِ اخگر صد آتشِ غم نہاں نہیں ہی
کب رات ہوئی کہ چشمِ تر سے جو نالۂ دل رواں نہیں ہی
سب کچھ ہی جو چاہیے مگر صبر ایک جنس ہی وہ کہ یاں نہیں ہی
بس تا بہ کجا اُٹھائیں یہ غم کیا ہم ہیں تو ہم میں جاں نہیں ہی
کہتا ئیں نہیں کہ ظُلم ہی بد پر خوب تر مہرباں نہیں ہی
سو بات کہوں پر اس کے آگے گویا مُنھ میں زباں نہیں ہی
قائم سا عزیز خوار ہو حیف
کوئی ہند میں قدرداں نہیں ہی

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے
فلک رُلائے تو ہی ہم کو لیک یہ ڈر ہی
کہ بُلبُلہ سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے
ہزار حیف کہ گُل چیں ہو اس جگہ گستاخ
مَیں جس چمن میں یہ چاہوں تھا یاں صبا نہ پھرے

---

تھی خیر یہی کہ رات پیارے | تم غیر کی گفتگو نہ سمجھے
سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو | پر حیف کہ رُو بہ رُو نہ سمجھے
ایک عرض تو تھی پر اُس سے پیارے | کیا کہیے جو بات کو' نہ سمجھے
قسمت کہ وہ چارہ گر ہی اپنا | جو زخم سے 'تا رفو' نہ سمجھے
سَو حرف ہیں خامشی میں لیکن | اس بات کو ہرزہ گو نہ سمجھے
شایانِ چمن نہیں وہ بُلبُل | ہر گُل کو جو رنگ و بُو نہ سمجھے

سمجھا رہے ہیں ہم تو تجھ کو قائم
پر کیجے کیا جو تو' نہ سمجھے

---

قطعات و رباعیات کی اگرچہ شیفتہ نے تعریف کی ہی لیکن وہ ایسے زیادہ تعریف کے قابل نہیں، اُن میں زیادہ تر لفظوں کے ہیر پھیر اور تلازمے سے مضمون پیدا کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک قطعہ ایک رباعی درج کی جاتی ہی ؛

رباعی ؎

قائم جو تو، نواب سے دُکھ پایا ہی          کہ بھڑ دے گو جو زباں پر آیا ہی
سرمہ نہیں کھایا کہ رہے گا خاموش          کھایا ہی اگر تو، تو، نمک کھایا ہی

قطعہ ؎

اندازۂ نگاہ رکھ سخن میں          یعنی جو کہے ہی نیک کہ تو،
دو گوش ترے ہیں اور زباں ایک          تا دو نہ سُنے نہ ایک کہ تو،

# مقدّمۂ 'چمنستانِ شعرا'

رائے لچھمی نرائن تخلّص شفیق دصاحب کے مالک والد رائے منسارام نواب نظام الملک آصف جاہ مرحوم کے عہد میں پیش کارِ صدارت شش صوبۂ دکن تھے[1] رائے منسارام اپنی ایک کتاب[2] کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "بندہ عقیدت شناس منسارام آصف جاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی نبیرۂ بال کشن عابد خانی نے تخمیناً مدّت پچاس سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بڑی اچھی طرح بسر کی، صدارت کل کی خدمت انجام دی اور موردِ عاطفت و شفقت رہا ؛

شفیق کھتری قوم سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا بھوانی داس لشکرِ عالم گیری کے ہم راہ دکن میں آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پزیر ہو گئے۔ رائے منسارام کو صغر سنی میں یتیمی کا داغ نصیب ہوا۔ سنِ شعور کو پہنچ کر ایسی لیاقت حاصل کی کہ نواب مغفرت مآب آصف جاہ اوّل کے عہد میں پیش کارِ صدارتِ صوبہ جاتِ دکن کی خدمت پر فائز ہو گئے۔ منسارام چار پشت سے خاندانِ آصف جاہ کے نمک خوار تھے ؛

---

[1] 'شامِ غریباں'، باب آخر [2] ماثر نظامی

رائے منسارام محض دفتر کے پیش کار یا سر رشتہ دار ہی نہ تھے بلکہ تاریخ و انشا کا بھی ذوق رکھتے تھے اور صاحبِ تالیف و تصنیف ہوئے ہیں۔ ایک کتاب ان کی 'ماثر نظامی' ہی۔ یہ کتاب انھوں نے اُس زمانے میں لکھی تھی جب ناموافق حالات کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل کے حالات ہیں۔ ابتدا میں ان کے بزرگوں کا بھی تذکرہ آگیا ہی۔ یہ حالات کچھ تو مصنّف کے چشم دید ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو ثقات سے معلوم ہوئے اور بعض حالات خود نواب آصف جاہ مرحوم کی زبانِ مبارک سے سننے میں آئے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۰۰ھ میں مرتّب ہوئی اور جب تیس سال کی گُم نامی اور گوشہ نشینی کے بعد حضرت مرشدزادۂ آفاق مہین پور خلافت و ریاست نواب عالی جاہ بہادر اسد جنگ نے یاد فرمایا، تو یہ رسالہ بہ طور تحفہ حضور میں پیش کیا۔ ان کی دُوسری تالیف 'قانون دربارِ آصفی' ہی۔ یہ کتاب بھی زمانۂ گوشہ نشینی کی لکھی ہوئی ہی۔ سنِ تالیف ۱۱۷۵ھ ہی۔ اس میں ضوابطِ دربار کے علاوہ بعض بعض بڑے کام کی باتیں بھی آگئی ہیں۔ مؤلّف نے آخر میں لکھا ہی کہ یہ کتاب مَیں نے دو روز میں لکھی ؛

اس سے یہ معلوم ہو گا کہ شفیق ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، جہاں علمی چرچا تھا اور خود ان کے والد صاحبِ تالیف و تصنیف تھے۔ شفیق کی ولادت سنہ ۱۱۸۵ھ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہی جب کہ شمالی ہندُستان سے لے کر دکن تک ریختہ گوئی کی گرم بازاری تھی اور من جملہ دُوسرے شہروں کے اورنگ آباد بھی مرکزِ شعر و سخن بنا ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت ذرائع آمد و رفت کی یہ آسانیاں نہ تھیں جو اس وقت ہیں لیکن اس پر بھی شمال کے اساتذہ کا

تازہ کلام یہاں پہنچتا رہتا ہے اور بڑے اشتیاق سے پڑھا جاتا ہے اور مشہورِ خاص وعام ہو جاتا ہے جس سے صاحبِ ذوق لوگوں کے دِلوں میں نئی نئی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ اُن باکمال اساتذہ کی تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؛

شفیق کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق فارسی، عربی، صرف ونحو، انشا وغیرہ میں ہوئی اور جیسا کہ خود انھوں نے اس تذکرے میں لکھا ہے، شیخ عبدالقادر صاحب سے کتبِ متعارفہ کی سند حاصل کی۔ سنِ شعور ہی سے ان میں شعر وسخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جن کا شمار ہندُستان کے جیّد علما میں ہے اور جو فنِ شعرگوئی اور تاریخ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، دکن ہی میں تھے۔ شفیق کو ان سے تلمّذ کا شرف حاصل ہُوا۔ لکھتے ہیں کہ " میر عبدالقادر مہربان نے جو حضرت آزاد کے تلامذہ میں سے تھے، مجھے " صاحب" تخلّص عنایت فرمایا غزلیات کا دیوان جس میں تقریباً دو ہزار بیت تھے، مرتب کیا لیکن جب ذرا استعداد بڑھی اور اصطلاح شعر اور قواعدِ شعر میں مہارت حاصل ہوئی تو اسے تقویمِ پارینہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اب کہ میری عمر اٹھارہ سال کی ہے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب میر محمد مسیح کا تخلّص فارسی میں " صاحب" ہے تو میں نے میر صاحب قبلہ (آزاد بلگرامی) سے تخلّص کی التجا کی۔ آپ نے ازراہِ شفقت " شفیق " تخلّص عطا فرمایا۔ چوں کہ میرے ریختے عوام وخواص میں مشہور ہو چکے تھے اس لیے ریختے میں " صاحب " ہی تخلّص رہنے دیا اور جن بحروں میں " شفیق " نہیں کھپ سکتا وہاں ناچار " صاحب" ہی رکھنا پڑا " اس نئے تخلّص کی خوشی اور شکریے میں وہ ایک قطعہ موزوں کرتے

ہیں اور "تخلّص" اس کی تاریخ نکالتے ہیں۔ مہربان، شفیق کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کے حالات میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔

میر غلام علی آزاد سنہ ۱۱۵۲ھ (سنہ ۱۷۴۰ء) میں اورنگ آباد وارد ہوئے اور باباشاہ مسافر کے تکیے میں قیام کیا اور سات سال یہیں بسر کر دیے۔ آزاد کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ہی میں گزرے اور یہیں وفات پائی اور خلد آباد میں پیوندِ زمین ہوئے۔ آپ کے فیضِ صحبت سے دکن کے اکثر باکمال مستفیض ہوئے۔ انھیں میں شفیق تھے۔ شفیق کو آزاد سے کمال عقیدت مندی تھی۔ جہاں کہیں ان کی تالیفات میں آزاد کا نام آیا ہے تو ان کا ذکر بڑے ادب و احترام اور خلوص و ارادت سے کرتے ہیں اور ہر جگہ انھیں "میر صاحب قبلہ" "پیر و مرشد" یا "قبلہ و کعبۂ برحق" اور اپنے آپ کو "غلام" لکھتے ہیں (غالباً اس میں آزاد کے لفظ کی رعایت بھی ملحوظ ہے) 'گلِ رعنا' میں آزاد کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے کلام میں جابجا حضرت کمال کے اور اپنے تعلقات و عنایات کا ذکر کیا ہے۔ ایک پُرزور قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے ؎

للہ الحمد صبا مژدۂ عشرت لائی — کہ بہار اب کے تجمّل سے چمن میں آئی
شاہ گل تختِ چمن پر ہے بہ صد زینت و ناز — سرو و شمشاد ہیں استادہ وہاں مجرائی

بہاریہ تشبیب کے بعد گریز کی ہے ؎

طبعِ حضرت سے مگر وام کرے رنگینی — اب جو کرتی ہے بہار ایسی چمن آرائی
یعنی وہ حضرتِ آزاد کہ خورشید و قمر — آستاں اس کی پہ رکھتے ہیں جبیں فرسائی
قبلۂ ہر دو جہاں، مرشدِ اربابِ سلوک — ختم ہے ذاتِ مبارک پہ کرم فرمائی
علمِ منقول میں اُس کو دمِ عیسیٰ ہے گا — علمِ معقول میں اس کو ہے یدِ بیضائی

قمریانِ عرب اس کی ہیں ثنا خوانی ہیں    عندلیبانِ عجم کی ہے سخن پیرائی
بس کہ رکھتا ہے سخن بیچ وہ شیریں کاری    ہند کے طوطیوں کو اس سے ہے شکر خائی
نگہ لطف مرے پر ہے ہمیشہ ہنڈول    مجھ کو زیبا ہے غلامی' اسے ہے آقائی

اس کے بعد دعا ہے اور دعا کے بعد یہ مقطع ہے ؎

فارسی شعر کہو مدح میں اس کی صاحب    کہ ملے تجھ کو خطابِ ملک الشعرائی

اسی طرح ایک پوری غزل آزاد کی شان میں کہی ہے۔ غزل کیا ہے گویا اپنے پیر و مرشد کی شان میں چھوٹا سا قصیدہ ہے ؎

سرورِ ہر دو جہاں آزاد ہے    والئ کون و مکاں آزاد ہے
کنتُ کنزاً کے معانی پر خبر    واقفِ سرِّ نہاں آزاد ہے
مرکزِ ادوار چرخِ چنبری    قطب الاقطابِ زماں آزاد ہے
اسمِ اعظم ہے زباں زد اس کے تئیں    جس کے تئیں وردِ زباں آزاد ہے
خورد و بزرگ کے تئیں یہاں ہے سرخ    مرشدِ پیر و جواں آزاد ہے
ایک دم میں دین و دنیا بخش دے    جس کے اوپر مہرباں آزاد ہے
دل سے اب صاحب ہوا ہے گا غلام    بادشاہِ انس و جاں آزاد ہے

کہاں تک لکھوں شفیق کی عقیدت کے اظہار کے لیے یہ بہت کافی ہے۔

حضرتِ آزاد کا ذوقِ سخن محتاجِ بیان نہیں۔ ایسے صاحبِ ذوق اور باکمال لوگ کم ہوتے ہیں ان کا کلام اور ان کی تصنیفات اس کی شاہد ہیں۔ اس کے ساتھ تاریخ و سیرت کا ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کے تذکرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں۔ 'مآثر الامرا' جو تاریخی لحاظ سے بے مثل کتاب ہے۔ انھیں کے فیضِ اثر کا نتیجہ ہے بلکہ بہت کچھ حضرت آزاد ہی کے قلم کی ممنون ہے۔ ادب میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور تحقیق و تلاش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اچھا اُستاد

دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہی۔ شفیق بڑا خوش قسمت تھا کہ اُسے آزاد سا اُستاد مِلا۔ اس نے بھی اُستاد کے قدم بہ قدم چلنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ شاعر تو وہ لڑکپن سے تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں میں اس کا کلام موجود ہی اگرچہ کم یاب ہی۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیفات وتالیفات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو شعرا کے تذکرے اور دُوسری تاریخی کتابیں یہاں اُن تالیفات[1] کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہی ؏

# تاریخ

## حقیقت ہائے ہندُستان'

شفیق اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں کہ "راقم کے والد رائے منسارام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندانِ آصفی ہیں سنہ ۱۲۰۴ھ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طبلق میرے پاس حیدرآباد بھیجے یہ میرے جدِّ ماجد کے لکھے ہوئے تھے، جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ والرضوان میں خدمت مستوفی گری اور پیش کاری صدارت امکنۂ ہندُستان پر فائز تھے۔ یہ فردیں نواب مغفرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزیّن تھیں۔ لیکن ان میں سے بعض بوسیدہ ہوگئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں۔ ان فردوں میں قدیم زمانے کے مختلف سنین سے سنہ ۱۱۳۹ف تک کے مداخل ومخارج وجمعیتِ سپاہ وغیرہ کا حساب بہ طور سیاق واصطلاحِ اہلِ جرائد

---

[1] اس مقدمہ میں رائے منسارام اور شفیق کی تالیفات کا ذکر آیا ہی ان میں سے تمنیق شگرف حالات حیدرآباد ریویو کی فہرست سے ماخوذ ہی، باقی کتابیں میرے پاس موجود ہیں ؏

میں درج تھے۔ ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا اور اس کے علاوہ دُوسری معلومات بھی فراہم کر کے مناسب مقامات پر اضافہ کیں ؂

یہ کتاب شفیق نے اس وقت کے ریزیڈنٹ اور اپنے سرپرست کپتان ولیم پیٹرک کے لیے تالیف کی۔ کتاب کے نام سے اس کا سنِ تالیف ۱۲۰۴ھ نکلتا ہے، اس میں چار مقالے ہیں:۔

مقالۂ اوّل میں دفترِ قدیمہ کی فردوں کی کیفیت ہے۔

مقالۂ دوم میں صوبہ ہائے ہندُستان کا حال ہے۔

مقالۂ سوم میں صوبہ جاتِ دکن کا ذِکر ہے۔

مقالۂ چہارم میں مسلمان سلاطینِ ہند کا مختصر حال سلطان معزالدین سام سے لے کر شاہ عالم بادشاہ تک ہے ؂

یہ کتاب اچھی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار، پرگنہ اور حویلی کے مداخل اور سمت اور فاصلہ درج ہے۔ ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آ گئے ہیں۔ غرض یہ کتاب اپنی نوعیّت کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے ؂

'تنمیقِ شگرف'

یہ بھی دکن کی تاریخ کے متعلق ہے۔ مختلف صوبوں کے جغرافی اور تاریخی حال اور اعداد و شمار ہیں۔ اس کے بعد سلاطینِ بہمنیہ کا ذِکر ہے جو 'تاریخِ فرشتہ' سے ماخوذ ہے۔ سلطنتِ بہمنیہ کے زوال پر جو حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی عادل شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی، برید شاہی اور خاندیس کے فاروقی سلاطین) ان کا مختصر حال ہے۔ آخر میں سلاطینِ تیموریہ کا ذِکر سنہ ۱۲۰۰ھ تک ہے۔ یہ نام بھی تاریخی ہے جس سے سنِ تالیف سنہ ۱۲۰۰ھ نکلتا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد

کے ریزیڈنٹ مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون ہی ؂

'ماثرِ آصفی'

یہ خاندانِ آصف جاہ کی تاریخ ہی، یعنی خواجہ عابد نظام الملک آصف جاہ اوّل کے دادا سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کے حالات ہیں۔ مرہٹوں نے جو ہندُستان پر حملہ کیا تھا اس کا بھی ذِکر ہی نیز اِس زمانے کے امرا اور راجاؤں کے حالات بھی لکھے ہیں۔ کتاب سنہ ۱۲۰۸ھ میں تالیف ہوئی ؂

'بساط الغنائم'

یہ مرہٹوں کی تاریخ ہی۔ یہ کتاب اس نے سرجان ملکم کی فرمائش سے لکھی، جو اس وقت حیدرآباد میں تھے۔ اس میں مرہٹوں کی تاریخ ابتدا سے مؤلف کے وقت تک کی ہی۔ اس کا ایک حصّہ شفیق نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہی۔ نام تاریخی ہی جس سے سنہ ۱۲۱۴ھ نکلتا ہی ؂

'حالاتِ حیدرآباد'

اس میں بلدۂ حیدرآباد کی مساجد، محلّات وباغات اور شہر کی مختصر تاریخ ہی اور بیدر اور ورنگل کے حالات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب بھی سنہ ۱۲۱۴ھ کی تالیف ہی ؂

## تذکرے

### 'شامِ غریباں'

یہ تذکرہ ان ایرانی شعرا کا ہی جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندُستان میں وارد ہوئے۔ نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہی۔ اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں مگر کتاب دل چسپ ہی اور اشعار کا انتخاب خوب ہی۔

لطائف وظرائف سے خالی نہیں۔ بعض بعض جگہ اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دیے ہیں ⁂

## 'گُلِ رعنا'

یہ ہندُستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس میں وہ ایرانی نژاد بھی ہیں جن کے باپ دادا ہندُستان میں آئے اور یہیں رہ گئے اور ہندی نژاد بھی۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔ ایک میں "شعرائے اسلامیاں" اور دوسری میں "نکتہ پردازانِ اصنامیاں" کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ 'شامِ غریباں' سے بہت بڑا ہے اور اکثر حالات بھی مفصّل بیان کیے ہیں۔ اپنے اُستاد آزاد بلگرامی کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اکبر کا حال کوئی ۴۶ صفحوں میں ہے، مگر سب مُلّا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ افسوس کہ شفیق نے اس میں تحقیق سے مطلق کام نہیں لیا۔ وہ اس مورّخ کے ادعائے راست گوئی کو اس کے جذباتِ تعصّب، حسد و رشک سے جُدا نہ کر سکے۔ علّامہ فیضی کے حالات بھی بلا کم و کاست بدایونی سے نقل کر دیے ہیں۔ شفیق بدایونی کو بالکل نہیں سمجھے ⁂

'شامِ غریباں' کے مقابلے میں اس تذکرے میں تاریخی واقعات اور لطائف وظرائف بھی زیادہ ہیں۔ بعض بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی کر دی ہے اور ان کے نکات بھی بتا دیے ہیں۔ مثلاً میر محمد افضل الہ آبادی ثابت کے ایک قصیدے میں کثرت سے طبّی تلمیحات و اصطلاحات ہیں۔ اس کے اشعار نقل کر کے ان تمام تلمیحات و اصطلاحات کی شرح لکھی ہے۔ اسی شاعر کا ایک دوسرا معرکے کا قصیدہ ہے، اس کا انتخاب درج کیا ہے اور اس کے مشکل مقامات کا حل بھی لکھ دیا ہے۔ یہ تذکرہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے ⁂

## 'چمنستانِ شعرا'

یہ ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ شفیق لکھتے ہیں کہ "جب ہندستان سے تازہ تازہ میر محمد تقی میرؔ اور فتح علی خاں کے تذکرے پہنچے تو سارے عالم میں غلغلہ پڑ گیا اور اشعار ہند کے اشتیاق میں ایک دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ کیوں کہ اہلِ دکن کو ان اشعار کا بہم پہنچنا دشوار ہے۔ اس لیے میری فکرِ ناقص میں یہ بات آئی کہ ان دونوں تذکروں کے اشعار اور دوسرے جواہر پارے ان کے ساتھ ملا کر ایک سفینہ تیار کروں۔ اس تقریب سے بعض احباب سخن داں کے حالات و کلام کے جمع کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ دوست احباب نے بھی اس کی تائید کی بلکہ اصرار کیا اور میں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔"

شفیق نے اس تذکرے کی ترتیب میں عجیب جدّت دکھائی ہے۔ اب تک جتنے فارسی اُردو کے تذکرے لکھے گئے ہیں (سوائے میر صاحب کے تذکرے کے، جس میں کوئی ترتیب نہیں) ان میں ناموں کی (یعنی تخلصوں کی) ترتیب حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ہے۔ لیکن شفیق نے اس تذکرے کی ترتیب حروفِ ابجد یعنی حساب جمل کے لحاظ سے رکھی ہے۔ اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ہوتی، نہ خود مؤلّف نے اس کی کوئی وجہ بتائی ہے۔ سوا اس کے کہ جوانی کی ترنگ کہا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جوانی کا زمانہ ہے، عبارت میں رنگینی پائی جاتی ہے، بعض اوقات تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ہیں۔ جہاں کہیں موقع ملتا ہے شاعر کے تخلص یا اس کے پیشے وغیرہ کی مناسبت سے اسی قسم کے الفاظ اور تشبیہات میں اس کا حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ (مثلاً ملاحظہ ہوں: آشنا، آوارہ، بہار، داؤد، خاکسار، زکی، محمد علی حشمت، مخلص، ناطق وغیرہ کے حالات)

لیکن عبارت گنجلک نہیں، بیان صاف اور شستہ ہی اور زبان پر قدرت ہی کہیں کہیں میر صاحب (میر تقی) کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ہوتا ہی تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں، جس سے شفیق کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہی ؎

اگرچہ شفیق نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں پر رکھی ہی لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو جو حالات مِل گئے ہیں حوالے کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر دیا ہی۔ چناں چہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم کے تذکرۂ 'مردم دیدہ' اور تذکرۂ 'مجمع النفائس' تالیف سراج الدّین خاں آرزو، 'سروِ آزاد' اور حاجی علی اکبر رمالؔ اور رضا خاں انوارؔ کی بیاضوں کا حوالہ مِلے گا ؎

بعض اوقات اشعار کے متعلق مغالطہ ہو جاتا ہی اور یہ دیکھنے میں آیا ہی کہ بعض اشعار خصوصاً مشہور اشعار مختلف شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ شفیق نے اس باب میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہی جن اشعار کا پتا نہیں چلا وہ تذکرے کے آخر میں جمع کر دیے ہیں کہ ان کا پتا چلانا دشوار ہی، خصوصاً اہلِ دکن کے لیے کیوں کہ ایک ہی تخلّص کے کئی کئی شاعر ہیں۔ ہندستان سے اشعار اکثر صرف تخلّص کے ساتھ آتے ہیں اور نادان پڑھنے والے سب کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہی کہ یہ شعر حقیقت میں کس کا ہی ؎

شفیق ہر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ہی اور کبھی کسی پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا۔ چناں چہ یقین کے بیان میں خود لکھتا ہی کہ "جب کسی شاعر کے کلام میں کوئی ثقیل مصرع نظر پڑا تو خود ایک دوسرا مصرع لکھ دیا ہی اور

ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مصرع بھی خوب معلوم ہوتا ہے" اپنے مصرع کو ترجیح نہیں دی بلکہ پڑھنے والے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے ؛

لیکن یقین کا تذکرہ مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ اس میں اس قدر مبالغے بلکہ غلو سے کام لیا ہے کہ خلافِ عادت شفیق کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا، وہ اسے اُردُو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہند و دکن میں کسی کو اس کی ٹکر کا نہیں سمجھتا۔ کہتا ہے کہ "اگر مرزا سودا کا غزل، رباعی، مخمّس، مثنوی، قصیدے، قطعہ بند وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے اور وہ بہت عالی مضامین تلاش کرتے ہیں۔ لیکن یقین کے ریختہ میں کچھ اور ہی فصاحت و ملاحت ہے ؎

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا	کرے جو فکر تتبع یقیں کا از دل و جاں
کہے گا معنئ باریک و خوب شیریں تر	ولے نزاکت و یہ لطف یہ قبول کہاں

وہ یکتائے عصر اور یگانۂ زمانہ ہے اور ایسا معنی آفریں اور نکتہ رس دُنیا میں پیدا نہیں ہوا۔" میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو یقین پر طعن و تعریض کی ہے اور اسے مبتذل بند کہا ہے اور سرقے کا الزام لگایا ہے تو اس پر شفیق آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت سُست کہتا ہے۔ سودا نے جو میر صاحب[1] کی ہجو کہی تھی اسے نقل کر کے اس کی داد دیتا ہے۔ اس کے بعد 'توارد' 'سرقے' پر بحث کی ہے، دُوسرے علما کے اقوال نقل کیے ہیں اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے۔ غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذِکر میں بھی ان کی حرف گیری پر چوٹ کی ہے ؛

غرض یقین کی شاعری کا بہت بڑا مدّاح اور معتقد ہے اور اس کی تقلید کو

---

[1] یہ صحیح نہیں۔ یہ ہجو ایک شخص محمد تقی نامی کی ہے ؛

فخر سمجھتا ہی۔ اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کا اشارہ کیا ہی۔ مثلاً ایک غزل کا مقطع ہی ؎

دیوان یقیں خوش خط صاحب نے لکھایا ہی
اوراقِ طلائی پر کھینچی ہیں گی تحریریں

یقین کا تذکرہ اور کلام تقریباً ۴۶ صفحوں میں درج ہی۔ اسی سے قیاس ہوسکتا ہی کہ وہ اس شاعر کو کیا سمجھتا تھا ؂

حاجی میر علی اکبر رمال حاجی سے شفیق نے رمل وغیرہ کی تحصیل کی تھی حاجی کے تذکرے میں خود بھی اپنے اظہارِ کمال کے لیے ایک زائچہ دیا ہی، جس سے عام ناظرین کو کوئی دل چسپی نہیں ہوسکتی ہی۔ ایک نوجوان طالب علم کا شوق نمود و نمائش سمجھنا چاہیے ؂

شفیق کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑا ہی اور بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ درج ہی جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا۔ بہت سے ایسے ہیں جو شفیق کے ہم عصر ہیں اور جن سے اس کی ذاتی ملاقات ہی اور خود ان شاعروں سے ان کا منتخب کلام لے کر درجِ تذکرہ کیا ہی۔ ایسے حالات خاص طور پر قابلِ اعتبار ہیں ؂

سب سے قابلِ تعریف بات یہ ہی کہ شفیق نے یہ تذکرہ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصے میں ختم کردیا اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کا تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں۔ اس سے شفیق کی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت معلوم ہوتی ہی۔ کتاب کا نام 'چمنستانِ شعرا' تاریخی ہی اور اس سے سنہ ۱۱۷۵ھ سنِ تالیف نکلتا ہی ؂

جہاں تک تحقیق کیا گیا، اس تذکرے کا صرف ایک ہی نسخہ ہی، جو کتب خانہ

آصفیہ سرکارِ عالی حیدرآباد میں ہے اور یہ بھی کِرم خوردہ، فرسودہ اور مشکوک ہے۔ یہ اسی نسخے کی نقل ہے۔ اس کی تصحیح میں بے حد دقّت اُٹھانی پڑی۔ بعض عبارتیں اصل کتب سے، جو اس کا ماخذ ہیں، صحیح کرنی پڑیں، کہیں قیاس سے کام لینا پڑا اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی دشمن کیڑے چٹ کر گئے ہیں، ویسے ہی چھوڑنے پڑے اور ان کی جگہ نقطے دے دیے ہیں بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوک یا کِرم خوردہ تھے، شعرا کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے۔ بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور ان کی صحت نہ ہو سکی، ان کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں۔ اگر دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو جہاں تک ممکن ہوگا اصلاح کی کوشش کی جائے گی ؛

ایک کام اس کی ترتیب میں اور کیا گیا ہے، جسے غالباً ناظرین پسند فرمائیں گے یعنی 'تحفۃ الشعرا'، تالیف افضل بیگ خاں قاق سال اورنگ آبادی دسنِ تالیف ۱۱۶۵ھ) سے ان ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو شفیق کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں، حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ جن جن شاعروں کا اس میں اُردو کا کلام نہیں وہاں صرف حالات ہی لکھ دیے گئے ہیں اور جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں ہے، وہاں صرف کلام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مشترک کلام ہر جگہ خارج کر دیا گیا ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں جن کا ذکر 'چمنستاں' میں نہیں ہے، ان کا حال اور کلام ہر حرف کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو ضرور بصیرت ہوگی اور وہ 'تحفۃ الشعرا' کے مطالعے سے مستغنی ہو جائیں گے۔ یہ تذکرہ 'چمنستاں' سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اصل میں یہ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس میں ضمناً ایسے شعرا بھی آ گئے ہیں جو

اُردو میں بھی شعر کہتے تھے ۔ بعض شعرا کے حالات اس میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں ۞

## شفیق کا کلام

شفیق کے اُردو کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پُرگو شاعر تھا۔ زبان پر قدرت تھی اور شاعری کے نکات سے خوب واقف تھا۔ اور اس کا کلام شعر کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ اُردو کا اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہے مگر اوسط درجے کے شعرا میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ غزلوں کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں میں خوب زور دکھایا ہے ۔ شہر آشوب ، واسوخت، مخمس، مثلث ، رباعیاں اور تضمینیں بھی لکھی ہیں ۔ ان نظموں سے کہیں کہیں شفیق کے ذاتی حالات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً شفیق ، نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے فرزند میر احمد علی خاں عالی جاہ کے متوسلین میں تھے ۔ یہ بڑے قدردان اور مُنہ زور رئیس تھے اور شفیق کو انھیں کی سرکار سے تعلق تھا۔ ان کی مدح میں اس نے کئی قصیدے لکھے ہیں ۔ چناں چہ ایک قصیدے میں صاف صاف نام اور پتا بتا دیا ہے :ـــــ

یک زبردست ہے مرا والی  یک قوی دل مرا ہے پشت و پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے  یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنی نواب میر احمد خاں  اسد الملک حضرت عالی جاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں  جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

ایک دُوسرے قصیدے میں لکھتے ہیں :ـــــ

جناب پاک یعنی میر احمد خاں عالی جاہ  ۔ کہ جس کی عمر و دولت کا نگہ باں ایزد سبحاں

آگے چل کر سفر میں رہنے کی صعوبت اور اپنے ضعف کی شکایت کی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ملازمت ایسی تھی جس میں دورہ کرنا پڑتا تھا۔ چناں چہ کہتے ہیں :ے

مگر فضلِ خداوندی مری اب دست گیری کر
نشست شہر فرما دے عنایت کر کے نیم ناں

آخر میں اپنے لڑکے کے لیے درخواست کی ہے :ے

مدو خرچ اب مرا دستخط ہوئے اس بندہ زادے کو
تعین ہو ڈیوڑھی کا بلدہ کی جب تک کہ ہے ناداں

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے آقا کا نام اور خطاب کا ذکر کیا ہے ے

چراغ و دودۂ حیدر جناب میر احمد خاں
کہ جس کے جد تئیں چرخِ بریں سے ذوالفقار آئے

دو اسد الملک اسد اللہ اس کا بانہہ بل نت ہے
کہ جس کی دھاک سے شیروں کو تپ بے اختیار آئے

نظام الدولہ آصف جاہ کا فرزند ارشد ہے
کہ دولت جس کے در پہ جبہ سا اُمید وار آئے

ایک صاحب سے شفیق کو بے حد الفت ہے اور اکثر غزلوں میں انتہائے محبّت سے "میرا میاں میرا میاں" کر کے اسے یاد کیا ہے۔ بعض غزلیں کی غزلیں اس کی یاد میں ("میرا میاں" کی ردیف میں) لکھ ڈالی ہیں۔ ایک قصیدہ بھی اسی ردیف میں لکھا ہے اور بڑے شوق اور محبّت سے اس کا ذکر کیا ہے جس کے دو چار شعر یہ ہیں :ے

ہے مرا ایمان و جاں میرا میاں      مجھ کو ہے وردِ زباں میرا میاں
انتظاری کی نہیں طاقت مجھے      جلد آ میرے میاں میرا میاں

گُل ملے بُلبُل کو اور قمری کو سرو　　میرے تئیں میرا میاں میرا میاں

ایک غزل میں معمّے کی طرز میں نام بھی بتا گئے ہیں اور وہ نام "شکرو میاں" ہے۔ ذکا (سیّد امتیاز خاں) سے بھی اپنی عقیدت کا بارہا اظہار کیا ہے :ـ

عقیدت ہے ذکا سے میرے تئیں ازبس کہ اے صاحب
مجھے وردِ زباں ہے رات دن یا پیر یا ہادی

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں :ـ

یک آن جُدائی نہ ہو صاحب سے ذکا کو　　اللہ کرے میری جو نیّت ہے بر آوے

شفیق کو ادبی تحقیق و نکات سے خاص ذوق تھا۔ توارد پر بحث اس نے کی ہے اور ایک غزل کے ضمن میں جو قطعہ توارد پر لکھا ہے وہ سب اس تذکرے میں موجود ہے۔ اُردو کلیات میں ایک قصیدہ نظر پڑا۔ جس کا مطلع یہ ہے :ـ

ساقی اس ابر مشک فام کو دیکھ　　اس طرف دیکھ مے کے جام کو دیکھ

کچھ شعر لکھنے کے بعد گریز کی ہے اور الفاظ کے متحرّک و ساکن ہونے کی بحث کا ذِکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک ہم عصر مفتون نے ان کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے ؛

شفیق نے ختم (بہ سکونِ تا) کو ختَم (بہ فتح تا) لکھ دیا تھا۔ معترض کی تردید اور اپنی تائید میں یہ اشعار لکھے ہیں ـ

گر ختَم کہہ دے ختم کو صاحب　　ہے روا حرکتِ مقام کو دیکھ
ریختے کی زباں میں یہ غلطی　　ابتدا سے ہے انتظام کو دیکھ
آبرو زُلف کو زلَف بولا　　اور الفاظِ ناتمام کو دیکھ
نقل ہے وقتِ مغرب اعظم شاہ　　یوں کہا اپنے ایک غلام کو دیکھ

ہو وے "اسواری" اس گھڑی تیّار — سیر چاہے ہو جی پہ شام کو دیکھ
مولوی جیون اوستادِ شاہ — تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ
لفظ اسواری نہیں سواری ہو — کچھ تو اس صحتِ کلام کو دیکھ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا — میری طرزِ سخن تمام کو دیکھ
یہ عبارت کہاں ہیں ہندی ہیں — اس میں جائز ہو تو نظام کو دیکھ

شفیق کی یہ رائے بالکل صحیح ہو کہ عربی کے جو لفظ عام طور پر اُردو میں بہ تبدیلِ حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں وہ اسی طرح فصیح ہیں خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ہوں۔ ہر زبان کا یہ قاعدہ ہو کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ ہوتے ہیں تو لہجے کے تغیّر سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہو؛

علاوہ غزلوں اور قصیدوں کے شفیق کا زورِ کلام دیکھنا ہو تو ان کی مثنوی 'تصویرِ جاناں' دیکھنی چاہیے جو رسالہ 'تجلّی' حیدرآباد دکن میں شایع ہو چکی ہو۔ اس میں بڑا زور سراپا کے بیان میں دکھایا ہو۔ اگرچہ یہ مضمون بہت پامال ہو اور ہمیشہ بھونڈا اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہو اور یہی حال اس مثنوی کے سراپا کا بھی ہو، تاہم اس سے شفیق کی قادر کلامی کا اندازہ ہوتا ہو؛

اگر کوئی شفیق کے نام اور حال سے واقف نہ ہو اور اس کا کلام پڑھے تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لکھنے والا ہندو ہو وہ تمام بزرگانِ دینِ اسلام کا ذکر اسی ادب، احترام اور عقیدت سے کرتا ہو، جیسے کوئی سچّا اور پکّا مسلمان اور یہ کوئی تصنّع سے نہیں بلکہ درحقیقت دل سے اور عقیدت سے ہو۔ معراج کے بیان میں جو مثنوی لکھی ہو اور جو 'اُردو' میں شایع ہو چکی ہو اسے دیکھیے، کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر کیا لکھے گا۔ اُردو کلیات میں ان کے

متعدد قصیدے حضرت علیؓ کی شان میں ہیں۔ امام آخرالزماں کی منقبت میں کئی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرتِ غوث الاعظم جیلانی کی مدح میں ہے۔ ایک حضرتِ گیسو دراز بندہ نواز کی تعریف میں۔ علاوہ ان قصائد کے ان کے تمام کلام میں جہاں کہیں مسلمانوں کے بزرگوں اور اولیا کا ذِکر آتا ہے تو وہ ان کا نام اور ذِکر اس عقیدت اور ارادت سے کرتا ہے جیسے مسلمان۔ اس کے کلام میں اسلامی تلمیحات کثرت سے آتی ہیں، برخلاف اس کے ہندو دیوتاؤں وغیرہ کا ذِکر شاذ ہی کہیں آیا ہو تو آیا ہو۔ یہ تعلیم، صحبت، ماحول اور اس زمانے کے اقتضا کا اثر تھا۔ آج کل کے لوگوں کو شاید یہ چیزیں پڑھ کر حیرت ہو، لیکن یہ اس زمانے کی یادگاریں ہیں، جب ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے سہتے تھے اور کسی کو کسی سے پُرخاش نہ تھی۔ یہ خوش حالی امن و آزادی اور ترقّی کی نشانی تھی۔ جب افلاس کا منحوس قدم آیا تو جہالت، تنگ دلی، تعصّب اور ناعاقبت اندیشی نے ایسا اندھا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے لگے، ایک دن آئے گا کہ وہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور گلے مِل مِل کر اپنے آنسوؤں سے اس داغ کو دھوئیں گے ؀

شفیق نے 'حسب حال زمانہ' کے عنوان سے ایک شہر آشوب بھی لکھا ہے، جس کے ابتدائی چند شعر یہ ہیں :-

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سُن اِدھر
کیوں ریاست دن بہ دن ایسی ذلیل اور ہے بتّر
اس دکن کے بیچ چھ صوبوں کے چھ تھے بادشاہ
عادل اور فیّاض، صاحب عزم اور صاحب ہُنر
ان کی دولت میں مرفّہ اور سبھی خوش حال تھے
کیا رعیّت، کیا سپاہی، کیا امیرِ نام وَر

آسماں وہی ہے اور وہی زمیں، خلقت ہے وہ
پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر
شامتِ نیّت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور
تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

زمانے کی یہ شکایت ہر عہد میں رہی ہے اور رہے گی۔ آسمان نے ہزاروں رنگ بدلے، دنیا نے سیکڑوں پلٹے کھائے، مگر انسان کی شکایت کم نہ ہوئی۔ بے عیب نہ کوئی کتاب ہے، نہ کوئی آدمی، نہ کوئی نظام ہے اور نہ کوئی زمانہ۔ یہ نقص کسی نہ کسی صورت میں رہتی دنیا تک رہے گا۔ بلاشبہ انسان کے کمال کی آزمایش اسی میں ہے ؎

# مقدّمۂ 'گُلشنِ ہند'

## مصنّفہ مرزا علی لُطف

یہ کتاب شعرائے 'اُردو' کا قابلِ قدر نایاب تذکرہ ہے۔ اتّفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمّت شخص[1] کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیّہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی۔ مَیں خود بے بضاعت تاہم اِس فرمایش کو جو اُنھوں نے دلی شوق سے کی تھی، ٹال نہ سکا اور بہ سروچشم قبول کیا ؛

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدّولہ کے عہد اور امیر الممالک وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں علی ابراہیم خاں[2] نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا اور اُس کا نام 'گلزارِ ابراہیم' رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں سنہ ۱۱۹۸ھ مطابق سنہ ۱۷۸۴ء میں جاکر ختم

---

[1] مولوی عبداللہ خاں صاحب کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

[2] علی ابراہیم خاں متخلص بہ علی، مشہور ادیب اور مورّخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بہ عہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعدازاں گورنر رہے۔ اور سنہ ۱۲۰۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔ ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں (۱) 'گلزار ابراہیم' تذکرہ شعرائے اُردو جو شاہ عالم

(باقی برصفحۂ آئندہ)

ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اُردو کے بڑے قدرداں اور محسن مسٹر گل کرسٹ کی نظر سے گزرا انھوں نے مؤلف تذکرۂ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ ان کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور ان میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ نرا ترجمہ ہی بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہی، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہی اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہی۔

یہ تالیف اس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہلِ کمال اپنے وطن سے مُنھ موڑ اسی طرف

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بادشاہ کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہسٹنگز کی گورنر جنرلی میں سنہ ۱۷۸۲ء (سنہ ۱۱۹۶ھ) میں لکھا ہی اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے تذکرۂ گلشن ہند کی بنیاد رکھی (۲) 'خلاصۃ الکلام' اور 'صحف ابراہیم' یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں (۳) 'وقایع جنگ مرہٹہ' یہ کتاب بہ عہد لارڈ کارنوالس سنہ ۱۲۰۱ھ میں لکھی گئی۔ اس میں سنہ ۱۷۸۵ء (سنہ ۱۱۹۹ھ) تک کے حالات درج ہیں میجر فلر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہی۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا ہی جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی (۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانہ کا ہی مگر چوں کہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہی کہ "من کہ علی ابراہیم خاں یکے از خیر خواہانِ کمپنی انگریز ام" لہٰذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہی (۵) خطوط جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں اور جس سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہی۔

(۶) ایک مجموعہ ہی فارسی مثنویوں کا ردیف وار ضخیم جلدوں میں ۱۲۔ شیرانی)

ہو لیے۔ یہ قدر دانی کے بھوکے تھے۔ قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو انھوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاءاللہ خاں نے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انھیں اپنی گون نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا ع

"میں ہوں ہنسوڑا اور تو، ہو مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بے شک۔ لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رُخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لیے کہ زبان روز بہ روز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شُستہ ہوتی جاتی تھی اور زوال اس لیے کہ فنِ شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لیے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہو، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا، ایک آدھ محاورہ آگیا۔ کسی نئی سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی۔ کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا۔ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لیے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیراتِ ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک

نہیں کہ ان شعرا کی محنت سے زبان صاف ہوگئی لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اُردو کے اُستاد ہیں، مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اُردو ہے مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اُردو میں نہیں۔ کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لیے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی میں۔ اب اُردو کو وسعت ہو تو کیوں کر۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط اس وقت ہندُستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہو۔ اس نے اُردو کی دست گیری کی اور وہ اس لیے کہ ہندُستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جُلنے کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دُوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے اس کا دَور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندُستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لیے انھوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان جان گل کرسٹ کا ہے جس نے اُنیسویں صدی کے شروع میں بہ مقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا۔ جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں ان کی تعلیم کے لیے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر

کی زبان قرار پائی - یہ عجیب واقعہ ہی، اور یاد رکھنے کی بات ہی کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجا ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی - اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی - اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں - حقیقت یہ ہی کہ جدید اُردو نثر کا لکھنا اُسی وقت سے شروع ہُوا اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اُردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گل کرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ؂

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نام ور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا - لہذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہُوا اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا نامناسب نہ ہوگا ؂

اس سلسلے میں سب سے اوّل سید محمد حیدر بخش حیدری قابلِ ذکر ہیں انھوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں 'توتا کہانی' لکھی جو اصل میں انھوں نے 'طوطی نامہ' کو اپنی زبان میں لکھا ہی - 'طوطی نامہ' ابنِ نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہی - 'آرایشِ محفل'، یعنی مشہور قصہ حاتم بھی جو اب تک عوام میں دل چسپی سے پڑھا جاتا ہی انھیں کا لکھا ہوا ہی - ایک کتاب 'گلِ مغفرت' یا 'دہ مجلس' مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہی - فارسی کی مشہور کتاب 'بہارِ دانش'، کا بھی اُردو ترجمہ کیا ہی جس کا نام 'گلزارِ دانش' ہی - ایک اور کتاب 'تاریخِ نادری'، اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہی ؂

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں، انھوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی 'سحرالبیان' (قصّہ بدرِ منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں بیان کیا ہے اور اس کا نام 'نثرِ بے نظیر' رکھا ہے۔ اور ایک اور کتاب 'اخلاقِ ہندی' کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب 'مفرح القلوب' ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں۔

میر امّن دہلوی سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ نادر شاہ درّانی کے زمانے میں جو دلّی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آرہے۔ یہاں سے سنہ ۱۸۰۶ء میں کلکتہ پہنچے۔ 'باغ و بہار' کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب سنہ ۲-۱۸۰۱ء میں لکھی گئی اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلّی کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسروؒ کی 'چہار درویش' ہے۔ میر امّن نے امیر خسروؒ کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس سے پیش تر ایک صاحب عطا حسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسروؒ کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام 'نوطرزِ مرصع' رکھا تھا میر امّن نے 'اخلاقِ محسنی' کے تتبّع میں ایک کتاب 'گنجِ خوبی' بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے علامہ ابوالفضل کی کتاب 'عیارِ دانش' کا ترجمہ اردو میں کیا اور 'خرد افروز' اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور عربی میں 'کلیلہ دمنہ' کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے

اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم وعالمیاں مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے متوسل ہو گئے مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہ جہاں آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ اور تلمذ ان کو میر حیدر علی حیرانؔ سے ہے اور بعض کا قول ہے کہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان بارلو صاحب نے مسٹر گل کرسٹ کے مشورے سے زبان دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا۔ چناں چہ لکھنؤ کے ریزی ڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوسؔ کا انتخاب کیا، اور دو سو رُپے ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانچ سو رُپے خرچ راہ دیا اور کلکتہ روانہ کیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انھوں نے ایک قابلِ قدر کتاب 'آرایشِ محفل' لکھی جس میں ہندُستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سبحان رائے کی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' ہے۔ اور مرنے سے سال بھر پہلے سنہ ۱۸۰۸ء میں سعدیؔ کی 'گلستاں' کا ترجمہ 'باغِ اُردو' کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چندؔ نے سنہ ۱۸۰۴ء میں 'مثنوی گل بکاولی' کو اردو نثر میں لکھا اور نام اس کا 'مذہبِ عشق' رکھا۔

کاظم علی جوانؔ بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انھوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انھوں نے ایک 'بارہ ماسہ' بھی لکھا ہے اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے جس کا نام 'دستورِ ہند' ہے اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علیؔ نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل 'اخوان الصفا' میں سے ایک

رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا جس میں شاہِ جنات کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ من جملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی 'اخوان الصفا' کے اہتمام سے لکھے گئے تھے ؂

سری لالو گجرات کا برہمن تھا جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا، اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً 'پریم ساگر'، 'راج نیتی'، 'لطائفِ ہندی'، ترجمہ یا تالیف کیں۔ 'سنگھاسن بتیسی'، سری لالو اور جوان نے مل کر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے ؂

مظہر علی ولا نے 'بیتال پچیسی' لکھی جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے 'سنگھاسن بتیسی' کے مثل ہے اور نیز ولا کی مدد سے 'قصّہ مادھونال' کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا ؂

علاوہ اس کے خود گل کرسٹ نے سنہ ۱۸۰۱ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے اور مختلف طرح سے اردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گل کرسٹ سے اوّل بھی ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی جو لندن میں سنہ ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چوں کہ وہ بالکل ناکافی تھی جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا جس کے انھوں نے تین حصّے کیے مگر اس کا ایک ہی حصّہ طبع ہونے پایا۔ اس حصّے میں انھوں نے وہ الفاظ لیے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں۔ باقی دو حصّوں کے طبع کرنے کے لیے انھیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصّہ لندن میں سنہ ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گل کرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں۔ مگر ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے۔ اس لیے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے اور ڈاکٹر گل کرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے ؂

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصّہ انگریزی ہندُستانی لغت کا تیار کر کے سنہ ۱۷۹۸ء میں چھاپ دیا۔ مگر دُوسری جلد ہندُستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ ان تمام دقّتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے ایک دقّت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے، صرف ستّر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حال آں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار رُپے کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری اکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی اس کے بعد سنہ ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندُستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظرثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندُستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی جو کلکتہ میں سنہ ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شکسپیر نے ایک اردو لغت سنہ ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسی کتاب کو دُوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت سنہ ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں سنہ ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ برائیس کی لغت سنہ ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی، پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں۔ ان کی ہندُستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے۔ جہاں تک کہ اہلِ زبان نے بھی جو دو ایک لغت

لکھے ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہی بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں ؛

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہی کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دل چسپی تھی اور اس کی ترقی دینے میں انھوں نے حتی الامکان کوشش کی ؛

میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہی اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہی۔ میر کے حال میں لکھا ہی :-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بے چارے مجبول سے محمول ہوئے اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی خالی نہیں ہی، اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست جالی ہی" ؛

غالباً اس جگہ کے لیے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا۔ کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا۔ چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور گھلاوٹ موجود ہی۔ اس لیے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہلِ زبان اُن کی نظم کی طرح اسے سر آنکھوں پر رکھتے اور اُردو زبان میں ایک عجیب اور قابلِ قدر اضافہ ہوتا ؛

نواب محبت خاں محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ذکر میں لکھا ہی کہ :-

"انھوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمایش سے قصہ

دستی پنّوں' کا اُردو میں نظم کیا۔ نام اس کا 'اسرارِ محبت' رکھا۔"
میر قمرالدین کے حال میں درج ہے کہ

"انھوں نے میر محمد حسین 'فرنگی لقب' کے توسّل سے ممتاز یارالدولہ مسٹر جانشین کی سرکار میں توسّل حاصل کیا اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عمادالدولہ گورنر مسٹر ہیستن (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی امانت سے پیش گاہ نظامت صوبۂ بنگال سے ملک الشّعرا کا خطاب لیا۔"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہی کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے بھی اُردو زبان کی ترقّی میں بیش بہا مدد دی۔ سلسلۂ تعلیم کے لیے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا، کتابت اور چھپائی میں خاص اہتمام کیا اور اس میں کار آمد اصلاحیں کیں اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ نظمیں لکھوائیں۔ شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انھیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہال رائڈ کا یہ کام بہت قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہی۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر بل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمنِ ترقّیِ اُردو کی صدارت قبول فرما کر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہی وہ بھی کچھ کم قابلِ شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک قابلِ قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہی اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہی کہ سب سے

اوّل اُردوٗ کتابیں بھی اُنھوں ہی نے چھپوائیں۔ اوّل اوّل فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردوٗ کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گل کرسٹ اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں۔ اس کے بعد لیتھوگراف پریس سب سے پہلے دہلی میں سنہ ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا اور اس کے بعد سے روز بہ روز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی ❖

وہ انگریز حاکم، جس نے اس ملک میں بیٹھ کر جو اُردوٗ کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہی اسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں۔ اور اس عجیب وغریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب وغریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہی، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی فرقے یا کسی خاص ملّت کی نہیں ہی۔ اس پر دُنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہی۔ ہندوٗ اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں اور انگریز اس کے گاڈفادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہی وہ غلطی پر ہیں۔ جب تک ہندوٗ اور مسلمان اور انگریز دُنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قائم رہے گی ❖

افسوس ہی کہ صاحبِ تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے۔ دیباچے میں تو ذِکر ہی نہیں۔ شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہی وہ بھی برائے نام ہی۔ بلکہ دوٗسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہی، البتہ اپنا کلام

بڑے شوق سے نقل کیا ہی، اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہی۔ لہٰذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ اِدھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہی ؂

نام میرزا علی، تخلّص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہاں آباد تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربارِ شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلّص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"میرا ارادہ سیرِ حیدر آباد کا تھا مگر چوں کہ مسٹر گل کرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی اُسے بسروچشم قبول کیا" ؂

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

"آج کے دن تک کہ سنہ ۱۲۱۵ھ اور سنہ ۱۸۰۱ء کے ہیں"؂

اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :۔

"موافق حکم اس صاحبِ والامناقب کے کہ نامِ نامی اسمِ گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہی اس ہیچمداں نے یہ تذکرہ لکھا"؂

اس سے صاف ظاہر ہی کہ یہ تذکرہ مؤلف نے سنہ ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا، اس کے مادۂ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہی کہ کتاب سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی ؎

حیراں پھریں ہیں بے سر و پا بہمن اور دَی
تاریخ اس کی جب سے کہ رشکِ بہشت ہی
۱۲۔		۱۲۲۷		۱۲۱۵ھ

اور غالباً یہی سال اختتامِ تذکرہ کا بھی ہی ؞

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہی کہ اس فرمایش کے بعد نہیں، تو اوّل ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصائد درج ہیں جو انھوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ سنہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے اور مئی سنہ ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے اور سنہ ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ مؤلف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہی یا اہلِ حیدرآباد سے، اس لیے انھوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہی۔ کہتے ہیں ؎

ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

جو قصیدہ انھوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ کی مدح میں لکھا ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے اور دکن میں جاکر ارسطوجاہ کے ہاں ڈیڑھ سو رُپی ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے۔ اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں :؎

کل ہی کی بات ہی یہ مسافر وطن میں تھا ... سَو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار
شکرِ خدا کہ آج یہ یک بینی و دو گوش ... گرچہ دکن میں ہی نہیں ہر در پہ خوار وزار
ہر چند ہی تری ہی عنایت سے یہ سکوں ... لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار
اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہی غرض ... سو یہ ہی اَی امیرِ فلک قدر وکی تبار

سرکار سے تری جو زراہِ تفضّلات ہی ڈیڑھ سو رُپی ترے خادم کا ماہ وار
ہرچند جائے شکر ہی، پر عرض کیا کروں جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار
بے گفتگو پچاس تو اُن ڈیڑھ سو میں سے ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار
خلقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہی پالکی مَیں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار
باقی جو سَو رہے، کئی دن میں زباں پہ پھر مثل مجردات فقط اُن کا ہی شمار
تجھ سا ہو قدردانِ نکات، اور یہ نکتہ سنج یوں ہو اسیر پنجۂ چرخِ ستم شعار
فضل و ہُنر جو مجھ میں ہی وہ سب بہ یک طرف اور قدردانیاں بھی تری سب بہ یک کنار
ہی ہمتِ بلند کا تری جو اقتضا اس امر میں تو ہی تجھے آیندہ اختیار
ازبس کہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے بالفعل تو اضافے کا ہوں گا امیدوار
لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشود کار
تضعیف اصل چاہتا ہی تجھ سے یہ ضعیف کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار
غالب ہی تجھ پہ شاق نہ ہوں میرے تین سو چھ سو جب اُمیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے آخر شعر میں کی ہی، معلوم ہوتا ہی کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہی اور اب تک باقی ہی ٭

اس قصیدے میں شاعر نے تعلّی کی ہی اور ناصر علی کا ذکر کیا ہی کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر ؎

ای شانِ حیدری ز جبین تو آشکار نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

امیر الامرا نے زر و سیم نثار کیا پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہی کہ اس میں کیا رکھا ہی ؎

جز لفظ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار
آئینِ قدردانی میں لیکن برائے نام لازم یہی ہی کر گیا جو خانِ باوقار

اور پھر خود اس مطلب کا جواب لکھتا ہی :-

کہتی ہی فارسی میں مجھے طبع مُطّلع — ہاں درجواب مطلع ناصر علی بیار
ای ذرّہ ہا ز نام تو خورشید اعتبار — تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہی کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہی مگر افسوس ہی کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہی اس میں بھی یہی رونا رویا ہی ؎

پر اتنی عرض ای حاجت روائے خلق ہی تجھ سے — کہ مَیں خواہاں نہیں کچھ مُلک و کوس و طبل و لشکر کا
توجّہ اتنی فرما تو کہ ما مُحتاج کی رؤ سے — نہ ہوں محتاج عند الوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرۂ شعرا 'گلشنِ بے خار' میں لکھتے ہیں کہ:-

"میرزا لطف کچھ دنوں نواحِ عظیم آباد میں بھی رہے ہیں اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں"۔

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں لکھتے ہیں :-

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہی"۔

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مدّاح اور ماننے والے ہیں اور غالبًا اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کردیے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں۔ غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہی مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ ان کا ایسا کارنامہ ہی جو اُردو زبان میں قابلِ یادگار ہی۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہی۔ زبان صاف اور سادہ ہی تاہم قافیے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے درحقیقت یہ قابلِ قدر ہی۔

اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتا لگ سکتا ہے اور محقق علم اللّساں کو، اور نیز اُن لوگوں کو جنھیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چناں چہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرّہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندُستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پُرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال' جو ہم حیدرآباد ہر روز سنتے ہیں اس تذکرے میں بھی جا بہ جا پایا جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں :-

"شورش تخلّص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر پھُنا کر کے تھے۔"

اسی طرح میر قمرالدین منّت کے حال میں لکھا ہے :-

"چناں چہ شکرستان کر کے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بہ طور گلستاں کے مشہور ہے"۔

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں۔ سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے :-

ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا     رہے گا مرگ کے بعد از ہزار میں رونا

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سُنتے ہیں مثلاً فعل متعدّی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے

"دلّی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرائے۔"

فقر کے تذکرے میں لکھتے ہیں :-

"بیش تر دکن بہ طورِ سیاحت کے دیکھے اور اکثر مقاموں میں سیر کی،
وضع پر پھرے"۔

دکن میں عام طور پر "مَیں کہا" بولتے ہیں۔ قائم کہتے ہیں:۔

مَیں کہا، عہد کیا کیا تھا رات ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں۔

۲۔ دُوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلّف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردُو زبان عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مؤلّف اُن کا ہم عصر تھا اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی اور اس لیے جس وثوق اور صحت کے ساتھ، ان کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دُوسرا نہیں لکھ سکتا۔ بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دُوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً ریزی ڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبانِ ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لیے طلب کرنا اور بہ وجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلّف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ اُن کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو انھوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہلِ دنیا کی اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر، جو کہ سحرکاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادُوطرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں پُوچھتا اُس کی آج ہے"۔

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب 'آبِ حیات' میں لکھتے ہیں :-

"جب میر صاحب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپے
مہینہ کر دیا مگر چوں کہ بدمزاج انتہا درجے کے تھے نواب سے بگاڑ
کر لیا اور گھر بیٹھ رہے اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"۔

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ صحیح نہیں کیوں کہ اس میں لکھا ہی کہ :-

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا اور
تین سو رُپے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا،
اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بہ روز صحبت نواب مرحوم سے
بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں
بہادر کے عہد میں آج کے دن تک کہ سنہ ۱۲۱۵ھ ہیں وہی حال
ہی جو اوپر مذکور ہوا"۔

مگر صاحبِ تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ کہنا کہ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہی یا تو مبالغہ ہی یا یہ ہی کہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحبِ تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہی کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہی ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب لکھے ہیں۔ چناں چہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بہ زمانۂ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلّی چھوڑنا باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا اور ان کا سنہ ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دِل بر خاں کی دلیری اور جاں نثاری،

فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتّفصیل لکھا ہی اور اخیر میں کور نمک سنگ دل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہی اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہی جس میں یہ واقعہ منظوم ہی اور خود اُردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہی اس لیے کہ تذکرہ اُردو کا ہی اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہی البتّہ اتنا تکلّف کیا ہی۔ اسی طرح تاناشاہ، آصف الدّولہ اور مرزا محمّد رضا امّید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً مرزا محمّد رضا امّید کے تذکرے میں امیر الامرا حسین علی خاں اور اُن کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کیے ہیں :

۴۔ چوتھے، اس کتاب سے اُس زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہی اور یہ بات تو صاف نظر آتی ہی کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا اور دُنیا و مافیہا کی اُنھیں کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ نواب اور امراء اس طرف جُھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، ان لوگوں نے رہا سہا انھیں اور کھو دیا، مُلک گیری اور مُلک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لیے اولوالعزمی اور ہمّت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرّت کہاں! البتّہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی شعر و شاعری نے اس کا سامان اور مہیّا کر دیا "دیوانہ را ہوئے بس است" شاعروں کی بن آئی۔ وہ تو اس شغل میں رہے اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذّب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لیے بڑے بڑے اہتمام کیے جاتے تھے، اس کے خاصّ خاص آداب تھے۔ بڑے بوڑھے، جوان، بچّے سب ہی شریک ہوتے تھے۔ باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی

تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور تُھو تُھو کا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے۔ جو شعرا کے لیے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے شاگرد ہو گئے اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لیے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔ مَیں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور اَدبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی کیا حالت ہوگی۔

علاوہ اس عام حالت کے تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ نواب وزیر اودھ اس زمانے میں بھی جب کہ ان کا عروجِ اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ شاہانِ دہلی اور ان کے گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل ہمارے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چناں چہ مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۹۸ھ میں دلّی سے لکھنؤ چلے آئے تھے:۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب خدمت گزاری کے تھے سب ادا کیے، خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجراگاہ پر سے جاکر آداب بجا لاتے تھے۔"

۵- پانچویں- بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا- مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے اور ان کا تخلص اشتیاق تھا، یا عبدالقادر بے دل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے یا تاناشاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی میں ہے بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے، جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دست یاب نہیں ہوتا- شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرۂ 'آبِ حیات' میں لکھتے ہیں :-

"ایک موقعہ پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چناں چہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے- مَیں نے یہ مثنوی دلّی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی اب ملتی نہیں لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں"۔

حُسنِ اتّفاق سے صاحبِ تذکرہ نے اِس مثنوی کا وہ حصّہ، جس میں فیض آباد اور لکھنؤ کی ہجو ہے میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے، ناظرین کو لکھنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا ؎

زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے ‏ ‏ ‏ اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے

اس مثنوی کا نام 'گلزارِ ارم' تھا- میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے۔ خواجہ میر درد کے بھائی میاں سیّد محمد میر اثر کی مثنوی 'خوابؔ و خیال'[1]

---

[1] اب انجمنِ ترقیِ اردو نے یہ مثنوی شایع کر دی ہے۔

اب تک سُنی ہی سُنی تھی، اس کے چند شعراثر کے حالات میں درج ہیں۔ شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلۂ ذیل نوٹ لکھا ہے جو کتاب کے صفحہ ۳۲ پر درج ہے:-

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اُس کا طرز اڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"۔

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حال آں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ میر انیس کی شاعری کی اُس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی 'موازنۂ دبیر و انیس' میں انھیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پہ رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حال آں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشو و نما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار

یا کتب کا ذکر آگیا ہے اور اس میں دلّی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمۂ 'دیوانِ حالی' میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہلِ وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سُننے کے شایق ہیں، تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فنِ تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے جو صرف ذوقِ سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بُت جنھیں وہ مدّت سے پُوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل ہو گئے اور ڈھے گئے۔ زیادہ تر یہ خیال 'گلزارِ نسیم' کی نکتہ چینی سے پیدا ہوا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لیے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس رُتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے، مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پُوری قلعی کھُل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے بہت کم تعلق ہے۔ مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انھوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہہ دیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں :

اوّل تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں۔ چناں چہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرۂ 'گلشنِ بے خار' میں لکھتا ہے :-

"مثنوی ای شاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحث اوست ازیں جہت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد 'آبِ حیات' میں کہتے ہیں کہ

"ایک مثنوی خواب و خیال اُن کی مشہور ہی اور بہت اچھی لکھی ہی"۔

دُوسرے اُن کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہی، کیوں کہ اس میں 'درد' زبان کی صفائی، شیفتگی اور لطافت بہ درجۂ کمال موجود ہی اور یہ سب باتیں مثنوی کے لیے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحبِ تذکرہ نے غضب یہ کیا ہی کہ مثنوی کا وہ حصّہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہی کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا یا اُس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہی، اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہی، اس لیے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہی۔ صاحبِ تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہی، مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہی لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہی کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اچھا شاعر ہی لیکن اس کا کیا جواب ہی کہ جو شعر خواجہ اثر کا یہ تبدیلِ لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہی یعنی ؎

اثر　ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا　　کھُلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
شوق　ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا　　چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہی کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا اُن کے بعد نواب مرزا شوق۔ اگر یہ شعر اُن کا ہی تو یہ کہنے کی پوُری وجہ ہی کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہی، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں :-

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تفاوت سے 'بہارِ عشق' میں موجود ہیں"

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں 'خواب وخیال' کو 'بہارِ عشق' سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"

آخر اس میں تو ظاہراً ایک حد تک کچھ گنجائش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید 'گلزارِ نسیم' کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جو پنڈت چکبست صاحب نے اپنے دیباچۂ 'گلزارِ نسیم' میں بطورِ سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحبِ ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوقِ سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے، ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لیے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لیے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

چھٹے صاحبِ تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جس میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً شاہ[1] ولی اللہ صاحب

---

[1] صاحب تذکرہ شاہ ولی اللہ اشتیاق کے حالات اس نہج سے لکھے ہیں جس سے یہ دھوکا ہوا کہ اس کی مراد دلی کے نامور محدث شاہ ولی اللہؒ سے ہے۔ اب تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ شاہ ولی اللہ ایک دوسرے صاحب ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ دلی میں رہتے تھے اور متوکل درویش تھے۔ ان کی جن تصانیف کا ذکر اس تذکرہ میں کیا گیا ہے۔ اُن کا کہیں پتہ نہیں لگا۔ (ملاحظہ ہو نکات الشعراء صفحہ ۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

کی نسبت لکھا ہی کہ :-

" قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسین' اور 'جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ'
اُن کی تصانیف سے ہیں":

حال آں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہی، نہ شہادتِ حسنین رض کا ابطال کیا ہی نہ مناقبِ معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہی، یہ محض اتہام ہی، اس کے بعد یہ کہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز رح کے خوب ہجو بلیغ کی ہی اور آخر میں یہ لکھا ہی :-

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہی، فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار، بہ قولِ شاعر کے :

شیر کے بچے ہیں غرش شیر سے اژدرہ ہی		بھونکیں ہیں کتّے کی بلّی میں سگی موجود ہی

یا مظہر جانِ جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۱۹۴ھ تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدّیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلودِ دنیا سے منھ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا":

یا تاناشاہ کے حالات میں مؤلف عالم گیر کی نسبت یوں گوہر افشانی کرتا ہی کہ :-

"خلد مکاں نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا۔ خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہی":

مکہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہی۔ تعجب ہی کہ مؤلف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہی، اس کذب کو لکھنا کیوں کر گوارا کر لیا۔ ہمیں

شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے اور اب تک نظرِ بد سے محفوظ ہے۔ لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگزر نہیں کرتا۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں ان کی داد و دہش اور مروّت کی بے انتہا بھٹئی کی ہے۔ لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے :-

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کے طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا"۔

یا سراج علی خاں آرزوؔ نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیںؔ کے کلام پر کی ہے اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ :-

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے"۔

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلّی کے تھے۔ دلّی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اُردو نے اس میں جنم لیا وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے زمانۂ قدیم سے محسودِ آفاق اور مرجع خلایق رہا۔ کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دھانی کبھی سلاطینِ اسلام کا دار الخلافت۔ کبھی طغیانی کی بدولت یہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا۔ کبھی معرکۂ جنگ و جدل و قتلِ عام ہے اور کبھی گھر گھر دن روز عید اور رات شب برات ہے۔ کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے کبھی موردِ

بلیّات و آفات ہی اور کبھی منزلِ حسنات و برکات۔ غرض یہ نگری یونہیں اُجڑتی اور بستی بگڑتی اور بنتی رہی مگر باوجود اس کے اس کے حُسنِ عالم افروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی۔ لیکن آخر زمانے میں جب سلطنتِ مغلیہ میں انحطاط و زوال کی علامات پیدا ہو گئیں تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا ؂

سب سے اول نادر شاہ کے حملے کا ایسا تھپیڑا لگا کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا۔ اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درّانی کی چڑھائی، پھر مرہٹوں نے وہ ادھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا۔ اب تک جو باکمال دلّی میں پڑے وضع داری نباہ رہے تھے، ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹِک سکے، سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں :۔

"جن ایّام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہلِ کمال سے اور کثرت منتخبانِ عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنّت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکوُن کا تنگ اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا جب کہ متواتر نزولِ آفات کے باعث اور مکرّر ورودِ بلیّات کے سبب خراب ہوا اور مصدرِ عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک گوشہ نشین نے اور ہر ایک صابر زاویہ گزین نے اور ہر ایک تونگر مال دار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا مگر وہ ستودہ الاعتبار، کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمانِ استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں اور حامل جفاؤں کے ہوئے اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ

اپنے کنجِ عزلت سے نہ گئے۔"

ایسے وقت میں شاعر بے چارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضع داروں اور متوکلوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں سے اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا۔ آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا۔ اہلِ کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اُٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے اس کے بعد سودا تشریف لے گئے۔ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے سنہ ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی اور میر حسن، میر سوز، جرأت سب لکھنؤ میں جا بسے اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آ گئی۔ اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا اثر ہوا اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے، مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خاں کے متعلق کوئی بات معلوم ہو گی۔ اور کم سے کم اس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے مگر یہ تذکرہ سنہ ۱۲۱۵ھ تک ہے میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے یا اُسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اس سال (سنہ ۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کیا ہے۔ صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ :۔ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے"، مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے

تھے اور آزاد نے کس سے سُنا۔ 'آبِ حیات' میں بعض بعض جگہ وہ 'مجلسِ رنگیں' کا حوالہ دیتے ہیں، مگر 'مجالسِ رنگیں' میں اس واقعے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے 'مجالسِ رنگیں' بھی سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی۔ میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے اور چوں کہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لیے یوں بھی اس میں نہیں ہوسکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کردیتے۔

مؤلف نے اپنے دیباچے میں بیان کیا ہے:-

"یہ کتاب ہم نے دو حصّوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصّہ ہے جس میں سلاطین نام دار امرائے عالی مقدار اور شعرائے صاحب وقار کے حالات لکھے گئے ہیں دوسری جلد میں غیر مشہور شعراء کا تذکرہ ہوگا۔"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مؤلف نے شعراء کا کلام جو بہ طور انتخاب کے درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کردیا ہے، صرف اعلیٰ درجے کے اشعار رکھے ہیں۔ مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا اُن کے کلام کو بہ جنسہٖ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دیے تھے اس میں بھی انتخاب کردیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا اور جو لوگ اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

# مقدمۂ تذکرۂ ہندی'

اُردو شاعری کا ستارہ اُس وقت چمکا جب سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب اقبال گہنا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری ایک پیشہ ہوگئی اور اُس عہد کے باکمال سخن وَر اپنے متاعِ ہُنر کو در بہ در لیے پھرتے تھے کہ شاید کوئی قدردان مِل جائے مصحفی اِن سب میں زیادہ بدنصیب تھا۔

نام غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابنِ درویش محمد، مصحفی تخلّص[1]، وطن امروہہ اور مولد اکبر پور[2]۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنے تذکرے میں سنِ پیدائش ۱۱۶۴ھ لکھا ہی لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا مصحفی اپنے تذکرہ 'ریاض الفصحا' میں اپنے حالات کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر ۸۰ برس کی ہی۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور سنہ ۱۲۳۰ھ میں اختتام کو پہنچا۔ اس حساب سے اُن کی پیدائش سنہ ۱۱۴۱ھ اور سنہ ۱۱۵۶ھ کے درمیان واقع ہوتی ہی۔

ابتدائی تعلیم مکتب میں امروہہ میں ہوئی اس کا اشارہ انھوں نے سید محمد زمان زمان تخلّص ساکن امروہہ کے حال میں کیا ہی[3]۔ اسی ضمن میں اپنے اُستاد کا بھی ذِکر

---

[1] 'تذکرہ ہندی گویاں' صفحہ ۲۴۷

[2] 'تذکرۂ میر حسن' صفحہ ۱۹۰

[3] 'تذکرۂ ہندی گویاں' صفحہ ۱۱۰۔ نیز دیکھو صفحہ ۲۲۷ حال محزوں؛ صفحہ ۱۳۰ حال شہید (تذکرۂ ہندی گویاں)

کر گئے ہیں لیکن نام نہیں لکھا۔ اصل تعلیم دلّی میں ہوئی۔ چناں چہ ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں کہ فارسی اور اس کی نظم و نثر کی تکمیل تیس سال کی عمر میں شاہ جہاں آباد میں ہوئی۔ جن دنوں میں جلا وطن ہو کر اس دیار میں تازہ تازہ پہنچا تو علم عربی یعنی طبیعیات، الٰہیات اور ریاضی مولوی مستقیم ساکن گوپامئو شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلما سے حاصل کی اور میبذی اور صدرا پڑھا۔ قانونچہ کا درس مولوی مظہر علی سے لیا جو صرف و نحو میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں عربی ادب اور تفاسیرِ قرآن مجید کا مطالعہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ عربی سے نابلد ہونے کا جو نقص تھا وہ میں نے اس شہر میں پہنچ کر رفع کر دیا۔ دوسرا نقص علمِ عروض و قافیہ کی ناواقفیت تھی۔ اس کی تلافی بھی میں نے چند روز اساتذہ کی تصانیف کا مطالعہ کر کے کر لی اور خود اس فن میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام 'خلاصۃ العروض' تھا۔

مصحفی نے اپنے اُستاد کا کہیں نام نہیں بتایا اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا ہے کسی اور تذکرے میں بھی اُس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ البتّہ صاحب 'سراپا سخن' نے ان کے اُستاد کا نام امانی لکھا ہے لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ کون تھے، کہاں کے رہنے والے تھے اور کس قماش کے شخص تھے۔

اس پر سب تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ ابتدائے شباب ہی میں وہ دلّی چلے آئے تھے، وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور وہیں ان کی شعر و شاعری چمکی۔ دلّی سے انھیں خاص محبت تھی، اس کا ذکر اپنے تذکرے میں جگہ جگہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ وہاں کے مشاعروں، ملاقاتوں اور یارانِ عزیز کا ذکرِ خیر آپ اس تذکرے میں جا بہ جا پائیں گے۔[۵]

دلّی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی — میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

یہ وہ زمانہ تھا کہ گئی گزری حالت پر بھی دلّی کا ہونا یا دلّی سے منسوب ہونا یا

---

۵ ص ۵۴

دہاں کی بود و باش، تہذیب و شائستگی اور زبان دانی کا تمغہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی بنا پر تو انھوں نے اپنے بعض حریفوں پر چوٹ کی ہی:

بعضوں کا گماں یہ ہی کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلّی نہیں دیکھی ہی زباں داں یہ کہاں ہیں

مصحفی نے اپنے بزرگوں کا پیشہ "نوکریٔ خانۂ بادشاہ" لکھا ہی لیکن جب سلطنت کے کاروبار میں خلل واقع ہوا تو ان کا روزگار بھی درہم برہم ہوگیا۔ میرحسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ان کی بسر اوقات تجارت[51] پر تھی۔ مصحفی نے اپنے حال میں اس کا کہیں ذِکر نہیں کیا لیکن دلّی کے قیام کے ذِکر میں جو چند جملے ضمناً ان کی قلم سے نکل گئے ہیں اس سے یہ قیاس ہوتا ہی کہ میرحسن کا یہ خیال صحیح ہی کہ اُس زمانے میں اُن کی گزران تجارت ہی پر تھی۔ لکھتے ہیں:۔

"میں شاہ جہاں آباد میں بارہ سال تک دورِ نواب نجف خاں مرحوم میں گوشۂ عزلت میں رہا اور اس افراتفری کے زمانے میں تلاشِ معاش کے لیے کسی کے دروازے پر نہیں گیا[52]"۔

اس سے قیاس ہوتا ہی کہ دلّی میں وہ اپنی معاش اپنے دست و بازو سے کماتے تھے اور کسی کے دستِ نگر نہ تھے۔

اگرچہ بہ قول خود وہ دہلی میں بارہ سال تک عزلت گزیں رہے لیکن اس پر بھی مشاعروں کی شرکت، شعر و شاعری کا چرچا برابر جاری رہا اور خود بھی اپنے ہاں مشاعرے ترتیب دیتے رہے[53] اور اس وقت بھی ان کی شاعری اس درجے کی سمجھی جاتی تھی کہ لوگ ان کے شعر سُننے کے لیے ان کے مکان پر حاضر ہوتے تھے[54]۔

---

[51] تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۹۰۔ سپرنگر نے بھی بہ حوالہ عشقی اس کی تائید کی ہی۔
[52] تذکرۂ ہندی گویاں صفحہ ۲۴۔
[53] تذکرۂ ہندی گویاں، حال آسد صفحہ ۱۶، امین صفحہ ۲۰، فراق صفحہ ۱۵۷، اشتیاق صفحہ ۲۱، محشر صفحہ ۲۴۴، نالاں صفحہ ۲۶۱، نصیر صفحہ ۲۶۱، ہاتف صفحہ ۲۷۰، نیز دیکھو عمدہ منتخبہ و مجموعۂ نغز۔
[54] دیکھو تذکرۂ ہندی گویاں ذکر عاقل صفحہ ۱۵۱۔

دلّی کا رنگ بدلا ہوا تھا، حالات ناسازگار تھے، بسرِ اوقات کے ذرائع تنگ ہو رہے تھے، ناچار اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح دل پر پتھر رکھ کر دلّی کو خیرباد کہا اور وادیٔ غربت میں قدم رکھا۔ دلّی کی حالت اس وقت کیسی ہی ہو، اس کا چھوٹنا کچھ آسان نہ تھا۔ وطن تو خیر سب ہی کو عزیز ہوتا ہے مگر اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ باہر سے بھی جو لوگ وہاں آ گئے تھے انھیں وہ وطن سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ پیٹ بڑا ظالم ہے اُس کی خاطر یہ مفارقت بھی گوارا کرنی پڑی۔ لیکن مرتے دم تک اُس کا داغ دل سے نہ مٹا اور جب تک رہے اور جہاں رہے اُس کی صحبتوں اور خوبیوں پر مٹے رہے۔ اس مقام پر ایک بات غور و تامّل کے قابل ہے۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے (مثلاً فرخ آباد، عظیم آباد اور خاص کر لکھنؤ) وہاں والوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا، عزّت و حرمت سے پیش آئے، آسایش پہنچائی، مسافر نہیں مہمان عزیز سمجھا اور وہ خدمت کی کہ غربت کی کلفت دلوں سے محو ہو گئی۔ آج کل کا سا حال نہ تھا کہ کوئی بھولا بھٹکا باکمال آ گیا تو سمجھے کہ غنیم چڑھ آیا۔

مصحفی دلّی سے آنولہ اور ٹانڈہ پہنچے ؎

جب مے کدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ٹانڈے میں نواب محمّد یار خاں امیر خلف نواب علی محمّد خاں، صاحبِ ذوق اور قدر شناس امیر تھے، شاعروں کا ان کے ہاں اچھّا خاصا جمگھٹا تھا۔ فدوی لاہوری، میر محمّد نعیم نعیم، پروانہ علی شاہ، پروانہ، میاں عشرت، حکیم کبیر، محمّد قائم وغیرہ مجلسِ شعر و سخن کے رونق افروز تھے۔ میاں مصحفی بھی شریکِ صحبت ہو گئے۔ نواب نے میر سوز اور مرزا محمّد رفیع سودا کو بھی خط لکھ کر بھیجا اور اپنے ہاں بلایا، وہ اُس زمانے میں مہربان خاں رند کی سرکار میں ملازم تھے فرخ آباد کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ لیکن یہ مجلس زیادہ مدّت جمنے نہ پائی۔ سکرتال کی

لڑائی (سنہ ۱۱۸۵ھ) میں نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم نے مرہٹوں کی امداد سے ایسی شکست دی کہ ٹانڈے کی امارت درہم برہم ہوگئی۔ بے چارے فلک زدہ شاعروں کا وہاں ٹھکانا نہ رہا اور منتشر ہوگئے۔

مصحفی ٹانڈے سے سنہ ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ سودا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سے اور بعض مشہور شعرا سے ملاقات ہوئی۔ ابھی سال بھر ہی رہنے پائے تھے کہ طبیعت اُچاٹ ہوئی اور پھر دلی کا رُخ کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی سرپرست اور قدردان نہ ملا اور روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی۔ لیکن دلی میں کیا رکھا تھا، حالت پہلے سے بھی بدتر تھی۔ آخر تھوڑے دنوں کے بعد ہی دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ پہنچ کر چند روز صبا (لالہ کانجی مل، کایستھ، سکسینہ) کے ہاں قیام رہا[1]۔ اس کے بعد چندے میر محمد نعیم خاں کی رفاقت میں رہے[2]۔ پھر مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈھو سرسبز تخلص (فرزند نواب سالار جنگ) نے جو اُردو شاعری کے بڑے دل دادہ تھے بہ سلسلۂ شاعری اپنی رفاقت و مصاحبت میں لے لیا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ بڑی عزت سے پیش آتے تھے اور شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ چار سال تک یعنی سنہ ۱۲۰۵ھ تک انھیں کے پاس رہے[3]۔

دلی کے شاہ زادے شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی اور سارا ٹھاٹ وہی قائم کر رکھا تھا۔ دلی سے جو جاتا پہلے ان کی سرکار میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈتا۔ شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور شعرا اور اہلِ کمال کے قدردان تھے۔ انشا، جرائت، سوز، مصحفی وغیرہ انھیں کے دربار میں ملازم تھے یا

---

[1] 'تذکرۂ ہندی گویاں' صفحہ ۱۴۱　[2] تذکرۂ ہندی گویاں صفحہ ۲۵　[3] 'تذکرۂ ہندی گویاں' صفحہ ۱۸

انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ بارہ سو سات آٹھ ہجری میں مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار میں داخل ہوئے[1]۔

ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت وغمازی اور ساز و باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے۔ ہر منھ چڑھا مصاحب دوسرے کے اُکھاڑنے اور اپنے جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیّاریاں اور افترا پردازیاں، فقرتیں اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشا، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اوّل اوّل شاعرانہ چشمک رہی۔ بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشا نے وہ وہ کیچڑ اُچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ سید انشا بے حد ظریف، ٹھٹھول اور بے چین طبیعت کے تھے اور اس پر ذہانت اور غضب تھی۔ مصحفی پختہ اور پرانے اُستاد تھے۔ ساتھ شاگردوں کا لشکر تھا۔ انشا کی زیادتیاں گوارا نہ ہوئیں۔ ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی۔ صاحب عالم کی نظریں ان کی طرف سے پھر گئیں۔ تنخواہ میں بھی تخفیف ہوئی۔ اور آخر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ اپنی تنخواہ کا ذکر کس حسرت سے کیا ہے: ؎

چالیس برس کا ہی ہی چالیس کے لایق  
تھا مردِ معمّر کہیں دس بیس کے لایق

ای وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے  
ہم بھی کبھی روزوں میں تھے پچیس کے لایق

اُستاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر  
ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لایق

---

[1] آزاد نے جو یہ لکھا ہے کہ مصحفی پہلے سے دربار میں تھے اور انشا بعد میں آئے صحیح نہیں۔

مصحفی طبیعت کے بہت نیک اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ اُن کے ہم عصر تذکرہ نویسوں نے ان کے مزاج اور اخلاق کی بہت تعریف کی ہے اور اُنھیں خلیق، متواضع، مسکین وضع، مسکین نہاد اور نیک سیرت لکھا ہے۔ وہ کبھی درباری شاعروں سے نہ اُلجھتے۔ لیکن جب دوسری طرف سے چھیڑ شروع ہوئی تو اس کے جواب میں خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ کچھ تو شاعری کا گھمنڈ کچھ درباری حالات اور اس پر شاگردوں کی شہ نے معاملہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

یہ حالات اُس زمانے کی معاشرت پر دھندلی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

مصحفی کی زندگی پریشان حالی، تنگ دستی اور عسرت میں گزری۔ اگرچہ کئی امیروں کی رفاقت اور صحبت رہی اور شاگرد بھی اُن کے کثرت سے ہوئے جن میں بڑے بڑے لوگ بھی تھے مگر کبھی فراغ بالی اور معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہ ہوا۔ علی لطف صاحبِ 'گلشنِ ہند' نے ان کے احوال میں صحیح لکھا ہے"...... برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے۔ عنیقِ معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب اہلِ کمال ہے۔ اسی طور پر درہم برہم اس غریب کا بھی احوال ہے"۔ آخر میں یہ حال ہوگیا تھا کہ یا تو سعادت مند شاگرد اُن کی مدد کرتے تھے یا غزلیں بیچ بیچ کے اپنی بسر اوقات کرتے تھے۔ اس طرح کلام کا بہت سا حصہ دوسروں کی قسمت میں آگیا۔

مصحفی نے عمر بھی بہت پائی۔ پُرانے اُستاد جنھوں نے اُردو کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور نئی پود جس نے آگے چل کر بڑا نام پایا، سب کو دیکھا، پرکھا اور اکثر ان کے سامنے چل بسے۔ وفات کا صحیح سن معلوم نہ ہوسکا۔ تذکرۂ 'ریاض الفصحا' جس کا سنِ اختتام سنہ ۱۲۳۶ھ ہے لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر اسّی سال کی

---

[1] دیکھو ذکرِ مصحفی 'تذکرۂ قدرت اللہ شوق'، 'تذکرۂ قدرت اللہ قاسم اور عمدۂ منتخبہ' میں

ہے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ آج کے دن مصحفی کو مرے دس سال ہوتے ہیں۔ یہ تذکرہ سنہ ١٢٥٠ھ میں لکھا گیا۔ اس حساب سے ان کا سنِ وفات ١٢٤٠ھ ہوا اور عمر چوراسی سال کی[1]

مصحفی کے اُستاد ہونے میں شبہ نہیں۔ بڑے مشّاق اور ریختہ گو شاعر تھے۔ آٹھ دیوان، متعدد قصائد اور مثنویاں ان کی تصنیف سے اب تک باقی ہیں۔ علاوہ اس ضخیم کلام کے شعرا کے تین تذکرے بھی ان کی بڑی یادگار ہیں. جو اب تک گُم نامی میں پڑے ہوئے تھے۔

سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے جس کا نام 'عقدِ ثریا' ہے۔ اس میں تین قسم کے شعرا کا ذکر ہے۔ اوّل شعرائے ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے۔ تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر۔ دوسرا تذکرہ اُردو کہنے والے شاعروں کا ہے۔ تیسرے تذکرے کا نام 'ریاض الفصحا' ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے اُن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔

ان تینوں میں تذکرہ نمبر ٢ یعنی 'تذکرۂ ہندی' اصل ہے، باقی دو کو اُس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ یہ تذکرہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی فرمایش سے تحریر میں آیا اور عہدِ فردوس آرام گاہ (محمد شاہ بادشاہ) سے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے تک کے شعرا کا حال درج ہے۔ بعض متقدم شعرا کے حالات تیمّناً لکھ دیے گئے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں معاصرین ہی کا ذکر ہے[1]

مصحفی کا زمانہ معمولی نہیں تھا۔ یہ اُردو زبان کی ترقّی و فروغ کا نہایت ممتاز دَور ہے۔ اگرچہ فارسی کا رواج عام تھا۔ مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی

---

[1] 'تذکرۂ ہندی گویاں' صفحہ ٣ و ٤

تعلیم برابر جاری تھی۔ فارسی کا پڑھنا علم و فضل ہی کے لیے نہیں بلکہ تہذیب و شائستگی کے لیے لازم خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ فارسی شعر و سخن کے ایسے ہی دل دادہ تھے جیسے اکبر و جہاں گیر کے زمانے میں۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یہی تذکرے جو اُردو شاعروں کے لکھے گئے فارسی میں ہیں لیکن اُردو زبان رفتہ رفتہ زور پکڑتی جاتی تھی اور مصحفی کے زمانے میں تو اُس نے یہ قوت حاصل کر لی تھی کہ ہمارے مستند شاعر فارسی کو چھوڑ کر اُردو کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ خود مصحفی جو فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی کے دو دیوان مرتب کر چکے تھے جن میں سے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں ہے، اپنے حال میں لکھتے ہیں "بہ مقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے این کہ رواجِ شعر فارسی در ہندستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زمانا بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ (بلکہ از و بہتر گردیدہ)[1]" اس سے بڑھ کر کوئی اور مستند شہادت نہیں ہو سکتی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس دَور میں اُردو کے ایسے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں جن کی بدولت اُردو نے وہ فروغ حاصل کیا کہ ہندستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اُردو میں لطافت و شیرینی، قوت اور وسعت پیدا کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اُن کی زبان اور کلام کا اثر اب تک باقی ہے اور باقی رہے گا؀

مصحفی کی حاتم سے لے کر نصیر دہلوی تک ذاتی ملاقات تھی۔ بعض ان میں سے بزرگ تھے جیسے حاتم، خواجہ میر درد، میر، سودا، فغاں وغیرہ، بعض ہم عمر اور ہم عصر تھے مثلاً قایم، جراءت، سوز، بقا، انشا، حسن، حسرت وغیرہ بعض نومشق تھے اور نام پیدا کر رہے تھے جیسے آتش، ناسخ، نصیر، رنگین،

---

[1] تذکرۂ ہندی گویاں صفحہ ۲۴۸۔ قوسین کے الفاظ ایک نسخے میں ہیں دوسرے میں نہیں؀

ممنون، طپش، خلیق، افسوس وغیرہ وغیرہ۔ شاگرد بھی مصحفی کے اس کثرت سے تھے کہ پُرانے اساتذہ میں شاید ہی کسی کے ہوں۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:[1]

شاگردِ تازہ از پسِ شاگردی رسد یعنی رجوعِ خلق بہ سویت ہماں کہ بود

ان میں سے بعضوں نے بہت نام پایا مثلاً ضمیر، خلق، رنگین، پروانہ، تنہا اور منتظر اور گرم دونوں ان کے خاص اور عزیز شاگرد تھے۔ اکثر کا حال ان تذکروں میں موجود ہے۔ ان تذکروں میں اکثر شعرا ایسے ہیں جن سے مصحفی ذاتی طور پر واقف تھے یا ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن کو نہیں جانتے تھے اُن کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ میں نہیں جانتا۔

مصحفی نے اپنے تذکرے صاف اور سیدھی زبان میں لکھے ہیں، تکلف اور تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا۔ کہیں بے جا طول نہیں دیا، جو حالات جس کسی کے معلوم تھے مختصر طور پر صاف صاف لکھ دیے ہیں۔ انھیں حالات کے ضمن میں کہیں کہیں اس زمانے کی شعر و شاعری اور اُردو ادب کے اُتار چڑھاؤ کی کیفیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً حاتم کے ذکر میں اُن کی زبانی ولی کے دیوان کا شاہ جہاں آباد میں آنا، لوگوں میں اُس کا چرچا ہونا، بعض صاحبوں کا ایہام گوئی پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھنا چند سطروں میں خوبی سے بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ حاتم کی بزرگی اُن کے دیوان زادے اور جگت اُستادی کا تذکرہ بھی اپنے انداز میں خوب لکھا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں مشاعروں کی حالت، اپنے مشاعرے کا ذکر بعض نام ور اور ہم عصر شعرا کی ملاقات کا حال جگہ جگہ لکھتے گئے ہیں۔ ایک جگہ مشاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ تجربے میں آیا ہے کہ ایسی مجلسیں ایک سال سے زیادہ نہیں رہنے پاتیں۔ ضرور کوئی نہ کوئی تفرقہ اور خلل پیدا ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] حال شیخ مغل خانی (تذکرۂ ثانی)

وہ اپنے تذکروں میں شعرا کے کلام کے متعلق رائے لکھتے ہیں۔ لیکن اُس میں تنقیدی حیثیت بہت کم ہوتی ہو۔ تاہم بعض نام وَر شعرا کے متعلق ان کی رائیں خاص وقعت رکھتی ہیں۔ مثلاً سودا کے تذکرے میں اگرچہ پورا ایک صفحہ بھی نہیں لکھا لیکن جو کچھ لکھا ہو اُس میں ان کے کمال اور سیرت کی تصویر کھینچ دی ہو۔ نکتہ چینوں کے اعتراضات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "غرض ہر چہ بود، در روانیٔ طبع نظیر خود نہ داشت" اور آخر میں کہتے ہیں "نقاشِ اوّلِ قصیدۂ در زبان ریختہ اوست، حالا ہر کہ گوید پیرو و متتبعش خواہد بود"۔

مظہر جان جاناں کی نسبت فرماتے ہیں کہ "در دورِ ایہام گویاں اوّل کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست"، آخر میں لکھتے ہیں "فی الحقیقت نقاشِ اوّل ریختہ بہ ایں وتیرہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است، بعدہٗ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ"۔

سودا سے مقابلہ کرنے کے بعد جس کا رواج اُس وقت عام تھا اور جس کا اثر اب بھی باقی ہو۔ میر صاحب کی نسبت فرماتے ہیں "غرض ہر چہ ہست اُستادیٔ ریختہ بر دِ مسلم است ہمہ ریختہ گویانِ ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنیٰ می دانند والحق چنیں است"۔

یقین کے کلام کے متعلق بھی قریب وہی رائے ظاہر کی ہو جو مظہر جان جاناں کے حق میں لکھی ہو۔ آخر یقین ہیں تو مظہر ہی کے تربیت یافتہ۔ کہتے ہیں کہ "در دورۂ ایہام گویان اوّل کسے کہ ریختہ راشتہ و رفتہ گفتہ ایں جواں بود، بعد ازاں تتبعش بہ دیگراں رسیدہ"۔

مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے میر حسن کی مثنوی کی سچی تعریف کی ہو۔ "در مثنویِ آخر کہ 'سحر البیان' نام دارد ید بیضا نمودہ۔ الحق کہ کار کارِ اوست۔ قطع نظر از بلاغتِ شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ"۔

ہم عصروں کے کلام کے متعلق صحیح رائے کا ظاہر کرنا آسان نہیں، اور خاص کر ایسے لوگوں کے متعلق جن سے آویزش اور چشمک رہی ہو۔ انشاء اللہ خاں اور ان میں کیا کچھ نہیں گزری تھی اور ان بزرگوں نے کون سی بات تھی جو اٹھا رکھی تھی اس پر بھی جب وہ انشا کا حال لکھنے بیٹھے تو سچی تعریف اور بے لاگ رائے ظاہر کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن کی سہ زبانی اور خاص کر فارسی دانی کی تعریف کی ہے۔ انشا نے مثنوی 'شیر برنج' مولانا بہاء الدین آملی کی مثنوی 'نان وحلوا' کے جواب میں لکھی اُس کی نسبت لکھتے ہیں "بسیار بہ صفا گفتہ و داد فصاحت زبانِ فارسی وردادہ"۔ اُن کے اردو کلام کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہے" اگرچہ ہمہ کلامش در عالم ظرافت، خالی از کیفیتے نیست اما انچہ از اشعار سادہ اش انتخاب فقیر افتادہ این ست" ان کے کلام کا انتخاب بھی بہت اچھا کیا ہے۔ انتقال کے بعد بھی انھیں یاد کیا ہے ؎

مصحفیؔ کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں		یاد ہے مرگِ قتیلؔ و مردنِ انشاؔ مجھے

بقاؔ سے مصحفیؔ کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اس کے خُلق و ظرافت اور قناعت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کلام کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ "در قصیدہ یدِ طولیٰ دارد اما در گفتن غزل لطفی است"۔

آتشؔ ان کے شاگرد تھے، اُن کے متعلق کیا صحیح رائے دی ہے" اگر عرشِ وفا کردہ و چندیں سال برہمیں وتیرہ رفت و فکر متینش را مانعے در پیش نیاید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد"۔

رنگینؔ بھی ان کے شاگرد تھے کیا خوب کہا ہے کہ" ہر چند چنداں بہرہ از علم ندارد اما ذکاوت طبعش بر صاحب علمان غالب"۔ رنگینؔ نے اپنا دیوان اصلاح کے لیے پیش کیا۔ شروع سے آخر تک دیکھ کر فرمایا" کلامش

بسیار کم اصلاح برآمدہ" اصل رائے یہ ہی "چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہ ہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشید"۔

ناسخ کی نسبت ایک جگہ فرماتے ہیں "تلاش ہائے معانی تازہ می کند" ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "بہ معنی بندیٔ تازہ علمِ استادیٔ برافراشتہ"۔ لیکن مصحفی اس قسم کی شاعری کو جس میں معنی بندی اور "اشعارِ خیالی" زیادہ ہوتے ہیں پسند نہیں کرتے تھے[1]۔

مصحفی کے تذکروں میں بیسیوں ہندو شاعروں کا حال درج ہی۔ اِن کا ذِکر بھی اسی گرم دلی اور خوبی سے کرتے ہیں جیسا دوسروں کا۔ اس سے اُس زمانے کی تہذیب اور آپس کی یک جہتی کا اندازہ ہوتا ہی۔

تذکرے میں اکثر نامور شعرا کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔ اس فن میں اُنھیں خاص دخل تھا۔

میر سوز کے ابتدائی تخلص "میر" کی شہادت بھی اس تذکرے سے ملتی ہی۔

سعادت امروہوی کا حال بھی لکھا ہی لیکن میر صاحب کے تعلق، تلمّذ و استادی کا ذِکر نہیں کیا۔

مصحفی نے اپنے تذکروں میں ضمناً صرف تین تذکروں کی طرف اشارہ کیا ہی ایک 'تذکرۂ میر حسن[2]'، دوسرے 'تذکرۂ گردیزی[3]'، تیسرے 'تذکرۂ قدرت اللہ شوق'۔

---

[1] دیکھو ذکرِ واجد 'تذکرۂ ثانی'۔

[2] 'تذکرۂ ہندی گویاں'، صفحہ ۸۸ ذِکرِ خاکسار، صفحہ ۲۶۰ ذِکرِ نالاں

[3] دیکھو صفحہ ۳۴ ذِکرِ بقا 'تذکرۂ ہندی گویاں'

ایک بات اور قابلِ لحاظ ان تذکروں میں پائی جاتی ہی۔ جہاں تک تحقیق ہوا ہی اُردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے "اُردو" کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہی۔ ان تذکروں میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہی۔ حضور کے حال میں ذکر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہ جہاں آباد میں لطف علی خاں ناطق کے گھر پہ مشاعرہ تھا۔ میر صاحب کی طرحی غزل میں قافیے کے بعد ردیف "اور" "بہ معنی طرف تھی۔ بعضے فصحانے اُسے خلافِ "اُردو" خیال کرکے اُس کی پیروی نہ کی۔ نثار کے حال میں لکھتے ہیں کہ "ادائے زبانِ اُردو چناں چہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود" قہر کے تذکرے میں مرزا قتیل کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اوہم باوصفِ فارسی گوئی دعوئے اردو دانی ریختہ داشت" اسی طرح مہجور کے حال میں لکھا ہو کہ "سہ کتاب در زبانِ اردوئے ریختہ شکر آمیختہ از خامہ فکرش رونق سواد پزیرفتہ" لیکن "زبان اُردوئے معلیٰ" کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے تذکرہ 'نکات الشعرا' میں لکھا ہی[1]: انشا نے بھی جابجا 'دریائے لطافت' میں اُردو کا لفظ استعمال کیا ہی۔ اس کے بعد پھر میر امّن کی 'باغ و بہار' میں نظر آتا ہی:

پہلے تذکرے کے آخر میں چند شاعر عورتوں کا حال بھی درج ہی:

ان تینوں تذکروں کی تصنیف کی تاریخیں یہ ہیں:-

تذکرۂ اول 'ہندی گویاں'، سنہ ۱۲۰۱ھ سے قبل شروع ہوتا ہی اور سنہ ۱۲۰۹ھ میں ختم ہوتا ہی۔ تاریخ اختتام تو مصحفی نے خود لکھ دی ہی۔ ابتدا کا صحیح سن تو معلوم نہیں ہوسکا لیکن خاکسار کے ذکر میں میر حسن (متوفّی سنہ ۱۲۰۱ھ) کا تذکرہ ضمناً آگیا ہی جس سے ظاہر ہی کہ وہ اس سن سے قبل لکھنا شروع کرچکے تھے:

تذکرۂ دوم 'ہندی گویاں': اس کا سنِ تصنیف اس کے نام 'ریاض الفصحا'

---

[1] صفحہ ایک

سے نکلتا ہی یعنی سنہ ۱۲۲۱ھ لیکن یہ تاریخ آغاز ہی، تاریخ اختتام سنہ ۱۲۳۶ھ ہی ٭

تذکرۂ فارسی گویاں یعنی 'عقدِ ثریا' کا سنِ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہی ٭

ہندی گو شاعروں کے دو تذکرے ہیں۔ ان میں بعض شعرا کے حالات مشترک ہیں، اس لیے کہیں کہیں بعض شعرا کے حالات کے متعلق رائے میں اختلاف پایا جاتا ہی۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیوں کہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہی ایک عالمِ شباب کا نتیجہ ہی اور دوٗسرا زمانۂ شیب کا ٭

ہندی گویوں کا پہلا تذکرہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے پر مبنی ہی۔ البتہ اس کا مقابلہ خدابخش خاں کے کتب خانے کے نسخے سے کیا گیا۔ بعض مشتبہ مقامات کا مقابلہ کتب خانۂ مدرسۂ ندوۃ العلما سے بھی کیا گیا۔ باقی دو تذکرے خدابخش خاں کے کتب خانے کے نسخوں کی نقل ہیں۔ بعد ازاں ان تینوں تذکروں کے مبیّضوں کا مقابلہ کتب خانہ ریاست رام پوٗر کے نسخوں سے ہوا۔ افسوس ہی کہ کتب خانۂ خدابخش خاں اور رام پوٗر کے نسخے بہت غلط اور بدخط نکلے۔ تاہم مقابلے سے بعض مقامات کی کچھ نہ کچھ تصحیح ہو گئی ٭

مَیں قاضی عبدالودوٗد صاحب بیرسٹرایٹ لا ایڈوکیٹ پٹنہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے دونوں نسخوں کی نقل خدابخش خاں کے کتب خانے سے لکھوا کر بھیجی اور خود بڑی احتیاط سے تینوں نسخوں کا مقابلہ وہاں کے نسخوں سے کیا ٭

حاشیے میں ان نسخوں کا حوالہ درج کر دیا گیا ہی۔ ن۔خ سے مراد نسخہ کتب خانۂ خدابخش خاں ہی اور ن۔ر سے نسخہ رام پوٗر۔ جہاں صرف ن لکھا ہی اُس سے بھی نسخۂ رام پوٗر مراد ہی ٭

# مقدمۂ 'گلِ عجائب'

اس سے قبل انجمن 'شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ شایع کر چکی ہے۔ یہ تذکرہ بھی اس کے ہم عصر اورنگ آبادی کا ہے۔ مؤلفِ تذکرہ کا نام اسد علی خاں اور تخلص تمنّا تھا۔ شاہ کمال نے اپنے تذکرے 'مجموعۂ انتخاب' میں صرف چند سطریں لکھی ہیں جن سے ان کا نام، اورنگ آباد کی وطنیت اور حیدرآباد کے قیام کا حال معلوم ہوتا ہے۔ 'مجموعۂ نغز' اور 'عمدۂ منتخبہ' نے صرف نام اور تخلص پر اکتفا کیا ہے۔ تفصیلی حالات ابھی تک دست یاب نہیں ہوئے۔ اس تذکرے میں بھی کہیں کہیں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے اتنا پتا چلتا ہے کہ ان کا وطن اورنگ آباد ہے۔ ابتدائی تعلیم بھی اورنگ آباد میں ہوئی۔ اور ان کے اُستاد داور صاحب تھے جن سے کتبِ فارسی کی تحصیل کی۔ ان کے ایک ہم مکتب محمد سیف اللہ انور اورنگ آبادی تھے جن کے ساتھ وہ فارسی کتب (مثل کلامِ شوکت و اسیر و چار عنصر مرزا بیدل) کا درس لیتے تھے۔[1] اس نے بعض ہم مکتبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چناں چہ ایک جگہ وہ ایک پُر لطف صحبت کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اور محمد سیف اللہ انور، صوفی شاہ کاظم اور میر رمز چاروں ایک جگہ بیٹھ کر اسیر، شوکت اور بیدل وغیرہ کا ذکر اذکار کیا کرتے

---

[1] صفحہ ۱۳

تھے اور ان میں باہم یہ طے ہوا تھا کہ ان میں سے ہر شخص مشکل اشعار کے معانی علیحدہ علیحدہ سیکھے[1] اپنے ایک اور ہم مکتب مہر علی شاہ مہر کا بھی ذکر کیا ہے جو آصف جاہ کے ساتھ دہلی آکر اورنگ آباد میں متوطن ہو گئے تھے[2]۔

آزاد بلگرامی اورنگ آباد میں کئی سال مقیم رہے اور اکثر لوگوں نے ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ تمنا کو بھی شعر و سخن میں انھیں سے تلمذ تھا[3]۔

تمنا کے خاندانی حالات بھی اب تک کہیں نہیں ملے۔ سیف اللہ انور کے حالات میں صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ انور میرے والد کی رفاقت میں بسر کرتا ہے[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والد اپنے وقت کے مرفہ الحال لوگوں میں سے تھے۔

تمنا کا ابتدائی زمانہ اورنگ آباد ہی میں گزرا اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن ان کے والد کو سرکاری تعلق کی بنا پر حیدر آباد آنا پڑا تو وہ بھی وہیں چلے گئے۔

خواجہ محمد منعم خاں، قدر کے حال میں لکھتے ہیں کہ قدر کے والد کچہری دیوانی صوبۂ حیدر آباد میں مامور تھے۔ ان کی وفات پر نواب صمصام الملک بہادر صدارم دیوانِ دکن نے از راہِ قدردانی انھیں والد کی جگہ پر مامور کرا دیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "با مؤلف بہ سبب ارتباطِ قدیم و آمد و شدِ ہر روزگی دربار نواب موصوف مدظلہ، و اشفاقہ، اتحادِ دلی بہم رسانیدہ۔ اکثر گاہ اتفاق ملاقات می شود و در حیدر آباد بہ فقیر خانہ کہ قریب خانہ اشعار فرود آمدہ ہر روز کرم نمودہ، اوقات را بہ فرحت و عشرت می گزراند۔ با والد مؤلف و پدر صاحب ترجمہ ہم چنیں با جدِ طرفین کمال دوستی بود[5]"۔ سالم کے حال میں بھی اسی قسم کا ایک

---

[1] صفحہ ۵۶ [2] صفحہ ۵۶ [3] صفحہ ۶۹ [4] صفحہ ۱۲ [5] صفحہ ۱۲۵

جملہ لکھا ہے "بنابر ملاقات ہر روزگی کہ دربارِ نواب موصوف دست می دہد بافقیر اتحاد دلی بہم رسانیدہ"۔

اس سے ظاہر ہے کہ تمنّا کو نواب صمصام الملک صارم اورنگ آبادی دیوانِ دکن کی سرکار سے توسل تھا۔

تمنّا اور ان کے والد کے حالات اس تذکرے سے صرف اس قدر معلوم ہوتے ہیں اور ضمناً دوسروں کے ذکر میں آگئے ہیں۔

'تحفۃ الشعرا'، تالیفِ قاقال اورنگ آبادی کے ایک قلمی نسخے کے شروع میں چند شاعروں کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس میں تمنّا کا نام اسد علی خاں لکھا ہے اور ان کا یہ شعر بہ طورِ انتخاب درج کیا ہے ؎

دیکھا میری سا مکھڑا تو دیوانہ بن گیا		تو شمع بن گیا تو میں پروانہ بن گیا

اس کے بعد ہی شفیق کی ایک پوری غزل اسی بحر اور ردیف و قافیہ کی درج ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

گلشن تری نگاہ سے مے خانہ بن گیا		نرگس کا پھول بادے کا پیمانہ بن گیا

اس سے ظاہر ہے کہ شفیق اور تمنّا ہم مشق ہیں۔ تعجب ہے کہ باوجود ہم مشق و ہم عصر اور ایک اُستاد کے شاگرد ہونے کے شفیق نے اپنے تذکرے میں تمنّا کا ذکر کہیں نہیں کیا۔

تمنّا کا کلیات میری نظر سے گزرا ہے۔ اچھا ضخیم ہے۔ علاوہ غزلوں کے اکثر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام سے پختگی اور مشاقی ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے وقت میں اُستادی کا درجہ رکھتے تھے۔ چناں چہ شاہ کمال لکھتے ہیں " احوالش از شاگردانِ میر موصوف کہ دریں جا حاضر اند معلوم شدہ کہ بسیار شاعر مسلّم الثبوت دریں ملک بود۔" دو ایک شاگردوں کا پتا بھی چلتا ہے۔ ایک خواجہ ابوطالب خاں آشفتہ

ہیں۔ وہ اپنے ایک شعر میں تمنا کی استادی کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں :-

اُستادِ فلاطونم و شاگردِ تمنا          آشفتہ دو عالم شدہ یکساں زمن افروز

محمد علی خاں شوق اورنگ آبادی بھی ان کے شاگرد تھے۔ شوق صمصام الملک صارم کے بھائی عبدالسلام خاں کے فرزند تھے۔ اور عبدالسلام خاں صمصام الملک شاہ نواز خاں مؤلف 'مآثر الامرا' کے بیٹے تھے۔ شوق اپنی منظوم مثنوی 'چہار درویش' میں لکھتے ہیں کہ وہ تیرہ سال کی عمر (یعنی سنہ ۱۱۹۴ھ) سے تمنا سے مشق سخنی کرتے تھے ؎

کری سیزدہ سالگی نے عروج          پڑی امرا اور نہی کی سوج بوج

ہوا شعر کا شوق اک بارگی          ہوئی جستجو تازہ مضمون کی

ہوا شاعری کا جو مرغوب فن          کیا میں تمنا سے مشقِ سخن

تمنا کا انتقال سنہ ۱۲۰۴ھ میں ہوا۔ شوق نے تاریخ وفات کہی ؎

لیا جب تمنا نے راہِ قدم          ہوا موج زن بحرِ اندوہ و غم

کہا شوق نے سالِ تاریخ یہ          وفاتِ بہشتی کر ای دل رقم

'مجموعۂ نغز' میں ان کے ایک شاگرد کا ذکر ہے۔ جن کا نام نواب مجاہد جنگ تخلص ارمان ہے جو امرائے نظام الملک میں سے تھے ؂[1]

اس تذکرے کا نام پہلے ورق کی پیشانی پر یوں لکھا ہے :-

"رنگ دوم گلِ عجائب من مقالات الغرائب"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمنا کی کوئی تالیف 'مقالات الغرائب' نام کی تھی جو کئی مقالوں پر مشتمل تھی۔ ہر مقالے کو اس نے گُل سے موسوم کیا ہے اور ہر گُل کے ذیلی باب کو رنگ کا نام دیا ہے۔ یہ تذکرہ 'گلِ عجائب' کا "رنگ دوم" ہے

[1] صفحہ ۱۷

چوں کہ پُوری کتاب اب تک دست یاب نہیں ہوئی اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں کتنے "گُل" اور کتنے "رنگ" ہیں اور ان میں کن کن مضامین سے بحث کی گئی ہے۔ مؤلف نے اس حصے کا نام جو تذکرۂ شاعراں پر مشتمل ہے 'گلِ عجائب' رکھا ہے جیسا کہ قطعۂ تاریخ اختتامِ تذکرہ سے ظاہر ہے ؛

تذکرہ بہت مختصر ہے۔ بہ ظاہر کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ اس کا اصل نسخہ کتاب خانۂ آصفیہ سرکارِ عالی میں محفوظ ہے۔ کانٹ چھانٹ بہت ہے خط بھی خراب ہے اور کئی خطوں میں لکھا ہے۔ ترتیب بھی درست نہیں۔ بعض شاعروں کے حالات ہیں تو کلام ندارد ہے اور کلام ہے تو حال ندارد۔ بعض شاعروں کے نہ حالات ہیں نہ کلام، تاہم یہ تذکرہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ اس میں بعض کام کی باتیں مِل جاتی ہیں ؛

تذکرے کی تالیف کا آغاز سنہ ۱۱۹۲ھ سے ہوا اور اختتام سنہ ۱۱۹۴ھ میں جیسا کہ قطعاتِ تاریخ سے ظاہر ہے ؛

اس میں بارھویں صدی ہجری کے اواخر کے اکثر اُن شعرا کا حال اور کلام ملتا ہے جو قلم روِ آصفیہ میں تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سراج وغیرہ کے بعد دکن میں ایک دُوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی ایک عمر دکن میں بسر ہوئی عالمِ شاہ زادگی میں بھی اور شہنشاہ ہونے کے بعد بھی اس کا مستقر اورنگ آباد خجستہ بنیاد تھا اور کئی لاکھ فوج جو اس کے ساتھ تھی وہیں مقیم تھی۔ یہ شمالی ہند کا لشکر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لایا تھا۔ اس دَور میں اورنگ آباد کی تقریباً پوری آبادی شمالی ہند کی آبادی تھی اور سارا رنگ ڈھنگ دلّی کا سا نظر آتا تھا۔ چناں چہ اس زمانے کی زبان اس کی صاف شہادت دے رہی ہے۔ سراج کے کلام کا مقابلہ آبرو، حاتم، ناجی وغیرہ سے کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ہی مقام

کے شاعر ہیں۔ یہ سلسلہ آصف جاہ اوّل تک برابر جاری رہا کیوں کہ جب وہ دلّی سے اورنگ آباد آئے تو دلّی کی آبادی کا منتخب حصّہ ان کے ساتھ یہیں آکر متوطن ہو گیا۔ اس زمانے تک شمالی ہند کی زبان کا اثر اورنگ آباد میں پورے طور پر باقی رہا۔ اس کے بعد جب اورنگ آباد کی بجائے حیدر آباد پایۂ تخت آصفی قرار پایا۔ اور اُن نوواردوں کی اولاد کا دَور آیا تو ترکِ مقام، تغیّرِ حالات و ماحول اور مرورِ زمانہ سے زبان میں بھی فرق آگیا۔ یہ تذکرہ اُس ادبی دورِ انقلاب کا نشان دیتا ہے۔ اس نظر سے اس کا مطالعہ کچھ نہ کچھ ضرور بصیرت افروز ہوگا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ تیس چالیس سال کے عرصے میں دکن میں اُردو نے قواعد، محاورہ و روزمرّہ اور لب ولہجہ کے اعتبار سے کیا صورت اختیار کرلی تھی۔ شاہ سراجؔ کے دَور تک اہلِ ہند اور اہلِ دکن (یعنی اہلِ اورنگ آباد) کی زبان میں کوئی خاص امتیاز نہ تھا اور کچھ تھا بھی تو برائے نام۔ اورنگ آباد والوں نے زبان اور لب ولہجہ ہی نہیں بلکہ وضع قطع بھی دلّی والوں کی اختیار کرلی تھی۔ لیکن تیس چالیس سال میں اُن اسباب کی وجہ سے جن کا ذِکر ہم اُوپر کر چکے ہیں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ چناں چہ تمنّاؔ، افسرؔ کے متعلق لکھتا ہے کہ "گفتگویش بہ طرزِ اہلِ ہند مانوس است"۔

اس تذکرے میں ایسے شاعروں کا حال ہے جو مؤلف کے ہم عصر تھے۔ اور اکثر اس کے دوست اور ملاقاتی۔ اکثر شعرا اورنگ آبادی ہیں، یعنی ان میں سے بعض اورنگ آباد میں رہتے ہیں بعض حیدر آباد میں لیکن ہیں وہ بھی اورنگ آباد ہی کے۔

مؤلفِ تذکرہ نے حالات کے لکھنے میں کوئی خاص اُصول مدِّنظر نہیں رکھا۔ اس نے بھی وہی عام تذکرہ نویسی کی روش اختیار کی ہے جو اس سے قبل کے تذکروں

میں پائی جاتی ہے لیکن جہاں تک اس کی دست رس تھی سنین وغیرہ بھی درج کر دیے ہیں اور حالات اگر معلوم ہو سکے تو ان کا بھی اضافہ کر دیا ہے جیسا کہ آمید، موسوی خاں جرأت، حشمت، درگاہ قلی خاں ذکا، ضیا، قدر، عاجز، عزلت، عروج وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے ؛

اس میں بعض نئی اطلاعیں بھی ملتی ہیں مثلاً آزاد بلگرامی کے اُردو دیوان کا ذکر جس سے مؤلف کے دو شعر انتخاب کیے ہیں یا تذکرۂ 'بہار و خزاں' کا ذکر اور اس پر رائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عروج کا تذکرہ سنہ ۱۱۹۲ھ سے قبل لکھا گیا تھا ؛

بہ ہر حال چند باتیں اس تذکرے میں کام کی نظر آئیں۔ اس لیے انجمن نے اسے طبع کرا کے شایع کیا ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ جس سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے اکثر جگہ سے بوسیدہ اور مسخ و مجروح ہے۔ اس لیے اس کی ترتیب میں بہت دِقت اُٹھانی پڑی۔ اس کے بعض حصوں کا کاتب بہت غلط نویس ہے، اکثر املا کی غلطیاں موجود ہیں اور اشعار غلط نویسی کی وجہ سے وزن و بحر سے خارج ہو گئے ہیں۔ ان کو دُوسرے تذکروں اور دیوانوں کے سیاق و سباق سے درست کرنا پڑا۔ بعض اشعار جو بالکل مہمل ہو گئے تھے مجبوراً خارج کرنے پڑے ؛

مجھے اس کی اصلاح و ترتیب میں شیخ چاند ام۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی سابق ری سرچ اسکالر (عثمانیہ) سے بہت مدد ملی ورنہ اس قدر جلد شایع نہ ہو سکتا ؛

---

# مقدمۂ مخزنِ شعرا

سر محمد اقبال کہا کریں کہ اردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے، مگر نہ معلوم اس میں کیا کشش ہی کہ آج نہیں صدیوں پہلے سے اس کی فرماں روائی پنجاب دوآبے، بہار اور بنگالے ہی پر نہیں گجرات اور دکن تک پہنچ گئی تھی۔ اس تذکرے کے فاضل تقریظ نگار نے صحیح لکھا ہی کہ اس وقت جتنے شعرائے مسلّم ہیں وہ سب ہندی (اردو) کی طرف مائل ہیں اور فارسی عربی کی اب وہ گرم بازاری نہیں رہی ہی۔ اپنی زبان چھوڑ کر دوسروں کی زبان میں لکھنا گویا اہلِ زبان کا منھ چڑانا ہی۔ کسی کو کیا پڑی ہی کہ خونِ جگر کھائے اور "بد نہ گفتہ" کی تحسین سُنے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والے کو مزہ نہ آیا۔ بات یہ ہی کہ اُردو میں ہندی کی بھی شان ہی اور فارسی کی بھی اور یہ بہت بڑی وجہ اس کی عام مقبولیت کی ہی اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہی کہ اپنی زبان ہی۔ غیر زبان پر ہزار قدرت ہو، اپنی زبان کی سی بات نہیں آتی۔ ہمیشہ غیروں کا محتاج رہنا یہاں تک کہ بولی میں بھی، پھر ان کا سا لہجہ بنانا، انھیں کے لفظوں میں سوچنا، انھیں کی طرح خیال ادا کرنا، نقّالی اور بے نہی تو ہی بے غیرتی بھی ہی۔ نقّالی آخر نقّالی ہی اور جدّت کی دشمن، یہی وجہ ہی کہ فارسی میں شاعری (یا اُردو میں اس کی نقل)

کرتے کرتے جدت کھو بیٹھے۔ کچھ عرصے سے اُردو میں نیا رنگ اور نئی سکت پیدا ہوگئی ہے، اور اب انشاء اللہ الہام بھی اسی میں ہوا کرے گا، اور کوشش کرنے پر بھی غیر زبان میں نہیں ہوگا۔

خطۂ گجرات اپنی خصوصیات کی وجہ سے ہندستان کے صوبوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان سیاحوں اور شاعروں نے اس کی آب وہوا، حسن و نزاکت اور صنعت و حرفت کی بے حد تعریف کی ہے۔ مسلمانوں کا تعلق اس خطے سے اُس وقت سے ہے جب سلطان محمود غزنوی سومنات کے ارادے سے ملتان ہوتا ہوا نہروالہ پٹن کی نواح میں پہنچا۔ راجا مقابلے کی تاب نہ لاکر فرار ہوگیا۔ پٹن سلطان کے قبضے میں آگیا۔ یہاں سے سامانِ رسد کا انتظام کرکے سومنات کی طرف روانہ ہوا۔ قطب الدین ایبک نے بھی ایک حملہ نہروالہ (گجرات) پر کیا تھا لیکن اصل تعلق گجرات کا سلطنتِ دہلی سے علاءُ الدین خلجی کے عہد میں ہوا۔ سلطان نے الغ خاں (یا الپ خاں) کی سرکردگی میں ایک لشکر فتح گجرات کے لیے بھیجا (سنہ ۶۹۶ھ) گجرات فتح ہوگیا، اور اس وقت سے اس خطے پر سلطنتِ دہلی کی طرف سے ناظم رہنے لگا۔ یہ سلسلہ محمد شاہ بن فیروز شاہ (وفات سنہ ۷۹۶ھ) کے عہد تک جاری رہا۔ اس وقت سلطنتِ دہلی کی حالت متزلزل ہو رہی تھی بادشاہ نے رعایائے گجرات کی فریاد پر جو ناظم راستی خاں کے مظالم سے تنگ آگئی تھی ظفر خاں مخاطب بہ اعظم ہمایوں بن وجیہہ الملک کو ناظم کی تنبیہ کے لیے روانہ کیا۔ ظفر خاں مظفر و منصور ہوا اور راستی خاں مارا گیا (سنہ ۷۹۴ھ)۔ ابھی یہ گجرات کی انتظامی حالت درست ہی کر رہا تھا کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ سلطنت پہلے ہی سے ضعیف ہو رہی تھی کہ اسی اثنا میں امیر تیمور نازل ہوئے، رہی سہی حالت اور بگڑ گئی اور تمام ملک میں پریشانی پھیل گئی۔ ظفر خاں جو گجرات میں ناظم کی تنبیہ کے لیے آیا تھا

مظفر شاہ کے نام سے خود مختار بن بیٹھا (سنہ ۸۱۰ھ) اور گجرات میں شاہی خاندان کا بانی ہوا۔ اس خاندان نے سنہ ۹۸۰ھ تک شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس کے بعد یہ خطّہ اکبر بادشاہ کے عہد میں ممالکِ محروسۂ ہندستان سے ملحق ہوگیا۔ اور سلطنتِ دہلی کی طرف سے صوبے دار رہنے لگا؛

اس مختصر تاریخی خاکے سے ظاہر ہے کہ گجرات کا تعلّق دلّی کی اسلامی حکومت سے ابتدا سے رہا ہے اور وہاں کے امرا اور علما کے علاوہ ہزارہا لشکری اور صنّاع وغیرہ گجرات میں آکر آباد ہوگئے اور گجرات سلطنتِ دہلی کا بہت ممتاز صوبہ ہوگیا۔ احمد آباد، سورت اور پٹن کے نام ایسے ہی مشہور و معروف ہوگئے جیسے دلّی، آگرہ اور الہ آباد وغیرہ کے۔ اس کا اثر وہاں کی معاشرت پر طرح طرح سے پڑا۔ خاص کر وہاں کی زبان پر جو بدل کر کچھ کی کچھ ہوگئی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ دِلّی کی حکومت یا اہلِ دہلی نے جس جس خطّے میں قدم رکھا خواہ وہ پنجاب ہو یا گجرات، دکن کے صوبے ہوں یا مدراس وہاں انھوں نے زبان پر اپنا نقش ضرور چھوڑا ہے اور وہ نقش ایسا گہرا ہے کہ اب تک اُجاگر نظر آتا ہے۔ اس بارے میں اہل اللہ اور صوفیا کو نہیں بھولنا چاہیے، ان کے نام اس فہرست میں سب سے پہلے آتے ہیں۔ ان کی یہ خدمت دینی خدمت سے کچھ کم نہیں ہے۔ گجرات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان بزرگوں نے اپنی تعلیم و تلقین کے لیے اُس زبان سے کام لیا ہے جو عوام میں بولی یا سمجھی جاتی تھی۔ چناں چہ حضرت قطب عالم (ولادت سنہ ۷۹۰ھ وفات سنہ ۸۵۰ھ) و حضرت شاہ عالم (ولادت سنہ ۸۱۷ھ وفات سنہ ۸۸۰ھ) شیخ بہاء الدّین باجن (وفات سنہ ۹۱۲ھ) و سلطان شاہ غزنی (وفات سنہ ۹۲۲ھ) کے اقوال جو ہندی (دہ ہندی آمیز اُردو) میں ہیں اب تک موجود ہیں ان کے علاوہ شاہ علی جیو گام دہنی (وفات سنہ ۹۷۲ھ) کا پورا دیوان

موسوم بہ 'جواہرالاسرار' ہندی زبان یعنی قدیم ہندی آمیز اُردو میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ اور میاں خوب محمد چشتی (وفات سنہ ۱۰۲۳ھ) کی کتاب 'خوب ترنگ' قدیم گجراتی اُردو میں ہے۔ یہ حضرات اپنی زبان کو عربی و عجمی آمیز گجراتی کہتے تھے۔ جس کے معنے قدیم گجراتی اُردو کے ہیں۔ اسی طرح شاہ وجیہ الدین علوی (وفات سنہ ۹۹۸ھ) اور ان کے بھتیجے سیّد شاہ ہاشم علوی (وفات سنہ ۱۰۵۹ھ) کے اقوال بھی اسی زبان میں اُن کے ملفوظات میں پائے جاتے ہیں۔ امین گجراتی نے 'یوسف زلیخا' سنہ ۱۱۰۹ھ میں لکھی۔ اگرچہ وہ اپنی زبان کو گوجری یا گجراتی کہتا ہے لیکن خالص پُرانی اُردو میں ہے البتہ کہیں کہیں گجراتی لفظ بھی آجاتے ہیں۔

زبان کی اس اجمالی کیفیت سے ظاہر ہے کہ اُردو کی ابتدائی نشو ونما دکن کی طرح گجرات میں بھی بہت پہلے سے شروع ہوگئی تھی۔ یہ مقام اس مضمون کی مفصّل بحث کا نہیں ہے لیکن سرسری ذِکر جو اوپر کیا گیا ہے اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ قابل مؤلّف تذکرہ نے اس کا مطلق ذِکر نہیں کیا۔ کیا اچھّا ہوتا کہ وہ قدیم گجراتی اُردو کے شعرا کے حالات بھی اس تذکرے میں شریک کر دیتے۔ مؤلّف نے اس بارے میں یہاں تک احتیاط کی ہے کہ اگر کسی شاعر کے کلام میں کچھ اشعار پُرانی زبان کے آگئے ہیں تو دانستہ ان کے انتخاب سے پہلوتہی کی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو 'تذکرۂ ثنا'، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "محاورہ اش با محاورۂ حال فرقے دارد .... امّا ایں یک دو شعر کہ موافق محاورۂ جدید اہلِ گجرات است' از سفائنِ قدیمہ بہم رسید، دریں اوراق ثبت گردید"۔ ذاکر کے بیان میں بھی اشعار کے انتخاب کے وقت "زبان جدید گجرات" کا اعادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ولی کے متعلق بھی یہی فرماتے ہیں کہ "ایں چند اشعار محمد ولی کہ مطابق

روزمرّہ جدید گجرات است از دیوانش انتخاب کردہ شد" مؤلف کو قدیم زبان سے کچھ انس نہیں اور اس لیے انھوں نے نہ تو قدیم شعرا کا ذکر کیا ہی اور نہ متاخرین کے ایسے اشعار درج تذکرہ کیے ہیں جن میں قدیم زبان کی بُو باس پائی جاتی ہی۔ تذکرے میں بارھویں اور زیادہ تر تیرھویں صدی کے شعرا کا ذکر ہی؛

اگرچہ وہ شعرا کے حالات سے زیادہ بحث نہیں کرتے اور نہ اس بارے میں تحقیق و تلاش کی زحمت گوارا کرتے ہیں، سنِ وفات وغیرہ بھی سوائے دو چار کے کسی کا نہیں لکھا، لیکن ولی کے معاملے میں انھوں نے پُرانی بحث کو پھر چھیڑ دیا ہی کہ وہ گجرات کے تھے یا اورنگ آباد کے۔ سب سے پہلے میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں اسے اورنگ آباد کا لکھا ہی۔ یہ نہیں لکھا کہ ان کی اس اطلاع کا ماخذ کیا ہی۔ ممکن ہی کہ عزلت کے بیاض میں (جس سے میر صاحب نے استفادہ کیا ہی) اس کا کچھ اشارہ ہو یا ان کی زبانی معلوم ہوا ہو۔ شفیق اورنگ آبادی نے بڑے شدّ و مد سے ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہی۔ اور گجرات کی نسبت کو غلط محض بتایا ہی۔ لیکن خواجہ خان حمید اورنگ آبادی (معاصر میر صاحب) اپنے تذکرہ ’گلشنِ گفتار‘ میں اسے گجرات ہی کا بتلاتے ہیں۔ قایم نے اپنے تذکرہ ’مخزنِ نکات‘ میں اس کا مولد گجرات لکھا ہی۔ تذکرہ ’گلزارِ ابراہیم‘ میں بھی اسے گجرات ہی سے منسوب کیا ہی۔ گردیزی نے "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" لکھ کر چھوڑ دیا ہی۔ کسی مقام کی تخصیص نہیں کی۔ سرور اور قاسم نے باشندۂ دکن اور شوق نے اورنگ آبادی لکھا ہی۔ آزاد نے بھی اس کا وطن گجرات قرار دیا ہی۔ یہ اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا ہی اور اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہی۔ جو لوگ ولی کو دکن (اورنگ آباد) کا کہتے ہیں وہ اس کا یہ شعر سند میں پیش کرتے ہیں ؎

ولی ایران و توراں میں ہی مشہور　　اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہی

ایک دُوسرے شعر میں دکھنی زبان کا ذِکر یوں کیا ہی :

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہیں ہیں ای ولی
لیکن نہیں بولا کوئی اک شعر خوش تر زیں نمط

لیکن اس تذکرے کے مؤلف کی رائے میں "ملکِ دکن" سے وہ خاص خطّہ مراد نہیں ہی جو گجرات سے الگ نربدا کے جنوب میں واقع ہی۔ تاریخی اور جغرافی نظر سے یہ استدلال صحیح نہیں ہی۔ فارسی تاریخوں میں گجرات اور دکن کا اطلاق اُس تمام خطّے پر بھی کیا جاتا ہی جس میں گجرات بھی شامل ہی۔ اس کی سند تذکرۂ 'گلزارِ ابراہیم' سے بھی ملتی ہی۔ چناں چہ صاحبِ تذکرۂ مذکور ولی کے بیان میں لکھتے ہیں " ولی دکھنی شاہ ولی اللہ، اصلش از گجرات، و در شعرائے دکھن مشہور و ممتاز است" اگرچہ وہ اسے گجرات کا باشندہ کہتا ہی مگر شعرائے دکھن میں شمار کرتا ہی۔

اس تذکرے کا مؤلف بھی دکن سے یہی مراد لیتا ہی اور کہتا ہی کہ " ولایت گجرات بہ نسبت دہلی و اکبرآباد سمتِ جنوب کہ ہندیانِ دکھن گویند واقع است"۔ نیز وہ کہتا ہی کہ بلدۂ احمد آباد کے ثقات سے یہی سُننے میں آیا ہی کہ ولی گجرات کا باشندہ تھا۔ چوں کہ ولی کا اکثر زمانہ احمد آباد میں بسر ہوا اور تعلیم بھی وہیں ہوئی، سورت کی مدح میں ایک مثنوی تصنیف کی اور گجرات کے فراق میں کچھ اشعار لکھے، اور اس کا مدفن بھی احمد آباد میں ہی، اس لیے اکثر لوگوں نے اسے گجراتی ہی قرار دیا۔ اور اس کا وطن بجائے اورنگ آباد گجرات ہی مشہور ہو گیا۔

اگرچہ صاحبِ تذکرہ نے ازراہِ انکسار محاورۂ شعرائے گجرات کے متعلق اہلِ دہلی و لکھنؤ سے معذرت کی ہی، لیکن حق یہ ہی کہ ان شعرا نے زبانِ اُردو کو

بڑی خوبی سے لکھا ہے اور ان کی زبان کسی طرح دلّی اور لکھنؤ کے عام شعرا سے کم نہیں ہے، بلکہ بعض ان میں اُستادانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی زبان کی فصاحت اور صفائی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ تذکرے کے مطالعے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ گجرات میں اس کثرت سے شاعر تھے اور شعر و سخن کا اس قدر چرچا تھا۔ میر عزلت اور میاں سمجھو کی وجہ سے اس ذوق کو اور بھی فروغ ہوا۔ ان دو صاحبوں کے شاگرد کثرت سے تھے۔ گجرات کے مسلمان اُردو کو اپنی قومی زبان سمجھتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے اس خطّے کے مسلمانوں میں اس کا عام رواج تھا اور اب بھی یہی حال ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے میں وہاں شعر و سخن اور اُردو ادب کی ترقّی کا وہ ذوق و شوق باقی نہیں رہا اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس شوق کو پھر زندہ کیا جائے ؛

مؤلّفِ تذکرہ قاضی نورالدین حسن خاں رضوی فائق بھڑوچ (گجرات) کے رہنے والے تھے۔ اس نواح میں ان کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے بڑی عزّت و احترام سے دیکھا جاتا تھا اور اب تک اس خاندان کے لوگ اسی عزّت و وقار سے بسر کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب مرحوم علاوہ عالم و فاضل ہونے کے شاعر بھی تھے اور فارسی اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اس تذکرے سے اُن کا ذوقِ سخن ظاہر ہوتا ہے۔ اشعار کا انتخاب ذوقِ سخن کا معیار ہے ؛

قاضی صاحب مرزا غالب کے ہم عصر تھے اور ان سے سلسلۂ خط و کتابت بھی تھا۔ قاضی صاحب کے ایک خط سے جو مرزا صاحب کے نام ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے کسی امر کی نسبت جو قدیم فارسی یا زردشتی مذہب کے متعلق تھا یہ لکھا تھا کہ جمشید جی پارسی سے (جو قاضی صاحب کا ہم وطن تھا)

دریافت کرکے لکھیں۔ قاضی صاحب جواب میں لکھتے ہیں کہ اس وقت سیٹھ صاحب یہاں نہیں ہیں آنے کے بعد آپ کا پیام پہنچا دوں گا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے فارسی زبان دانی پر جو عبور اور زبان کے غوامض و اسرار پر جو قدرت جناب کو عطا فرمائی ہو وہ اس سیٹھ بے چارے کو کہاں حاصل ہو۔ اس کا مذہب زردشتی ہوا تو کیا ہوتا ہو۔ یہاں پارسی آئین زردشتی سے بیزار ہیں اور بہت انگریز پسند ہوگئے ہیں۔ بعض جو اب تک اپنے مذہب کے پابند ہیں وہ اصل کتابوں کو نہیں سمجھتے بلکہ بعض زند و پاژند کی کتابوں کو گجراتی حروف میں لکھ لیا ہو جسے صبح و شام رٹتے رہتے ہیں۔ یہ خط بڑا پُرلطف ہو ؀

قاضی صاحب مرحوم نے اس تذکرے کا مسوّدہ بھی مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا، بعد ملاحظہ مرزا صاحب نے جو خط لکھا ہو وہ بہ طور یادگار کے اس تذکرے کے آخر میں درج کر دیا گیا ہو ؀

علاوہ اس تذکرے کے مرزا صاحب کی اور بھی کئی تالیفات ہیں جن میں سے «جواہر الفقہ» اور «تحفۃ العرفان» مطبع نول کشور میں طبع ہو چکی ہیں۔ دو ایک کتابیں غیر مطبوعہ اب تک ان کے خاندان میں موجود ہیں۔ قاضی صاحب نے سنہ ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا ؀

یہ تذکرہ جو انجمن نے طبع کیا ہو دو مختلف نسخوں سے تیّار کیا گیا ہو۔ ایک نسخہ قاضی صاحب کے خاندان میں تھا۔ جو ان کے قابل پوتے اور ہم نام قاضی نور الدین حسین صاحب نے بہ کمال عنایت و شفقت ہمیں عنایت فرمایا۔ دُوسرا نسخہ بمبئی یونی ورسٹی کا ہو۔ ان دونوں کے مقابلے اور تصحیح کے بعد یہ نسخہ تیّار کیا گیا ہو ؀

آخر میں مَیں اپنے قابل شاگرد مولوی شیخ چاند صاحب ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی

ری سرچ اسکالر (عثمانیہ یونی ورسٹی) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے بھڑوچ کے نسخے کے بہم پہنچانے اور دونوں نسخوں کے مقابلے اور قاضی صاحب کے حالات دریافت کرنے میں مجھے مدد دی ؛

---

# شاعری

# مقدّمۂ قطب مشتری'

وجہی قدیم دکھنی اُردو کا بہت بڑا ادیب گزرا ہے۔ اُسے نثر اور نظم دونوں پر بڑی قدرت تھی۔ اب تک اُس کی تین کتابیں دریافت ہوئی ہیں۔ ایک 'سب رس' جو اس سے قبل انجمن کی طرف سے شایع ہو چکی ہے۔ ایک دُوسری کتاب 'تاج الحقائق' ہے اور وہ بھی نثر میں ہے۔ تیسری یہ مثنوی ہے جو 'قطب مشتری' کے نام سے موسوم ہے۔

اس مثنوی میں سلطان محمّد قلی قطب شاہ بادشاہ گول کنڈہ کے عشق کا حال ہے۔ قصّہ وہی قدیم طرز کا ہے۔ یعنی محمّد قلی قطب شاہ کے باپ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہ ہوتا تھا۔ آخر بیٹا ہوا، بڑی خوشیاں منائی گئیں، داد و دہش کی گئی۔ بڑے ہوئے، زمانے کے رواج کے موافق تعلیم دی گئی۔ ایک روز خواب میں ایک نازنین کو دیکھا، اس پر عاشق ہو گئے۔ اب جو آنکھ کھلی تو نظروں میں وہی سماں تھا۔ روز بہ روز حالت خراب ہونے لگی۔ بہت کچھ سمجھایا، کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر اپنے ایک مشیر مصوّر عطارد کو ساتھ لے کر پُورے ساز و سامان کے ساتھ اُس نازنین کی تلاش میں نکلے۔ رستے میں بڑی بڑی مصیبتوں اور آفتوں کا سامنا ہوا، غرض اس ہفت خواں کو طے کر کے بنگالہ پہنچے جہاں کی

وہ رہنے والی تھی۔ دونوں میں محبّت ہو جاتی ہے۔ اور شاہزادے صاحب اُسے لے کر گول کنڈہ آتے ہیں جہاں بڑی دھوم سے شادی ہوتی ہے ؁

یہ مثنوی جیسا کہ خود وجہی نے لکھا ہے سنہ ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی ہے

تمام اس کیا دیس بارا منے  سن ایک ہزار ہور اٹھارا بنے

یعنی ۱۰۱۸ھ میں بارہ دن میں لکھ کر پوری کر دی ؁

سلطان محمّد قلی قطب شاہ سنہ ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوئے اور سنہ ۱۰۲۰ھ میں انتقال کر گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی سلطان کے انتقال سے دو سال قبل لکھی گئی اور اس وقت سلطان کے والد ابراہیم قطب شاہ زندہ نہ تھے اور اس لیے اس مثنوی میں ابراہیم قطب شاہ کی جو مدح ہے وہ قصّے کے تعلّق سے ہے نہ کہ شاہ وقت ہونے کے لحاظ سے۔ اور محمّد قلی قطب شاہ کی مدح اس لیے نہیں ہے کہ وہ خود قصّے کے ہیرو ہیں۔ 'سب رس' عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں سنہ ۱۰۴۵ھ میں یعنی اس مثنوی سے ستائیس اٹھائیس برس بعد لکھی گئی۔ اس وقت ابراہیم قطب شاہ کو مرے ہوئے تقریباً اٹھاون برس ہوئے تھے۔ اس حساب سے یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ وجہی نے ابراہیم قطب شاہ کا زمانہ دیکھا تھا یا اُس کے دربار سے کچھ تعلّق تھا۔ البتّہ یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بچپن ابراہیم قطب شاہ کے آخر عہد میں بسر ہوا ہو۔ کیوں کہ جس وقت اُس نے یہ مثنوی لکھی ہے وہ مشّاق شاعر تھا جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس نے پوری مثنوی بارہ دن میں کہہ ڈالی ؁

ایک قیاس اس مثنوی کے متعلّق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس میں درپردہ سلطان محمّد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ وہ واقعہ بھی عالمِ شہزادگی کا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ

نہیں پایا جاتا۔ مثنوی میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں' بھاگ متی کے عشق سے ان کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس ٭

اگرچہ وجہی نے بہت کچھ دعویٰ کیا ہے اور تعلّی کی ہے لیکن یہ مثنوی کوئی اعلیٰ پایے کی نہیں ہے۔ ہاں اس اعتبار سے کہ قدیم ہے اور اُس زمانے کا ایسا مُرتّب کلام کم مِلتا ہے، قابلِ قدر ہے۔ چند شعر تعلّی کے ملاحظہ ہوں ؎

نہ نپجے نہ نپجیا ہے گن گیان میں		سو طوطی منج ایسا ہندستان میں
جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے		سو منج تی طرز شعر کا پائیں گے
دکھن میں جو دکھنی مٹھی بات کا		ادا نیں کیا کوئی اس دھات کا
یو بولیا ہوں سب گنج نارنج ہے		اجھوں میرے دل میں بہوت گنج ہے
جو لک برس کوئی سولیوے رنج کوں		نہ پاویں کدھیں اس چھپے گنج کوں
ہوا جیو جب شعر یو بولنے		خزینے لگیا غیب کے کھولنے
رتن یو اتھے دل کرے کھان میں		وہاں تی لے آیا ہوں دکان میں
گہر یو مرے یوں لگے جھمکنے		کہ پانی ہو گئے موتی سیپیاں منے
اگر غوطے لک برس غواص کھائے		تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے

وجہی، محمود اور فیروز کا جو اس سے قبل گزرے ہیں بہت قائل ہے اور اُن کا ذِکر بڑی تعریف اور ادب سے کرتا ہے۔ اس موقع پر خواب میں فیروز کی زبانی اپنی تعریف میں یہ شعر کہتا ہے ؎

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں		دعا دے کے چومے مرے ہات کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس		کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
تو ایسی طرز دل تی پنچیا نوی		کہ دسرے کریں سب تری پیروی
وجہی ترا ذہن جیوں برق ہے		تجے ہور بعضیاں میں لئی فرق ہے

ترا شعر سُن دل پگلتا ہی یوں		کہ پانی تی ابلوج گلتا ہی جیوں
تو وجہی کھیا شعر کی دھات کا		ہوا زیا مرت تج تے مزابات کا

گو یہ مثنوی اعلیٰ پایے کی نہ ہو، تاہم اس میں بعض باتیں بڑی خوبی کی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند ایک کا ذِکر یہاں کرتا ہوں۔ لیکن پڑھتے وقت یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ یہ مثنوی اب سے تقریبًا تین سو چالیس برس پہلے کی لکھی ہوئی ہی۔

اس کتاب میں وجہی نے ایک باب "در شرح شعر" کے عنوان سے لکھا ہی۔ اس میں وہ بتاتا ہی کہ شعر کی اصل خوبی کیا ہی اور اس میں کیا کیا جوہر ہونے چاہییں۔ سب سے پہلی بات وہ یہ کہتا ہی کہ شعر سلیس ہونا چاہیے۔ زیادہ کہنے کی ہوس نہ کر، ایک شعر کہہ پر اچھا کہہ، مگر اس میں کچھ نزاکت ہونی چاہیے پھر وہ کہتا ہی کہ شعر کہنے میں سب سے بڑی مشکل یہ آپڑتی ہی کہ لفظ اور معنی میں ایسا ربط ہو کہ دونوں مِل کر ایک جان ہو جائیں۔ لفظ موزوں اور منتخب اور معنی بلند ہوں۔ معنی میں اگر زور ہی تو بات کا مزہ ہی اور ہو جاتا ہی۔ البتہ اس کا سنوارنا ضروری ہی، مثلاً اگر کوئی محبوب حسین ہی تو سنوارنے سے نورٌ علیٰ نور ہو جائے گا۔ ایک بات بڑی اچھی یہ کہی ہی کہ شعر میں کوئی جدّت ہونی چاہیے۔ دوسروں کی تقلید کرنی آسان ہی لیکن شاعر وہی ہی جو اپنے دِل سے نئی بات پیدا کرتا ہی۔ کہتا ہی کہ میں تو اُس رنگین بات کا قائل ہوں جو دل میں جا کر بیٹھ جائے، جس سے دل میں ولولہ پیدا ہو اور آدمی سُن کر اُچھل پڑے۔

اب ان باتوں کو خود اس کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے ؎

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات		کہ ہی فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس		بھلا ہی جو یک بیت بولے سلیس

جسے بات کے ربط کا فام نیں　　اُسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
نکو کر تو لئی بولنے کا ہوس　　اگر خوب بولے تو یک بیت بس
ہُنر ہے تو کچ نازکی برت یاں　　کہ موتاں نہیں باندتے رنگ کیاں
وہ کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے　　کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
اُسی شعر کو لفظ میں لیائیں توں　　کہ لیایا ہے اُستاد جس لفظ کوں
اگر فام ہے شعر کا تجکوں چھند　　چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے　　دلے بھی مزا بات کا ہور ہے
اگر خوب محبوب جیوں سور ہے　　سنوارے تو نورٌ علیٰ نور ہے
ہُنر مشکل اس شعر میں یوچ ہے　　کہ تھوڑے اچھیں حرف معنی سولے
یو سب شعر کہتے یو سب شعر نئیں　　کہ بولاں کدھر اور معنی کہیں
جو کرتا یکس کا ہُنر دیک کر　　ہُنر دند اسے نیں کہتے ہے ہُنر
نوا دل تی لیانا ہے مشکل کنا　　کہ آسان ہے دیک کر بولنا
ہُنر وند اُس کوں کہیا جائے گا　　جو کوئی اپنے دل تی نوا لیائے گا
فرق ہے اوّل ہور آخیر میں　　تفاوت اچھے نیر ہور شیر میں
دیوانا ہوں مَیں اُس رنگی بات کا　　کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ
کہاں بات وہ چنچل ہور چلبلی　　کہ دل کوں نہواں سو کرے گدگلی
مری بات سن بات اس دھات بول　　کہ جیوں کوں خوشی ہور دل کوں کلول
سخن گو دہی جس کی گفتار تھی　　اُچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھی
شعر بولنا گرچہ اپروپ ہے　　دلے فاما کہنے تی خوب ہے

وجہی کا کلام بہت سلیس، صاف اور ستھرا ہے، البتہ زبان قدیم ہے اور وہ اُس کی اپنی اور اپنے زمانے کی زبان ہے، اس لیے متروک اور قدیم الفاظ اور

محاوروں کی وجہ سے سہیں مشکل معلوم ہوتی ہی۔ بعض بعض مقامات پر اس نے بعض خیالات بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں۔ مثلاً عشق کی تعریف میں چند شعر کہے ہیں۔ مگر خوب ہیں دو ایک مثالیں اور یہاں لکھتا ہوں :-

عطارد نقاش جس سے شہزادہ اپنے عشق کے معاملے میں مشورہ کرتا ہی، اس بات کو بیان کرنا چاہتا ہی کہ دُنیا میں حسین بہت ہیں، کسی میں کوئی خوبی ہی کسی میں کوئی۔ مَیں کسے اچھا کہوں اور کسے بُرا۔ سب اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں لیکن اصل یہ ہی کہ سب سے حسین وہی ہی جو دل کو بھا جائے۔ وہ حسینوں کو پھول سے تشبیہ دے کر یوں کہتا ہی ؎

پھلاں ہور خوباں یو یک ذات ہی ۔۔۔ کہ یک رنگ یک رُوپ یک دھات ہی
کسے باس ہی ہور کسے رنگ ہی ۔۔۔ کسے باس ہور رنگ بھی سنگ ہی
کسی میں سو چھند بند ہور ناز بھُوت ۔۔۔ کسی میں صورت شکل کا ساز بھُوت
کسے مَیں بُرا کوں کسے مَیں سرا دوں ۔۔۔ کہ خُوباں ہی شہ خوب سب اپنے ٹھادوں
نہیں باس سنبل کی نرگس منے ۔۔۔ جو بھاوے اپس کوں وہی خوب ہی
جو عاشق لبدتا ہی دیک آس تی ۔۔۔ وہ کچھ خارج ہی رنگ اور باس تی

شہزادہ جب اپنے باپ سے تلاشِ معشوق کے لیے جانے کی اجازت مانگتا ہی تو بادشاہ طرح طرح سے اُسے سمجھا کر اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہی اور کہتا ہی ؎

توں سور ہے نکو دور ہو آسمان تی ۔۔۔ توں ہیرا اہے نا بچھڑ کھان تی
توں پھل ہور ہی ٹھا تو تج پھُول بن ۔۔۔ توں سرو ہور جا گا ہی تیرا چمن
توں شاہی کیرے بزم کا شمع ہی ۔۔۔ تو جم جیو تج تھے مرا جمع ہی
نکوں کر پریشان دل جمع کوں ۔۔۔ نکو توں بجھا جھمکتی شمع کوں

جسے یار کہتے سو کئیں یار نیں اگر ہے تو بھی کوئی وفادار نیں
وفادار سو یار کرتار ہے توں اُس سات ہو یار اگر یار ہے

یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ تو سورج ہے آسمان سے دُور نہ ہو۔ تو پھُول ہے اور اور تیرا مقام پھُول بن باغ ہے، تو سرو ہے اور تیری جگہ چمن میں ہے۔ تو شاہی بزم کی شمع ہے۔ تو سدا سلامت رہے کہ تو ہی میری پُونجی ہے۔ تو اپنے دِل کو پریشان نہ کر اور خاطر جمع رکھ اور روشن شمع کو نہ بجُھا۔ جسے یار کہتے ہیں وہ کہیں نہیں پایا جاتا اور کہیں ہے تو وفادار نہیں۔ اگر کوئی وفادار یار ہے تو وہ خدائے پروردگار ہے، تجھے یاری کرنی ہے تو اُس سے کر:

جب شاہ زادہ رخصت ہوتا ہے تو وہ مقام کسی قدر دردناک ہو جاتا ہے۔ شہ زادہ ماں باپ سے کہتا ہے کہ میں دل کے ہاتھوں لاچار ہوں اور اب نہیں رہ سکتا۔ یہ شعر موقع کے لحاظ سے نہایت سچے اور پُراثر ہیں ؎

نکلنا کسے گھر سے بھاتا اہے منجے دل یوستی لجاتا اہے
کتا ئیں رکھوں دل کو رہتا نہیں یو کیا بھید ہے کوئی کہتا نہیں
بھوت منج کوں لگتا اہے یو عجب کہ آدم پہ غالب ہے دل کیا سبب
منجے یاں رہنا بھوت مشکل اہے کہ اتنا کیا سب سو یہ دل اہے

ایک مقام پر باغ کی کیفیت اس طرح لکھی ہے ؎

یکایک دِسیا ایک نزدیک باغ ہوا اس کی باساں تے ترسب دماغ
کہ پاتاں کے پردیاں کو سب پھاڑ کر پھلاں جھانکتے تھے سراں گاڑ کر
دو بازو دو دھر جھاڑ دو رست ہو پوں مدسوں ڈُلتے تھے سب مست ہو
سرو داں سو مُرغاں کے نالے تھے واں سُریاں کلیاں، پھول پیالے تھے واں
سو رنگ سانولے خوب پاتاں بھرے ندیم ہو کے بُلبُل جو چالے کرے

سو طاؤس پنکھی طوطی کبک ہنس ۔ پکڑ پیٹ لڑنے لگے ہنس ہنس
وہ سب خوش ہو بلبل کے چالیاں اُپر ۔ اُچھلنے اتھے مست ہو ڈالیاں اُپر
بھنور جھونڈ ہو بن میں گھمتے اتھے ۔ سو پھولاں کرے موکھ چمنتے اتھے
چمن تر نہ شبنم کے ہی آب سوں ۔ کہ موں دھوئے ہیں پھول گلاب سوں
برگ بار آئے ہیں اس دھات سب ۔ کہ چھپ گئے پھلاں کے تلیں پات سب
خزاں کو نہ تھا آنے اس ٹھار ٹھار ۔ بہار ہور بہتیرا تھا سب بہار

یعنی قریب ایک باغ نظر آیا جس کی خوش بوئں سے دماغ معطر ہو گئے پھول، پتوں کے پردوں کو پھاڑ کر سر نکال نکال کے دیکھ رہے تھے۔ دونوں طرف پیڑوں کی دو قطاریں تھیں جو ہوا کی مستی سے جھوم رہے تھے۔ پرندوں کے نالے سرود تھے، کلیاں صراحیاں تھیں اور پھول پیالے تھے۔ باتونی خوش رنگ سانولی بلبلیں وہاں ندیم تھیں اور طرح طرح کے ناز و انداز کر رہی تھیں جنھیں دیکھ کر مور، لوتے، کبک اور ہنس مارے ہنسی کے لوٹے جاتے تھے۔ وہ سب بلبلوں کے ناز و انداز سے خوش ہو کر ڈالیوں پر مست ہو ہو کر اُچھلتے تھے بھونروں کے جھنڈ گھوئے منتے پھر رہے تھے۔ چمن اوس سے بھیگا ہوا نہ تھا بلکہ پھولوں نے گُلاب سے مُنھ دھوئے تھے۔ پھول اور پھل اس کثرت سے آئے ہیں کہ پتے پھولوں کے تلے چھپ گئے ہیں۔ خزاں کو اس مقام پر آنے کی اجازت نہ تھی اور اندر اور باہر بہار ہی بہار تھی ❊

عطارد مشتری کے محل میں نقاشی کرتا ہی، اُسی نقش و نگار میں وہ چالاکی سے شہزادہ قلی قطب شاہ کی تصویر کھینچ دیتا ہی۔ جب مشتری نقش و نگار دیکھنے آتی ہی تو اس کی نظر اس تصویر پر بھی پڑتی ہی اور پہلی ہی نظر میں تیرِ عشق سے گھایل ہو جاتی ہی اور بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہی۔ دائی یہ حال دیکھ کر بہت پریشان ہوتی ہی۔ اور ہوش آنے پر اصرار کر کے پوچھتی ہی کہ یہ کیا ہوا۔ پہلے پہل وہ بتانے،

سے انکار کرتی ہے لیکن جب دائی نے بہت اصرار کیا اور پھسلایا تو جو بات تھی وہ کہہ دی ۔ دائی بھی تصویر دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے، لیکن نصیحت کے طور پر کہتی ہے:۔

| اصل اشعار | مطلب |
|---|---|
| تو چنچل چتر نار اتنی سی ہے | تو اتنی سی بڑی چالاک اور چلتر ہے |
| بڑی چھند بھری بھوت فتنی سی ہے | تجھ میں بڑے گن بھرے ہوئے ہیں اور بڑی فتنہ ہے ۔ |
| یو کیسا اہے عشق جو توں کری | یہ کیسا عشق ہے جو توں نے کیا ہے |
| بھلی ہے توں شاباش جو نیں ڈری | شاباش تجھ پر جو ذرا نہیں ڈری |
| پرت پنت میں توں نوی آئی ہے | محبت کے کوچے میں تو نئی نئی آئی ہے |
| اجھوں نیہ کے چر کے نہیں پائی ہے | ابھی تو نے عشق کے چرکے نہیں کھائے ہیں |
| عشق بازی دھن کچھ نھنا کام نیں | عشق بازی کوئی معمولی بات نہیں |
| نھنی ہے تو اجنوں تجے فام نیں | تو ابھی بچی ہے تجھے ابھی سمجھ بوجھ نہیں ہے |
| کچی توں تجے بد کچی آئی ہے | تو خود بھی کچی ہے اور تیری عقل بھی کچی ہے |
| کہ کانداں کے نقشاں سوں جیو لائی ہے | کہ دیوار کی نقاشی سے دل لگایا ہے |
| توں اس نقش سو عشق سازی اہے | تو نے اس نقش سے عشق بازی کی ہے |
| یو نیہ نیں ہے طفلاں کی بازی اہے | یہ عشق نہیں ہے بچوں کا کھیل ہے |
| عشق کیا ہے کر کے پہچانی ہے توں | تو نے عشق کیا سمجھ کر کیا ہے |
| گڑیاں کا مگر کھیل جانی ہے توں | کیا تو اسے گڑیوں کا کھیل سمجھی ہے |
| انگے عشق کیا ہے سو جانے گی توں | عشق کیا ہے یہ آگے چل کر معلوم ہوگا |
| بڑی ہوے گی تو پچانے گی توں | بڑی ہوگی تو سمجھے گی کہ یہ کیا ہے |

تؤں صوُرت منے جیو کیا لائی ہے — تؤنے صوُرت سے کیا دِل لگایا ہے
تؤں صوُرت منے معنی کیا پائی ہے — تؤنے صورت میں کیا جوہر دیکھا ہے
اگر معنی سوں جیو تؤں لائے گی — گر تو، حُسنِ سیرت سے دل لگائے گی
تو صورت تھے پھل بھی تؤں کچ پائے گی — تو، پھر صوُرت بھی کچھ پھل پائے گی

اس کے جواب میں مشتری کہتی ہے کہ مَیں نے اس صورت میں کچھ حسنِ سیرت بھی دیکھا ہے تبھی تو اس سے دل لگایا ہے۔ میرا تو یہ حال ہے اور اس پر تو، میرے پیچھے پڑی ہے۔ سچ ہے دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ تیری یہ دل سوزی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ مَیں دیوانی ہوں۔ مجھے پند نہیں بھاتی۔ غرض اس طرح کہتے کہتے آخر میں یہ کہتی ہے:۔

| اصل | مطلب |
|---|---|
| غرض ایسی باتاں سے کیا ہے تجے | تجھے ایسی باتوں سے کیا حاصل |
| نصیبا منے تھا سو انپڑیا مجھے | جو میرے نصیبوں میں تھا وہ مجھے ملا |
| نہ کوئی عشق کوں لا نہارا اہے | عشق کسی کے لانے سے نہیں آتا ہے |
| کہ یو عشق آئے آ نہارا اہے | یہ تو خود بہ خود ہی آتا ہے |
| جہاں عشق ہے واں ہے حیران سب | جہاں عشق ہے وہاں سب حیران ہیں |
| اخل ہور فہم سد بد گیان سب | عقل فہم سد بد علم سب جاتے رہتے ہیں |
| نہ جاسی پرت منج تے اب چھوٹ کر | اب محبت مجھ سے نہیں چھوٹ سکتی |
| کہ دل لے گیا ہے مرا لوٹ کر | وہ میرا دل لوٹ لے گیا ہے |
| بو فریاد مَیں کس کنے جا کروں | اب مَیں اپنی فریاد کس کو جا کر سناؤں |
| نہ ہونا اتھا ہور ہوا، کیا کروں | جو نہ ہوتا وہ ہو گیا، اب کیا کر سکتی ہوں |

اس میں خوبی یہ ہے کہ دونوں کی گفتگو موقع کے مناسب اور موافقِ فطرت

ہی اور کسی قسم کا تصنع یا تکلف نہیں پایا جاتا۔ اس قسم کی باتیں وہ بے تکلفی سے کئی جگہ لکھ گیا مثلاً

| اصل | مطلب |
| --- | --- |
| جو عاجز ہو دکھلائے عاشق نیاز | جب عاشق عاجز ہو کر نیاز دکھاتا ہی |
| تو معشوق کرتا ہی تیڑ پیچ ناز | تو معشوق ناز سے ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں کرتا ہی۔ |
| کہ خوباں میں عادت سو اس دھات ہی | کہ حسینوں میں اس قسم کی عادت ہوتی ہی |
| چھپی نیں ہی مشہور یہ بات ہی | یہ بات چھپی نہیں سب جانتے ہیں |

شہ زادے کے ہجر میں مشتری کی بے تابی اور اس کی آہ و فریاد کا بیان خوب لکھا ہی :-

| اصل | مطلب |
| --- | --- |
| کہاں ہی وہ شہ نرملا نوجواں | وہ بے مثل نوجوان شہ کہاں ہی |
| کہاں ہی وہ شہ گنونتا گن ندھاں | وہ گُن بھرا ہُنر کا گنج کہاں ہی |
| کہاں ہی وہ لالن مٹھی چال کا | وہ دل کش چال والا محبوب کہاں ہی |
| کہاں ہی وہ ساجن لنبے بال کا | وہ لمبے بالوں والا معشوق کہاں ہی |
| کہاں وہ چتر چنچلا من ہرن | وہ چنچل چالاک دل ربا کہاں ہی |
| کہاں وہ سگھڑ اچپلا ہی سجن | وہ باسلیقہ اچپل کہاں ہی |
| نہ منج دیس ہی سُکھ نہ منج رات | مجھے نہ دن کو سُکھ ہی نہ رات کو |
| نہ جانوں کہ گُمتا ہی شہ کس سنگات | نہ معلوم شہ کس کے ساتھ عیش کر رہا ہی |
| جکوئی نار اُس گن ہی اُس نار تھی | اگر اس کے ساتھ کوئی عورت ہی تو میں |
| منجے رشک آتی ہی اُس ٹھار تھی | یہیں سے اُس عورت پر رشک کرتی ہوں |

| | |
|---|---|
| ہوے جل کجل نین دیدار باج | میری آنکھیں تیرے دیدار بغیر جل بجھی ہیں۔ |
| یکیلی کدھاں لگ رہوں یار باج | اب میں یار کے بغیر اکیلی کب تک رہوں |
| رتن تھی سو تن پر انگارے ہوئے | تن پر جو جواہر ہیں وہ انگارے معلوم ہوتے ہیں |
| کہ مکھ چاند انجھو سو تارے ہوئے | چہرہ چاند اور آنسو تارے ہیں۔ |
| ہریک روں میرے تن پہ جیوں ناگ ہے | میرے تن کا ہر ایک رواں مثل ناگ کے ہے |
| سُنا تھا اوّل سو اتال آگ ہے | پہلے سونا تھا اور اب آگ ہے |
| کہی شاہ کے تیئں سو دھن یاد کر | اس حسینہ نے شاہ کو یاد کر کے کہا |
| دُکھیا جیو میرے کوں ٹک شاد کر | کہ اے شہ میرے دُکھے دل کو شاد کر |
| منجے تیرے ملنے کی لئی آس ہے | مجھے تیرے ملنے کی بہت آس ہے |
| کہ تن منج کنے جیو تج پاس ہے | میرا تن تو میرے پاس ہے اور دل تیرے پاس ہے۔ |
| چھڑا منج برہے کے تو جنجال تھی | تو مجھے فراق کے جنجال سے چھڑا |
| نوں غافل نکو اچ مرے حال تھی | اور میرے حال سے غافل نہ رہ |
| گیا ہے برہ زیاستی داد دے | فراق نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے تو فریاد کو پہنچ |
| پریشاں ہے جیو دل شاد دے | میرا دل پریشان ہے تو اسے شاد کر |
| کہ کوئی داد دیسی نہ تج باج منج | کیوں کہ تیرے سوا کوئی میری داد کو پہنچنے والا نہیں |
| عجب کام آکر پڑیا آج منج | مجھ پر اب برا وقت آپڑا ہے |
| محبت میں جو زیاست سو زیاست ہے | بڑا وہی ہے جو محبت میں بڑا ہے |
| کہی بات میں راست ہور راست ہے | میں نے یہ سچی بات کہی ہے اور یہ سچ ہے |

تشبیہیں اور استعارے بھی بہت صاف اور دلچسپ لکھے ہیں۔ مثلاً زلفیں

چہرے پر بکھر گئی ہیں تو اُن کالے بالوں میں دو آنکھیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے دو مچھلیاں جو جال میں پھنس گئی ہوں ؎

چھبیں نین اس کیس کالے منے      کہ مچھلیاں دو سینٹریاں ہیں جالے منے

اسی کی تشبیہ ایک دوسری طرح بیان کرتا ہی آنکھیں بالوں میں اس طرح چمکتی ہیں جیسے بادلوں میں بجلی ؎

اُچھلتیاں ہیں بجلیاں ابھالاں تلے      کہ نیناں جھمکے ہیں بالاں تلے

معشوق کے بدن پر گوہر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے سرو پر جگنو ؎

سو دھن کے تن اوپر دسے یوں گہر      کہ بیٹھے ہیں جگنے مگر سرو پر

معشوق گھوڑے پر سوار ہوتی ہی تو اس کی کئی تشبیہیں دی ہیں جیسے دھنویں میں روشن انگارہ یا ناگ کے سر پر من یا جیسے کوّے پر مور بیٹھا ہو یا جیسے اندھیری رات میں مشعل ؎

ہوئی سار شب رنگ ترنگ ہر دو بار      دھویں میں اچھیں جیوں جھمکتا انگار
پدم جگمگے جوت سوں ناگ پر      کہ طاؤس بیٹھا مگر کاگ پر
سو شب رنگ ترنگ پر اچھے ناز یوں      کہ مشعل دسے رات اندھاری میں جیوں

پیٹھ پر پڑی ہوئی چوٹی کو لکھتا ہی کہ گویا تختی پر خط ثلث کا الف ہی ؎

رہی چوٹی یوں پیٹ پر چھب سوں آ      پٹی پر اچھے جیوں الف ثلث کا

ایک جگہ لکھتا ہی کہ بادشاہ کے انصاف سے دکھن ایسا آباد ہی جیسے پانی سے چمن ؎

بسا شہ کے انصاف تی یوں دکھن      کہ بستا ہی پانی سے جوں پھول بن

کہیں کہیں دکھنی یا عام ضرب الامثال بھی استعمال کی ہیں۔ مثلاً

یہ قصا وہ مسلا ہوا دکھنی      بھروسے کرے بھینس کٹرا جنی

یا

وہ قصّا کہ مسکے کوں دانت آئے ہیں

یا

کُوا کھودے پر کاج اپے ڈب مرے

یا

اگے بائیں ہی ہور پیچھیں کوا

قدیم دکھنی شاعر شعر کے وزن کی خاطر لفظ کو بُری طرح توڑ مروڑ دیتے ہیں۔ ضرورتِ شعری ایک چیز ہی لیکن یہ حضرات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ان کے ہاں حرف کا گِر جانا معمولی بات ہی جیسے

توں آدم کے فرزند کوں کھانے مدام

ہنرسیک ہُنروند ہوا سب منے

ان دونوں مصرعوں میں د گِر جاتی ہی۔

ع جکوئی یار سوں اختیار ہوے گا

اس میں ہ صاف اُڑ گئی ہی۔

ے مجھے سوں ہی اس رنگ بھرے گال کی

دو رنگ تھے اُسے رنگ سیہ ہور سفید

ان دونوں مصرعوں میں گ غائب ہی۔ غرض اس قسم کی مثالیں بہت ہیں ؛

حرکات و سکنات میں بے تکلف ردّ و بدل کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس مثنوی میں آپ دیکھیں گے کہ عقل، وقت، صبح، مرد، عشق، اصل، شرم، شرط، طرز، درد، شعر کے درمیانی حروف کو فتح کے ساتھ استعمال کیا ہی۔ اسی طرح جہاں فتح ہی وہاں ساکن کو دیتے ہیں جیسے غرض کو غرْض ؛

اسی طرح وہ ضرورت کے وقت امالہ اور حذف کو بھی کام میں لاتے ہیں مثلاً

| | | |
|---|---|---|
| کروڑ | کو | کرڑ |
| عطارد | " | عطارید |
| سر | " | سیر |
| سورج | " | سوریج |
| تج | " | تج ، توج |
| کچ | " | کچھ ، کوچ |
| بغیر | " | بغر |

بعض اوقات لکھتے تو پورا لفظ ہیں مگر پڑھتے اسے حذف کے ساتھ ہیں۔ جیسے کوئی کو کئی یا صورت کو صُرت - یہ سب ضرورتِ شعری میں داخل ہیں ؛

قدیم دکھنی شاعروں اور ادیبوں میں ایک بات اَور پائی جاتی ہو کہ لفظ جیسے وہ بولتے ہیں ویسے ہی لکھتے بھی ہیں - جیسے :-

| | | |
|---|---|---|
| ملمّا | بجائے | ملمع |
| اخل | " | عقل |
| صفے | " | صفحے |
| خیریز | " | خارج |
| وخت | " | وقت |
| منا | " | منع |
| نخس | " | نقش |
| مستید | " | مستعد |
| نفا | " | نفع |

| | | |
|---|---|---|
| وضا | بجائے | وضع |
| ملاذا | " | ملاحظہ |

قدیم دکھنی کتابیں پڑھتے وقت ایک بات کا اور خیال رکھنا چاہیے کہ اس وقت بہت سے الفاظ کا تلفّظ آج کل کے تلفظ یا تحریری صورت سے مختلف تھا مثلاً ان کی ماضی مطلق میں آخری الف سے پہلے ی ضرور ہوتی ہے جیسے ملیا، رہیا، سنیا وغیرہ، لیکن ان لفظوں کے تلفّظ میں ی کا تلفظ الگ نہیں ہے بلکہ یہ یائے مخلوط ہے اور اپنے پہلے حرف سے مل کر بولی جاتی ہے۔ یعنی اس طرح کہ وزن میں ملا اور ملیا سُنا اور سُنیا ایک ہوں گے۔ یہی حال جمع کا ہے۔ دکھنی جمع ان سے بنتی ہے جیسے ہتیاں (ہاتھی)، بڈھیاں (بڈّھے) وغیرہ۔ ان کی ی بھی مخلوط سمجھنی چاہیے ؎

اگر ان چند باتوں کا خیال رکھا جائے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو بعض مصرعے جو بہ ظاہر ناموزوں معلوم ہوتے ہیں ناموزوں نہیں رہیں گے ؎

مثنوی کے بیان میں موقع موقع سے چند غزلیں بھی آگئی ہیں۔ یہ غزلیں خود وجہی کی ہیں۔ ان میں زبان اور خیال دونوں اعتبار سے ہندی کا پورا اثر پایا جاتا ہے۔ زبان سادہ اور شیریں ہے، الفاظ زیادہ تر ہندی ہیں اور بعض فارسی عربی لفظوں کو ہندی لب ولہجے میں ڈھال کر ہندی بنالیا ہے۔ عاشق عورت ہے اور مرد معشوق فارسی ہندی الفاظ کا تناسب ایک اور اڑھائی کا پڑتا ہے۔ اور یہی ساری مثنوی کا حال ہے۔ یہ گویا اُردو کی ابتدائی ترقی یافتہ صورت ہے ؎

اس مثنوی سے ایک یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنا تخلص "وجہی" اور "وجیہی" دونوں طرح لکھتا ہے ؎

یہ مثنوی مَیں نے دو نسخوں سے مرتب کی ہے۔ ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے جو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے لیکن ناقص اور نامکمل ہے اور اوّل و آخر اور بیچ بیچ میں

سے ورق غائب ہیں۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن کا ہی جس کا عکس منگا لیا گیا تھا۔ ان دونوں نسخوں سے مقابلہ کر کے یہ نسخہ ترتیب دیا گیا ہی۔ چوں کہ میرا نسخہ ناقص ہی۔ اس لیے بعض مصرعے صاف نہیں ہوئے اور جیسے برٹش میوزیم کے نسخے میں تھے ویسے ہی لکھ دیے گئے۔ جہاں تک میرے نسخے نے ساتھ دیا تصحیح میں دقت نہیں ہوئی ؛

میرے نسخے کی دو خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زیادہ بڑا ہی یعنی اس میں بعض بیان ایسے ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں نہیں۔ مثلاً سفر میں شہزادے کو جو مہمیں پیش آئی ہیں وہ لندن والے نسخے میں صرف دو ہیں، اژدہے اور دیو کی لڑائی۔ لیکن میرے نسخے میں سی مُرغ کا بھی مقابلہ ہی۔ اسی طرح اور بھی کئی مقامات میں اضافہ ہی۔ اگر یہ بیانات مکمل ہوتے تو میں مثنوی کے متن میں شامل کر دیتا، اس لیے مجبوراً جتنا حصّہ موجود ہی وہ ضمیمے کے طور پر اضافہ کر دیا گیا ہی۔ بعض بعض مقامات پر اشعار بھی زیادہ ہیں، وہ شعر داخل کر دیے گئے ہیں اور ان کے شروع میں (ن) لکھ دیا گیا ہی تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ میرے نسخے سے لیے گئے ہیں۔ میرے نسخے میں ایک غزل بھی زائد نکلی جو داخل کر دی گئی ہی۔ کتاب کے حاشیے میں جو لفظ دیے گئے ہیں وہ میرے نسخے میں ان لفظوں کا بدل ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں ہیں اور پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ میرے نسخے کے لفظ زیادہ مناسب اور برمحل ہیں۔ ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہی کہ اس کا رسم الخط عجیب قسم کا ہی۔ خط نسخ ہی لیکن الفاظ میں اکثر حروفِ علّت کا کام اعراب سے لیا ہی۔ خصوصاً ان حروفِ علّت کے لیے جو لفظ کے آخر میں آئے ہیں۔ مثلاً اس مصرعے کو "جو بے ربط بولے تو بیتاں بچیں" یوں لکھا ہی "جوبِ ربط بولِ توں بیتاں بچیں" ؛

مَیں نے اس رسمِ خط کا عکسی نمونہ بھی کتاب میں دے دیا ہے۔

چوں کہ کتاب قدیم زبان میں ہے، اس میں بہت سے نامانوس اور غریب الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا سمجھنا دشوار ہے، خاص کر ٹھیٹ دکھنی لفظ جن کا سمجھنا سب سے مشکل ہے۔ اس لیے کتاب کے آخر میں ایسے الفاظ کی ایک فرہنگ بھی لکھ دی ہے۔

# مقدمۂ گلشنِ عشق،

عادل شاہی خاندان کے فرماں رواؤں نے اپنے زمانے میں علم و ہُنر کی بڑی سرپرستی کی۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر یوسف عادل شاہ نے بیجا پور میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ (سنہ ۱۵۱۱ء - ۸۹۵ھ) اس کی وفات پر اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت پر بیٹھا۔ اسمٰعیل کے بعد ابراہیم عادل شاہ اوّل (سنہ ۹۴۱ھ) اور اس کا جانشین علی عادل شاہ اوّل (سنہ ۹۶۵ھ - ۱۵۵۷ء) ہوا۔ یہ بادشاہ بڑا اولوالعزم اور قدردانِ علم و ہُنر تھا۔ اس کے جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی (سنہ ۹۸۸ھ - ۱۵۷۹ء) کے وقت ملک کے عروج و فروغ، رعیت کی خوش حالی اور علم و کمال کی سرپرستی برابر قائم رہی۔ علمی دنیا میں "نورس نامہ" اس کی بڑی یادگار ہے۔ اس کے بعد اگرچہ محمد عادل شاہ کے عہد (سنہ ۱۰۳۷ھ - ۱۶۲۸ء) میں ایک طرف شیواجی اور دوسری طرف شاہ جہاں کی للچائی ہوئی نظریں بیجا پور پر پڑ رہی تھیں۔ تاہم اس کے عہد میں بھی اُردو کے بعض اچھے شاعر گزرے ہیں۔ محمد عادل شاہ کی وفات پر علی عادل شاہ ثانی تخت پر بیٹھا۔ (۱۰۶۷ھ - ۱۶۵۶ء)

علی عادل شاہ ثانی کے زمانے میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا۔ دکنی اُردو کو اُس زمانے میں بڑا فروغ ہوا۔ بادشاہ خود بڑا سخن سنج اور خوش گو شاعر تھا۔

خوش کلام شعرا کی قدر کرتا تھا۔ اور بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنی ملکی زبان دکنی اُردو کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اور اس کے کلام سے جو ہمیں دست یاب ہوا ہے اس کے صحیح ذوق کا پتا لگتا ہے۔ صاحبِ 'بساتین السلاطین' لکھتے ہیں :۔

"در عہدِ ہمایونش سخن ورانِ فارسی گو چند فرد نادر روزگار بودند اما چوں طبع ہمایوں بادشاہ اکثر میل بہ جانب لغت خاص خویش یعنی زبان دکنی داشت ۔ برطبق النّاس علیٰ دین ملوکہم شعرائے ہندی گو بسیار از خاک بیجاپوری برخواستہ اند، خانہ بہ خانہ ہنگامۂ شعر تازہ گوی گرم داشتہ اند" ؎

"لغت خاص خویش" کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ شخصی حکومتوں میں اکثر اوقات بادشاہ جدّت و بدعت کا سرچشمہ ہو جاتا ہے۔ جدھر اس کا میلان دیکھتے ہیں اُدھر ہی سب ڈھل جاتے ہیں اور اس کی مرضی مذہب، رسم و رواج وغیرہ سب پر غالب آجاتی ہے۔ علی عادل شاہ کا یہ رجحان دیکھ کر لوگوں کا شوق بڑھا اور دکنی شاعری عام ہوگئی۔ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں دکنی اُردو کے بہت شاعر گزرے ہیں لیکن ان سب میں نصرتی کا پایہ بہت بلند ہے اور رزم و بزم دونوں کا اُستاد ہے ؎

مصنّف تذکرہ شعرائے دکن نے نصرتی کا نام محمّد نصرت لکھا ہے۔ گارساں دتاسی نے 'گلشنِ عشق' کے ایک قلمی نسخے کی سند پر اسے برہمن بتایا ہے۔ سر چارلس لائل نے 'ان سائی کلوپی ڈیا برٹنی کا' میں اپنے مضمون 'ہندستانی' میں اُسے برہمن لکھا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ خود اس کے کلام سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ نیز میں نے ذاتی طور پر اس کے خاندان کے حالات کی جو تحقیق کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسل مسلمان

تھا۔ اس پر مَیں نے اپنی تالیف 'نصرتی' میں تفصیل سے بحث کی ہے:
'گلشنِ عشق' میں نصرتی نے اپنی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لیے وہ اپنے والد کا ممنون ہے۔ بادشاہ کے دربار میں پہنچنے کا واقعہ اس نے اس طرح لکھا ہے کہ جب مَیں تعلیم و تربیت پا چکا تو میری تقدیر چمکی۔ بادشاہ شہ زادگی کے زمانے میں مجھ پر مہربان تھا۔ اب جو تخت پر بیٹھا اور عین کام رانی و جہاں بانی کا عالم تھا تو:

بُلا بھیج بندے کو اس سال میں — نظر کر مرے بے بہا مال میں
پرکھتا چلیا یو رتن سر بہ سر — مجھے دیکھ پارکھ یو اہلِ نظر
وہیں جگ میں بندہ رہے بے نیاز — رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

بادشاہ چوں کہ خود ایک خوش مذاق اور خوش گو شاعر تھے۔ اس لیے نصرتی جگہ جگہ اپنے تئیں بادشاہ کا شاگرد ظاہر کرتا ہے۔ اسے نصرتی کی شاہی عقیدت مندی پر محمول کرنا چاہیے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا۔ چناں چہ کہتا ہے:

بحمداللہ کیا مجھ بڑے بخت آج — نہ اُستاد کوئی مجھ علی شہ کے باج

صاحب 'بساتین' نے نصرتی کی بدیہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز بادشاہ محل میں رونق افروز تھے اور حوض میں فوّارہ عجیب بہار دے رہا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا:۔ ؎

اُڑتا سو یو فوّارہ پانی کا کیا چنچل ہے

ملّا نصرتی نے فوراً جواب میں یہ مصرع کہا:۔ ؎

'تجھ شاہ پر اُڑانے موتی کا مورچھل ہے

نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور

سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا اور بڑی عمر پائی ؛

نصرتی کی تصانیف جو اب تک ہمیں دست یاب ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:
(۱) 'گلشنِ عشق'، (۲) 'علی نامہ' (۳) 'تاریخِ سکندری'، (۴) قصائد، غزلیات، رباعیات ؛

'علی نامہ' ایک رزمیہ نظم ہے جس میں اُن مہمات کا ذکر ہے جو علی عادل شاہ کو شیواجی کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے، سرحدی صوبوں کی غداری کو کچلنے اور مغلوں کے فوجی سیلاب کو پیچھے ہٹانے میں پیش آئیں۔ یہ نظم خاصی طویل اور دکھنی شاعری کا شہ کار ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعد کی اُردو زبان میں بھی ایسی پُرزور اور پُرشکوہ رزمیہ نظم نہیں ہے ؛

'تاریخِ سکندری'، ایک مختصر رزمیہ مثنوی ہے جس میں بیجاپور کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ کی فوج اور شیواجی کے لشکر کی لڑائی کا حال ہے۔ یہ نایاب کتاب ہے اس کا صرف ایک نسخہ ہے جو میرے کتاب خانے میں ہے ؛

'گلشنِ عشق'، نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے اور ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں بھی اُردو فارسی کی اکثر مثنویوں کی طرح دیووں اور پریوں اور سحر و طلسمات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر لی جائے تو یہ مثنوی دکنی اُردو میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور حُسنِ شاعری کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اکثر باب کے شروع میں مختلف قدرتی مناظر کا سماں دکھاتا ہے۔ اور قصے کے ضمن میں جو بعض حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ان کی تصویر خوب کھینچتا ہے۔ مثلاً جہاز کے سفر میں کشتی کا حال طوفان کا زور شور، باغ اور پرندوں کی کیفیت، شادی بیاہ کا حال، برف باری کی کیفیت، کھانوں کی تفصیل وغیرہ۔ اسی طرح طلوع و غروبِ آفتاب، چاندنی کا سماں موقع موقع

سے خوب بیان کیا ہی :-

انسانی جذبات کی کیفیت بھی ہر موقع پر خوبی سے دکھائی ہی۔ اکثر ابواب کے خاتمے پر نصیحت آمیز اشعار لکھ جاتا ہی۔ کلام میں طوٗل ضرور ہی۔ ایک اُبلتا ہُوا چشمہ ہی جس کا روکنا مشکل ہی۔ لیکن اس طوٗل سے بعض اوقات طبیعت مکدّر ہو جاتی ہی۔ نموٗنے کے طور پر بعض مقامات کے چند شعر لکھتا ہوں جن سے اس کے کلام کی خوٗبی کا اندازہ ہوگا :-

عقل کو وہ نصف الکرامت بلکہ فوق الکرامت کہتا ہی۔ عقل ہی شکل کی حل کی کلید ہی اور عقل ہی سے دین و دنیا کے کام چلتے ہیں۔ شعر و سخن کی روشنی عقل ہی کے طفیل میں ہی۔ یہ سب تعریفیں کرتے کرتے آخر میں کہتا ہی ؎

اَٹل عقل کا گرچہ کچ مست ہی    دلے عشق شورہ زبردست ہی
کہ جس ٹھار پر ہوے شرزے کی چال    تو اس ٹھار گج کا چلے کیا مجال

اس کے بعد ہی عشق کی مدح شروع کرتا ہی۔ ایک شعر اس میں یہ ہی ؎

نصیحت کو تجھ شہر میں غدر ہی    ترے ملک میں صبر بے قدر ہی

فقیری کے بیان میں اُس کے لوازمات اُسی نوعیت کے بیان کیے ہیں جو دیا شنکر نسیم کا رنگ ہی۔ نسیم اگر اسے لکھتے تو بلاشبہ اسی طرح لکھتے جیسے محنت کی گدڑی زیبِ بدن کی، توکّل کی کچکول ہاتھ میں لی، قناعت کی راکھ بدن پر ملی اور آہ کا سنکھ ساتھ لیا۔ وغیرہ وغیرہ ؎

کنٹھا سخت محنت کا اب گل کیا    سو کچکول ثابت توکّل کیا
چڑایا سو تن پر قناعت کی راک    سُن کے کر لیا آہ کے دم کی ھاک
صبوری کے مُدرے دیا گوش کوں    کیا حلم زنبیل ادک ہوش سوں

ایک باغ کے بیان میں لکھتا ہی ؎

سہیں حوض پر ہو چمن میں ہرے — طبق سبز میں جام جوں مے بھرے
بہتا تھا چمناں میں چو گرد آب — او لبریز تھا جام تی تس شراب
دہی ہو ہریک رکھ کے تن میں اُتر — متے ہو کے جھولتے تھے ات بے خبر
سہاویں کلیاں یوں کنول کیاں سرنگ — کو پیاں چین کیاں مے بھریاں رنگ رنگ
لٹاں چھوڑ سنبل کی خوش بالکیاں — نگاراں ڈولیں مست پھل ڈال کیاں
رہی تھک ہو جب بن خماری کے ساتھ — صبا باؤ کے ہت سوں ہنسنے کے دھات
کلیاں پر ٹھنڈا نیر سٹ چھب سوں دیں — ہنسا تس مکدرا نیندیاں کے تئیں
کریں بزم کوں تازہ پھر بے درنگ — دھرے جشن میں سوتے خوش راگ رنگ
ہو مطرب پون برگ کا دف بجائے — پپیا و کوئل نوی تان آ چائے
سو سرخاں دیویں کھینچ سرخوش گلا — کریں کوک کو کے دلاں بتلا
لگے ناچنے مھور ہو بے خبر — کریں حال لوٹن نکل رقص پر
ہو ادھر کبوتر کو لاٹاں میں آئے — پراں جوڑ تالیاں سوں دسنک بجائے

آج کل کی زبان میں یوں کہیں گے :-

اُس سبززمین میں حوض بھرے بھرے ایسے پیارے معلوم ہوتے تھے جیسے ہرے طبق میں شراب بھرے پیالے - چمنوں میں چوطرف پانی نہیں بہ رہا تھا بلکہ جامِ مے شراب سے لب ریز تھا اور وہ شراب بہ بہ کر درختوں کے رگ و پے میں پہنچ رہی تھی جس کی مستی سے درخت مدہوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے کنول کی خوب صورت کلیاں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں جیسے چینی کے شیشوں میں رنگ بہ رنگ شراب - سنبل نے اپنی زلفیں چھوڑ رکھی تھیں اور پھولوں کی ڈالیاں معشوقوں کی طرح مست جھوم رہی تھیں - جب سارا باغ مستی سے بے حس ہوگیا تو بادِ صبا نے از راہِ تفنّن خاص ادا سے کلیوں پر ٹھنڈا پانی چھڑکا اور وہ

مخمور (چمن) کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر بزم از سرِ نو تازہ ہوگئی اور راگ رنگ کا دَور شروع ہوا۔ ہوا نے مطرب بن کر پتّوں کا دف بجانا شروع کیا اور کوئلیں اور پپیہے تانے اُڑانے لگے۔ مور ناچنے لگے۔ کبوتروں نے قلا بازیاں کھائیں، فاختہ کوکو کرنے لگی۔ وغیرہ وغیرہ

چاندنی کی کیفیت کے چند شعر دیکھیے ؎

ڈوباتی او نیلاب مغرب میں رخش ۔۔۔ نکل آئی نس ہو ہتو وصل بخش

چندر پاک چھاتی تی دھویا غبار ۔۔۔ سُورج کا ہوا آئینہ تاب دار

دیے جلوہ خوش نس پتی کے حضور ۔۔۔ کیا پردہ پردہ نشیناں سے دُور

کنگن پر نہ ہو ٹھار تارا دسے ۔۔۔ کٹورے بھریا سب او پارا دسے

صفائی سوں چندنے کے چار درخن ۔۔۔ جھلکتی بھوئیں صاف ابرک نمن

فلک اور زمیں پر اتھے نوُر میں ۔۔۔ چھپیا تھا جتا مشک کافور میں

نگر کھم پہ چادر مرصّع کی سٹ ۔۔۔ زمیں پر بچھائے تھے اجلا نکٹ

پون اب وطن میں دھریا تھا قرار ۔۔۔ نہ کوئی بات ہلنا اتھا بن منجھار

کھڑا تھا سب اس دھات حوضاں میں نیر ۔۔۔ مگر دُودکا کر رکھے تھے پنیر

جس کے معنی یہ ہیں :-

رات نے اپنا مشکی گھوڑا مغرب کے دریا میں ڈالا اور وصل بخش دوست بن کر نکلی۔ پاک صاف چاند نے اپنی چھاتی سے غبار دھویا اور سورج کا آئینہ (بدر) روشن ہُوا۔ تاج دارِ شب (بدر) کے حضور جلوہ دکھانے کے لیے پردہ نشینوں نے پردے اُٹھا دیے۔ آسمان پر کہیں کوئی تارا نظر نہ آتا تھا وہ بالکل ایک پارہ بھرا کٹورہ معلوم ہوتا تھا۔ چاندنی کی براقی سے چاروں طرف زمین کی طرح چمک رہی تھی۔ زمین اور آسمان نور سے بھرپور تھے، جس قدر

سیاہی تھی وہ سب کافور (روشنی) میں چھپ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان پر مرصّع چادر تان دی ہے اور زمین پر روپہلا فرش بچھا ہوا ہے۔ اُس وقت کوئی پتّا تک نہیں ہلتا تھا شاید ہَوا وہاں سے رخصت ہوگئی تھی۔ ڈالیوں پر پھول پھل ایسے بھلے معلوم ہوتے تھے جیسے دودھ بھرے چینی کے پیالے۔ حوضوں میں پانی اس طرح ساکت کھڑا تھا گویا دودھ کا پنیر بنا کر رکھ دیا ہے ؛

چاندنی کی کیفیت کیسے اچھے اشعاروں میں بیان کی ہے۔ بدر کو سوُرج کا آئینہ اور تاج دارِ شب سے تعبیر کیا ہے۔ ہَوا نام کو نہ تھی، کہیں کوئی پتّا تک نہیں ہلتا تھا اور حوضوں کا پانی اس طرح ساکت تھا گویا دودھ کا پنیر بن گیا ہے۔ کیا اچھی تشبیہ ہے۔ یعنی پانی براق چاندنی کی وجہ سے دودھ معلوم ہوتا تھا اور ہَوا کے نہ ہونے سے یہ دودھ پنیر نظر آتا تھا ؛

نصرتی نے کنور کے ہجر کی حالت بہت تفصیل سے لکھی ہے۔ بعض وقت طول عیب کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ چند شعر اس مقام کے لکھے جاتے ہیں :-

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھائے — نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگ آئے

دسے دیس تو نس اندھاری مجھے — رین کال دوزخ تی بھاری مجھے

انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھائے — وگر موچتا ہوں تو یوں خوف آئے

کہ مت پھر پڑے خواب دندی سوں سنگ — سٹے پھر کے خرمن ہیں من کے انگ

پڑیا آہ ماہی نمن مجھ رہنا — گنوانا زباں ہور نہ چک موچنا

بیان صاف ہے یعنی : نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کسی کی بات سُن کر جی خوش ہوتا ہے۔ دن رات سے بھی زیادہ کالا معلوم ہوتا ہے اور رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک۔ آنکھیں کھولنا ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھاتا اور اگر بند کرتا ہوں تو ڈر ہے کہ کہیں پھر وہی دشمنِ جاں

خواب میں نہ آجائے اور میرے دل کے خرمن میں آگ نہ لگادے۔ مجھے مچھلی کی طرح پڑا رہنا پڑتا ہی زبان بند اور آنکھیں کھلی ہوئی ؏

اسی کیفیت کو ایک دوسری جگہ بڑی خوبی سے بیان کیا ہی ؎

| | |
|---|---|
| برہ کی اوبالاں جو ہی تن منجھار | ادک جوش سوں جیو کوں ہوے کونڈیار |
| اوساساں نہ کچھ مکھ ستی بھا سکوں | نہ چک تھی انجھو بھار ٹک لا سکوں |
| یکٹ حت رہوں غم سوں کر سر نلار | نہ کوئی بانٹ لے وے مرے دل کا بار |
| ملے دن تو ہر کیوں سہیلیاں سنگات | پڑے پن بچر سل ہو سینے پہ رات |
| ناراین اگن تن پہ سارے لگیں | گلاں سیج کے مجھ انگارے لگیں |
| ادک سوز لگ مجھ تلپنا پڑے | اُسی گھات کے باج تپنا پڑے |
| نہ سنگ زور سوں چھٹ اساساں کا باؤ | دیوے جوش سوں دل کے دریا کوں تاؤ |
| تریاں نین کی تب اُبلنے لگیں | اُمنڈ تن کی خشکی پہ چلنے لگیں |
| ہوئے سیج بھر جل سمندر نمن | پڑے تس گھڑی سخت غوطے میں من |
| بچاری صبا دیکھتے دوڑ آئے | پکڑ ہات ڈبتے کوں کڑکے لگائے |
| رین کل نکھی سنگ بر آئے نا | دیکھن زرد رو دن کوں بھی بھائے نا |
| اچھے نس تو دوزخ تی کالی کٹھن | دسے دن تو روزِ قیامت کا دن |
| مرے سر ٹلیں یوں کٹھن ماہ و سال | خدا بن کہوں کس سوں مجھ دل کا حال |
| کہ ناچار اچھے رودیا کے بدل | سو ہنس کھیل گمناسیکیاں ہیں سگل |
| جو دیکھوں تجھا تو دسے نین ہیں | جو بولوں بچن تو بسے بین ہیں |

"جدائی کی آگ جو تن میں لگی ہوئی ہی اس کے شدید جوش سے دل منقبض رہتا ہی۔ نہ منہ سے آہ نکال سکتی ہوں اور نہ آنکھ سے آنسو بہا سکتی ہوں۔ ہمیشہ تنہا اور غم سے سرنگوں رہتی ہوں کوئی ایسا نہیں جو میرے دل کے بوجھ کو بانٹ لے

دن تو جوں توں سہیلیوں کے ساتھ کٹ جاتا ہی لیکن رات چھاتی پر پہاڑ ہو جاتی ہی لباس وغیرہ بدن پر آگ معلوم ہوتے ہیں اور سیج پر کے پھول انگارے۔ چاند میرے لیے زہر کا پیالہ ہی اور ہر ستارہ میرے دل پر داغ دیتا ہی۔ سوزشِ دروں سے مَیں تڑپتی رہتی ہوں۔ اور اس دُکھ بغیر مجھے قرار بھی نہیں۔ آہوں کا طوفان اس زور سے چلتا ہی کہ دل کا دریا اس سے سخت جوش میں آجاتا ہی۔ تب آنکھوں کی مچھلیاں (آنسو) اُبلنے لگتی ہیں اور اُمنڈ کر تن کی خشکی پر چلنے لگتی ہیں۔ سیج پانی سے بھر کر سمندر ہو جاتی ہی اور اس وقت دل سخت غوطے کھانے لگتا ہی۔ یہ دیکھتے ہی بچاری صبح دوڑی آتی ہی اور ہاتھ پکڑ کر ڈوبتی کو کنارے لگا دیتی ہی۔ سیاہ روُ شب سے صحبت گوارا نہیں اور نہ زرد روُ دن کا دیکھنا بھاتا ہی۔ رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک اور کٹھن ہی اور دن قیامت کا دن ہی۔ یہ کٹھن زمانہ اس طرح مجھ پر گزرتا ہی۔ خدا کے سوا اپنے دل کا حال کس سے کہوں۔ ناچار پاسِ خاطر کے لیے (یعنی دکھانے کو) سہیلیوں میں ہنس کھیل کے وقت گزار دیتی ہوں غور سے دیکھتی ہوں تو وہ آنکھوں میں نظر آتا ہی اور جو بات کرتی ہوں تو بیان میں بسا ہوا ہی۔" اسی موضوع پر میر حسنؔ نے جو کچھ لکھا ہی اس سے مقابلہ کیجیے:

سردی اور تمازتِ آفتاب کا جو بیان اُس نے لکھا ہی اس کے بعض حصّے سودا کے قصیدوں سے لگّا کھاتے ہیں۔ اسی طرح اس نے باغ کی بہار کی جو کیفیت لکھی ہی اس میں بیسیوں پرندوں کا حال، ایک ایک کا نام اور رنگ کے ساتھ بڑی تفصیل سے لکھا ہی اور پھلوں اور پھولوں کا ذِکر بھی اسی شرح و بسط سے کیا ہی۔ شادی کی مجلس، راگ رنگ، رقص و سرود، دعوت اور اُس کے کھانوں کا ذِکر اس تفصیل سے کیا ہی کہ شاید ہی کوئی کھانا، ترکاری، پکوان اور پھل بچا ہو۔ یہی حال آتش بازی کا ہی۔ تمام آتش بازیوں کا ذِکر نام لے لے کر

کرتا ہے اور شادی کے جتنے لوازم اور رسُوم ہیں اُن سب کا ذِکر دل کھول کر کیا ہے۔ اس میں نصرتی نے ہر موقع کے مناسب اس قدر الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی ہیں کہ اس سے اُس کی وسعتِ معلومات اور قدرتِ زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے شاعری کا بڑا زور دکھایا ہے لیکن یہ بیان تصنّع اور آورد سے خالی نہیں ۞

جیسا کہ مَیں پہلے لکھ چکا ہوں یہ نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے جس میں منوہر اور مدمالتی کے عشق کا فسانہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصّہ کہاں سے لیا گیا ہے اس کا معلوم کرنا دشوار ہے کیوں کہ نصرتی نے اس کا کہیں اشارہ نہیں کیا۔ صرف اس قدر لکھا ہے کہ اس کے ایک دوست مسمّٰی نبی ابن عبدالصمد نے اس قصّے کے لکھنے کی ترغیب دی۔ تحقیق سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصّہ اس سے قبل بھی تحریر میں آچکا ہے۔ ایک صاحب شیخ منجھن نامی نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک دست یاب نہیں ہوئی۔ اس کا حوالہ ایک دُوسری کتاب مسمّٰی "قصّۂ کنور منوہر و مدمالت" میں ملتا ہے۔ یہ فارسی مثنوی ہے مصنّف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ البتّہ سنہ تصنیف ۱۰۵۹ ہجری ہے۔ اس میں مصنّف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے اور اپنے قصّے کی بنیاد اسی پر رکھی ہے۞

تیسری کتاب عاقل خاں رازی عالم گیری کی مثنوی 'مہر و ماہ' ہے جو ۱۰۶۵ھ کی تصنیف ہے جیسا کہ وہ خود اپنی مثنوی کے آخر میں لکھتا ہے:ـ

زہجرت یک ہزار و شست و پنج است
کزیں غم نامہ طبعم نقطہ سنج است
چو من ایں داستاں از غم زدم دم
بہ خواں تاریخ آں "دیباچۂ غم"

اس میں بھی یہی قصّہ ہے۔ رازی نے منوہر کو مختصر کر کے مہر کر دیا ہے۔ یہ تینوں کتابیں 'گلشنِ عشق' سے پہلے کی تصنیف ہیں کیوں کہ 'گلشنِ عشق' کا سنہ تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے جیسا کہ خود اس نے مثنوی کے آخر میں تاریخِ تصنیف ایک مصرعِ سے نکالی ہے :ے

دھریا اس کی تاریخ کا جب خیال — وہیں ہاتفِ غیب معجز مقال
کیا اس کی تاریخ یوں ہجرتی — مبارک یو ہے ہدیۂ نصرتی

لیکن بعض شعرا نے اس کے بعد بھی اس فسانے کو نظم کیا ہے۔ ان میں سے ایک حسام الدین حصار کا رہنے والا عالم گیر کے عہد میں ہوا ہے۔ کتاب کا نام 'حسن وعشق' اور اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۱ھ ہے۔ اگرچہ ان سب کتابوں میں قصّہ ایک ہے لیکن ہر مصنّف نے کسی قدر ردّوبدل یا اختصار سے کام لیا ہے۔ ان سب میں 'گلشنِ عشق' بہت جامع اور ضخیم ہے۔ نصرتی نے اصل قصّے میں چنپاوتی اور چندرسین کی داستان ضمنی طور پر بڑی خوبی سے ملائی ہے ؎

میرے پاس اس کتاب کے کئی نسخے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم ۱۰۹۳ھ کا ہے یعنی تصنیف سے ۲۵ سال بعد کا ؎

قصّے کے اختتام کے بعد خاتمۂ کتاب ہے جس میں بادشاہ کی مدح، اپنی مثنوی کی تعریف اور اس کی خصوصیت بیان کی ہے۔ خاص کر دکنی زبان وکلام کا مقابلہ فارسی سے کر کے بڑے مزے کی باتیں کہی ہیں :ے

ہر ایک داستاں بوستاں دل گزیں — ہر یک بیت ہے یک محل جانشیں
معانی کی صورت کی ہے آرسی — دکن کا کیا شعر جوں فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام — دھرے فخر ہندی بچن پر تمام

دگر شعر ہندی کے بعضے ہُنر نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
مَیں اس دو ہُنر کے خلاصے کو پا کیا شعر تازہ دونو فن ملا
دیویں داد سُن فارسی شعرداں جو ہندی منے تو کہے دل سوہاں
ادیکھیا ادک ہو حسد سے کباب رکھے بول اتنا کہ دکھنی کتاب
سمجھ دار کوں خوب سودے سوں کام نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

یہ اشعار صاف زبان میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کلام معانی کی صورت کا آئینہ ہے۔ مَیں نے دکنی شعر کو فارسی شعر کا رتبہ دیا ہے۔ اگرچہ فارسی کا خوش کلام ہندی شعر پر ہمیشہ اپنی فضیلت اور فخر جتاتا ہے لیکن ہندی کلام میں بعض ایسی خوبیاں ہیں جو فارسی میں ادا نہیں ہو سکتیں۔ مَیں نے ان دونوں کی خوبیوں کا نچوڑ پایا ہے اور دونوں حُسن ملا کر تازہ شعر کہا ہے۔ جسے سُن کر فارسی سخن شناس داد دیں گے اور ہندی سُن کر کہے گا کہ "ہاں" البتہ ناتواں ہیں یعنی حاسد حسد سے جل کر کباب ہو جائے گا اور طنز سے کہے گا کہ "دکھنی کتاب" ہے۔ جاننے والے کو اچھے سودے سے کام ہے اُسے دُکان کے سقف و بام سے کیا غرض ؞

یہاں نصرتی نے وہ دعویٰ کیا ہے جس کی اوّلیت کی فضیلت ولی کو دی جاتی ہے۔ نصرتی نے آج سے اڑھائی سو برس پہلے اور ولی سے کم از کم ساٹھ ستّر برس قبل فارسی اور اُردو کے ظاہر و باطن کے میل سے وہ بات پیدا کی ہے جس کی فرمایش شاہ سعداللہ گلشن نے ولی سے کی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت شاعر کے نصرتی کا درجہ ولی سے کہیں بلند ہے۔ جسے اس کی تفصیل درکار ہو وہ میری تالیف 'نصرتی' کا مطالعہ کریں ؞

# مقدمۂ ذکرِ میر

میر تقی میر اُردو کے اُن چند مسلّم اساتذہ میں سے ہیں جن پر اُردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ اہلِ ذوق میر صاحب کے کلام کو سر اور آنکھوں سے لگاتے ہیں اور پڑھ پڑھ کے سر دُھنتے ہیں۔ جب تک یہ زبان دنیا میں قائم ہے یہ ذوق کبھی کم نہ ہوگا۔ میر صاحب خود بھی اسے سمجھتے تھے، کیا کہہ گئے ہیں ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز    تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں، حقیقتِ حال ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اردو ادب کے شائقین میں کون ایسا ہوگا جو اس باکمال شاعر کے حالات سُننے کا مشتاق نہ ہوگا، جس نے اُردو شاعری کو (غزل کی حیثیت سے) انتہائے کمال تک پہنچا دیا تھا اور جس کے بعد اُسے پھر یہ رتبہ کبھی نصیب نہ ہُوا۔ پھر حالات خود اس کے اپنے لکھے ہوئے۔ آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی (تاریخ) میں کہاں۔ مورّخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے، آپ بیتی کے لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے ایک بے ساختہ جملے سے وہ وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدّتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی میسّر نہیں ہوتے۔ ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے اور کچھ کیا بھی ہے اپنی بیتی آپ لکھ جایا کرے تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات اَن مول ہوں۔ 'ذکرِ میر' ایسا ہی اَن مول موتی ہے۔

اُردو میں شعرا کے تذکروں کی کچھ کمی نہیں، اور کون سا تذکرہ ہے جس نے میر صاحب کا ذکر نہ کیا ہو اور ان کی تعریف کے پُل نہ باندھے ہوں۔ مگر حالات کے نام سے وہی چند باتیں ہیں جن سے نہ دل سیر ہوتا ہے اور نہ تحقیق کی پیاس بجھتی ہے۔ بعض ان میں سے میر صاحب کے ہم عصر اور جان پہچان والے بھی ہیں اور بعض ان کے معتقد بھی لیکن وہ کلام کی تعریف کو حالات کی تحقیق پر زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال سے یہ ہے بھی صحیح۔ آدمی فانی ہے کلام باقی ہے۔ مگر کلام کو آدمی سے جو تعلق ہے وہ کیوں کر جُدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کے متعلق بہت سی سُنی سُنائی غلط سلط روایتیں چلی آتی ہیں جن کے پرکھنے کی کوئی کسوٹی نہ تھی۔ اب 'ذکرِ میر' کی بدولت بہت سی باتیں جو اندھیرے میں تھیں اُجالے میں آگئیں ؟

جیسا کہ اُس زمانے میں رواج تھا، میر صاحب نے یہ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ ان کا تذکرۂ 'نکات الشعرا' بھی فارسی ہی میں ہے لیکن 'ذکرِ میر' کی زبان زیادہ رنگین، شیریں اور فصیح ہے۔ کہیں کہیں مسجع اور مقفیٰ ہوگئی ہے مگر سادگی اور بے ساختہ پن اس کا اصلی حُسن ہے جو شروع سے آخر تک جلوہ نما ہے۔ جگہ جگہ اپنے والد اور دُوسرے بزرگوں کے قول یا اُن کی پند و موعظت یا گفتگو جو سراسر حقّانیت اور اخلاق سے مملو ہے ایسی پاکیزہ زبان میں اور ایسے موثّر طریقے سے بیان کی ہے کہ کتاب میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے ؟

میر صاحب کو (جیسا کہ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا) لڑکپن ہی میں یتیمی کا داغ سہنا پڑا اور ظالم پیٹ انھیں وطن سے دلّی کھینچ لایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنتِ مغلیہ کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا اور عقل و ہمّت اور اخلاق استقلال اہلِ ملک سے رخصت ہو چکے تھے ؟

دہلی اگرچہ ہندستان کی جان اور سلطنتِ مغلیہ کی راج دھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیداولی سے کہیں دکھیاری ہے۔ اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد اُن کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی، اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ روز زوال گردوپیش منڈلا رہا تھا۔ بادشاہِ سلامت دست نگر اور امیر اُمراء مضمحل اور پریشان تھے۔ سب سے اوّل نادر شاہ کا حملہ ہوا، حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا۔ نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی ہوس ناک غارت گری نے دلّی کو لوچ کھسوٹ کے ویران و برباد کر دیا تھا۔ ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ دُرّانی کی چڑھائی، پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ حالات میر صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھے اور دیکھے ہی نہیں، اُن کے چرکے سہے اور اُن انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ یہ دلّی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی[1]۔

میر صاحب نے ان تباہیوں اور بربادیوں اور آپس کی خانہ جنگی اور خود غرضیوں کے منظر اپنی آنکھوں دیکھے، ان میں شریک رہے، ان کے زخم کھائے اور پھر انھیں اپنی اس آپ بیتی میں ایسے پُر درد الفاظ میں بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے اپنے اعمال کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ میر صاحب نے ان تمام واقعات اور حالات کو بڑی صحت اور خوبی سے لکھا ہے اور اس زمانے کی تاریخ کے لیے یہ کتاب بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔ بعض مقامات پر وہ مورخ کی حیثیت سے رائے بھی دیتے ہیں۔ مثلاً پانی پت کی آخری جنگ میں مرہٹوں کے طریقۂ جنگ کے

---

[1] مقدمہ انتخاب کلام میر از راقم

متعلق فرماتے ہیں "حقیقت ہر دو لشکر آں کہ اگر دکھنیاں بہ جنگ گریز کہ طورِ قدیم آں ہا بود می جنگیدند، اغلب کہ غالب می گردیدند"۔ ہم اس جگہ تاریخی حالات و واقعات پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ جن لوگوں کو مغلیہ سلطنت کے آخری ایام کی تاریخ کا شوق ہے اُن کے لیے یہ حصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کتاب سے ہمیں میر صاحب کی زندگی کے متعلق کیا کیا نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور کون کون سی غلط فہمیاں رفع ہوتی ہیں:-

۱۔ 'آبِ حیات'، میں نیز 'گلزارِ ابراہیمی' میں میر صاحب کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ میر صاحب اس کتاب میں ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں اور کہیں ایک مقام پر بھی میر عبداللہ نہیں آیا۔ والد کی عادات و خصائل، اشغال و افکار، اخلاق و اطوار کو بڑی خوبی سے لکھا ہے اور سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں "جوان صالح عاشق پیشہ بود، دل گرمی داشت، بہ خطاب علی متقی امتیاز یافت"۔ اس جملے میں خطاب کے لفظ سے کچھ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید اصلی نام کچھ اور ہو۔ ساری کتاب میں کہیں اس کا اشارہ تک نہیں ہے کہ سوائے اس کے اُن کا کوئی اور نام بھی تھا، جہاں کہیں انھوں نے والد کا ذکر کیا ہے تو علی متقی یا درویش کے نام سے کیا ہے۔ سید امان اللہ میر صاحب کے والد کے مریدِ خاص تھے اور گھر بار چھوڑ کر مرشد ہی کے قدموں میں آ پڑے تھے۔ میر صاحب کے بچپن کا زمانہ انھیں کے پاس گزرا، وہ انھیں ہر جگہ عمِّ بزرگوار لکھتے ہیں، وہ ایک درویش سے ملنے جاتے ہیں، میر صاحب بھی ان کے ساتھ ہیں۔ درویش پوچھتا ہے کہ یہ کس کا لڑکا ہے۔ سید امان اللہ جواب دیتے ہیں "فرزند علی متقی" مگر جب باپ کے مرنے کے بعد پہلی بار دلی آئے اور خواجہ محمد باسط نے انھیں نواب صمصام الدولہ امیر الامراء کے ہاں پیش کیا اور امیر الامرا نے دریافت کیا

کہ یہ کس کا لڑکا ہی تو خواجہ محمد باسط نے کہا میر محمد علی کا۔ اور وہ فوراً پہچان گئے! ان کے والد کا ایک پیر بھائی ایک مدت کے بعد ان سے ملنے آتا ہی، وہ پوچھتے ہیں کہ کیسے آنا ہوا تو وہ کہتا ہی کہ پیر میرے خواب میں آئے اور فرمانے لگے" ..... اما یک بار بر خوردن تو با علی متقی ضرور" غرض ان کے والد کا نام کتاب میں بارہا آیا ہی، میر صاحب کی زبان سے ہو یا کسی دوسرے کی زبان سے، ہر جگہ علی متقی ہی لکھا ہی، سوائے ایک مقام کے جس کا اوپر ذکر ہوا ہی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اصل نام میر محمد علی تھا اور علی متقی بہ طور لقب کے اختیار کیا تھا لیکن میر عبداللہ کہیں نہیں آتا ؛

۲۔ بعض لوگوں نے ان کی سیادت میں بھی شبہہ کیا ہی جس کا ذکر 'آبِ حیات' میں مذکور ہی۔ آزاد نے یہ قصہ 'تذکرۂ شورش' (غلام حسین) سے نقل کیا ہی جس نے سب سے پہلے یہ افترا باندھا ہی۔ لیکن میر صاحب نے اس کتاب میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ "میر" کا لفظ لکھا ہی۔ اپنے والد اور دوسروں کی زبانی اپنا نام بھی میر محمد تقی لکھتے ہیں۔ یہ محض غلط ہی کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو، ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی، اس وقت نہ شعر کہتے تھے اور نہ شعر گوئی کا خیال تھا۔ شعر گوئی کا ذوق دلی میں آکر پیدا ہوا۔ یہیں انھوں نے تحصیلِ علم کی۔ یہیں شعر کہنا سیکھا۔ اور یہیں ان کے کلام کو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی اور آخر دم تک دلی ہی کو یاد کرتے رہے ؛

۳۔ یہ ممکن نہیں کہ میر صاحب کا ذکر ہو اور خان آرزو (سراج الدین علی خاں) کا نام نہ آئے۔ خان آرزو فارسی کے بڑے اُستاد اور محقق شاعر تھے، کبھی کبھی ریختے میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہی کہ میر صاحب پہلی بیوی

سے تھے اور جب وہ مر گئیں تو ان کے والد نے خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی۔ لیکن میر صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بڑے بھائی خان آرزو کے حقیقی بھانجے تھے اور میر صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی دُوسری بیوی سے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ میر علی متقی کی پہلی بیوی خان آرزؤ کی بہن تھیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ خان آرزؔو میر صاحب کے سوتیلے ماموں ہوتے ہیں تمام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے باپ کے مرنے کے بعد خان آرزؔو ہی کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی اور انھیں کے فیضِ تربیت سے علمی استعداد اور شاعری کا ذوق حاصل کیا۔ جب میر صاحب کا "تذکرۂ نکات الشعرا[1]" چھپ کے شایع ہوا تو اس بیان پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ اس کتاب میں میر صاحب نے خان آرزو کا بڑے ادب سے ذکر کیا ہے اور اُن کے کمال اور سخن فہمی کی بے حد تعریف کی ہے اور مرزا معز فطرتؔ، موسوی خاں کے حال میں انھیں "استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے۔ ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آزاد کا یہ قول نہایت ناگوار گزرتا ہے کہ "خان صاحب حنفی مذہب تھے میر صاحب شیعہ، اس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلے پر بگڑ کر الگ ہو گئے"[2] قیاس یہی ہوا کہ یہ بھی آزاد کا ایک چٹکلا ہے جو حسبِ عادت لطفِ داستان اور رنگینیٔ بیان کی خاطر لکھ گئے ہیں۔ لیکن جب یہ کتاب ("ذکرِ میر") نظر سے گزری تو معلوم ہوا کہ آزاد بڑی پتے کی بات لکھ گئے ہیں۔ میر صاحب خان آرزؔو کے دِل آزار برتاؤ اور بے مروّتی کے نہایت شاکی ہیں۔ ایک تو لڑکپن اور ناتجربہ کاری، دُوسرے یتیمی کا تازہ تازہ داغ، پھر غریب الوطنی اور بے روزگاری، اس پر بے مروّت بھائی اور سنگ دل ماموں کا یہ سلوک، میر صاحب کی زندگی تلخ ہوگئی غیور تو

---

[1] یہ تذکرہ انجمن ترقیٔ اردو کی طرف سے شایع ہو چکا ہے [2] 'آبِ حیات'، تذکرۂ میر

وہ بچپن ہی سے تھے، جیسا کہ خود ان کے والد[۱] نے اس کا اعتراف کیا ہی، ان کے دل پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ نوبت جنون تک پہنچ گئی ؛

اب قابلِ غور یہ ہی کہ میر صاحب کے ان دو بیانات میں اس قدر تفاوت اور تضاد کیوں ہی حال آں کہ ، نکات الشعرا، بھی دلی ہی میں لکھا گیا اور ، ذکرِ میر، بھی وہیں شروع کی اور سوائے آخر کے کچھ کچھ اوراق کے (جس کی صراحت آگے چل کر کی جائے گی) ساری کتاب وہیں لکھی ۔ بات یہ معلوم ہوتی ہی کہ تذکرہ میر صاحب کے خیال میں ایک ایسی چیز تھی جو مقبول ہونے والی تھی اور چوں کہ اس قسم کا یہ پہلا تذکرہ تھا (جیسا کہ میر صاحب نے خود تحریر فرمایا ہی) اس لیے یقین تھا کہ لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے اور ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے گا انھوں نے اس ناگوار اور بدنما ذاتی اور خانگی قضیے کو چھیڑنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا اور تقاضائے غیرت نے یہی مناسب خیال کیا کہ اس پر پردہ ڈال دیا جائے ۔ لیکن جب وہ آپ بیتی لکھنے بیٹھے تو رہا نہ گیا، ساری رام کہانی کہ سنائی اور سچ بھی ہی وہ آپ بیتی ہی کیا جس میں بُری بھلی جو کچھ بھی گزری ہو صاف صاف نہ لکھ دی جائے اب وہ وارداتِ قلب ہو یا حالات و واقعات اپنے ہوں یا دوسرے کے جو کچھ آنکھوں نے دیکھا یا دل پر گزرا سب ہی لکھنا پڑتا ہی اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ کتاب کبھی دوسرے ہاتھوں میں جائے گی یا مقبول ہوگی اور حقیقت بھی یہی ہی، آج تک یہ کتاب گم نامی میں رہی ۔ یہ محض اتفاق ہی کہ آج اس کی اشاعت کا موقع نکل آیا ورنہ جہاں اور بہت سے جواہر پارے خاک میں رل گئے یہ بھی کیڑے مکوڑوں یا کسی پنساری کی پڑیوں کی نذر ہو جاتی ؛

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جو مشہور چلا آتا ہی، خان آرزو میر صاحب

---

[۱] دیکھو صفحہ ۵۹

کے اُستاد تھے صحیح نہیں۔ ہاں وہ اتنی بات کے قصور وار ضرور ہیں کہ دوبارہ جب دلّی آئے تو ماموں ہی کے ہاں آ کے ٹھیرے۔ چناں چہ فرماتے ہیں "یعنی چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یاران شہر خواندم" اس کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کا حال لکھا ہے کہ کیوں کر اتفاق سے راستے میں میر جعفر سے مڈبھیڑ ہوئی اور ان سے فارسی پڑھنی شروع کی۔ اتفاق سے جب وہ اپنے وطن پٹنے چلے گئے تو میر سعادت علی سے جو امروہہ کے باشندے تھے، ملاقات ہوئی انھوں نے میر صاحب کو ریختے میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی اور اس وقت سے ان کی شعر گوئی کی بنیاد پڑی۔ میر صاحب نے بھی ایسی جان توڑ کے محنت کی اور وہ مشق بہم پہنچائی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے بلکہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔

۴۔ میر صاحب کے لکھنؤ پہنچنے کا حال بھی عجیب ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے اور آزاد نے نمک مرچ لگا کر اُسے ایک افسانہ بنا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کے سحر نگار قلم نے اس وقت اور موقع کی اور میر صاحب کی قطع وضع اور ان کی بے کسی اور استغنا کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ ڈرامے کا لطف آجاتا ہے۔ اور آنکھوں کے سامنے عبرت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ لیکن لکھنؤ پہنچ کر سرائے میں اُترنا، مشاعرے میں جانا، ان کی پُرانی وضع پر اہلِ مشاعرہ کا ہنسنا اور شمع سامنے آنے پر غزل میں حسبِ حال فی البدیہہ اشعار کا پڑھنا حقیقت سے بعید ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دلّی اُجڑ گئی تھی، قدردان اُٹھ گئے تھے، اہلِ کمال کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ اور اُن کا ٹھکانا صرف ایک ہی رہ گیا تھا یعنی لکھنؤ کا نوابی دربار جو اس وقت بہار پر تھا زمانے کے ہاتھوں تنگ آکر ہر باکمال قدردانی کا بھوکا اپنے عزیز وطن سے مُنھ موڑ کر وہیں جا پہنچا تھا۔ میر صاحب اگرچہ دلّی میں تنگ حال اور شکستہ دل تھے

مگر بڑے غیور تھے۔ وہ بعض اور لوگوں کی طرح دوسروں پر بار ہونا یا احتیاج لے کر پہنچنا اپنی وضع کے خلاف سمجھتے تھے۔ جس طرح شجاع الدولہ نے ازراہِ قدردانی مرزا سودا کو دلّی سے بُلا بھیجا تھا اسی طرح آصف الدولہ نے نواب سالار جنگ کے ذریعے زادِ راہ بھیج کر میر صاحب کو لکھنؤ بُلایا۔ لکھنؤ پہنچ کر نواب سالار جنگ کے ہاں گئے جو ان کے حال پر پہلے ہی سے مہربان تھے۔ انھوں نے فوراً بندگانِ عالی کی خدمت میں اطّلاع کی۔ چار پانچ روز بعد بندگانِ عالی مرغوں کی لڑائی کے لیے تشریف لائے۔ میر صاحب بھی وہاں تھے۔ محض فراست سے سمجھ گئے کہ میر صاحب ہیں نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے۔ اپنے شعر میر صاحب کو مخاطب کر کے سُنائے اور پھر میر صاحب سے کلام سُننے کی فرمایش کی مگر میر صاحب نے اپنی غزل کے صرف دو چار ہی شعر سُنائے اس سے ظاہر ہو کہ میر صاحب فقیروں کی طرح لکھنؤ نہیں گئے جیسا کہ آزاد نے بیان کیا ہو بلکہ عزّت سے بُلائے گئے اور آخر دم تک اسی عزّت سے رہے ؛

۵۔ میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو بڑے مبالغے سے بیان کیا گیا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ اس کا راز ان کی ابتدائی تربیت اور پرورش اور بعد کے حالات میں ہو۔ میر صاحب کے والد بڑے پائے کے درویش تھے، لوگ ان کے قدم لیتے اور ہاتھ چومتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان کے ملنے کی تمنّا کرتے تھے۔ ایسے حالات میں درویش دماغ دار نہ ہو تو ممکن ہو، لیکن صاحب زادے کے دماغ کا کیا پُوچھنا وہ تو آسمان ہی پر ہوتا ہو۔ سید امان اللہ جو اُن کے والد کے مریدِ خاص تھے، میر صاحب انھیں چچا کہتے تھے۔ سیّد صاحب نے انھیں بڑے چاؤ چوچلے سے پالا۔ یہ شب و روز

انھیں کے پاس رہتے، انھیں کے ساتھ کھاتے، انھیں کے ساتھ سوتے، جب کبھی کسی درویش سے ملنے جاتے تو میر صاحب کو ساتھ لیتے جاتے اور یہ ان کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں حاضر رہتے۔ ان کے والد کی خدمت میں بھی اکثر درویش اور صوفی حاضر ہوتے، یہ چپکے چپکے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں جو اپنے والد کی تلقین اور دوسرے درویشوں کی باتیں اور اقوال لکھے ہیں وہ سراسر درویشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہیں سے ان میں غیرت، استغنا، قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا ہونے لگی تھی۔ ابھی دس گیارہ ہی برس کی عمر تھی کہ ڈہری یتیمی دیکھنی پڑی، ایک چچا جو باپ سے زیادہ ناز بردار تھا داغِ مفارقت دے گیا، دوسرے اسی سال باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھر عزیز و اقارب کی طوطا چشمی خصوصاً بھائی کی بے مروّتی اور ماموں کی بدسلوکی اور دل آزاری، اس پر بے سروسامانی اور پریشانی، ان سب پر مزید ملک و حکومت کی ناگفتہ بہ حالت، جہاں آئے دن نئے نئے انقلابات اور دل خراش واقعات، خانہ جنگیاں اور بربادیاں برپا رہتی تھیں۔ ان سب نے ان کے دل پر ایسے چرکے دیے کہ تن بدن کا ایک ایک تار بلبلا اُٹھا۔ اسی نے اُن کے کلام میں فصاحت کے ساتھ وہ سوز و گداز اور درد پیدا کر دیا جو اُن کے بعد آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

آزاد نے خان آرزو سے ناچاقی کی وجہ میر صاحب کی نازک مزاجی ہی قرار دی ہے اگرچہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی قدر تامل ہوتا ہے۔ تاہم دوسرے واقعات ایسے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نازک مزاج ضرور تھے۔ مثلاً سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی کے ملازم ہیں، ایک روز خان موصوف شب ماہ میں مہتابی پر بیٹھے تھے اور قوال کا لڑکا ان کے سامنے بیٹھا کچھ گا رہا تھا

اتنے میں میر صاحب پہنچے، خان نے کہا: میر صاحب اسے اپنے ریختے کے دو چار شعر بتا دیجیے تو یہ اپنے طور پر درست کر کے گا لے گا۔ میر صاحب نے کسی قدر ترش ہو کر کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا تو اس نے اپنے سر کی قسم دی اور خوشامد کی تو میر صاحب نے چار و ناچار چند شعر اسے یاد کرا دیے لیکن یہ بات انھیں ایسی ناگوار گزری کہ اس کے بعد سے خاں صاحب کے ہاں جانا چھوڑ دیا اور خانہ نشین ہو گئے۔ خان موصوف نے بہت منت سماجت کی مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔ مگر اُس شخص کی مروّت کو دیکھیے کہ اس نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور محض میر صاحب کی خاطر سے اُن کے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر نوکر رکھ لیا۔ راجا جگل کشور جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑے امیر آدمی تھے، شوق اور قدر دانی سے میر صاحب کے گھر سے اُٹھا کر اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور اپنے شعر اصلاح کے لیے پیش کرتے ہیں مگر میر صاحب اس کے کلام کو قابلِ اصلاح نہیں سمجھتے اور سب پر خط کھینچ دیتے ہیں۔ راجا ناگر مل جو میر صاحب کا بڑا قدر دان تھا اس کی رفاقت محض اس وجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اس کے ایما سے بادشاہی امرا سے کر کے آئے تھے اس پر اُس نے عمل نہ کیا۔ بادشاہ بڑے اشتیاق سے بار بار بُلاتے ہیں مگر یہ نہیں جاتے۔ غرض میر صاحب کو اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور ابتدائی تربیت اور فقر و فاقہ نے وضع داری کے ساتھ نازک مزاجی بھی پیدا کر دی تھی ؀

۶۔ اس کتاب میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد ان کی بعض نظموں کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب اُن کے سوتیلے ماموں خان آرزو نے اپنے بھانجے (میر صاحب کے بڑے بھائی) کے اشتعال سے انھیں طرح طرح سے ستانا شروع کیا اور اُن کی خصومت اور

دل آزاری اور بدسلوکی حد سے بڑھ گئی تو اس بےکسی اور بےنوائی کے عالم میں ان کے قلب پر اس کا بڑا صدمہ ہوا اور بہت ہی دل شکستہ اور دل گرفتہ رہنے لگے۔ اس غم و غصّے کی حالت میں ان پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہوگئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی۔ اس وہم کے ساتھ وحشت و دیوانگی بڑھنے لگی اور حالت نازک ہوگئی۔ اس تمام کیفیت کو میر صاحب نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ان کی مثنوی 'خواب و خیال' پڑھیے تو اس واردات کی سچّی تصویر اور اس خواب کی پوری تعبیر نظر آتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض خواب و خیال نہیں بلکہ ایک واقعہ تھا جو اُن کے مایوس اور حزیں دل پر گزرا تھا۔

اس مثنوی کے شروع میں اپنی پریشان حالی کا ذکر کیا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے بیگانے ہوگئے، یاروں نے بےوفائی کی اور عزیز و اقربا نے بےمروّتی، ناچار وطن چھوڑنا پڑا اور یہ پہلا وقت تھا جو گھر سے قدم باہر نکالا ؎

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشمِ حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیوں کر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

اب دلّی پہنچتے ہیں ؎

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت — بہت کھینچے یاں مَیں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہوگیا — مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہوگیا

اب اس کے بعد سے جنوں کی کیفیت بیان کی ہے جو عجیب و غریب ہے۔

میر صاحب کو دو بار کاما جانا پڑا اور دونوں بار پریشان حالی ان کے ہم رکاب تھی۔ پہلی بار جب دیکھا شہر کی حالت رہنے کے قابل نہیں رہی تو راجا (ناگرمل) سے اجازت چاہی کہ شہر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہوں، یہاں رہنے کی تاب

نہیں۔ راجا نے اپنی عنایت سے اجازت دی۔ میر صاحب توکّل علی اللہ لواحقین کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور بہ ہزار پریشانی کاماں پہنچے۔ یہ ذیحجہ کی آخری تاریخ تھی۔ عشرہ وہیں بسر کیا اور عاشورے کے روز وہاں سے آگے چلے۔ دوسری بار جب راجا جاٹوں کے ہاتھوں سے تنگ آکر اپنے تمام متوسلین کے ساتھ قلعے سے نکل کر کوچ کرتے ہوئے کاماں پہنچتے ہیں تو میر صاحب بھی بہ سبب ملازمت اس قافلے کے ساتھ ہیں۔ یہ عالم بھی پریشانی کا تھا اور غالباً اسی حالت میں انھوں نے ایک مخمس لکھا ہے۔ زمانے کی شکایت میں فرماتے ہیں ؎

کاماں سے تلخ کام اُٹھایا میرے تئیں
دلّی میں بے دِلانہ پھرایا میرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا میرے تئیں
حاصل کہ پیس سرمہ بنایا میرے تئیں
مَیں مشتِ خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

تلاشِ معاش میں جگہ جگہ مارے مارے پھرنے کے متعلق کئی بند لکھے گئے ہیں ایک یہ ہے ؎

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا
ضعفِ قویٰ سے دست بہ دیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلب گار واں گیا
چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اِس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

آگے چل کے کہتے ہیں ؎

حاجت مری روا دلِ پُر درد نے نہ کی
تاثیر اشکِ سُرخ و رُخِ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دمِ سرد نے نہ کی
دل جوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

اور بند تو دو آخر کے ہیں جو میر صاحب کی حالت اور مزاج کا سچّا نقشہ ہیں ؎

دلِ سر بہ سر خراب ہو تعمیر کیا کروں     آشفتگیٔ حال کی تعبیر کیا کروں
خوں نالہ ہائے چشم کی تقریر کیا کروں     زردیٔ رنگِ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار
حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ     دل سوزشِ درونی سے جلتا ہو جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہو سارا جگر ہو داغ     ہو نام مجلسوں میں میرا میرِ بے دماغ
ازبس کہ بے دماغی نے پایا ہو اشتہار

اسی طرح "شہر آشوب"، اور "مستزاد" (جو دلّی کے حال پر لکھی ہو) اور خاص کر جو نظم "دُنیا" کے نام سے ہو ان کا لُطف اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آتا ہو۔ آخری نظم ("دنیا") کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہو کہ گویا اس کتاب کے آخری صفحے کے لفظ لفظ کو نظم کر دیا ہو۔ غرض میر صاحب کے کلام کے سمجھنے اور لطف حاصل کرنے میں بھی اس کتاب سے بہت کچھ رہ نمائی ہوتی ہو ؏

۷۔ "ذِکرِ میر" میں جہاں اس زمانے کی معاشرت اور حکومت کے بہت سے واقعات ملتے ہیں وہاں ایک یہ بات بھی صاف نظر آتی ہو کہ اس زمانے میں ہندو مسلمان کی کوئی بحث ہی نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر بُرا کون سا زمانہ ہوگا جب کہ مُلک میں ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، لوٹ مار کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور زوال و انحطاط کا انتہائی وقت آگیا تھا، تاہم ہندو مسلمانوں کے تعلّقات آپس میں ایسے تھے جیسے بھائیوں بھائیوں میں ہوتے ہیں۔ وہ لڑتے بھی تھے، ملتے بھی تھے، مگر اس دوستی، محبّت اور لڑائی بھڑائی میں مذہب و ملّت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ یہ آفت اِس زمانے کی لائی ہوئی ہو جس میں بدبختی سے دونوں مبتلا ہیں۔ اس کا انجام سب سمجھے ہوئے ہیں مگر اپنے وہم کے ہاتھوں لاچار ہیں۔ خود میر صاحب کئی راجاؤں کے متوسّل تھے، ان کی مروّت اور انسانیت کا ذِکر کس محبّت اور عزّت سے کرتے ہیں۔ راجا

ناگرمل کی شرافت اور وضع داری دیکھیے۔ جاٹوں کی چیرہ دستی اور مردم آزاری سے آزردہ ہو کر دلیرانہ قلعہ چھوڑ کر باہر نکل کر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ بیس ہزار گھروں کو جو انھیں کی وجہ سے آباد تھے اور اکثر ان کے متوسّل تھے اور جس میں ہندو مسلمان سب ہی تھے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ وقت خطرے سے خالی نہ تھا۔ میر صاحب لکھتے ہیں "راجا نظر بر خدا کردہ آں چہ لازمۂ سرداریست بہ کار بردہ باہر دو پسر بہ جرأت تمام سوار شد و بیرونِ قلعہ آمد چناں ہمت بہ امداد غربا گماشت کہ ناموس نفرے ہم آں جا نہ گزاشت۔ از لطف دادار بے ہمال و بہ یُمن نیت خوب در دو سہ روز مع ایں قافلہ گراں داخل کاماں گشت۔" اگرچہ ملک کی حالت بہت خراب و خستہ اور ابتر تھی، عام و خاص، نواب اور راجا سب خود غرضی میں مبتلا اور ناعاقبت اندیشی میں گرفتار تھے، مگر پُرانی وضع داریاں برابر چلی جا رہی تھیں۔ بزم ہو یا رزم، غم ہو یا شادی، معاملات ہوں یا مطالبات اُن میں وہ تنگ دلی اور تعصب جس کا جلوہ ہمیں آج کل نظر آ رہا ہے۔ بداخلاقی اُن میں تھی، بدمعاملگی اُس وقت بھی تھی، غدّاری اور بے وفائی سے وہ زمانہ بھی خالی نہ تھا، مگر وہ معایب جسے مذہبی تعصب کہتے ہیں، اس سے ان کے سینے پاک تھے۔

۸۔ میر صاحب بڑے مہذب اور باوضع شخص ہیں وہ کہیں مذہب کا ذکر یا بحث نہیں کرتے تاہم ضمناً بعض واقعات سے اُن کے مذہب اور مشرب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اپنے والد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "روزے در خدمتِ شیخ سوال کرد کہ بندہ آں چہ عقائد خود درست کردہ ام بہ خدمتِ عالی واضح است امّا در حق حاکم شام چہ فرمایند"، شیخ نے فرمایا "کہوں گا" کچھ مدت کے بعد مُنھ اندھیرے محرّم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے نوکر وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے، والد خود اٹھے اور آفتابہ لے کر

ہاتھ منھ دھلانے لگے فرمانے لگے "ای علی متقی مَیں عمر بھر کبھی اُس کا نام زبان پر نہیں لایا ہوں، اس کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔" والد کہتے تھے کہ اس کے بعد سے مَیں نے بھی اس کا نام کبھی نہیں لیا۔

سبحان اللہ، کس خوبی اور حکمت سے تلقین کی ہے۔ یہ بزرگ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی، میر علی متقی کے پیر و مرشد تھے اور میر علی متقی کا شیخ سے یہ کہنا کہ "مَیں نے جیسا کہ آپ پر ظاہر ہے، اپنے عقائد درست کر لیے ہیں"، شیخ کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ میر صاحب بھی آخر اسی باپ کے بیٹے تھے، ابتدا سے درویشوں میں تربیت پائی، خود درویش منش واقع ہوئے تھے، اسی لیے ان کا مشرب وسیع اور دل صاف تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ جب میر صاحب، سادات خاں ذوالفقار جنگ کے پاس تھے تو ایک لڑائی میں وہ بھی ساتھ تھے۔ لڑائی قصبہ سامر کے پاس ہوئی جو اجمیر سے بیس کوس ہے۔ غرض ملہار راؤ کے بیچ میں پڑنے سے لڑائی موقوف ہوئی اور صلح صفائی ہو گئی۔ میر صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور حضرت خواجہ معین الدّین اجمیری کی زیارت کے لیے اجمیر جا پہنچے۔ اس ماجرے کو ان چند الفاظ میں بیان کرتے ہیں "من پس از صلح برائے حصولِ سعادت زیارت درگاہ فلک اشتباہ خواجۂ بزرگ رفتم"۔

۹۔ میر صاحب کی وفات کا سال تو صحیح معلوم ہے، سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں انتقال ہوا۔ ناسخ نے تاریخ کہی ہے "واویلا مرد شہ شاعراں" لیکن پیدائش کا سال معلوم نہ ہونے سے اُن کی عمر کے متعلق بہت اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں "عمرش تخمیناً قریب بہ ہشتاد است"۔ تذکرے کی تالیف کا سنہ ۱۲۰۹ھ ہے۔ اس حساب سے تقریباً ۹۶ سال ہوتے ہیں۔ جہان نے ان کی عمر ۸۰ ہی برس لکھی ہے۔ اگرچہ

میرؔ صاحب نے اس کتاب میں اپنی پیدائش کا سن نہیں لکھا تاہم بعض حالات اور قرائن ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی عمر اور پیدائش کا تخمینی سن معلوم ہو سکتا ہے:

جب سید امان اللہ کا (جنھیں میرؔ صاحب عمِ بزرگ وار کر کے لکھتے ہیں) انتقال ہوا اور رنج و غم سے اُن کی حالت بہت نڈھال ہوئی تو ان کے والد ان کو سمجھانے لگے۔ اس میں ایک فقرہ یہ بھی فرمایا کہ "ماہ من انہ طفل ہالۂ الحمد للہ کہ دہ سالۂ"، اور اسی سال میر علی متقی کا بھی انتقال ہو گیا۔ گویا باپ کی وفات کے بعد اُن کی عمر دس سال کی تھی یا زیادہ سے زیادہ گیارہ سال کی ہوگی۔ باپ کے مرجانے سے اس چھوٹی سی عمر میں فکرِ معاش ہوئی جس کی تلاش میں وہ اکبر آباد کے آس پاس بہت کچھ پھرے۔ جب مایوس ہوئے تو شاہ جہاں آباد کا قصد کیا۔ نواب صمصام الدولہ امیر الامرا نے ان کے باپ کے حقوق کا خیال کر کے میرؔ صاحب کا ایک رُپیہ روز مقرر کر دیا اور یہ روزینہ نادر شاہ کے حملے تک مِلتا رہا۔ اس جنگ میں نواب صاحب کے مارے جانے سے بند ہو گیا۔ نادر کا حملہ سنہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا۔ اس کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ساٹھ سال بتائی ہے اور کتاب کی تاریخ اس قطعہ سے نکالی ہے ؎

| | |
|---|---|
| مسمّی بہ اسمی شد ای باہُنر | کہ این نسخہ گردد بہ عالم سمر |
| ز تاریخ آگہ شوی بے گماں | فزائ عدد بست و ہفت از براں |

کتاب کا نام "ذکرِ میر" ہے جس کے عدد ۱۱۷۰ ہوتے ہیں، اس میں ۲۷ ملائے تو سنہ ۱۱۹۷ھ ہوئے۔ اس میں سے اگر ۶۰ منہا کیے تو ان کی پیدائش کا سال تقریباً سنہ ۱۱۳۷ھ نکلتا ہے۔ اس حساب سے نادر کے حملے کے وقت ان کی عمر کوئی پندرہ سال کی سمجھنی چاہیے۔ اس حادثے کے بعد وہ پھر دلی جاتے ہیں

اور چند روز اپنے ماموں خان آرزو کے مہمان ہوتے ہیں۔ ایک مدت کے بعد جب راجا ناگرمل کے ہم راہ اکبر آباد جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو لکھتے ہیں کہ تیس سال بعد وطن میں آنا ہوا۔ یعنی اس وقت ان کی عمر ۴۵، ۴۶ برس کی ہوگی ؎

'آبِ حیات' میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے دلی سنہ ۱۱۹۰ھ میں چھوڑی، لیکن 'گلشنِ ہند' اور 'گلزارِ ابراہیم' میں ان کے لکھنؤ جانے کی تاریخ سنہ ۱۱۹۷ھ لکھی ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت مرزا محمد رفیع سودا اس جہانِ فانی سے عالمِ باقی کو سدھار چکے تھے۔ سودا کا انتقال سنہ ۱۱۹۵ میں ہوا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت وہ دلی ہی میں ہیں۔ حسن کے تذکرے کا سنِ تالیف ۱۱۹۴ھ ہے۔ غرض لطف ہی کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب لکھنؤ ۱۱۹۷ھ میں پہنچے۔ اس حساب سے میر صاحب کے لکھنؤ پہنچنے اور 'ذکرِ میر' کے ختم ہونے تک ایک ہی سال ہوتا ہے اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اب اگر سنِ پیدائش ۱۱۳۷ھ اور سنِ وفات ۱۲۲۵ھ ہو تو میر صاحب کی عمر تقریباً ۸۹ برس ہوتی ہے، بہ ہر حال ۹۰ سے زائد کسی حال میں نہیں اور میری رائے میں یہی صحیح بھی ہے ؎

۱۰۔ 'ذکرِ میر' ایک نادر الوجود کتاب ہے۔ ہماری زبان میں ایک نہیں بیسیوں تذکرے شعرا کے لکھے گئے ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے مگر کسی تذکرے میں اس کتاب کا نام نہیں۔ آزاد نے بہت تفصیل سے میر صاحب کے کلام اور تصنیفات کی فہرست دی ہے مگر 'ذکرِ میر' کا ذکر اس میں بھی نہیں۔ سوائے ڈاکٹر سپرنگر کے کہ اس نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے اور کہیں اس کا پتا نہیں ملا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ کتاب خان بہادر مولوی بشیر الدین احمد صاحب بانی مسلم ہائی اسکول اٹاوہ کے ہاتھ لگ گئی اور اُن کی عنایت سے ہمیں دیکھنی نصیب ہوئی

اور اس کے شایع کرنے کا موقع مِلا۔ مَیں مولوی صاحب کے اس لطف وکرم کا بے حد ممنون ہوں۔ یہ نسخہ بہت صاف اور اچھّا لکھا ہوا ہی۔ کتابت سن ۱۲۲۲ھ (سنہ ۱۸۰۸ء) کی ہی۔ یعنی میر صاحب کی زندگی ہی میں لکھا گیا اور کیا تعجب ہی کہ انھیں کے نسخے کی نقل ہو۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ اور محاورات کے معنی بھی دیے ہیں جو ہم نے بہ جنسہٖ چھاپ دیے ہیں البتّہ مضامین کے عنوان اس میں نہیں تھے وہ ہم نے اضافہ کیے ہیں۔ جب پروفیسر محمّد شفیع ایم۔اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کو جو علم وادب کا خاص ذوق رکھتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ میرا ارادہ اس کتاب کے شایع کرنے کا ہی تو انھوں نے مجھے فوراً لکھا کہ ایک نسخہ اس کا میرے پاس بھی ہی، کہو تو بھیج دوں، چناں چہ انھوں نے میرے لکھنے پر اپنا نسخہ مجھے مستعار عنایت فرمایا جس کا مَیں بہت شکر گزار ہوں۔ مَیں نے کتاب کا چھپنا روک دیا اور اٹاوے کے نسخے سے مقابلہ کرنا شروع کیا اس سے بعض بعض جگہ بہت مدد ملی۔ پروفیسر صاحب کا نسخہ ایسا اچھّا لکھا ہوا نہیں ہی جیسا اٹاوے کا ہی اور ناقص بھی ہی، یعنی ایک چوتھائی سے زائد کم ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ آخری حصّہ میر صاحب نے بعد میں بڑھایا ہی۔ چناں چہ لکھنؤ جانے کا حال لاہور کے نسخہ میں مطلق نہیں۔ جہاں کہیں ان دو نسخوں کی عبارت میں اختلاف تھا۔ اس اختلاف کو ہم نے حاشیے میں (ن) کا نشان کرکے لکھ دیا ہی۔ کتاب کے آخر میں میر صاحب نے کچھ لطیفے بھی جمع کر دیے ہیں بعض پُرانے اور تاریخی ہیں اور بعض خود اُن کے زمانے کے ہیں اور پُر لطف ہیں۔ مگر افسوس کہ بعض اُن میں سے ایسے فحش ہیں کہ ان کا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں اس سے اس زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہی ورنہ میر صاحب کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا ہی! اس وجہ سے نیز اس لیے کہ یہ ایک غیر متعلق چیز تھی ہم نے یہ لطیفے اس کتاب سے خارج کر دیے ہیں ؛

---

# مقدمۂ انتخابِ کلامِ میرؔ

جہاں سے دیکھیے ہر شعر شور انگیز نکلے ہی
قیامت کا سا ہنگامہ ہی ہر جا میرے دیواں ہیں

میر تقی میرؔ سرتاج شعرائے اُردُو ہیں، ان کا کلام اُسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا، جیسے سعدیؔ کا کلام فارسی زبان میں اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میرؔ کا نام اُس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔ یہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے موزونیٔ طبع کی وجہ سے، یا اپنا دل بہلانے کی خاطر، یا دُوسروں سے تحسین سُننے کے لیے شعر کہے ہیں، بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے کمال سے اُردُو کی فصاحت کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری میرؔ صاحب کی زندگی کا جُز تھی گویا فطرت نے انھیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ اُن کا احسان اُردُو زبان پر تا قیامت رہے گا اور ان کے کلام کا لطف کبھی کم نہ ہوگا، کیوں کہ اس میں وہ عالم گیر حُسن ہی جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں ہے

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز   تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میرؔ صاحب جیسا کہ خود انھوں نے اپنے ”تذکرۂ نکات الشعرا“ میں لکھا

ہے " وطن اکبر آباد است، بہ سبب گردشِ لیل و نہار از چندے در شاہ جہان آباد است " علی ابراہیم کے "تذکرۂ گلزارِ ابراہیم" میں جس کا ترجمہ میرزا علی لطف نے 'گلشنِ ہند' کے نام سے مسٹر جان گل کرسٹ کی فرمایش سے (سنہ ۱۸۰۱ء-۱۲۲۵ھ) اُردو میں کیا، یہ لکھا ہے کہ " میر تخلص، نام نامی اُس رنگین خاتم آفرینی کا میر محمد تقی ہے، متوطن اکبر آباد کے سراج الدین علی خاں آرزو، تخلص، آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے ابتدائے سنِ شعور سے پرورش انھوں نے دارالخلافہ شاہ جہاں آباد میں پائی ہے اور خان مذکور کی صحبت سے نظمِ ریختہ کی کیفیت، باریکیوں کے ساتھ اُٹھائی ہے " غرض یہ کہ اگرچہ میر صاحب اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور ان کے بچپن کا زمانہ بھی وہیں گزرا، لیکن بعد میں وہ دلّی میں چلے آئے اور دلّی ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کو دلّی سے نہیں بلکہ دلّی کو اُن کے توطن سے فخر ہے پھر وہ دلّی ہی کے ہو گئے اور دلّی ہی کے کہلائے اور ان کی زبان بھی جو اس زمانے میں مایۂ افتخار اور شرافت کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی، دلّی ہی کی تھی۔

میر صاحب کے بزرگ اپنے قبیلے کے ساتھ حجاز سے سرحد دکن میں پہنچے اور وہاں سے احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے مگر اُن کے جدِ کلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا۔ میر صاحب کے والد میر علی متقی ایک متوکل گوشہ نشین درویش تھے اور ادنیٰ و اعلیٰ سب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں پہلی بیوی سراج الدین علی خاں آرزو کی بہن تھیں۔ دوسری بیوی کے بطن سے میر صاحب (میر تقی) تھے۔ اولاد دونوں بیویوں سے ہوئی اس رشتے سے سراج الدین علی خاں آرزو میر صاحب کے ماموں ہوئے۔ اگرچہ 'تذکرۂ گلزارِ ابراہیمی'، 'گلشنِ ہند'، نیز دوسرے تذکروں میں اور خود میر صاحب

نے اپنے 'تذکرۂ شعرائے اُردو' میں خان آرزوؔ کو اپنا اُستاد اور پیر و مرشد لکھا ہی لیکن حقیقتِ حال 'ذکرِ میر'[1] سے معلوم ہوتی ہی، جو یہ ہی :

میر صاحب والد کی وفات کے بعد ہی کوئی گیارہ سال کے سن میں دلی آگئے تھے اور نواب صمصام الدولہ امیرالامرا نے جو ان کے والد سے ارادت رکھتے تھے' میر صاحب کا اپنی سرکار سے ایک رُپیہ روزانہ مقرر کر دیا۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ سنہ ۱۱۵۱ھ میں مارے گئے اور میر صاحب کا روزینہ بند ہو گیا۔ اس وجہ سے انھیں پھر دہلی آنا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی پندرہ برس ہو گی۔ لکھتے ہیں کہ " جو لوگ درویش (والد) کی زندگی میں میری خاک پا کو سُرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے۔ اب انھوں نے یک بارگی مجھ سے آنکھیں چُرالیں۔ ناچار پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کا منّت پزیر ہوا۔ یعنی کچھ دن اُن کے پاس رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں جب مَیں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہی، ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے۔ وہ عزیز (سراج الدین علی خاں) واقعی دنیادار شخص تھے، اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گئے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلاوجہ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے۔ میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسے کسی دشمن سے ہوتا ہی۔ فرماتے ہیں کہ " اگر ان کی دشمنی کی تفصیل کروں تو ایک دفتر ہو جائے۔ غرض اس سے میر صاحب کو اس قدر رنج اور تکلیف ہوئی کہ وہ دروازہ بند کیے پڑے رہتے تھے اور اس رنج و غم میں ان کی حالت جنون کی سی ہو گئی تھی :

---

[1] یہ کتاب میر صاحب نے اپنے حالات میں لکھی ہے اس پر مفصل تبصرہ گزشتہ اپریل کے رسالۂ 'اُردو' میں ہو چکا ہی۔ اب یہ کتاب انجمن کی طرف سے شایع کی گئی ہی :

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب اور خان آرزو کے تعلقات بے حد ناگوار اور تلخ تھے اُن کی تربیت اور شاگردی کی روایت فسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکات الشعرا"، "ذکرِ میر" سے بہت دیر بعد لکھی گئی ہے۔ "ذکرِ میر" لکھتے وقت وہ تمام حالات تازہ تھے دل پر صدمہ اور عالم پریشانی کا تھا، جو کچھ گزرا تھا من وعن سب لکھ ڈالا۔ بعد میں جب ایک مدت گزر گئی، پریشان حالی بھی رفع ہو گئی تو اس صدمے کا اثر بھی خود بہ خود کم ہو گیا۔ ایسی حالت میں اُن ناگوار واقعات کا دُہرانا مناسب نہ سمجھا اور خوش اسلوبی سے اُن پر پردہ ڈال دیا۔ میر صاحب اپنی تعلیم اور شعر گوئی کی ابتدا کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں کہ "میر جعفر نامی ایک صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی اور انھوں نے بڑی عنایت اور دل سوزی سے مجھے پڑھانا شروع کیا۔ اچانک ایک روز ان کے وطن عظیم آباد سے خط آیا اور وہ اُدھر چلے گئے کچھ دنوں بعد سعادت علی سے جو امروہے کے سیّد تھے، ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے مجھے ریختی میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ مَیں نے جان توڑ کے محنت کی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ مَیں شہر کے موزوں گویوں میں مستند سمجھا جانے لگا اور میرے شعر سارے شہر میں مشہور ہو گئے اور چھوٹے بڑے سب شوق سے پڑھتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر صاحب نے خان آرزو کی صحبت سے بھی کچھ فیض پایا ہو۔ مگر اُن کے اور خان آرزو کے ذوق میں زمین آسمان کا فرق ہے میر صاحب فطرتی طور پر شاعر واقع ہوئے تھے۔ اور ذوقِ شعر ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ کسی کی صحبت یا شاگردی سے بالکل مستغنی معلوم ہوتے ہیں:

میر صاحب اس زمانے میں بہت پریشان رہے کچھ دن رعایت خاں (عظیم اللہ خاں کے بیٹے اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے نواسے) کی مصاحبت

اور رفافت میں گزری۔ اس کے بعد نواب بہادر کی سرکار سے تعلق ہو گیا۔ نواب بہادر محمد شاہ بادشاہ کا خواجہ سرا تھا اور بادشاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ کے زمانے میں سلطنت میں اسے بڑا دخل ہو گیا تھا۔ جب نواب بہادر دغا سے قتل کر دیے گئے تو میر صاحب بھی بے کار ہو گئے۔ اس کے بعد وزیر کے دیوان مہانرائن نے بڑے اشتیاق سے بلا بھیجا اور اُس وقت سے ان کی سرکار کے متوسل ہو گئے۔ مگر چند ہی ماہ میں یہاں کا رنگ بدل گیا۔ چند روز گوشہ نشین رہنا پڑا۔ دو تین ماہ بعد راجا جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے، میر صاحب کو گھر سے اُٹھا کر لے گئے۔ جب راجا ندکور بھی زمانے کے ہاتھوں لاچار ہو گئے تو انھوں نے اپنی عنایت سے میر صاحب کی تقریب راجا ناگرمل سے کرا دی جو اُس وقت نائب وزیر اور عمدۃ الملک اور مہاراجا کے خطاب سے ممتاز تھے۔ یہ تمام امرا میر صاحب سے بڑی مہربانی اور عنایت سے پیش آتے اور ان کی بڑی عزت و حرمت کرتے تھے۔ راجا ناگرمل کی رفاقت میں میر صاحب بہت دنوں تک رہے، اکثر مقامات میں راجا کے ساتھ جانا پڑا۔ اور بعض معرکے بھی دیکھے اور راجا کی بدولت دوبارہ اکبر آباد کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ میر صاحب کو راجا کی رفاقت چھوڑنی پڑی جس زمانے میں جاٹوں نے بڑا فساد مچا رکھا تھا، راجا بھی پریشان تھے۔ اس نے میر صاحب کو شاہی کیمپ میں جو اس وقت فرخ آباد میں سایہ فگن تھا، حسام الدین کے پاس بھیجا جسے بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میر صاحب گئے اور تمام عہد و پیمان کیے لیکن یہاں راجا کا چھوٹا بیٹا میر صاحب سے خوش نہ تھا، اس لیے کہ اُن سے راجا کے بڑے بیٹے سے بہت ربط ضبط تھا۔ اُس نے برخلاف باپ کو یہ سمجھایا کہ دکھنیوں کے پاس جانا بہتر ہے۔ چناں چہ

راجا بادشاہ کے لشکر میں نہ گئے اور شہر کی طرف روانہ ہو گئے اس میں میر صاحب کی بہت سبکی ہوئی، وہ دہلی پہنچ کر راجا سے علیحدہ ہو گئے ؛

اس کے بعد ہی کا زمانہ ہے جب کہ میر صاحب لکھتے ہیں "فقیر ان ایام میں خانہ نشین تھا۔ بادشاہ اکثر طلب فرماتے تھے مگر میں کبھی نہیں گیا! ابوالقاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر اور عبدالاحد خاں کا (جو اس وقت بادشاہ کی ناک کا بال تھا) بھائی میرے ساتھ بہت سلوک کرتا تھا، میں بھی کبھی کبھی اس کی ملاقات کو جاتا تھا اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے ؛

میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا ایک سلسلہ تھی جس کا تار بچپن سے لے کر لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا لڑکپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا سیّد امان اللہ جوان کے والد کے نہایت عزیز مرید تھے اور میر صاحب انھیں اپنی کتاب میں ہر جگہ عمّ بزرگ وار لکھتے ہیں اور جو انھیں باپ سے کم عزیز نہ تھے، وہ پہلے ہی دُنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ باپ کے مرنے پر بھائی اور عزیز و اقارب نے بہت بے مروّتی کی۔ دس گیارہ سال کے سن میں بسر اوقات کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت اُن کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو گی۔ جب آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں کوئی صورت نہ نکلی تو وہ ناچار دلّی پہنچے ؛

اس وقت کی دلّی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے وہ ہندُستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راج دھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دکھیاری ہے۔ اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد اُن کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انحطاط کے سامان ہو چکے تھے

اور سیاہ زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا۔ بادشاہ دست نگر اور امیر امرا مضمحل و پریشان تھے۔ سب سے اوّل نادر شاہ کا حملہ ہوا، حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی ہوس ناک غارت گری نے دلّی کو نوچ کھسوٹ کے ویران و برباد کر دیا۔ ابھی کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی ہوئی۔ پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ حالات میر صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھے اور دیکھے ہی نہیں، اُن کے چرکے سہے اور اِن انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ یہ دلّی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی۔

ایسے وقت میں، جب کہ پے در پے آفتیں نازل ہو رہی تھیں، شاعر بے چارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضع داروں اور متوکلوں کے اوسان بجا نہیں رہتے۔ اب تک جو باکمال دلّی میں پڑے وضع داری نباہ رہے تھے، ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹِک سکے، سوائے ایک خواجہ میر درد کے کہ ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہ ہوئی۔

دلّی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ آصف الدّولہ سا لکھ لُٹ نواب تھا، اہلِ کمال کی قدر ہونے لگی، پھر جو اُٹھا وہیں پہنچا اور وہیں کا ہو رہا سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدّین علی خاں آرزو نے ادھر کا رُخ کیا ابھی ان کے لیے کوئی صورت نہ نکلی تھی کہ انتقال کر گئے۔ اس کے بعد مرزا رفیع سودا کے انتقال کے بعد میر صاحب نے نواب آصف الدّولہ کے یاد کرنے پر سنہ ۱۱۹۷ھ م سنہ ۱۷۸۲ء میں دلّی سے لکھنؤ کوچ فرمایا۔ میر صاحب

کے جاتے ہی دلّی سونی ہوگئی اور میر حسن، میر سوز، جراءت سب لکھنؤ میں جا بسے اور دلّی کی رونق لکھنؤ میں آگئی۔

میر صاحب نے اپنے لکھنؤ جانے کا حال اس طرح لکھا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دلّی میں خانہ جنگی اور ابتری بپا ہے "فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سرو سامانی کی وجہ سے معذور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے نواب وزیرالممالک آصف الدّولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میر میرے پاس چلا آئے تو اچھا ہو۔ میری طلبی کے لیے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدّولہ اور نواب اسحاق خاں کے چھوٹے بھائی نجم الدّولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے ماموں سے تھے، کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہِ عنایت کچھ زادِ راہ عنایت فرمائیں تو البتّہ میر صاحب آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے اجازت دی اور انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد فرماتے ہیں، جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجایئے میں پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا، خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ چوں کہ خدا کا یہی منشا تھا، میں بے یار و مددگار، بغیر قافلے اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گزرا۔ وہاں کے رئیس مظفّر جنگ تھے، انھوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھیر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہ کیا، دو ایک روز کے بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ اوّل سالارِ جنگ کے ہاں گیا، خدا انھیں سلامت رکھے، بڑی عزت و توقیر سے پیش آئے اور جو کچھ مناسب تھا بندگانِ عالی کی جناب میں کہلا کے بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغوں کی لڑائی کے لیے تشریف لائے، میں بھی وہاں تھا۔ ملازمت حاصل کی۔ محض فراست سے

دریافت فرمایا کہ میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے۔ اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سنائے سبحان اللہ "کلام الملوک ملوک الکلام" اس کے بعد فرطِ مہربانی سے مجھ سے فرمایش کی۔ اُس روز مَیں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر کہے۔ رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہو گئے ہیں، بندگانِ عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت فرما دی جائے، جب مرضیٔ مبارک ہو، یاد فرمائیں۔ فرمایا کہ مَیں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع کر دوں گا دو تین روز بعد یاد فرمایا، حاضر ہوا اور جو قصیدہ مَیں نے مدح میں کہا تھا، پڑھا سماعت فرمایا اور بکمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔

اب میر صاحب کی دلّی کی بود و باش کا خاتمہ ہوتا ہے اور لکھنؤ کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ از روئے صاحبِ 'گلزارِ ابراہیم'، میر صاحب لکھنؤ سنہ ۱۱۹۷ھ میں پہنچے اُس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ باقی عمر تادمِ آخر سنہ ۱۲۲۵ھ[1] تک لکھنؤ ہی میں بسر ہوئی۔

لکھنؤ آنے سے پہلے میر صاحب کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی، یہاں آئے تو لوگوں نے ان کے لیے آنکھیں بچھا دیں۔ امیر سے لے کر غریب تک اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک نے اعزاز و قدردانی میں سبقت کی۔ گویا میر صاحب کے آنے سے لکھنؤ کو بھاگ لگ گئے شعر و سخن میں جان پڑ گئی اور مشاعروں کی رونق بڑھ گئی۔ میر صاحب مرجعِ کمال بن گئے۔ دُور دُور سے لوگ اس شوق میں آتے تھے کہ میر صاحب کی

---

[1] ناسخ نے میر صاحب کا سنِ وفات اس مصرعے سے نکالا ہے: "واویلا مرد شہِ شاعراں"۔

زبانِ مبارک سے اُن کا کلام سُنیں اور اپنے اپنے شہروں کو ان کے اشعار بطور سوغات کے لے جائیں یہ قبولیت اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی تھی، اُس وقت سے اب تک میر صاحب کے کمال کا سکّہ لوگوں کے دِلوں پر بیٹھا ہوا ہی اور بڑے بڑے شاعروں نے انھیں اُستاد مانا ہی۔ چناں چہ مرزا غالبؔ فرماتے ہیں ؎

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہی بہ قولِ ناسخؔ　　آپ بے بہرہ ہی جو معتقدِ میرؔ نہیں

ذوقؔ کا ایک شعر ہی:-؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب　　ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر میر صاحب اپنے کمال سے خود واقف تھے اور اُنھیں اس پر ناز تھا اور اس کا اظہار انھوں نے جا بہ جا اس طور سے کیا ہی کہ دوسرے کی مجال نہیں چناں چہ چند اشعار اس مضمون کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں: ؎

ریختہ خوب ہی کہتا ہی جو انصاف کرو　　چاہیے اہلِ سخن میرؔ کو اُستاد کریں

---

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اُس کا ہی　　معتقد کون نہیں میرؔ کی اُستادی کا

---

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے　　کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

---

جہاں سے دیکھیے یک شعر شور انگیز نکلے ہی　　قیامت کا سا ہنگامہ ہی ہر جا میرے دیوان میں

---

جلنے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز		تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

---

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض		اوّل تو مَیں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے

---

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں مَیں شاعروں میں میرؔ		یہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

---

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

---

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں		تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے گا

---

سارے عالم پر ہوں مَیں چھایا ہوا		مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس آخر شعر میں تعلّی کی انتہا ہوگئی ہے۔ کسی دُوسرے شخص کی کیا مجال ہے کہ وہ "فرمانے" کا لفظ اپنے لیے اس طور سے لکھے، یہ میرؔ صاحب ہی کو زیبا تھا:

میرؔ صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اردُو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ میرؔ صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے، جو لطف سے خالی نہیں ہوتی ان کی زبان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز، مضامین کی جدّت اور تاثیر

یہ ایسی خوبیاں ہیں جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی شاعری عاشقانہ ہی لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔ یہ خاص انداز میر صاحب کا ہی، مگر ان کا کلام حسرت و ناکامی، حرمان و مایوسی سے بھرا ہوا ہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہی کہ میر صاحب بہت بڑے درویش کے بیٹے تھے، ان کے بچپن کا تمام زمانہ درویشوں ہی کی صحبت میں گزرا۔ سید امان اللہ جنھیں میر صاحب چچا کہتے تھے اور حقیقت یہ ہی کہ انھیں کی آغوش شفقت میں پرورش اور تربیت پائی۔ جب کبھی کسی درویش سے ملنے جاتے تو ہمیشہ میر صاحب کو ساتھ لے جاتے اور یہ ان کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں حاضر رہتے۔ اُن کے والد کی خدمت میں بھی اکثر درویش اور دوسرے لوگ حاضر ہوتے۔ یہ چُپکے چُپکے سب کچھ دیکھتے اور سُنتے رہتے۔ خود والد نے سید امان اللہ یا میر صاحب کو تلقین کی تو وہ بھی درویشانہ اور صوفیانہ اور خاص کر عشق اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے "بیٹا: عشق اختیار کرو کہ عشق ہی کا اس کارخانے پر تسلط ہی۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا بے عشق کے زندگانی وبال ہی اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہی۔ عشق بہ سازد و عشق بہ سوزد۔ عالم میں جو کچھ ہی وہ عشق ہی کا ظہور ہی . . . . . . . . بیٹا زمانہ سیال ہی یعنی بہت کم فرصت، اپنی تربیت سے غافل نہ رہو اس رستے میں بہت نشیب و فراز ہی دیکھ کر چلو . . . . . . . . ایسے پھول کا بلبل بنو جو سدا بہار ہو . . . . . . فرصت کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو۔" جب دن رات یہی صدائیں کان میں پڑتی رہیں تو وہ بچہ بڑا ہو کر درویش نہیں تو درویش منش ضرور ہو کر رہے گا۔ وہ اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں "جوان صلح اور عاشق پیشہ تھے،

دِل میں گرمی اور سوز رکھتے تھے۔ اخلاق سنجیدہ اور اوصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ شاید ہی کسی میں ہو طبیعش مشکل پسند، جانش دردمند، مژگاں نم، حال درہم۔ یہی اوصاف اکثر میر صاحب کو بھی ملے۔ اس پر لڑکپن میں یتیم ہو گئے۔ ایک تو یتیمی کا صدمہ دوسرے عزیز و اقارب کی طوطا چشمی، زمانے کی بے مروّتی، بے سروسامانی، یہ ایسی حالتیں نہ تھیں کہ ان کے دل پر اثر نہ کرتیں پھر وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب کہ مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ گہنا رہا تھا اور ہر طرف مایوسی و ناکامی نظر آتی تھی، اور اُن حیرت انگیز اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا اور برتا جو چند خاندانوں اور شہروں کا نہیں مُلکوں اور قوموں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میر صاحب کی سی اثر قبول طبیعت ان حالات سے متاثر نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اُن کے کلام کی فصاحت و شستگی سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے مگر پڑھنے والے کے دل پر مایوسانہ اثر پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہیں تھی وہ سراپا یاس و حرماں تھے اور یہی حال ان کے کلام کا ہے گویا ان کا کلام اُن کی طبیعت کی ہو بہو تصویر ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت و حقیقت سے خالی نہیں ؂

یہ رائے قیاسی یا فرضی نہیں۔ 'ذکرِ میر' پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر شعر ان کے دردِ دل کی تصویر ہے۔ غزلوں سے صرف ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ہوتا ہے، یہ معلوم ہونا دشوار ہے کہ کون سی غزل کس وقت اور کس حالت میں لکھی گئی۔ لیکن بعض واقعات جو ضمناً آ گئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی شاعری کا بہت سا حصّہ آپ بیتی اور اپنے دل کی کیفیت ہے۔ مثلاً خان آرزو کی بے مروّتی اور دل آزار سلوک اور اپنی بے نوائی اور بے بسی کا ان کے قلب پر بڑا صدمہ تھا اور وہ بہت ہی شکستہ دِل اور دل گرفتہ

رہتے تھے۔ اسی غم و غصّے میں اُن پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہوگئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے ان کی وحشت اور دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کو ہم اُنھیں کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:۔

"در شبِ ماہ پیکرے خوش صورت با کمالِ خوبی از جرم قمر انداز طرف من می کرد و موجب بے خودی می شد۔ بہ ہر طرف کہ چشم می افتاد بر آں رشکِ پری می افتاد، بہ ہر جا کہ نگاہ می کردم تماشائے آں غیرت حور می کردم۔ در و بام و صحن خانہ من ورق تصویر شدہ بود، یعنی از حیرت افزائی ازش جہت رو می نمود۔ گاہے چوں ماہ چہاردہ مقابل گاہے سیرگاہ و منزل دل اگر نظر بر گل مہتاب می افتاد، آتشے در جان بے تاب می افتاد۔ ہر شب باد صحبت، ہر صبح بے او وحشت دمے کہ سفیدۂ صبح می دمید از دل گرم آہ سرد می کشید، یعنی آہ می کرد و انداز ماہ می کرد۔ تمام روز جنون می کردم، دل دریا داد خوں می کردم، کف بر لب چوں دیوانہ دمست، پارہ ہائے سنگ در دستِ من افتاں و خیزاں، مردم از من گریزاں۔ تا چار ماہ آں گل شب افروز رنگ تازہ می ریخت و از فتنہ خرامی ہا قیامت می انگیخت ناگاہ موسم گل رسید، داغ سودا سیاہ گردید، یعنی چوں پریدار شدم مطلق از کار شدم صورت آں شکل وہمیں در نظر، خیال مشکینش در سر۔ شائستۂ کنارہ گیر شدم، زندانی و زنجیری شدم"۔

اب اس کے بعد میرؔ صاحب کی 'مثنوی خواب و خیال' پڑھیے۔ اس قلبی واردات کی تصویر اور اس خواب کی تعبیر صاف نظر آتی ہے۔ یہ محض خواب و خیال ہی نہیں بلکہ ایک واقعہ تھا جو اُن کے مایوس اور حزیں دل پر گزرا تھا۔

یا جب جاٹوں کی سرکشی اور فتنہ پردازی سے تنگ آکر راجا ناگرمل ۲۰ ہزار

گھروں سمیت، جن میں زیادہ تر انھیں کے وابستہ تھے، اپنا عزیز مقام چھوڑ کر کاما جاتے ہیں (میر صاحب بھی اس سفر میں راجا صاحب کے ہم راہ تھے) تو میر صاحب نے ایک مخمس لکھا ہی جس میں اپنی پریشان دلی اور اس بُرے وقت کا رونا رویا ہی۔ اسی قسم کی اور نظمیں بھی ہیں (مثلاً 'اپنے گھر کا حال'، وغیرہ) جن میں اپنی بے تابیاں بیان کی ہیں۔ اگرچہ یہ وقتی حالات اور ایک شخص واحد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سچّا شاعر ان کو اس انداز اور خوبی سے بیان کر جاتا ہی کہ ہر شخص لطف حاصل کر سکتا ہی۔ وہ مر جاتا ہی مگر یہ چھوٹے چھوٹے بے حقیقت واقعات اُس کے لطف بیان کی بدولت ہمیشہ کے لیے زندہ رہ جاتے ہیں:

اُن کا کلام دُور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے اور خلاف عادت امُور سے پاک ہی۔ بھونڈے اور بے جا تکلف و تصنع اور فضول لفّاظی کا نام نہیں، وہ قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ، شستہ اور صاف زبان میں ایسے دل کش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دِل میں اُتر جاتی ہی۔ غرض یہ کہ اُن کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہی اور سہلِ ممتنع کلام کا تجزیہ کر کے الگ الگ اُس کی خوبیوں کا گنوانا ناممکن ہی۔ کیوں کہ اس سے کلام کی اصلی خوبی کا کامل اندازہ تو ہوتا نہیں البتّہ اس کی نسبت غلط فہمی پیدا کر دینے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہی:

شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہی۔ اگر اس معیار پر میرؔ صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو اُن کا رُتبہ اُردو شعرا میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہی۔ ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں، زبان سے نکلتے ہی دِل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میرؔ صاحب کی عمر کوئی نوّے برس کی تھی اور اُن کو وفات

پائے بھی سو برس سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اب تک یہ حال ہو کہ لوگ ان کے کلام کو پڑھ پڑھ کر مزے لیتے اور سر دھنتے ہیں ۔

میری یہ رائے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ہو ورنہ ان کی ضخیم کلیات میں رطب و یابس سب کچھ بھرا پڑا ہو۔ مولانا آزاد نے ان کے کلام کی نسبت اپنے تذکرے میں صحیح لکھا ہو کہ "پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند است" اس پر مولانا حالی کی عام رائے کا نقل کر دینا جو انھوں نے شعرا کی نسبت لکھی ہو، لطف سے خالی نہ ہوگا :-

"یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جن کو اُستاد ماننا چاہیے، ان میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا جس کا تمام کلام اوّل سے آخر تک حُسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہوا ہو کیوں کہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہوسکتی ہو۔ شاعر کا معراجِ کمال یہ ہو کہ اس کا عام کلام ہم وار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے البتہ اتنی بات ہو کہ اس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دِل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اُس کا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہو اور یہ بات اسی شاعر کے کلام میں پائی جاسکتی ہو جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو"[1] ۔

میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہو لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں ۔ اسی طرح

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی صفحہ ۲۰ طبع دہلی ۔

اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہی۔ الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہی وہ اُن پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے اُن سلیس الفاظ اور معمولی ترکیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں۔ میر صاحب کا کلام اس بارے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور غور سے پڑھنے کے قابل ہی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہی کہ پڑھنے والے قدیم الفاظ یا محاورے یا متروک ترکیب کو دیکھ کر شعر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اسی لفظ یا ترکیب نے جسے وہ متروک سمجھتے ہیں خاص لطف پیدا کر دیا ہی یا کم سے کم وہ شعر کے حُسن میں ہارج نہیں:

میں یہاں چند شعر مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں جس سے اُن کے کلام کی حسن و خوبی اور اُن کے خاص انداز کا اندازہ ہو سکتا ہی ؎

دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا ۔۔۔ ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا ۔۔۔ مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں

---

اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا ۔۔۔ ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر

---

نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا ۔۔۔ یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ

---

تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا ۔۔۔ جو اس شور سے میر روتا رہے گا

---

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں مُوند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہی مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہی سو اتنا ہی
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

---

گُل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل
اک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

---

کیوں کر گلی سے اُس کی اُٹھ کر میں چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا، لوہو میں نہانا تھا
کہتا تھا کسو سے کچھ، تکتا تھا کسو کا مُنھ
کل میر کھڑا تھا یاں، سچ ہی کہ دِوانا تھا

---

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

---

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

---

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی، وہ اس کی جوانی

---

یہ کہہ کے مَیں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں مَیں ظلم رسیدوں کی کہانی

---

جب کوندتی ہی بجلی تب جانبِ گلستاں
رکھتی ہی چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہی مصلحت اب
ہر اک سے حالِ دل کا مدّت کہا زباں سے

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے　　اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

---

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل　　ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

---

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہی　　دل ہوا ہی چراغ مفلس کا

---

عشق ہمارے خیال پڑا ہی خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھیر گیا ہی صبح گیا یا شام گیا

---

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط　　اس کے در سے جاتے کی حسرت بھی ہی

---

اب کے جنوں ہیں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک ہیں

اِس آخری شعر پر مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ دیوان میں ایک بہت ہی پُرلطف لطیفہ لکھا ہی جس سے نہ صرف اس شعر کی خوبی بلکہ میر صاحب کے کلام کی خصوصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "مولانا آزردہ کے مکان پر اُن کے چند احباب، جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے، میر کا یہ شعر پڑھا گیا۔ شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیے کو ہر شخص اپنے سلیقے اور فکر کے موافق باندھ کر دکھائے۔ سب قلم دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ مولانا نے کہا:

"قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں"۔

مولانا حالیؔ نے اسی شعر کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:-

"ظاہر ہے کہ جوشِ جنوں میں گریبان یا دامن یا دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جس کو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں، ایسے چھیچھڑے ہوئے مضمون کو میرؔ نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے ایک اچھوتے نرالے اور دل کش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصوّر میں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے، نیچرل ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے"۔

یہی خوبی میرؔ کے تمام منتخب کلام میں پائی جاتی ہے چناں چہ چند اشعار جو نمونے کے طور پر اوپر لکھے گئے ہیں ان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان کی سلاست و فصاحت کے ساتھ پیرایۂ بیان کس قدر دل کش، نرالا اور پُرتاثیر ہے، یوں تو میر صاحب کے تمام نام ور ہم عصروں کے کلام میں سادگی، صفائی اور روزمرّے کی پابندی پائی جاتی ہے۔ لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی جب تک کہ زبان میں تازگی، ادائے مطلب میں شگفتگی اور خیال میں بلندی وجدّت نہ ہو۔ میرؔ صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں ایک جا جمع ہیں اور پھر اس پر درد اور تاثیر خداداد معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز اور اُردو شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور ان کی اس ممتاز خصوصیت کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے۔ البتّہ خواجہ میر دردؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سلاست و فصاحتِ زبان کے ساتھ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی ہے اور کلام

میں درد پیدا کیا ہے، بیان میں جدت اور تازگی بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ میر صاحب کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں لیکن بیان میں وہ گھلاوٹ نہیں جو میر صاحب کے ہاں ہے اور نہ غایت درجہ سلاست و سادگی کے ساتھ وہ سوز و گداز ہے اور نہ تخیل کی وہ شان ہے جو شاعری کی جان ہے خصوصاً بیان کا وہ انوکھا انداز جس میں ایک خاص نزاکت ہوتی ہے نظر نہیں آیا۔ میر صاحب کا بڑا کمال اسی میں ہے۔ میر انیس بھی جن کا فصاحت میں بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، میر صاحب کو نہیں پہنچتے۔ میر انیس میں پھر بھی تصنع اور تکلف آجاتا ہے، میر اس سے بالکل بری ہے وہ خود سوز و غم کا پُتلا ہے اور اس کا شعر سوز و غم کی صحیح اور سچی تصویر ہے جس میں تکلف کا نام نہیں۔ میر انیس کے ہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے لیکن میر کے اشعار میں الفاظ خیال کے ساتھ اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے اور اسے لفظ خیال سے الگ نظر نہیں آتا۔ میر انیس کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے، میر کے ہاں سکون اور خاموشی ہے اور اس کے شعر چُپکے چُپکے خود بہ خود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں جس کی مثال اس نشتر کی سی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دِل پر جا کر کھٹکتا ہے۔ میر انیس رُلاتے ہیں میر خود روتا ہے یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی ؂

میر کے کلام کی جن خصوصیتوں کا ذِکر ہوا ہے وہ مثال سے پوری طرح واضح ہو جائیں گی۔ جو اشعار نمونے کے طور پر اُوپر لکھے گئے ہیں اُن میں کا ایک شعر یہ ہے ؎

کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو		ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر

اس شعر کا حُسن شرح و بیان سے باہر ہی، آرام طلب کا لفظ اس کی جان ہی۔ اس لفظ کو نظر میں رکھیے اور پھر اس شعر کو غور سے ملاحظہ کیجیے تو شعر کا اصلی لطف سمجھ میں آئے گا۔ ایک شخص جو محبّت کی خاطر عیش آرام پر لات مار کے اور گھر بار چھوڑ کر، بے یار و بے خانماں، آوارہ و سرگرداں، محبوب کی دیوار کے نیچے پڑا ہی، اُسے طعنہ دیا جاتا ہی کہ آرام طلب ہی اور ایسے آرام طلب کو محبّت سے کیا کام! جب یہ آرام طلبی ہی تو قیاس کرنا چاہیے کہ محبّت کی مصیبت کیا ہوگی اور شاعر عاشق سے کیا توقع رکھتا ہی؟ ایک دُوسری مثال لیجیے :-

ایک شخص مجھی سا تھا کہ تھا، تجھ سے پہ عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اُس کی جوانی!
یہ کہہ کے مَیں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں مَیں ظلم رسیدوں کی کہانی

اس میں کوئی اعلیٰ درجے کا مضمون یا کوئی مبالغہ یا استعارہ و تشبیہ یا کسی قِسم کی صنعت نہیں مگر اظہارِ مطلب کے لیے کیسا خوب صورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہی۔ اس قسم کے اظہارِ حال میں سخت مشکل پیش آتی ہی اور انسان ہزار کوشش کرے اور کیسا ہی پہلو کیوں نہ اختیار کرے پھوڑپنے سے بچ نہیں سکتا۔ شاعر نے اس بدتمیزی سے بچنے کے لیے پردے ہی پردے میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ دردِ دل کی کیفیت کا اظہار کیا ہی اور اس پیرائے سے جو اثر پیدا ہو سکتا ہی وہ کبھی صاف صاف اپنے حال کے بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا اور پھر لطف یہ ہی کہ اس میں کہیں معشوق کی جفا یا بے وفائی کا ذکر نہیں صرف عاشق کی جوانی اور اس کے حالِ زار کی طرف اشارہ کیا گیا ہی اور یہ کہہ کے اس کا رونے لگنا، اس کے دردِ دل کو آشکارا کر دیتا ہی اور یہاں پردہ خود بہ خود اُٹھ جاتا ہی۔ یہ پیرایہ غضب

کا درد انگیز ہی اور پھر معشوق کے جواب نے اس درد میں ہزاروں ٹیسیں پیدا کردی ہیں۔ یہ میرؔ صاحب کا خاص کمال ہی اور یہی چیز ہی جو اُن کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گی؛ ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہی

یہ شعر کس قدر سادہ ہی۔ اس سے زیادہ آسان، عام اور معمولی الفاظ اور کیا ہوں گے لیکن اندازِ بیان درد سے لبریز ہی اور لفظ لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہی۔ اُردو کیا، مشکل سے کسی زبان میں اس پائے کا اور ایسا درد انگیز شعر ملے گا۔ ایک دوسری بات اس شعر میں قابلِ غور یہ ہی کہ جو شخص دوسروں کو غل نہ کرنے اور آہستہ بولنے کی ہدایت کر رہا ہی وہ بھی بیمار کے پاس بیٹھا ہی اور اُس پر بھی لازم ہی کہ یہ بات آہستہ سے کہے۔ اس کے لیے یہ ضرور ہی کہ لفظ ایسے چھوٹے، سلیس اور دھیمے ہوں کہ دھیمی سے دھیمی آواز میں بھی ادا ہو سکیں۔ اب اس شعر کو دیکھیے کہ لفظ تو کیا ایک حرف بھی ایسا نہیں جو کرخت ہو یا ہونٹوں کے ذرا سے اشارے سے بھی ادا نہ ہو سکتا ہو: ؎

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس میں کوئی خاص مضمون یا بات نہیں مگر شعر کس قدر پُر درد ہی دوسرے مصرعے نے اسے نہایت درد انگیز بنادیا ہی۔ یہ سلاست اور یہ اندازِ بیان اور اس میں یہ درد میرؔ صاحب کا حصہ ہی۔ ان اشعار کے سامنے صنائع و بدائع، تکلّف و مضمون آفرینی، فارسی و عربی ترکیبیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ ؎

مقدور بھر تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں منھ سے نکل ہی جاتی ہی اک بات پیار کی

یہ شعر میرؔ کے اعلیٰ یا منتخب اشعار میں سے نہیں ہی ایک معمولی شعر ہی، لیکن دل کی ایک فطری کیفیت کو کس خوبی سے بیان کیا ہی اور جیسا یہ خیال فطرتی

اور سادہ ہو ویسے ہی الفاظ بھی سادہ اور بندش اور ترکیب بھی صاف اور ستھری ہو مگر اندازِ بیان کا حُسن یہاں بھی وہی ہو :

ایسے اشعار میر کے کلام میں سینکڑوں ملیں گے اس لیے یہاں اور اشعار کا مثال کے طور پر لکھنا مضمون کو طول دینا ہو :

میر صاحب کے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار کی بھی کچھ کمی نہیں لیکن اخلاق ہو یا حکمت، اندرونی کیفیت ہو یا بیرونی حالت اندازِ بیان وہی ہو۔ نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بلند مضامین اس بے تکلفی سے بیان کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہو بلکہ بعض اوقات سرسری طور پر پڑھنے سے خیال نہیں گزرتا کہ ان سادہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے پردے میں ایسے ایسے بلند خیالات پنہاں ہیں :

مثال کے طور پر یہاں چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

سرسری تم جہان سے گزرے | ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

(کس قدر بلند اور اعلیٰ مضمون ہو مگر کس خوبی اور آسانی سے ادا کیا گیا ہو) ؎

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا | یک سر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر! | میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

---

وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

---

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

---

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں
مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

اُوپر کے ان تینوں شعروں میں انسان کی حالت کا کس قدر سچا نقشہ کھینچا ہے :-

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

---

کہا میں نے "کتنا ہے گُل کا ثبات" کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

---

بیان کی یہ نزاکت قابلِ غور ہے :-
ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے
اُڑنے کی ایک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستہ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

---

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقشِ قدم یاں
پامال ہُوا خوب تو ہموار ہوا میں

---

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

میر صاحب کا کلام عاشقانہ ہے لیکن ان میں اکثر اشعار ایسے ملیں گے جن میں کوئی اخلاقی یا حکیمانہ نکتہ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی

طبیعت کے دو رنگ ہیں، لطف و مسرت یا اندوہ و الم، میر صاحب کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ ان میں اندوہ و الم، ناکامی و مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ ان کی طبیعت کی افتاد ہے، وہ کسی حال میں ہوں، کوئی کیفیت ان پر طاری ہو، ان کے دل سے جب کوئی بات نکلی وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ظرافت کی چاشنی میر صاحب کے کلام میں مطلق نہیں مگر نہ معلوم کیا اتّفاق ہوتا تھا اور وہ کیسی شُبھ گھڑی ہوتی تھی کہ جب اُن کے افسردہ اور حرماں نصیب دِل کی کلی کِھلتی اور وہ ایک آدھ شعر اس قسم کا بھی کہہ جاتے۔ ان کے کلام میں چند ظریفانہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں لیکن یا تو وہ ایسے مبتذل قسم کے ہیں کہ ان سے بدمذاقی پائی جاتی ہے یا وہی حسرت و یاس جو ان کے دم کے ساتھ تھی۔ حیرت ہے کہ ظرافت کے وقت بھی یہ رنگ نہ گیا۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلاتا جا

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے ہیں اگرچہ اس میں بھی وہ بندہیں اور ترکیب و خیال میں بلندی پائی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس گون کے نہیں تھے اور قصیدہ لکھنا اُن کی طبیعت کی اُفتاد کے خلاف تھا جس کی وجہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے قصیدے دو چار سے زیادہ نہیں۔

البتہ مثنویاں قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو چودہ پندرہ مثنویاں ہیں لیکن بعض ان میں ایسی ہیں کہ اب بھی اُن کا پڑھنا لطف سے خالی نہیں، مثلاً دو مثنویاں جو اپنے گھر کی خرابی اور برسات کی شکایت میں لکھی ہیں، خوب ہیں۔ برسات میں اس مصیبت کا حال بہت ہی دردناک ہے، صحیح اور سچی واردات جو ایسی حالت میں واقع ہوتی ہے اس طرح لکھی ہے کہ آنکھوں کے سامنے بے سروسامانی کا نقشہ

کھنچ جاتا ہی اور غربا پر جو اس موسم میں گزرتی ہی اس کی حقیقی تصویر اس سے بہتر کہیں نہیں مِلتی - اس سے میر صاحب کی قوتِ مشاہدہ اور بیانِ واقعہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہی - عشقیہ مثنویوں میں قصّے اور بیان کے لحاظ سے بہتر 'شعلۂ عشق' ہی - یہ ایک سادہ اور مختصر سا قصّہ ہی - لیکن جس طرح انھوں نے اسے اٹھایا ہی اور آخر تک نبھایا ہی، وہ بہت قابلِ تعریف ہی - یہ پرس رام کی بیوی کی دردناک کہانی ہی - سارے قصّے پر یاس و الم کا سایہ سا پڑا ہوا نظر آتا ہی - اوّل ابتدا ہی پر درد انجام کا پتا دیتی ہی - جن اشخاص کا اس میں ذکر آیا ہی - اُن کی ساری حالت حقیقی رنگ میں دکھائی ہی - قصّے کی دل چسپی اس میں نہیں کہ کس کس نے کیا کیا کیا بلکہ اس راز میں ہی کہ ہوئی اَن ہوئی نہیں ہو سکتی - مثنوی میں ہر چیز انسانی زندگی سے کامل طور پر مطابق ہی - سوائے انجام کے جسے تخیّل کی پروازِ حقیقی سے خیالی زندگی میں اُڑا لے گئی ہی ؀

دُوسری عشقیہ مثنوی 'دریائے عشق' ہی - یہ بھی ایک معمُولی قصّہ ہی - اِن مثنویوں میں بیان سادہ اور بے تکلّف اور مسلسل ہی - کہیں کہیں فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں ورنہ زبان بہت صاف ستھری ہی اور میر صاحب کا اصلی رنگ صاف نظر آتا ہی ؀

سب سے بڑی مثنوی "شکار نامہ" کی ہی جس میں نواب آصف الدّولہ کے شکار کا حال ہی اس میں جا بہ جا غزلیں آتی ہیں جن کے متعلق کچھ کہنے کی حاجت نہیں - اس میں میر صاحب کو خاص کمال ہی لیکن صفائی بیان و زبان میں یہ اُدھر کی دو مثنویوں کو نہیں پہنچتی - اس میں فارسیت کا رنگ غالب ہی - مثنوی 'جوشِ عشق' اور 'خواب و خیال' بھی پڑھنے کے قابل ہیں - اگرچہ بظاہر یہ محض خیالی ہیں اور عالمِ خیال میں بڑے لطف کے ساتھ تخیّل کی جولانی دکھائی

ہے - لیکن خیال کی وسیع فضا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں - اسی طرح جھوٹ کی مذمت، مناجاتِ عاشقاں، عشقِ خانماں آباد کی مثنویاں بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت پُر لطف ہیں - مثنویوں میں بھی میر صاحب کا اندازِ بیان بہت سادہ اور دل گداز ہے - اس سے پہلے اُردو میں مثنوی کا یہ انداز کہیں نہیں پایا جاتا - مثنوی اصنافِ نظم میں بہت مشکل ہے - میر صاحب نے اسے خوب نبھایا ہے - اُردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا اور عمدہ نمونہ ہیں، مثنوی کو اُنھیں کی بدولت ترقی ہوئی، اور میر حسن اور شوق وغیرہ سب اُنھیں کے مقلد ہیں - البتہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' ایک ایسی نظم ہے جو روزمرہ کی صفائی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے کہیں بڑھی ہوئی ہے - لیکن وہ ہجر و وصل، راز و نیاز، تغافلِ معشوقانہ اور سراپا کی داستان ہے جس میں قصے کا سا کوئی تسلسل نہیں اور اس لیے میر صاحب کی مثنوی 'شعلۂ عشق' کو کسی طرح نہیں پہنچتی، بلکہ اس سے مقابلہ کرنا ہی فضول ہے - میر کی مثنویوں کے متعلق مولانا حالی کی رائے بہت سچی اور چچی تُلی ہے :-

" اب تک اُردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گزری ہیں، ان میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوئے ہیں، اوّل میر تقی جنھوں نے غالباً سب سے اوّل چند عشقیہ قصے اُردو مثنوی میں بیان کیے ہیں - جس زمانے میں میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اُس وقت اُردو زبان میں فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اُردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اُس سے چنداں مدد نہیں مِل سکتی - اس کے

سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی مگر مثنوی کا راستہ صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا اسی لیے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں، فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اُردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی اُس انداز سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار ہے بلاشبہ کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اُردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات جو اب متروک ہو گئے ہیں، میر کی مثنوی میں موجود ہیں اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں بھی کم و بیش پائی جاتی ہیں، مگر غزل میں ان کی کھپت ہوسکتی ہے کیوں کہ غزل میں اگر ایک شعر بھی صاف اور عمدہ نکل آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پُرکن اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا لیکن مثنوی میں جستہ جستہ اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس ان اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں نہ جچے مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا جس وقت میر نے یہ مثنوی لکھی ہے اُس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی۔ بہ ایں ہمہ میر کی مثنوی اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے، باوجودے کہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے، مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انھوں نے کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مطالب کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے جیسا کہ ایک مشّاق اور ماہر اُستاد کر سکتا ہے اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بہ مقابلہ اُن اشعار کے جن میں پُرانے محاورے یا فارسیت غالب ہے کچھ کم نہیں ہیں صدہا

اشعار میرؔ کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زبان زد چلے آتے ہیں۔
اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصّہ پن بہت کم پایا جاتا ہے انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بہ طور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کیے ہیں نہ اُن میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا بیان کیا گیا ہے، نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے مگر جتنی میرؔ کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں سے مبرّا ہیں"۔

اس میں شک نہیں کہ میرؔ کے کلام میں فارسیت کا رنگ زیادہ ہے مگر اس پر بھی صاف اور سُتھرے اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فصاحت اور سلاست متاخّرین کے کلام سے کہیں زیادہ ہے اگرچہ میرؔ اور ان کے ہم عصر شعرا کے کلام میں فارسیت غالب ہے لیکن اس زمانے میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جاتا ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کیا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا کر لیا اور صرف، صَرف و نحو کے خراد پر چڑھا کر اُردو بنا لیا۔ لیکن آج کل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے ایسا نہ ہو کہ یہ مقدّس الفاظ اردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس ہو جائیں۔ ان بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ ان کی تقلید کو ننگ سمجھتے اور ان کی کوششوں کو "غلط العام" سے تعبیر کرتے ہیں حال آں کہ وہ صحیح اصول پر چل رہے تھے اور ہم باوجود ہمہ دانی کے زبان کی اصلی ترقّی و نشو و نما کے گُر سے ناواقف ہیں۔ ایک دوسرا فریق جو فارسی، عربی کے مقبول الفاظ نکال کر

ان کی جگہ غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنا چاہتا ہی اسی نافہمی میں مبتلا ہی۔ ہماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ہیں۔ اس رجحان کے خاص اسباب ہیں جن پر ہم اس وقت بحث کرنی نہیں چاہتے لیکن اس قدر ضرور جتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہی اور درحقیقت ہم اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں پھر اسی اصول کو اختیار کرنا چاہیے۔

خود میر صاحب نے فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کے متعلق اپنے تذکرہ شعرائے اُردو یعنی 'نکات الشعرا'[۱] میں جو رائے ظاہر کی ہی وہ بہت ہی مناسب اور اب بھی قابلِ عمل ہی، وہ لکھتے ہیں:—

"سیوم آں کہ حرف و فعل پارسی بہ کار برند و ایں قبیح است چہارم آں کہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آں جائز است و ایں را غیر شاعرانہ می دانند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است، اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ نہ دارد"۔

بہرحال میر کی مثنویوں کے بیسیوں شعر جو اب تک زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں، اور اب بھی تاریخی لحاظ سے نیز اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہاں بہ طور نمونے کے ایسے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو اس وقت زبان زد خاص و عام ہیں:—

ضبط کروں میں کب تک آہ اب        چل اے خامے بسم اللہ اب

---

[۱] میر صاحب کا تذکرہ 'نکات الشعرا' ہندی بہت نایاب ہی اتفاق سے دستیاب ہو گیا اور انجمنِ ترقیٔ اُردو کی طرف سے شایع ہو گیا ہی۔

نہ کعبے نہ دیر کے قابل    مذہب اُن کا ہی سَیر کے قابل

---

مِیَر جی اس طرح سے آتے ہیں    جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

---

سنو ای عزیزانِ ذی ہوش وعقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہی نقل
پیمبر ہی، شہ ہی کہ درویش ہی
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہی

---

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہوگئی    وہ رنگینیٔ باغ کیا ہوگئی

---

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہی    عاقبت اس کو مار رکھتا ہی

---

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں    ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں

---

رفتہ رفتہ ہُوا ہوں سودائی    دوٗر پہنچی ہی میری رسوائی

---

آہ جو ہم دمی سی کرتی ہی    اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہی

---

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ    صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ

مِیر صاحب کی رباعیات بھی کچھ کم پُرلطف نہیں اور بعض تو بہت اچھی

ہیں۔ ان کے علاوہ متفرق مخمس، مستزاد اور فرد وغیرہ ہیں لیکن میرؔ کا اصل رنگ غزل اور مثنوی ہی میں پایا جاتا ہے اور اس میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اور ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اہلِ ذوق خود پڑھ کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں :ے

شاعر نہیں، جو دیکھا تو، تو ہے کوئی ساحر　　دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

بعض بعض جگہ میرؔ صاحب نے فارسی اشعار کا اُردو میں اس خوبی سے ترجمہ کر دیا ہے کہ اصل سے بڑھ گیا ہے ے

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم
باید اوّل بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میرؔ صاحب فرماتے ہیں :ے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

اس شعر میں پیارے کے لفظ نے جو حُسن پیدا کر دیا ہے وہ اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ سعدیؔ کا ایک اور شعر ہے ے

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بہ گویم
چہ بہ گویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میرؔ صاحب نے اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے :ے

کہتے تھے کہ یوں کہتے، یوں کہتے، اگر آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ایک فارسی شعر ہے :ے

عنقا سرو بر گیم مپرس از فقرا ہیچ　　عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

میرؔ نے اس مضمون کو کس خوبی سے اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

کہتے ہیں کہ انسان کا طرزِ بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے، یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے۔ لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میرؔ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ جو شخص میرؔ کے حالات اور اُن کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بہ خود اُن کے انداز، ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایک ایک لفظ، طرزِ بیان، ترتیب و بندش میں اُن کے قلبی واردات واحساسات کا نقشہ کھنچا ہوا ہے وہ شعر میں اپنا دل نکال کے رکھ دیتے ہیں اور اُن کی جدّتِ بیان میں صاف ان کے تیور نظر آتے ہیں۔ میرؔ صاحب کی سیرت ان کے کلام سے کچھ کم قابلِ قدر نہیں بلکہ میری رائے میں زیادہ قابلِ وقعت ہے۔ کلام میں تو صرف یہی ہے کہ اسے پڑھ کر ایک خاص قسم کی لذّت حاصل ہوتی ہے یا اُس کے اثر سے متاثر ہو کر لطف ملتا ہے، لیکن سیرت کی خوبی دوسروں کی اصلاح کرتی اور ان کو بناتی ہے۔ کلام کا لطف تو ممکن ہے کسی کو نہ آئے لیکن سیرت کے اثر سے بہت کم ہیں کہ متاثر نہ ہوں، اس میں ایک زبردست اخلاقی قوّت ہے جو اصلاح کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور کلام و سیرت میں وہی فرق ہے جو قول و فعل میں ہوتا ہے۔ میر کی وضع داری نے کمال کی لاج رکھ لی۔ انھوں نے شاعری کو ذریعۂ عزّت یا وسیلۂ معاش نہیں بنایا۔ ان کا صبر واستقلال، ان کی قناعت و بے نیازی اور ان کی غیرت اور وضع داری وہ خوبیاں ہیں جو انسان کو کمالِ انسانیت پر

پہنچاتی اور فرشتوں سے بڑھا دیتی ہیں۔ رنج والم سہے مگر کبھی اُف تک نہ کی، فاقے سے رہے مگر کیا مجال کہ بھُول کر بھی زبان پر حرف شکایت آیا ہو۔ اور یہی نہیں بلکہ کسی دؤسرے کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ ان سے معمؤلی طریقے پر سلوک کرنے کی جرأت کر سکے یا ایسا خیال بھی دل میں لا سکے۔ محتاج رہے مگر ممکن نہ تھا کہ کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں اُن کے مذہب میں یہ کفر تھا وہ اپنے کمال میں مگن تھے اور خود اپنے تئیں اقلیمِ سخن کا شہنشاہ سمجھتے تھے وہ دنیا کے مال و دولت کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ شاہوں کی شان و شوکت اور امیروں کی جاہ و ثروت ان کے سامنے ہیچ تھیں۔ کسی کے سامنے سر جھکانا یا کسی سے اظہارِ مدعا کرنا ان کے ہاں سب سے بڑی معصیت تھی ؎

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا     حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

ان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھیں بالکل عبث ہے، اُن کی غیرت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ کسی نا اہل کی بھٹی کریں۔ یہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو تین قصیدے جو انھوں نے عمر بھر میں لکھے وہ اُن کے دؤسرے کلام کے سامنے بے مزہ، پھیکے اور بے لطف ہیں کہ خود فرماتے ہیں ؎

مجھ کو دماغ وصفِ گُل و یاسمن نہیں     مَیں جوں نسیم بادہ فروشِ چمن نہیں

اس میں شک نہیں کہ میرؔ کے کمال کی قدر خود انھیں کے زمانے میں ایسی ہوئی کہ کم کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدر زیادہ تر ان کے زبردست کیرکٹر یعنی سیرت کی وجہ سے ہوئی ورنہ کمال کی قدر جیسی کچھ ہوتی ہے وہ معلوم ہے۔ یہ ان کے صبر و استقلال اور استغنا و قناعت کی قوت تھی کہ ان کے سامنے اچھوں نے سر جھکائے اور زانوے ادب تہ کیے،

یہاں تک کہ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں بھی ان کا بڑا ادب و احترام کرتے اور بڑی عزّت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ لیکن ان کی نازک مزاجی اور بد دماغی کی کیفیت اُن والیانِ ملک سے بھی وہی تھی جو اوروں کے ساتھ تھی اور صبر و قناعت اور غیرت و خودداری نے اس کی لی اور بڑھا دی تھی حتّٰی کہ بعض وقت وہ لوگ بھی جو ان کے دل سے قدردان تھے، اور ان کی ناز برداری کو اپنا فخر سمجھتے تھے، ان کی بد دماغی سے عاجز آجاتے تھے۔ وہ اپنے کمال کے سامنے کسی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور جا و بے جا بد دماغی کر بیٹھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس سے واقف تھے، چناں چہ کہتے ہیں :ـ

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ ۔۔۔ دل شورشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ۔۔۔ ہے نام مجلسوں میں مرا میرِؔ بے دماغ
ازبس کہ بد دماغی نے پایا ہے اشتہار

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ـ

تری چال ٹیڑھی تری بات رُوکھی ۔۔۔ تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس نازک مزاجی اور خودداری کے ہاتھوں وہ زندگی سے بے زار رہے اور ہمیشہ دُکھ درد سہتے اور خونِ جگر کھاتے رہے اور اسی خونِ جگر سے انھوں نے زمینِ شعر کو سینچا جو اب تک تر و تازہ ہے ـ

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب مَیں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

افسوس کہ آرام و راحت، زندہ دلی اور مسرّت ان کی قسمت میں نہ تھی۔ اور انھوں نے اپنی زندگی اس دنیا میں ایک حرماں نصیب قیدی کی طرح

کاٹی۔ یہ معلوم ہوتا ہی کہ غم والم کا ایک ابرِ سیاہ ہمیشہ اُن پر چھایا ہوا ہی، جس میں سے خوشی کی ایک کرن بھی چھن کر اُن پر نہیں گرتی اور یہی رنگ اُن کے اشعار سے ٹپکتا ہی۔ گویا وہ اور ان کا کلام ایک ہو گئے ہیں اور یہ انتہائے کمالِ شاعری ہی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو خود بیان کرتے ہیں ؎

یار و ٹے یا رُلایا اپنی تو یوں ہی گزری
کیا ذِکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا

قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہی نالگی کی
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا

ایک دُوسری غزل کے چند اشعار ہیں :؎

یہ میرِ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا　انداز سخن اس کا سببِ شور و فغاں تھا
جادو کی پُڑی پرچۂ ابیات تھا اُس کا　مُنھ تکیے غزل پڑھتے، عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا　ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک　آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا
غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے　وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا

باوجود ان حالات کے انھوں نے خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا، اور اضطراب میں بھی کوئی فعل اُن سے ایسا سرزد نہیں ہوا جو ان کی شان اور وضع داری کے خلاف ہوتا، آج ہم ان کی نازک مزاجی اور خودداری کے واقعات اور لطیفے شوق سے پڑھتے اور ان پر فخر کرتے ہیں اور ان سے وہی لطف حاصل ہوتا ہی جو ان کے کلام سے ہو سکتا ہی بلکہ اثر میں اُن کے حالات اُن کے کلام سے کہیں زیادہ ہیں خوب کہا ہی ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

یہ وہ لوگ ہیں کہ باوجود مصائب و آلام کے ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی، انھوں نے اپنے کلام کی عزت قائم رکھی اور اپنے افعال سے اس کو ذلیل نہیں کیا۔ کمال کی وجہ سے اُن کی عزت نہیں بلکہ ان کی وجہ سے اُن کے کمال کا رتبہ دہ چند بڑھ گیا۔ اسی وجہ سے میر کی زندگی سبق آموز اور عبرت خیز ہے سبق ان کے لیے جو کسبِ کمال کی راہ میں گام زن ہیں اور ان کے گرد وپیش موانعات اور سامنے ترغیبات کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہی اُن کا امتحان ہے، ان پر لازم ہے کہ وہ راہِ راست پر ثابت رہیں اور اپنے قدم میں لغزش نہ آنے دیں۔ عبرت ہے اُن کے لیے جو اپنے کمال کو اپنی ہوس کے پورا کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اُسے ایک دُکان داری سمجھتے ہیں اور اپنی بے حمیتی سے اپنے کمال کو بٹا لگاتے ہیں اگر کسی میں ہزار کمال ہوں لیکن اس میں میر کی سی خودداری، صبر واستقلال غیرت اور وضع داری نہ ہو تو ایسے شخص کا وجود دنیا کے لیے بے کار ہے اور خود اس کے کمال کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔ اُن بے تہوں[1] کو جنھیں اتفاق سے ہلدی کی گرہ ہاتھ لگ جاتی ہے اور پنساری بن بیٹھتے ہیں، میر کی زندگی کا مطالعہ غور سے کرنا چاہیے تب اُنھیں معلوم ہوگا کہ ایک صاحبِ کمال کے تیور ہی اور ہوتے ہیں :۔

میر کا کلام اور ان کی سیرت دونوں قابلِ مطالعہ ہیں اور دونوں نے مل کر میر کا رتبہ اُردو شعرا میں نہایت بلند کر دیا ہے۔ ایسے باکمال اور صاحبِ سیرت لوگ، کہیں مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا نقش ایسا مستقل اور گہرا ہوتا ہے کہ زمانہ مٹا نہیں سکتا، خوب کہا ہے ؎

---

[1] بے تہ، خاص میر صاحب کا لفظ ہے اُنھوں نے اُسے کم مایہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ آج کل سطحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے اور بے تہ کے مقابلے میں بہت بھونڈا اور ثقیل ہے۔ یہ لفظ استعمال کرنے اور رواج دینے کے قابل ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہی فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر صاحب کو درباداری اور امرا کی ملاقات سے طبعاً نفرت تھی۔ صاحب 'آبِ حیات' لکھتے ہیں کہ :-

"گورنر جنرل اور اکثر صاحبانِ عالی شان جب لکھنؤ جاتے تو اپنی قدردانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علوِ حوصلہ سے ایک صاحبِ کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے میر صاحب کو ملاقات کے لیے بلاتے مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہی تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہی۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں' میرا کلام سمجھتے نہیں' البتہ کچھ انعام دیں گے' ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل"۔

اس سے زیادہ قابلِ لحاظ ایک واقعہ صاحبِ 'گلشنِ ہند' نے لکھا ہی جس کا یہاں نقل کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں :-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبِ عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بے چارے مجہول کے محمول ہوئے اور نوجوان نومشق مربی گری سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے نہیں خالی ہی۔ اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست جمالی ہی کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہلِ تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غور کے میں مویز ہیں۔ اب بھی جو بوجھ تمکنتِ معنی کا جرِ ثقیلِ طبع سے تراز و کرکے وہ دکھاتا ہو جوان اگر کوہِ بوقبیس ہی تو تحمل سے اُس کے کمر چراتا ہی"۔

غالباً اس جگہ کے لیے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا۔ یہ اردو زبان کی بدنصیبی

تھی کہ میرؔ صاحب کا انتخاب نہ ہوسکا۔ چوں کہ ان کی نظم میں غایت درجہ فصاحت، شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ پائی جاتی ہی۔ اس لیے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہلِ زبان اُن کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے اور میر امّنؔ کی 'چہار درویش' کی طرح اردو ادب میں اس کا نام بھی روشن ہوتا۔

اب ایک سوال یہ باقی ہی کہ میر کی شاعری کا اثر ان کے ہم عصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا؟ اگرچہ میرؔ صاحب کی شاعری کی خود ان کے زمانے میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ اُن کی اُستادی کا لوہا مانتے ہیں لیکن حیرت ہی کہ ان کے آخر زمانے نیز مابعد کی شاعری پر میرؔ کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہی اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ اہلِ لکھنؤ جس کلام کی اس قدر دِل سے داد دیتے تھے اور جسے پڑھ پڑھ کر جھومتے اور سر دُھنتے تھے اس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوئے اور اس نے ایک جداگانہ روش اختیار کی جسے میرؔ کے انداز سے کچھ نسبت نہیں۔ مولانا حالیؔ نے اپنے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں اس کی وجہ بتائی ہی جسے یہاں بہ جنسہٖ نقل کیا جاتا ہی :۔

"شجاع الدّولہ کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک اُردو کے تمام نام ور شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میرؔ، سوداؔ، سوزؔ، جراءتؔ، مصحفیؔ اور انشاؔ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے مگر متاخرین کی غزل میں اُن کے طرزِ بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہی۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہی کہ جب دلّی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلّی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نام وَر شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علومِ قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تو

اس وقت نیچرل طور پر اہلِ لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب ولہجے میں بھی ہم دلّی سے فائق رہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ اپنی اور دلّی کی زبان میں کوئی امرمابہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چوں کہ منطق و فلسفہ وطب وعلم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود یہ خود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور اہلِ علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ ثقات سے سُنا گیا ہے۔ معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم ونثر پر بھی غالب آگیا"۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے۔ جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم ونثر میں آجاتی ہے۔ اگر ہم اس زمانے کے لکھنؤ کو دیکھیں اور اس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہلِ لکھنؤ کے کھانے پینے رہنے سہنے، لباس، آداب واطوار غرض تمام طرزِ معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف پایا جاتا تھا۔ انھیں سوچ سمجھ کر کسی خاص امتیاز کے پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو عام روش زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی تھی، اسی میں ان کا علمِ ادب بھی رنگا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ منطق و فلسفہ اور علمِ کلام کی ممارست نے ان کے علمِ ادب پر اثر ڈالا لیکن اس سے قبل دلّی میں بھی ان علوم کا چرچا تھا اور دُور دُور سے طالب علم ان علوم کی تحصیل کے لیے وہاں آتے تھے لیکن وہاں کی بول چال اور نظم ونثر پر کبھی ایسا بُرا اثر نہیں پڑا۔ مگر اس زمانے کے لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف

تھی اور یہ اُن کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے۔ وہ نئی تراش خراش اور جدّت پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی اس لیے سب کے سب اُدھر ہی ڈھل گئے اور ساری ہمت تکلّفات میں صرف کر دی۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی۔ میر اور ان کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا اور ان کے بجائے دوسرے اُستاد پیدا ہوئے جو اُس سوسائٹی کے سپوت اور اُس تمدّن کے پروردہ تھے حضرت ناسخ اور ان کے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت، لفظی مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلّفات کے کچھ بھی نہیں۔ نثر میں اس کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا رجب علی سرور کا 'فسانۂ عجائب' ہے۔ اس دَور کا اثر ایک مدّت تک رہا اور شاید اب بھی لکھنؤ کی سرزمین میں کہیں کہیں باقی ہو۔ لیکن یہ چلنے والی چیز نہ تھی۔ آخر اس کا زور ٹوٹا جس میں بیرُونی اثر کو بھی دخل ہے۔ میر مجروح اور مولانا حالی کے کلام میں کچھ کچھ میر کا رنگ نظر آتا ہے۔ نثر میں فورٹ ولیم کالج، مرزا غالب، سر سید احمد خاں، مولانا حالی، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ نے ایک نئی رُوح پھونکی۔ انجمنِ پنجاب نے بھی اردو نظم و نثر کی اصلاح میں مدد دی، یہ اثر زیادہ تر مغربی رنگ نے پیدا کیا۔ آج کل اُردو پھر ایک تذبذب کی حالت میں ہے۔ ہندو مسلمان کے اختلاف نے اردو پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے، ایک فریق عربی پر تُلا ہوا ہے اور دوسرا فریق سنسکرت پر۔ دونوں غلطی پر ہیں۔ زمانے کے اقتضا سے زبان بچ نہیں سکتی اور یہ اسی کا اثر ہے لیکن جو اسباب اُس کے باعث ہوئے ہیں وہ سب عارضی ہیں اور قائم رہنے والے نہیں۔ جب لوگ اُردو زبان کی تاریخ، اس کی ابتدا اور اس کے نشو و نما پر غور کریں گے اور زبان کے عمدہ نمونے اُن کے پیشِ نظر ہوں گے تو وہ اس بے راہ روی

سے خود بہ خود باز آجائیں گے جس میں سب سے بڑی تقویت مغربی تعلیم، وہاں کے عمدہ نمونوں اور صحیح تنقیدی اصولوں سے ملے گی اور گو میرؔ کا حقیقی اور اصلی رنگ واپس نہ آئے مگر اس کا کلام پھر بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا اور جس حُسن و سادگی کو ہم بھولے ہوئے ہیں اُس کی یاد کو تازہ کرتا رہے گا اور ہمیں بھٹکنے سے روکتا رہے گا۔ یہ کیا کم احسان ہی؟ ؎

سہل ہی میرؔ کا سمجھنا کیا؟
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہی

---

# مقدمۂ دیوانِ اثر

سیّد محمد نام اور تخلّص اثر تھا۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کی بزرگی، تقویٰ اور علم و فضل کو تسلیم کیا ہی۔ اپنے بھائی کے عاشق تھے۔ اُن کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے اور اُن سے وہی عقیدت تھی جو ایک سچّے طالب اور مرید کو اپنے مرشد سے ہوتی ہی اور اُن کے بعد یہی ان کے سجّادہ نشین ہوئے اور حقیقت یہ ہی کہ مستحق بھی یہی تھے۔ مثنوی 'خوابِ[1] و خیال' میں انھوں نے اپنی اس عقیدت کو بڑے خلوص سے بیان کیا ہی[2]۔ خواجہ میر درد کا پایہ درویشی اور شاعری میں بہت بلند ہی اور اثر نے بھی پوُرا ان کا تتبع کیا ہی۔

افسوس ہی کہ اثر کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ اس سے قبل ان کا کلام بھی مفقود تھا۔ بارے غنیمت ہی کہ اب ان کا کلام مِل گیا ہی۔ مثنوی پہلے چھپ چکی ہی۔

---

[1] مطبوعۂ انجمن ترقّیِ اُردو۔

[2] فرماتے ہیں :-

درد ہی میرے جی میں چھایا ہی — درد کا میرے سر پہ سایا ہی
تو نے ایسی ہی دست گیری کی — پدری، مادری و پیری کی
تو نے اس مہر و غور سے پالا — نہ پڑا مجھ کو اور سے پالا

(دیکھو مقدمۂ مثنوی 'خواب و خیال')

اب دیوان شایع کیا جاتا ہے۔ دونوں نہایت قابلِ قدر ہیں اُردو کی بڑی بدقسمتی ہوتی اگر یہ گُم نامی میں پڑے رہتے اور شایع نہ ہوتے۔ یہی ان کی ساری کائنات ہے اور اسی میں اُن کی حیات کا سارا سرمایہ ہے۔ اگر ان کی زندگی کے حالات معلوم نہیں تو نہ ہوں، ان کے کلام کا مل جانا بہت بڑی فتوح ہے۔ اردو کے دل دادہ کے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت ہو نہیں سکتی۔

'خواب وخیال' ایک ایسی مثنوی ہے کہ ہماری زبان میں اس کا جواب نہیں اسے اثر کی شاعری کا کمال سمجھنا چاہیے۔ دیوان مختصر ہے، کچھ غزلیں ہیں، کچھ اور قطعے اور رباعیاں اور کچھ مختلف مطلعے۔ مگر نہایت ہی پاک اور ستھرا کلام ہے۔ نہ فارسی ترکیبیں ہیں نہ تعقید و اغلاق ہے اور نہ بعید از کار تشبیہات و استعارات سے کچھ کام لیا ہے اور نہ تخیل کی بلند پروازی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحریں اور سادہ سادہ لفظ ہیں۔ اتنے سادہ کہ اُن سے بڑھ کر سادہ مل نہیں سکتے۔ مضمون کو دیکھیے تو اس میں تصوّف ہے نہ اخلاق نہ حکمت و فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کردی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ ہم باتوں میں بھی ایسی سادہ اور سلیس زبان نہیں بولتے جیسی وہ اپنے شعروں میں لکھ جاتے ہیں۔ اس سادگی اور سلاست پر خوبی یہ ہے کہ اثر سے خالی نہیں۔ ان کی زبان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اُردو کے کسی شاعر کو ایسی سلیس زبان نصیب نہیں ہوئی۔ باتیں وہی ہیں مگر زبان اور بیان اور ہے۔ ان کی سلیس زبان اور بے تکلف بیان نے جادو کا سا کام کیا ہے۔ کوئی شعر ایسا نہیں جو بے جان ہو اور اثر نہ رکھتا ہو۔ اُن کے شعر میں زبان اور بیان ہی کا لطف نہیں، دل بھی مزے لیتا ہے اور ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خود فرماتے ہیں :ؔ

دیوانِ اثر تمام دیکھا　　ہے اس میں ہر ایک شعر حالی

یہ جوہر سادگی ہی کو عطا ہوا ہی کہ وہ دِلوں کو گرماتا اور قال میں حال کا عالم پیدا کر دیتا ہی۔ اثر ہمیشہ سادگی کے سایے میں چلتا ہی اور دل نشینی اس کا حُسن ہی جو دلوں کو موہ لیتا ہی۔ اثر کے کلام میں یہ خوبی ایسی ہی جو اُردو کے دوسرے شاعروں میں کم پائی جاتی ہی۔ صاحبِ ذوق اسے شوق سے پڑھیں گے اور اس شگفتہ چمن سے اپنے ذوق کے مطابق ایسے پھول چُن لیں گے جن کی بھینی بھینی خوش بو سے دل کو فرحت اور دماغ کو نشاط حاصل ہوگا۔ ہم نے بھی اس چمن کی سیر کی، چند تازہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی سادگی تازگی اور لطافت ملاحظہ فرمائیے :-

مرزا غالب کی مشہور غزل ہی ؎

بر نہیں آتی، کر نہیں آتی

خوب لکھی ہی، جواب نہیں رکھتی۔ اثر کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

حالِ دل مثلِ شمع رکھتا ہوں ۔ گو مجھے بات کر نہیں آتی
ہر دم آتی ہی گرچہ آہ پہ آہ ۔ پر کوئی کارگر نہیں آتی
کیا کہوں آہ اور کس کے حضور ۔ نیند کس بات پر نہیں آتی
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن ۔ رات کٹتی نظر نہیں آتی
ظاہرا کچھ سوائے مہر و وفا ۔ بات تجکو اثر نہیں آتی

ایک دوسری غزل دیکھیے ؎

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہی ۔ دل تجھے اعتبار آتا ہی؟
دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا ۔ دشمنی پر تو پیار آتا ہی
تیرے کوچے میں بے قرار ترا ۔ ہر گھڑی بار بار آتا ہی
زیرِ دیوار تو سُنے نہ سُنے ۔ نام تیرا پکار آتا ہی
حال اپنے پہ مجکو آپ اثر ۔ رحم بے اختیار آتا ہی

اثر کیجیے کیا کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے
کبھو دوستی ہی کبھو دشمنی — تری کون سی بات پر جائیے
کئی روز کی زندگانی ہی یاں — بنے جس طرح زیست کر جائیے
اثر ان سلوکوں پہ کیا لطف ہی — پھر اس بے مروّت کے گھر جائیے

---

اب توقع کسے بھلائی کی — دل نہ ہوتا تو کچھ بھلا ہوتا
بے وفائی پہ تیری جی ہی فدا — قہر ہوتا جو با وفا ہوتا

---

کسو کو مجھ سے نی مجھ کو کسو سے کام رہتا ہی
مرے دل میں سوا تیرے خدا کا نام رہتا ہی
بیاں میں کیا کروں اس سے اب آگے اپنی ناکامی
ترے یہ طور اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہی

---

بے وفا کچھ تری نہیں تقصیر — مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

---

کبھی جفا کے سوا تجھ سے کچھ نہیں دیکھا — پہ تو بھی مجکو وفا کا گمان باقی ہی

کیا شعر کہا ہی :ے

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے — اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

---

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا — جب تجھے ڈر کے ایک نظر دیکھا

---

## رباعی

گزرے ہی جو کچھ کہ دل پہ کس سے مَیں کہوں		کوئی نہ چڑھا نظر کہ اُس سے مَیں کہوں
یہ بات ہی ایسی ہو کہ تو کیا پیارے		باور نہ کرے اُسے وہ جس سے مَیں کہوں

---

احوالِ تباہ کو دکھاؤں مَیں کسے		افسانۂ دردِ دل سُناؤں مَیں کسے
تو دیکھ نہ دیکھ، سُن نہ سُن، جان نہ جان		رکھتا ہوں تجھی کو اور مَناؤں مَیں کسے

---

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ نسخہ دو قلمی نسخوں سے مرتّب کیا گیا ہی۔ ایک تو جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے کتب خانے کا ہی جو جامعہ کے فاضل پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے بہ کمال عنایت مستعار مرحمت فرمایا جس کا مَیں بہت شکر گزار ہوں۔ دُوسرا مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے کتب خانۂ آصفیہ سرکارِ عالی (حیدر آباد دکن) سے نقل کر کے بھیجا۔ مرزا صاحب کی اس زحمت اور کرم فرمائی کا بہت ممنون ہوں۔ لیکن کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ بہت ناقص ہی۔ اس میں بہت سا کلام چُھٹ گیا ہی۔ جامعہ کا نسخہ بہت اچھا ہی۔ کچھ مَیں نے مختلف تذکروں نیز دُوسرے ذرائع سے جمع کیا تھا۔ غرض اس طرح جمع کر کے مرتّب کیا ہی۔ اب اس کی قدر پڑھنے والوں کے ہاتھ ہی ؛

---

# مقدمۂ مثنوی خواب و خیال

سیّد محمّد نام، تخلص اثرؔ کرتے تھے۔ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ میر حسن اپنے 'تذکرۂ شعرا' میں لکھتے ہیں :۔

"درویشے است موقّر و صاحب سخنے است موثر، عالم و فاضل رتبۂ قدرش بہ غایت بلند، گوہر صدرش نہایت ارجمند۔"

وہ خواجہ صاحب کے چھوٹے بھائی ہی نہیں تھے بلکہ اُن کے شاگرد اور مرید بھی تھے۔ اس مثنوی میں انھوں نے بھائی کا ذکر نہایت ادب اور عقیدت سے کیا ہے۔ درویشی اور شاعری دونوں میں انھیں کے قدم بہ قدم چلتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

خواجہ میر دردؔ اُن بزرگوں میں سے ہیں جو اپنی سیرت اور کلام کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ دلّی پر صدموں پر صدمے اور آفتوں پر آفتیں نازل ہوئیں مگر ان کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہوئی۔ ایک وجہ تو بظاہر یہ تھی کہ بزرگوں کے وقت سے کچھ جاگیر چلی آتی تھی اور لوگ ان کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں حقیقی درویشی کی چاشنی تھی، توکّل کے ساتھ استغنا اور بے نیازی ان کے خمیر میں تھی۔ انھوں نے کبھی امرا اور بادشاہوں کو منھ نہ لگایا۔ پاسِ وضع کا ہمیشہ خیال رکھا اور عمر بھر تک

نبھایا۔ میر اثرؔ نے بھی اپنے بھائی اور پیرومرشد کی طرح جن سے انھوں نے کسبِ کمال کیا تھا "بہ طورِ درویشاں صاحبِ معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی"[1] اور اپنے بھائی کے سجّادے پر عمر بسر کردی ؛

صاحبِ 'خم خانۂ جاوید' لکھتے ہیں کہ "خواجہ میر دردؔ کے عالمِ ضعیفی میں اُن کے ایک مرید نے عرض کی کہ دنیا دارِ فانی ہے اور حضرت کا وقتِ آخر حضور ہدایت فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو آپ کا جانشین اور صاحبِ سجّادہ مانیں۔ آپ یہ سُن کر آنسو بھر لائے اور جواباً یہ قطعہ پڑھا: ؎

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کے دلِ عالم سے
دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثرؔ جاتے ہیں[2]

اس سے ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کو اپنے بھائی کا کس قدر خیال تھا اور وہ انھیں کیا سمجھتے تھے۔ اور میر اثرؔ کے دِل میں جو ادب واحترام اور ارادت و عقیدت مندی حضرت خواجہ صاحب کی طرف سے تھی، اس کی انتہا نہ تھی چناں چہ اس کا ثبوت جابہ جا اس مثنوی میں ملے گا اور اسی فیضِ صحبت کے اثر سے اثرؔ کچھ کے کچھ ہو گئے ؎

دردؔ ہی میرے جی میں چھایا ہے
دردؔ کا میرے سر پہ سایا ہے

. . . . . . . . . . . . . . . . .

تُو نے ایسی ہی دست گیری کی
پدری، مادری و پیری کی

---

[1] گلشنِ ہند، ص ۳۰ [2] 'خم خانۂ جاوید'، جلد اوّل ص ۱۲۶

تو نے اس مہر و غور سے پالا
نہ پڑا مجکو اور سے پالا

بات جو ہی مری سو تیرے ساتھ
تو نے ایسی ہی کی ہو میرے ساتھ

تو نے بندے کو یوں نوازا ہی
ایسے ناکس کو سرفرازا ہی

میراثرؔ کا کلام بہت ہی پاک وصاف اور فصیح ہی اور درد واثر کی چاشنی رکھتا ہی اور مثنوی[1] تو سلاست وفصاحت کی کان ہی۔ اُردو زبان میں مثنوی کا رواج بہت قدیم زمانے سے ہی اور دسویں صدی ہجری سے اب تک سیکڑوں مثنویاں لکھی گئی ہیں، جن میں عاشقانہ بھی ہیں، صوفیانہ بھی اور تاریخی بھی، بعض ان میں سے بہت ضخیم اور بڑے پایے کی ہیں۔ لیکن اُس وقت اور اس وقت کی زبان میں اس قدر تفاوت ہی کہ باہم کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جدید اردو زبان کی جب سے بنیاد پڑی ہی، شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی 'خواب وخیال' کا مقابلہ

---

[1] ان کے دیوان کی طرح ان کی مثنوی بھی بہت کم یاب ہی۔ مجھے ایک مدت سے اس کی تلاش تھی اتفاق سے اس کا ایک نسخہ میرے برادرِ معظم شیخ ضیاء الحق صاحب نے مجھے بھیجا جو انھیں کہیں سے مل گیا تھا۔ میں اس کی اصلاح وترتیب میں مصروف تھا کہ مولوی نجیب اشرف صاحب ندوی نے اطلاع دی کہ انھیں ایک نسخہ انجمن اصلاح ڈیسنہ (بہار) کے کتب خانے میں دست یاب ہوا ہی اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں انجمن کی طرف سے اسے شایع کرنے والا ہوں تو کمال عنایت سے وہ نسخہ میرے پاس بھیج دیا۔ جس سے مجھے اپنے نسخے کی تصحیح میں بہت مدد ملی اور میں مولوی صاحب موصوف کا بہت شکر گزار ہوں۔

کر سکتی ہے۔ مگر بات کیا ہے کہ یہ کوئی مسلسل قصہ یا داستان نہیں ہے، ہجر و مفارقت، تمنّائے ملاقات و مواصلت، راز و نیاز، چھیڑ چھاڑ اور عشق و عاشقی کی کیفیات اور واردات کا بیان ہے اور بہت پُرلطف ہے۔ لیکن ایک مسلسل داستان کے بیان میں جو مختلف اشخاص کی سیرت نگاری اور مختلف حالات و واقعات کے دکھانے میں شاعر کو مشکلات پڑتی ہیں اور جس سے اس کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے، اُن سب چیزوں سے یہ مثنوی خالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ میر تقی میر کی مثنویاں صفائی زبان کے لحاظ سے اسے نہیں پہنچتیں، لیکن جب اُن تمام امور کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جو ایک مسلسل مثنوی کے لیے لازم ہیں تو میر صاحب کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو نہ صرف بہ لحاظِ زمانہ بلکہ ہر لحاظ سے تقدّم اور فضیلت ہے۔ البتہ اس مثنوی میں دِلی کیفیتوں اور معاملاتِ عشقیہ کا بیان بہت قابلِ تعریف ہے اور خاص کر اس کا بے ساختہ اور بے تکلّف طرزِ بیان بہت ہی لائقِ داد ہے اور حق یہ ہے کہ کمال کو پہنچا دیا ہے جہاں سے کتاب کو کھولیے ایک سی حالت ہے، یہاں محض نمونے کے لیے بعض مقامات سے بغیر کسی خاص کوشش کے چند شعر لکھے جاتے ہیں، جن سے اثرؔ کے کلام کا اندازہ معلوم ہوگا:ؔ

شادمانی نظر نہیں آتی
زندگانی نظر نہیں آتی

کیا کہوں میں کسو سے اپنا حال
زیست کرنی غرض ہوئی ہے محال

کون کس کی سُنے ہے کس سے کہوں
اور اُلٹے ہنسے وہ جس سے کہوں

درد کوئی کسو کا کیا جانے
اس کا دل جانے یا خدا جانے

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا
گر کہا بھی تو کون مانے ہی
جو سُنے ہی سو جھوٹ جانے ہی

گر کسو نے سُنا تو کیا حاصل
اور سے کب کھُلے ہی عقدۂ دل
کوئی دم گر اکیلے پاؤں اُسے
دردِ دل ٹک ذرا سناؤں اُسے

دِل کا شاید بخار نکلے جب
یہ جو کھٹکے ہی خار نکلے جب

. . . . . . . . . . . . . . . .

غم کسو کے گھٹائے گھٹتا ہی — یا کسو کے مٹائے مٹتا ہی
جس کے جی پر پڑے وہی جانے — اور کے دل کی اور کب جانے

. . . . . . . . . . . . . . . .

مَیں نے کردی ہی اب خبر تجکو — مل نہ جاوے کہیں اثر تجکو

. . . . . . . . . . . . . . . .

تو خبردار گو کہ ہووے گا — دیکھیو آپ ہی جو ہووے گا
سب دنوں کا قصور نکلے گا — کیسا تیرا غرور نکلے گا
اُس کے ہاتھ اب کے بار آتو سہی — پھر سلامت تو بچ کے جا تو سہی
میر وہ تو جو ہوگی سو ہوگی
اب تو مرتا ہی عشق کا روگی

اب نہ دن ہی کٹے نہ رات کٹے — کس طرح عرصۂ حیات کٹے
رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے — بات بنتی نہیں ہی بن کاٹے
عمر یوں کاٹے کس کو بھاتا ہی — تس پہ دن رات کاٹے کھاتا ہی
ہی شبِ ماہ دل پہ یوں پیارے — جیسے گھوڑے کو چاندنی مارے

..............

جس کے آنے کا لگ رہا ہی خیال — روز در پیش ہی یہی جنجال
گر ابھی وہ دوچار ہو جاوے — پھر سرِ نو بہار ہو جاوے

..............

دانتوں کی تعریف میں :ـــ

یوں تو کہنے کو جیسے موتی ہیں — باتیں موتی میں کب یہ ہوتی ہیں
گو ہزار آب دار موتی ہی — یہ صفا کوئی اُس میں ہوتی ہی

..............

اپنی حیرت میں ایک تو ہوں میں — تس پہ حیران لوگ کرتے ہیں
میری تیری طرف یہ تکتے ہیں — کچھ کچھ آپس میں بیٹھے بکتے ہیں
کوئی ایدھر کو دھیان رکھتا ہی — کوئی باتوں پہ کان رکھتا ہی
کوئی آپس میں آنکھ مارے ہی — کوئی چپ درپئے اشارے ہی
کوئی پکڑے ہی منھ کی بات کہی — کوئی کہتا ہی دیکھ رہ تو سہی
کوئی پھینکے ہی بیٹھا آوازے — کہ یہ کھینچیں گے اس کے خمیازے
کوئی حیران بن کے بیٹھے ہی — کوئی ان جان بن کے بیٹھے ہی
کوئی آنکھیں اِدھر کو گاڑے ہی — کوئی نظریں چُرائے تاڑے ہی
کوئی چتون کو اب پرکھتا ہی — کوئی تیوری پہ دھیان رکھتا ہی

ہر کوئی ہی اسی کے اب درپَے | کہ بھلا دیکھوں بات یہ کیا ہی

. . . . . . . . . . . .

اب کہاں تجھ کو دیکھ سکتا ہوں | بیٹھا اوروں کے مُنھ کو تکتا ہوں
تجھ کو دیکھوں کہ آہ ان کی سُنوں | سبھی دشمن ہیں کس کو دوست کہوں

. . . . . . . . . . . .

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا | تب تجھے ڈر کے یک نظر دیکھا

. . . . . . . . . . . .

نہیں معلوم کیا کیا ان کا | ہم غریبوں نے کیا کیا ان کا

. . . . . . . . . . . .

کس لیے اس قدر تو ڈرتا ہی | سب سے یوں سہم کر بگڑتا ہی
ٹک سمجھ تو کسی کا چور نہیں | تیرے اوپر کسو کا زور نہیں
مجھ سے نظریں جو تو چُراتا ہی | چور اپنے تئیں گِناتا ہی
یا کہ دز دیدہ مَیں جو دیکھوں ہوں | کبھی پوشیدہ مَیں جو دیکھوں ہوں
چور نہیں ہم نہ چور کے ساتھی | بات اب کیا ہی بیش تر کیا تھی
اپنے اوپر کریں ہیں سب کو قیاس | ہم تو اِن باتوں کے نہ آس پاس
تو جو ملنے سے منھ چھپاتا ہی | آنکھ کھُل کر نہیں مِلاتا ہی
خلق اس سے کچھ اور سمجھے ہی | ہاں بُرائی کے طور سمجھے ہی
واہ یہ بات کا چھپانا ہی | یا کہ اور آپ خود جتانا ہی
اس پہ لوگوں نے زور ٹھیرایا | ہمیں آپس میں چور ٹھیرایا
یہ بہ تکرار آزمایا ہی | بارہا دیکھنے میں آیا ہی
جس قدر بات کو چھپاتے ہیں | لوگ اتنا ہی صاف پاتے ہیں

دیکھ میری طرف تو اب نہ دھڑک ساتھ مِل بیٹھ اس قدر نہ بھڑک
پھر جو بولے کوئی تو مَیں جانوں بات کھولے کوئی تو مَیں جانوں
لوگ تیرے جو پاس آتے ہیں سُن کے میرے حواس جاتے ہیں
ہوش اُن کے ٹھکانے رہتے ہیں تیری سنتے ہیں اپنی کہتے ہیں
مَیں جو تجھ سے دو چار ہوتا ہوں پھر تو بے اختیار ہوتا ہوں
جس گھڑی تیرے پاس جاتا ہوں بس نپٹ بے حواس جاتا ہوں
سارے منصوبے بھُول جاتے ہیں ہاتھ پانو اپنے بھُول جاتے ہیں
مُنھ کو حسرت سے دیکھ رہتا ہوں پھر نہ سنتا ہوں کچھ نہ کہتا ہوں
بات کہنی تھی اور نکلی اور بے حواسی ٹک ایک کرنا غور
جب بہ جائے خود اپنے آتا ہوں دل کو ذرا ٹھکانے لاتا ہوں
جی میں کہتا ہوں کھا کے پچھتاوے اب کے یہ یہ کہوں جو مِل جاوے
بارہا اس کو آزمایا ہی یہی حالِ خراب پایا ہی

. . . . . . . . . . . . .

ہجر میں جی ہی میرے پاس کہاں وصل میں گر جیا حواس کہاں

. . . . . . . . . . . . . .

ان وارداتِ قلبی کے علاوہ اثرؔ نے ایک سراپا بھی لکھا ہی جس کے تقریباً تین سو شعر ہوں گے۔ سراپا ہماری شاعری میں ایک پامال مضمون ہی اور اُس کی تشبیہیں اور استعارے اس قسم کے ہیں کہ بعض اوقات مضمون مضحکہ خیز ہو جاتا ہی، تاہم انھوں نے اس میں خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ سراپا کے لیے زیادہ تر فارسی تشبیہیں استعمال کی جاتی ہیں مگر میر اثرؔ نے کہیں کہیں ہندی تشبیہوں سے بھی کام لیا ہی۔ مثال کے لیے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہی جاتی نہیں کمر کی لچک پائی چیتے نے کب یہ ایسی لپک
یوں سیہ مست جھولے آتے ہیں مست جوں ہاتھی ہولے آتے ہیں
مانگ موتی بھری وہ دے ہے بہار جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار

سراپا میں کوئی عضو نہیں چھوڑا اور اس دھن میں وہ حد سے آگے نکل گئے ہیں، اس سے بڑھ کر میر صاحب نے اختلاط کے موقعے کی جو باتیں لکھی ہیں، اس میں تو خوب کھل کھیلے ہیں اور پردہ بالکل اٹھا دیا ہے۔ مولانا حالی مرحوم کی نظر سے یہ مثنوی نہیں گزری تھی، اس کے متعلق بعض احباب سے سُنا تھا اور ایک دو شعر خود انھیں یاد تھے اس پر سے انھوں نے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ شوق نے اپنی مثنویوں کی بنیاد میر اثرؔ ہی کی مثنوی پر رکھی ہے اور مثلاً ایک شعر بھی لکھا ہے جو شوق کے ہاں صرف ایک لفظ کے ادل بدل سے بہ جنسہٖ موجود ہے۔ چناں چہ وہ اپنے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں لکھتے ہیں:-

"یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ نواب مرزا شوق کو اپنے اسکول کے برخلاف مثنوی میں ایسے صاف اور بامحاورہ زبان برتنے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ کیوں کہ جب سوسائٹی کا رُخ دوسری طرف پھرا ہوا ہوتا ہے تو اس کے مخالف رُخ بدلنے کے لیے کسی خارجی تحریک کا ہونا ضروری ہے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثرؔ دہلوی نے جو مثنوی لکھی ہے، جس کا نام 'خوابِ خیال' رکھا تھا، (جس کی شہرت ایک خاص وجہ سے زیادہ تر پورب میں ہوئی تھی)، اس مثنوی میں جیسا کہ ہم نے اپنے بعض احباب سے سنا ہے تقریباً ۴۰-۵۰ شعر اسی قسم کے ہیں جیسے کہ شوق نے 'بہارِ عشق' میں اختلاط کے موقع پر ان سے بہت زیادہ لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کو یہی

صاف زبان برتنے کا خیال اس مثنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اور چوں کہ وہ ایک شوخ طبع آدمی تھا اور بیگمات کے محاورات پر بھی اس کو زیادہ عبور تھا، اُس نے اپنی مثنوی کی بنیاد 'خواب وخیال' کے انھیں ۴۰۔۴۵ شعروں پر رکھی اور اُن معاملات کو جو خواجہ میر اثر کے ہاں ضمناً مختصر طور پر بیان ہوئے تھے، اپنی مثنوی میں بہت وسعت کے ساتھ بیان کیا۔ اور جس قسم کے محاوروں کی انھوں نے بنیاد قائم کی تھی، شوق نے اُس پر ایک عمارت چن دی۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ 'خواب وخیال' کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تفاوت سے 'بہارِ عشق' میں موجود ہیں۔"

جب 'گلشنِ ہند' چھپی، جس میں اثر کا بھی تذکرہ ہے، تو اس میں چند اشعار اس مثنوی کے بھی نظر آئے۔ اتفاق سے صاحبِ تذکرہ نے سراپا کے معمولی شعر نقل کر دیے ہیں جن سے اس مثنوی کی خوبی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان اشعار کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے تذکرے کے حاشیے پر یہ خیال ظاہر فرمایا ہے :-

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمے میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا، یہ اشعار اُسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"۔

اب جو یہ مثنوی ہمارے سامنے موجود ہی تو ہم بلا شبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ تھی اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ مولانا حالی کا قیاس کس قدر صحیح تھا اس خاص موقع کے چند شعر غزلوں، مثنویوں سے نقل کیے جاتے ہیں ؎

| 'بہارِ عشق' | 'خواب وخیال' |
| --- | --- |
| ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا | ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا |
| چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا | کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا |
| چپکے چپکے پکارتی تھی کبھی | ہولے ہولے پکارنے لگنا |
| ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی تھی کبھی | ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا |
| کھول کر دل چمٹ چمٹ کے ملا | وہ نرا پیار سے نپٹ جانا |
| کیسا کیسا لپٹ لپٹ کے ملا | اور دل کھول کے چمٹ جانا |
| کبھی منھ سے دیا چباکر پان | وہ نرا منھ سے منھ بھڑا دینا |
| کبھی مل کر لڑی زباں سے زباں | وہ نرا جیب کا لڑا دینا |

اگر دونوں مثنویوں کے اس قسم کے اشعار برابر برابر رکھ کر پڑھے جائیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مرزا شوق نے 'خواب وخیال' ہی کو اپنا نمونہ بنایا اور اسی مثنوی سے انھیں اس قسم کی زبان لکھنے کا خیال پیدا ہوا، کیوں کہ شوق کے زمانے میں لکھنؤ میں شاعری لفظوں کا گورکھ دھندہ ہو کے رہ گئی تھی اور تصنع اور تکلف انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا ؛

لفظی رعایت بھی کہیں کہیں نظر آتی ہی، مگر بہت کم اور وہ بھی زیادہ تر سراپا ہی میں پائی جاتی ہی ؛

میر اثر بزرگ اور بزرگ زادے تھے، درویشی ان کا شعار تھا اس لیے

تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مقامات پر ایسی کھُلی کھُلی باتیں کیوں کر لکھ دیں مثنوی کے شروع میں انھوں نے خود اس کا ذِکر کیا ہے۔ عشق کا ذِکر کرتے کرتے فرماتے ہیں: ؎

الغرض آگیا تھا ذِکرِ مجاز تس پہ کھولا ہے اس کا راز و نیاز
عشقِ صوری کے اس میں ہیں حالات اور اس راہ کی ہیں کیفیات
حال ہے مبتلائے رسوا کا وصف ہے یار کے سراپا کا
ہر کسو کی نہیں شبیہ و مثال ہے یہ تصویر از قبیلِ خیال

اگرچہ یہ تصویر خیالی ہے مگر کس قدر سچی ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں: ؎

ظاہرا گفتگو بہانہ ہے توسنِ دل کو تازیانہ ہے
بہرِ یارانِ شوخ طبع و جواں نکتہ رس، شعر فہم، ریختہ خواں
ایک بھی طرح یہ نکالی ہے بات کی طرز کچھ نرالی ہے
تاکہ افسردگی سے گرما دیں گُم رہی چھوڑ راہ پر آدیں
کچھ نصیحت نہ واعظانہ ہے بلکہ یہ پندِ عارفانہ ہے

اور اس طور پر نصیحت کرنے کی وجہ بتائی ہے کہ ؎

عشق کی حالتوں کو زینہ کریں سارے خطروں سے پاک سینہ کریں
دل جلوں کا ہے دل کی لاگ علاج آگ کے جوں جلے کا آگ علاج

مگر ان معاملات میں یہ علاج اکثر کارگر نہیں ہوتا بلکہ مخالف پڑتا ہے۔ آگے چل کر بہ طورِ معذرت کچھ کہتے ہیں اور اپنی صفائی کرتے ہیں: ؎

پڑ گیا اس میں یوں سخن کا رنگ ہیں مضامیں بہت شوخ و شنگ
بے طرح گرچہ لغویات ہے یہ پر خدا جانتا ہے بات ہے یہ
کام مجھ کو کسی کے ساتھ نہیں یہ سررشتہ ہی میرے ہاتھ نہیں

چھپی رہتی نہیں کسی کی معاش نظر آتی ہو سب کی بُود و باش
مَیں کہاں اور یہ خیال کہاں ہجر کس کا اثر وصال کہاں

..................

بات میں بات کچھ نکل آئی ہوگئی یوُں ہی طبع آرائی
وضع اس کی ہوئی خلافِ طبع ہو مجھے اس سے انحرافِ طبع
نہ کہوں عہد ہو گر اس کو تمام لغو بے ہودہ ہیچ پوچ کلام
کچھ سرِ دست ہنستے ہنستے کہا بعض یاروں کو سُن کے یاد رہا
نہ کیا اس کو داخلِ دیواں نہیں یہ نظم شاملِ دیواں
آزمانا تھا کچھ روانی طبع کچھ دکھانا تھا نوجوانی طبع
ایک دو دن میں کہ کے پھینک دیا نہیں معلوم کن نے اس کو لیا
اب جو دیکھو کسی کے پاس کہیں ہیں یہ اس کے ہی شعر میرے نہیں

باوجود ان سب باتوں کے فرماتے ہیں کہ جو لوگ سخن فہم اور ذوقِ شعر رکھتے ہیں اور جن کے دل میں سوز و گداز ہو اور راز و نیاز کی گھاتوں سے واقف ہیں :ـ

لطف سب بات کا وہ پاویں گے جی میں خطرہ بُرا نہ لاویں گے
ورنہ بے درد اس کو کیا جانے اور دلِ سرد اس کو کیا جانے
سب یہ بے درد نکتہ چیں ہیں گے قابلِ گفتگو نہیں ہیں گے

اگرچہ اس مثنوی میں ایک آدھ مقام ایسا آگیا ہو جہاں حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھ دیا ہو، مگر میر اثر کی زندگی ایسی پاک صاف اور درویشانہ تھی کہ اُن پر کسی کا وہ گمان نہیں ہوسکتا جو شوق کی مثنویاں پڑھ کر ہوتا ہو۔ یہاں صرف گنتی کے چند شعر ہیں اور وہاں دفتر کا دفتر اسی سے سیاہ کیا ہو لیکن

اس میں شک نہیں کہ مثنوی میں اس سلاست و فصاحت کے بانی میر اثر ہی ہیں اور خود فرماتے ہیں:

نظم کی طرح یہ نرالی ہی	طرز اس کی نئی نکالی ہی

اس مثنوی کی وجہ تصنیف یہ بیان کی ہی کہ ایک بار خواجہ میر درد نے مثنوی کے طور پر ازراہِ تفنّن کوئی سو شعر کہہ ڈالے، وہ مَیں نے مانگ لیے اور وہی اشعار اس مثنوی کی بنا قرار پائے۔ اگرچہ ہی تو یہ مثنوی کہیں کہیں خود اپنی اور خواجہ میر دردؔ کی اُردو فارسی غزلیں جو مثنوی کی بحر میں ہیں، موقع موقع سے لکھی ہیں۔ علاوہ اس کے مثنوی میں بھی خواجہ میر دردؔ کے اشعار ہیں یعنی سو فارسی اور سو ہندوی (اُردو) اور سو مثنوی کے، کُل تین سو۔

بعض بعض جگہ ایسے لفظ آتے ہیں جو اب بول چال میں نہیں ہیں۔ مثلاً مشغولا، بھرمانا (بھرم سے) بست (بہ معنی چیز) ہلنا (بہ فتح ہ) دوکھنا (دوس، الزام) رنڈی (بہ معنی عورت) کب لگ (کب تک) دمنا (چمکنا) مزاخ (مزاح، مذاق) نگرآگو، پیچھو، کد، جد، تروار ایسے الفاظ ہیں، جو اب بھی عوام کی زبان پر ہیں۔

رسمِ خط ہم نے وہی رکھا ہی جو اس وقت رائج تھا اور پُرانے نسخے میں لکھا تھا۔ مثلاً 'دنے، 'کُونیں، 'دمٹاوے، 'کُومٹیارے'۔

اگر چند الفاظ کا خیال نہ کیا جائے جو اب متروک ہیں تو مثنوی کی زبان ایسی پاک صاف اور شستہ، بول چال ایسی بے ساختہ ہی کہ اُس وقت کی اور آج کل کی بول چال میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ صفائی اور بھی زیادہ اس وجہ سے معلوم ہوتی ہی کہ اس میں وہ فارسی ترکیبیں نہیں پائی جاتیں جو میر اثر کے ہم عصر شعرا کے کلام میں نظر آتی ہیں۔

افسوس ہی کہ میر آثر کا دیوان اب تک ہمیں دست یاب نہیں ہوا۔ اس مثنوی میں جابہ جا اُن کی غزلیں آئی ہیں اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ غزل میں بھی اُن کا وہی رنگ ہی، اور سادگی اور کلام کی صفائی کے ساتھ درد واثر بھی ویسا ہی پایا جاتا ہی؛

# مقدمۂ "دیوانِ تاباں"

میر عبدالحئی تاباںؔ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے اور دَورِ محمد شاہی کے شعرا میں سے تھے۔ میر صاحب سے لے کر شیفتہ تک جس قدر تذکرے اردو شعرا کے لکھے گئے ہیں ان سب میں ان کے حسن و جمال کی بے انتہا تعریف لکھی ہے۔ عین عالمِ شباب میں کثرتِ مے نوشی کے باعث انتقال کیا۔

ان کی شاگردی کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ لطفؔ اور شیفتہؔ اور ان کی تقلید میں نساخؔ نے انھیں سوداؔ کا شاگرد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ میر صاحب محمد علی حشمتؔ کا شاگرد بتلاتے ہیں۔ قاسمؔ نے بھی اسی کو صحیح مانا ہے اور حاتمؔ کی استادی کو تسلیم نہیں کرتا۔ مصحفیؔ کا قول اس بارے میں زیادہ قرینِ صحت ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ زبانی شاہ حاتمؔ در ابتدا شاگرد شاہ حاتمؔ است، اما آں چہ شہرت دارد، و واقعی است ایں ست کہ بہ شاگردی محمد علی حشمتؔ کہ شاگرد محمد غنی بیگ قبولؔ کشمیری ست، بسیار بہ سر بردہ۔" آزادؔ نے مصحفیؔ کی تقلید میں ان کے تلمذ کو حاتمؔ اور حشمتؔ دونوں سے منسوب کیا ہے۔ حاتمؔ نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنے تلامذہ کے جو نام لکھے ہیں ان میں تاباںؔ کا نام بھی شریک ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے مکمل دیوان میں دو شعر ایسے

ان کی اُستادی کا دعویٰ کیا ہے ؎

فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں
طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

---

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت
پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

تاباں کے دیوان میں بھی دو ایسے شعر موجود ہیں جن میں اپنے اُستاد کی طرف اشارہ کیا ہے، ان میں ایک شعر کا دُوسرا مصرع حاتم کے مصرع سے لڑ گیا ہے ؎

ریختہ کیوں نہ میں حاتم کو سُناؤں تاباں
اس سوا دُوسرا کوئی ہند میں اُستاد نہیں

---

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا
جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف

لیکن ایک قلمی دیوان میں جس سے اس مطبوعہ نسخے کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے، ان دونوں شعروں میں بجائے حاتم کے حشمت لکھا ہے مگر حشمت کی شاگردی کا ایک قطعی ثبوت تاباں کے دیوان میں ایسا موجود ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تاباں نے ایک مثنوی اپنے اُستاد اور عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی مدح میں لکھی ہے جس میں وہ صاف صاف حشمت کی شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں ؎

نہ اُستاد کی مجھ کو تابِ ثنا		کہوں گر تو کب ایسی فکرِ رسا

کمالوں میں جن کے نہیں کچھ قصور | وے سب طفلِ مکتب ہیں ان کے حضور
کسی کو کہاں اس سے ہی برتری | کہ ہی نام اس کا محمد علی
تخلص بھی حشمت ہی اس کا بجا | وہ اہلِ سخن بیچ ہی بادشا

اس سے بڑھ کر کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت نہیں ؂

تاباں کا کلام صاف سادہ اور شیریں ہی، تخیل کی بلند پروازی نام کو نہیں، خیالات بھی کچھ گہرے یا دقیق نہیں۔ عشق و محبت کی عام باتیں ہیں لیکن زبان اور بول چال کا لطف ضرور پایا جاتا ہی۔ اگرچہ تاباں دورِ محمد شاہی کے شاعر ہیں لیکن قدیم الفاظ اور محاورے ان کے کلام میں نسبتاً بہت کم ہیں میر صاحب نے ان کے کلام کے متعلق بہت سچی رائے دی ہی :-

ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظ ہائے گُل و بلبل تمام است، اما بسیار بہ رنگین گفت "۔

دیوان میں علاوہ غزلوں کے کچھ رباعیات، ایک مثلث، ۶ مخمس، ۲ مسدس، ایک ترکیب بند، ایک مستزاد، ایک قصیدہ مدحِ بادشاہ میں، ایک مثنوی اپنے اُستاد اور نواب عمدۃ الملک کی مدح میں، چند تضمینیں حافظ اور مظہر جانِ جاں وغیرہ کی غزلوں پر اور آخر میں تاریخی قطعاتِ وفات ہیں۔ ان قطعات میں بعض ایسے شعرا وغیرہ کی وفات کی تاریخیں بھی ہیں جو دوسری جگہ نہیں ملتیں ؂

تاباں کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہوئی۔ میر صاحب نے ان کے احوال کے ضمن میں ان کی وفات کا بھی ذکر کیا ہی۔ میر صاحب کے تذکرے کا سنِ تالیف ۱۱۶۵ھ ہی۔ تاباں کے دیوان کے آخر میں جو تاریخی قطعات ہیں ان میں سب سے آخری قطع حشمت کی وفات پر ہی جو سن ۱۱۶۱ھ میں واقع ہوئی۔

اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ تاباں کا انتقال سنہ ۱۱۶۱ھ اور سنہ ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہوا :

یہ نسخہ تین قلمی نسخوں سے مرتّب کیا گیا ہے۔ ایک نسخہ جو سب سے ضخیم اور مکمل ہے، وہ محترم پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی کا عطیہ ہے، دوسرا ری سرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونی ورسٹی کا اور تیسرا انجمن کا :

# مقدمۂ انتخابِ داغ

نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نواب مرزا خاں اور داغ تخلص ہے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس لوہارو کے فرزند تھے۔ ۱۳ر ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ (۲۵ مئی سنہ ۱۸۳۱ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ان کی والدہ نے بادشاہ کے بیٹے فتح الملک عرف مرزا فخرو ولی عہد سے عقد کرلیا۔ داغ کی تعلیم و تربیت دہلی کے قلعے میں شاہزادوں کے ساتھ ہوئی اور زمانے کے دستور کے مطابق سپہ گری، شہسواری وغیرہ بھی اُستادوں سے سیکھی۔ بچپن اور جوانی کا زمانہ لال قلعے میں بسر ہوا۔ شعر میں ذوق کے شاگرد ہوے۔ ابتدائی مشق کے زمانے ہی میں لوگوں کی نگاہیں ان پر پڑنے لگیں۔

سنہ ۱۲۷۳ھ میں مرزا فخرو کا انتقال ہوگیا۔ اس کے چند ماہ بعد سنہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہوا۔ اس وقت داغ کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ کچھ پریشانی اُٹھانے کے بعد رام پور پہنچے۔ نواب یوسف علی خاں نے سرپرستی فرمائی اور ولی عہد کے مصاحبوں میں منسلک ہوگئے۔ جب نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوے تو انھوں نے ازراہِ قدردانی اپنا معتمدِ خاص بنا لیا۔ اور

اصطبل اور فراش خانے کا محکمہ ان کی نگرانی میں دے دیا۔ مرزا داغ رام پور کی صحبتوں اور نواب کلب علی خاں کی قدر دانیوں اور عنایتوں کا اکثر تذکرہ کرتے رہتے تھے ؛

سنہ ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد دلی آ گئے۔ شمالی ہند کے مختلف مقامات میں آتے جاتے رہے۔ لیکن یہ زمانہ عسرت اور پریشان حالی میں گزرا۔ چند ہی مہینے میں گھبرا کر واپس آ گئے ؛

۱۷ اپریل سنہ ۱۸۸۸ء کو حیدر آباد سے طلبی کا شاہی فرمان وصول ہوا۔ اس مرتبہ تین ساڑھے تین سال کی اُمیدواری کے بعد اعلاحضرت میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی بارگاہ میں رسائی ہوئی اور حضور کی استادی کا شرف حاصل ہوا ؛

ابتدا میں ان کی تنخواہ ساڑھے چار سو رُپے ماہوار مقرر ہوئی اور اسی حساب سے تین برس کی اُمیدواری کی بھی پوری تنخواہ مِل گئی۔ تین برس بعد ایک ہزار ہو گئی۔ اس ایک ہزار کا حساب بھی اُمیدواری کے زمانے سے کیا گیا اور چالیس اکتالیس ہزار رُپے یک مشت ملے ؛

استادی کا شرف ملنے کے بعد اعلاحضرت نے یہ خطابات عطا فرمائے۔ جہان اُستاد نواب فصیح الملک دبیر الدولہ ناظم یار جنگ۔ علاوہ تنخواہ اور خطابات کے جاگیر بھی مرحمت فرمائی۔ حیدر آباد کا زمانہ بڑی خوش حالی، بے فکری اور فارغ البالی سے گزرا ؛

مرزا داغ کے چار دیوان اور ایک مثنوی 'فریادِ داغ' ہے۔ داغ زبان کے بادشاہ ہیں۔ اُردو زبان پر جو قدرت انھیں حاصل تھی وہ کسی دُوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ علاوہ فصاحت و سادگی کے ان کے کلام میں شوخی، ظرافت

اور خاص بانکپن پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام اردو زبان کے محاوروں اور روزمرّہ اور بول چال کا خزانہ ہے۔ محاورے دوسروں نے بھی استعمال کیے ہیں لیکن داغ کا سا بے ساختہ پن نہیں پایا جاتا۔ مثلاً ان کے استاد ذوق اس معاملے میں خاص طور پر مشہور ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ زبان کے بڑے اُستاد ہیں لیکن بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے محاورے کے لیے شعر کہا ہے ورنہ اکثر مقامات پر محاورہ الگ اُبھرا اُبھرا معلوم ہوتا ہے۔ داغ کا کمال یہ ہے کہ وہ محاورہ یا روزمرّہ اس طرح لکھ جاتا ہے کہ خبر تک نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی بات چیت کرتا ہو۔ عشق و عاشقی کے معاملات ان کا خاص مضمون ہے اور جس انداز سے وہ ان معاملات کو لکھتے ہیں وہ انھی کا حصّہ ہے۔ بہت سے ایسے محاورے اور روزمرّہ کے جملے جو اب تک تحریر میں نہیں آئے تھے، اُن کے کلام کی وجہ سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ جو مقبولیت ان کو حاصل ہوئی وہ ان کے کسی ہم عصر کو نصیب نہیں ہوئی۔ خاص و عام دونوں ان کے کلام کا مزہ لیتے اور سر دُھنتے تھے۔ ان کے کلام کی مقبولیت کی وجہ زبان کی صفائی اور سلاست، بیان کا بانکپن اور بے ساختہ پن، ظرافت اور شوخی، بول چال کا لُطف اور خاص اندازِ بیان ہے۔ بعض اوقات گہرے مضامین اپنے خاص انداز اور شُستہ زبان میں اس صفائی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ غزل کے شاعر تھے اور غزل میں جو رنگ ان کا تھا وہ انھی پر ختم ہو گیا۔ تصنّع، ثقیل الفاظ، فارسی ترکیبوں سے احتراز کرتے تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

مرزا داغ بڑے خوش مزاج، زندہ دل اور ظریف تھے۔ بہ قولِ احسن مرحوم

"خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کسی وقت کسی سے مذاق کرنے میں نہ رُکتے تھے۔ بوڑھا، جوان، بچّہ، عورت، مرد سب ان کی ظرافت اور خوش مزاجی سے لطف اندوز ہوتے۔" مستحق اور متعلقین کی مدد کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے۔ شاگرد بے شمار تھے۔ روزانہ بیسیوں غزلیں اصلاح کے لیے آتیں اس کے علاوہ مقامی اور باہر کے آئے ہوئے شاگرد روزانہ اصلاح کے لیے حاضر ہوتے وہ بلا تکلف اصلاح و مشورہ دیتے۔ اس میں ان کو خاص مشق ہوگئی تھی۔

مرزا داغؔ نے اپنی زندگی خاص کر آخری زمانہ بڑی شان اور وقار سے گزارا اور آخر ۷۶ برس پورے کر کے سنہ ۱۳۲۴ھ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے ؎

داغؔ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

# مقدّمۂ مسدّسِ حالی

مولانا حالی کا آبائی وطن پانی پت تھا اور وہیں اُن کی پیدائش ہوئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہندستان کی تین ایسی گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں کہ سلطنتوں کے تار و پود بکھر گئے اور زوال و اقبال دونوں ایک جا ایسے ملے اور جدا ہو گئے جیسے جھٹ پٹے میں دونوں وقت ملتے اور جدا ہو جاتے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُردو شاعری کے جدید انقلاب نے بھی اسی معرکہ خیز سرزمین میں جنم لیا۔

مولانا کی پیدائش تیرھویں صدی کے تقریباً وسط سنہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں ہوئی۔ ان کا لڑکپن اور شباب دہلی میں بسر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تیموری خاندان کا آفتابِ اقبال گہنا رہا تھا اور بیرونی قوتیں کہیں خفیہ اور کہیں علانیہ اپنا کام کر رہی تھیں۔ اہلِ نظر کو سیاسی اور معاشی انقلاب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لیکن حالی کی تعلیم اُن درس گاہوں میں ہو رہی تھی جہاں اپنے علوم کے سوا باقی سب علوم جہالت سے تعبیر کیے جاتے تھے اور جہاں ہر نئی چیز مشتبہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ اگرچہ دہلی کالج چند ہی قدم پر تھا مگر بہ قول مولانا مرحوم "اس عرصے میں کبھی کالج جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے"۔ دہلی

اس وقت بھی علم و فن کا مرکز تھی، قدیم علم و فضل کی زندہ یادگاریں موجود تھیں اور اپنا حق ادا کر رہی تھیں۔ اور طالبانِ علم دُور دُور سے آکر اُس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ نئی طرزِ تعلیم بھی وہاں دبے پاؤں آپہنچی تھی اور اس نے خیالات کو سمونا شروع کر دیا تھا۔ یُوں تو انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم اس سے کہیں پہلے دُوسرے مقامات میں رس بس چکی تھی، لیکن مشرق و مغرب کا پہلا سنگم دلّی میں ہوا تھا۔ مگر یہ بہار چند روزہ تھی، اگر یہ سلسلہ جس کی بنیاد دہلی کالج میں پڑی تھی باقی رہ جاتا تو ہمارے نصیب جاگ اُٹھتے۔ مگر یہاں کچھ اور بدی تھی۔

اتنے میں سنہ ۱۸۵۷ کی شورش کچھ ایسی بےتمیزی سے اٹھی کہ وہ اپنی رَو میں خس و خاشاک کے ساتھ صدہا سال کی وہ عزیز کمائی بھی بہا لے گئی جس پر ہمیں بڑا ناز تھا، اور جسے ہم اب تک پیٹ رہے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لیے بُجھ گیا، اور برائے نام جو ایک سہارا تھا اور ایک موہوم سی امّید جو اب تک دلوں میں باقی تھی، وہ بھی اُس کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ اس درد انگیز سانحے کو حالی نے اپنی آنکھوں دیکھا، اور ان واقعات کا ان کے تخیّل پر ایسا گہرا نقش بیٹھا جسے وہ کبھی نہ بھولے۔

دہلی کے قیام میں انھوں نے شعر و سخن کی بزم آرائیاں اور مشاعروں میں ذوق و غالب اور مومن اور دُوسرے پختہ کار اور نوجوان شعرا کی سخن سنجیاں دیکھیں اور خود ان میں شریک ہوئے۔ اُس وقت شعر گوئی سب سے زیادہ مقبول فن تھا اور ہر کس و ناکس اس کا شوق رکھتا تھا۔ مولانا نے بھی اُسی زمانے میں طبع آزمائی کی اور اصلاح کے لیے مرزا غالب کو انتخاب کیا، یہ انتخاب خود ان کے ذوق کا پتا دیتا ہے۔ ایک بار مولانا کی ایک غزل دیکھنے

کے بعد مرزا صاحب نے فرمایا "اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" مرزا صاحب کا یہ قول بالکل صحیح نکلا، مرزا صاحب کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے، لیکن شاگرد بھی انھیں ایسا ملا جس نے استاد کا نام دنیا میں روشن کر دیا ؎

مولانا اپنا اُردو فارسی کلام مرزا صاحب کو دکھاتے تھے، مگر جیسا کہ خود وہ تحریر فرماتے ہیں "مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔" وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے، اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچّی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا اُسے منتہائے کلام و شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ و غالب دونوں متنفر تھے ؎

یہ پہلی ہدایت تھی جو مولانا کو اِن دو بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوئی، چناں چہ ان کا قدیم کلام بھی اُن عیوب سے پاک ہے جو اُردو شاعری کی بدنامی کا باعث ہوئے۔ لیکن مولانا کی شاعری کی پوُری حقیقت اس سے بھی پرے ہے۔ اگرچہ ان کی ادبی شاگردی کا حق غالب و شیفتہ کو پہنچتا ہے، لیکن اُن کے حقیقی دماغی آبا عرب جاہلیت اور مابعد کے شعرا ہیں۔ ان کی قدیم شاعری بلاشبہ غالب و شیفتہ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہے، لیکن بعد کی شاعری میں شعرائے عرب کا رُوحانی اثر پایا جاتا ہے۔ جو اُن اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے نامعلوم طور پر ازخود مولانا کو پہنچا ؎

لیکن ماسوا ان کے اُس زمانے میں ایک اور اثر اپنا کام کر رہا تھا۔ سنہ ۵۷ کے انقلاب نے جہاں ہمیں طرح طرح کے نقصان پہنچائے، وہاں اس

انقلاب کے جلو میں کچھ فائدے بھی پہنچے۔ اور لاکھ فائدوں کا ایک فائدہ یہ تھا کہ اس نے ہماری آنکھیں کھول دیں، اُس نے مسلمانوں کے معاشرتی، ادبی اور مذہبی جمود میں حرکت پیدا کردی۔ اس جمود کا توڑنے والا وہ شخص تھا جسے اس کی قوم نے کافر و ملحد کے خطاب عطا فرمائے۔ سرسیّد احمد خاں نے سنہ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں کالج قائم کرکے اپنے اصلاحی کام کی بنیاد مضبوط کردی۔ اور یہ اس کے استقلال کا نتیجہ تھا کہ منکر بھی قائل ہوگئے۔ دُوسرا کمال اس کا یہ تھا کہ اس نے اپنی کشش سے ایسے ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا جو اس کے اثر سے ملک میں روشن ستارے ہوکر چمکے۔ حالی بھی انھیں چند افراد میں سے تھے۔ مولانا نے اپنی آپ بیتی کو ایک عجیب دل کش پیرائے میں اپنے مسدّس کے دیباچے میں تحریر فرمایا ہی ؂

حالی کی جدید شاعری علی گڑھ کی تحریک کا نتیجہ ہی۔ سرسیّد احمد خاں مرحوم کی تحریک سے ملک میں ایک نئی تہذیب کا دوردورہ شروع ہوا، جس نے مسلمانوں کی دماغی زندگی میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ مغربی تعلیم نے خیالات میں ہل چل مچادی، پُرانی چیزوں اور روایتوں کو لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے، نئے خیالات نے نئی نئی راہیں سجھائیں، ذوق و ادب کے اصول کچھ کے کچھ ہوگئے۔ جدید سائنس نے ذہنی و باطنی جانب سے محسوسات کی طرف متوجہ کیا، نمائشی لفظی بندشوں اور بے معنی تکلّف و تصنّع کی جگہ نیچرل اور سادہ طرزِ بیان آگیا۔ غرض جدید انقلاب نے دِلوں میں نئے خیالات کے ساتھ نئی اُمنگیں پیدا کردی تھیں اور نظر کے زاویے کو دُوسری طرف پھیر دیا تھا۔ حالی نے ان نئے خیالات کا راگ گایا اور عہدِ جدید کی سب سے اوّل نمایندگی کی۔ یہیں سے ہماری شاعری کا رُخ بدلتا ہی ؂

حالی نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہی تو اس وقت ایک شاعری کیا ہمارا سارا ادب ایک مضحکہ اور نقّالی سی ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ ایک بے جان اور

بے مزہ چیز تھی جسے تقلید کی جکڑ بندیوں نے لفظوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ اگرچہ غالب نے اسے کچھ دنوں کے لیے سنبھالا، لیکن اس طرح وہ سنبھلنے اور رہنے والی چیز نہ تھی۔ غالب و شیفتہ کی صحبت، شعرائے ادب کے کلام کے مطالعے، جدید عہد کے اثر اور سرسید احمد خاں کی تحریک نے حالی کو حالی بنایا اور اُس نے اردو کی مردہ شاعری میں ایک نئی جان ڈال دی۔ اس میں شک نہیں کہ حالی مغربی ادب کا ترجمان ہے، لیکن وہ اندھا مقلد نہیں وہ سچا "حالی" ہے اور حقیقت و فطرت کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا اور مغربی خیالات کی رَو میں اُس کے پانو اکھڑنے نہیں پاتے۔ اُس نے قدامت اور جدت میں اُس صحیح تناسب کو قائم رکھا جو ہر دَور میں راست فکر مصلح، شاعر اور مجدد کا فرض ہے۔ اور اپنے دل کی گرمی سے مردہ دِلوں کو گرما دیا۔ وہ عرب کے شعرا کی طرح حیات کا نقاد اور گزشتہ و حال کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں عرب شاعروں کا سا فخر، آزادی اور مردانہ پن پایا جاتا ہے اُس کی شاعری کی بنیاد صداقت پر ہے، جس کی خاطر وہ بعض اوقات حسنِ بیان کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ اگرچہ مولانا نے 'مسدس' سے قبل دو چار نظمیں ('حبِ وطن'، 'رحم و انصاف'، 'امید' اور 'برسات') لکھی تھیں، مگر 'مسدس' خالص سرسید کی تحریک پر لکھا، اور یہ ایسی نظم ہے جو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی، حالی نے مسلمانوں کے کھوئے ہوئے عظمت و جلال کو ایسے سوز و گداز اور درد سے بیان کیا ہے کہ اس سے قبل کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی اس نے اپنے مسدس میں تاریخی زمانۂ گزشتہ ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ ہندی مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرقع بھی نہایت تفصیل سے کھینچا ہے، اگرچہ اس کی شاعری کی بنیاد زوال یافتہ قوم کی گہری بے آواز مایوسی پر ہے جسے پڑھ کر بے اختیار ہمارے آنسو نکل پڑتے ہیں لیکن اس کی روح عربی ہے، وہ اس بگڑے ہوئے گھر کو پھر

بنانا اور اس خرابے کو از سرِ نو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

یہ نظم اپنے طرز کی بالکل جدید ہے، اور جس قدر جدید ہے اُسی قدر ہر پہلو سے کامل ہے۔ ابتدا ہی کو دیکھیے کہ شاعر کس طرح اُسے شروع کرتا ہے۔ یہ اسلوبِ بیان اگرچہ ہمارے لیے بالکل انوکھا تھا، لیکن مضمون کے لحاظ سے کس قدر عجیب اور موزوں ہے، وہ ابتدائی دو بندوں کے بعد ہی اپنی قوم کی حالتِ زار پر نظر ڈالتا ہے، اور جب یہ پُر درد نغمہ دلوں کو پگھلانے لگتا ہے تو ہمیں فوراً اس چشمۂ ہدایت کی طرف لے جاتا ہے جہاں سے وہ نورِ وحدت پھوٹا جو ہجومِ ظلمت کو کاٹتا ہوا روئے عالم پر پھیل گیا۔ گویا ہمارے سامنے سے ایک پردہ اُٹھتا اور ایک نیا اور عجیب سماں آ جاتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نعت میں ہمارے شعرا نے بڑے بڑے زور مارے ہیں اور حق یہ ہے کہ نئے نئے اسلوب سے بڑی پُر زور اور بے مثل نظمیں لکھی ہیں، لیکن 'مسدس' کے چند بند جو بعثتِ خاتم النبیینؐ پر ہیں پڑھیے۔ ان میں جو سادگی، خلوص جوش اور صداقت ہے اس کا کہیں جواب نہیں، اس کے بعد اسلام کی تعلیم کو جس پیرائے میں پیش کیا ہے وہ مولانا ہی کا حق ہے۔ اس کی تعلیم کا بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے عرب کے متضاد اور سرکش قبیلوں کو ایک قوم بنا دیا، اور یہی نہیں بلکہ سارے عالم کو ایک بنا دینے کی بشارت دی ہے۔ اب اس تعلیم کے اثر دکھائے ہیں کہ وہ قوم جو اس طرح بنی اُس نے دنیا میں کیا کیا کمالات دکھائے، ظلمت کو مٹایا، جہالت کو دُور کیا، علم و حکمت کی روشنی پھیلائی، اخلاق و صداقت کے نمونے پیش کیے، طلبِ صادق کا کمال دکھایا، خلوص و ایثار کا سبق دیا، حکومت میں مساوات دکھائی اور چار دانگِ عالم میں اپنی قوت و اخوت کا سکّہ جمایا۔

ہر کمال کی قسمت میں زوال ہی، جب اس ملّت نے جو خیر الامم کے درجے کو پہنچ گئی تھی اپنی بے اعتدالیوں اور بداخلاقیوں سے اس چشمۂ صفا کو گدلا کر دیا جو اس کے حیرت انگیز عروج کا باعث ہوا تھا، تو ؎

بُرے اُن پہ وقت آکے پڑنے لگے اب    وہ دنیا میں بس کر اُجڑنے لگے اب
بھرے اُن کے میلے بچھڑنے لگے اب    بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کُھل گئی سارے عالم میں چھا کر

شاعر کا بڑا کمال یہاں یہ ہی کہ شروع ہی میں اُس نے قوم کی موجودہ حالت کی ایک جھپکی سی دکھادی تھی، گویا ناظرین کو پہلے ہی سے آیندہ کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس کے بعد فوراً ہی اُس پر پردہ ڈال دیتا ہی اور دفعتہً انھیں وہاں لے جاتا ہی جو ملّت کا اصل گھر تھا، جاہلیت (حالتِ قبلِ اسلام) کا بھیانک نقشہ دکھاتا ہی، مگر اُسی خرابۂ ظلمت سے نورِ نبوّت طلوع ہوتا ہی جس کی بدولت عرب کے وحشی مہذّب قوم بن جاتے ہیں، اور دنیا میں اُن کے عروج کا ڈنکا بجتا ہی۔ شاعر ہمیں تمام منازلِ عروج کی سیر کراتا ہوا انتہائے کمال پر لے جاتا ہی جب کہ ایک دنیا ملّتِ اسلام کے قدموں تلے تھی۔ اس کے بعد جب ہر طرف سے زوال کی گھٹائیں آنے لگتی ہیں تو ہمیں وہیں لے آتا ہی جہاں اُس نے ابتدا ہی میں ہمیں قوم کی حالتِ زار کی جھلکی دکھائی تھی، یہ بہت دردناک سماں ہی اور شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہی۔ وہ ہمارا ہاتھ پکڑے ہوے ایک بہت اونچے ٹیلے پر لے جاتا ہی اور کہتا ہی کہ وہ سماں دیکھا تھا تو اب یہ بھی دیکھو، ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف سیکڑوں ایسے چمن لہلہا رہے ہیں جن پر جنّت کا دھوکا ہوتا ہی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ویسے تو نہیں مگر اچھے خاصے

شاداب اور پھول پھل سے بھرپور ہیں، بعض ایسے بھی ہیں جن میں نہ یہ شادابی اور طراوت ہو اور نہ پھول پھل ہیں، تاہم ان کے پودے ہونہار اور بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ادھر سے فارغ ہو کر جب ہم دوسری طرف نظر ڈالتے ہیں تو ایک عجیب منظر نظر پڑتا ہو، جسے دیکھ کر دل مسوس کے رہ جاتے ہیں، وہ کہتا ہو ؎

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر		جہاں خاک اڑتی ہو ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر		ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں		جہاں آکے دیتا تھا رو ابرِ نیساں
تردد سے جو اور ہوتا تھا ویراں		نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہو
کہ اسلام کا باغِ ویراں یہی ہو

پتھر کا دل بھی ہو تو پسیج جائے۔

یہاں شاعر زوال یافتہ قوم کی داستان سناتا ہو، انتہائی عروج کو پہنچ کر جو قوم زوال پاتی ہو اس کی حالت ایسی مسخ ہو جاتی ہو کہ ناگفتہ بہ ہوتی ہو۔ مولانا نے اس زمانے کے مسلمانوں کے اخلاق و عادات، ان کی معاشرت، ان کے اطوار و اشغال اور ان کی حرکات کا جو مرقع پیش کیا ہو وہ حقیقت میں ایک مرثیہ ہو۔ ان کے خط و خال کو اس طرح مو بہ مو دکھایا ہو، اور ان کی چھپی ہوئی چوریاں اس طرح کھول کر دکھائی ہیں کہ غیرت مند مسلمان پڑھ کر بے تاب ہو جاتا ہو۔ ہر طبقے کی افسوس ناک حالت اور اس کی بے اعتدالیاں

اور بداعمالیاں خاص انداز سے بیان کی ہیں جن میں ایسے بجھے ہوئے نشتر موجود ہیں کہ پڑھنے سے دل میں گھاؤ پڑ جاتے ہیں۔

مولانا کا منشا اس سے کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اُن کو اپنی حالتِ زار پر آگاہ کرنا اور عبرت دلانا ہے، وہ بار بار گزشتہ اسلامی تاریخی واقعات یاد دلاکر اور موجودہ یورپی اور دیگر اقوام کی ہمدردی وایثار اور عمدہ خصائل بیان کرکے اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور انھیں جدوجہد اور ترقی کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں، وہ بار بار یہ سمجھاتے اور جتاتے ہیں کہ حکومت کے چلے جانے سے یہ لازم نہیں کہ قوم کے اخلاق بھی بگڑ جائیں۔ دنیا میں اور بھی ایسی قومیں ہیں مگر ان پر کہیں یہ پستی اور وبال نہیں، پھر حکومت جانے سے تمھاری یہ حالت کیوں ہوگئی: ؎

حکومت تھی گویا کہ اک جھول تم پہ ۔۔۔ کہ اُڑتے ہی اس کے نکل آئے جوہر

اب بھی ترقی کی راہیں کھلی ہیں، اور اگر تم کمرِ ہمت باندھو تو اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ مگر مولانا کے دل پر اہلِ اسلام کے عبرت خیز زوال کا ایسا زخمِ کاری تھا کہ یہ دردانگیز فسانہ لکھتے لکھتے پُرانا ناسور پھوٹ بہتا ہے اور کتاب کا خاتمہ نامعلوم طور پر ایسے دل شکن اشعار پر ہوتا ہے جس سے مایوسی ٹپکتی ہے۔ بعد میں مولانا خود اس پر متنبّہ ہوے، نیز قوم میں بیداری کے کچھ آثار دیکھ کر وہ ایک ضمیمے کا اضافہ کرتے ہیں، جس میں وہ امّید سے خطاب کرکے قوم کی افسردگی کو مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ ضمیمہ بھی اُسی شان کا ہے اس میں وہ قومی غیرت اور امکانِ ترقی کا نغمہ سناتے ہیں، ترقی کے کچھ کچھ آثار جو نظر آتے ہیں، اس کی خوش خبری دیتے ہیں۔ اقبال مندی کی صحیح تعریف، محنت پسندی کی مدح اور کاہلی کی مذمت کرتے ہیں۔ شرافت، محنت اور

غم خواری بنی نوع انسان، فضیلتِ علم اور ترغیبِ علوم و فنون کا دل کش ترانہ سُنا کر ہمّت بڑھاتے ہیں۔ علومِ جدید کے نتائج سے آگاہ کر کے متفقہ کوشش پر اُبھارتے اور دعا پر ضمیمے کا خاتمہ کرتے ہیں ؎

یہ ایک سرسری اور ناقص سا خاکہ اس بے بدل نظم کا ہے لیکن اس جوش و گداز، فصاحت کی کیفیت جو شروع سے آخر تک اس نظم میں پائی جاتی ہے الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ زبان کا مزہ ہم اس سے پہلے عموماً غزلوں یا کبھی کبھی بعض مرثیوں یا مثنویوں میں لیتے تھے، لیکن زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو اس نظم میں دیکھنی چاہیے جس میں مختلف قسم کے مضامین و واقعات نہایت بے تکلفی اور روانی سے ادا کیے گئے ہیں اس پر بیان کا تسلسل اور مضامین کی بلندی قابلِ دید ہے۔ نظم میں الفاظ کا صحیح استعمال جس طرح مولانا نے کیا ہے اور زبان کو اخلاقی اور حکیمانہ خیالات ادا کرنے کے لیے جس طرح وہ کام میں لائے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ بہت سے الفاظ جو دربارِ فصاحت میں بار نہیں پا سکتے تھے اور جن کے جوہر ہم پر اب تک نہیں کھلے تھے، مولانا نے ان کی قدر کی اور انھیں ایسے ٹھکانے سے بٹھایا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں معمولی سادہ الفاظ جادو کا سا اثر پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی، ایک نئی زبان پیدا کی ہے ؎

حالی سے قبل ہمارا ادب ایک خاص جماعت کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھا، اس کی بھی گویا ایک ذات بن گئی تھی، حالی نے اس کا دروازہ عام لوگوں کے لیے کھولا اور اپنے خیالات کے لیے اس زبان کو اختیار کیا جو لوگوں کی زبان تھی، کسی خاص ذات یا جماعت کی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ جب 'مسدس' چھپ کر شایع ہوا تو اس پر لعن طعن کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ سب سے زیادہ

ناراض ہمارے بذلہ سنج اور "صاحب ذوق" شعرا تھے، دلّی اور لکھنؤ جوان باتوں پر کبھی متفق نہیں ہوتے اس معاملے میں ہم خیال تھے۔ جو لعن طعن میں شریک نہ تھے، وہ بھی مولانا کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ فن، زبان، مذہب و اعتقاد کے رُو سے نکتہ چینیاں کی گئیں، جواب میں اسی قسم کی نظمیں لکھی گئیں لیکن زمانہ' جو سب سے بڑا منصف اور مصلح ہے حالی کے ساتھ تھا۔ یہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب کبھی دنیا میں نئی روشنی جلوہ گر ہوتی ہے، تو اس کے متعلق ان لوگوں کی رائے جو روایت و تقلید کے بندے ہیں، اتفاق سے صحیح ہو تو ہو ورنہ اکثر و بیش تر غلط اور نہایت غلط ہوتی ہے۔ علم و فضل اور درسی ذوق اسے جھٹلاتے ہیں لیکن انسانی فطرت سے باخبر اور بنی نوع انسان کے ہم درد اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں (سوائے ہمارے شعرا کے) ہر طبقے میں اس نظم نے وہ حسنِ قبول حاصل کیا جو شاید ہی اُردو کی کسی نظم کو نصیب ہوا ہو۔ عام و عامی، چھوٹے بڑے سب اسے پڑھ پڑھ کر سر دھنتے اور آنسو بہاتے تھے۔ واعظ اپنے وعظوں میں، میلاد خواں میلاد کی محفلوں میں اس کے بند سُنا سُنا کر مجلسوں کو گرماتے تھے۔ بعض قومی ناٹکوں میں اس کے ایکٹ ہوئے اور مدارس میں یہ کتاب نصاب میں داخل کی گئی۔ اور بار بار چھپی اور پڑھی گئی۔ لیکن سچی داد سر سیّد احمد خاں نے دی، جب یہ کتاب پہنچی تو ایک ہی جلسے میں شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی اور پڑھنے کے بعد جو خط مولانا کو لکھا ہے وہ اُردو ادب میں ایک یادگار چیز ہے۔ اس کا یہ فقرہ اس عجیب و غریب اور گہرے اثر کی تراوش ہے جو اس نظم کے پڑھنے سے سر سیّد کے دل پر ہوا:-

"جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا، میں کہوں گا کہ حالی سے 'مسدس' لکھوا لایا ہوں۔"

اس کے بعد متعدّد نظمیں اسی طرز اور اسی بحر میں لکھی گئیں، مگر وہ نقالی تھی، نہ حالی کا سا دردِ دل تھا نہ اس کی سی صداقت اس لیے بے اثر رہیں ٭

ایسے لوگ جو نیا خیال پیش کرتے ہیں اور اپنی قوّتِ فکر سے ادب یا فن کا رُخ بدل دیتے ہیں، کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ کم سے کم ہماری زندگی میں ایک ایسا شخص ہوا ہے۔ عین اس وقت جب کہ اُردو شاعری پر نازک وقت آپڑا تھا، قدرت نے ایک ایسے شخص کو بھیج دیا جس نے اُسے گرتے گرتے بچا لیا۔ اس کا کلام بہ طور ایک عزیز ارث کے ہماری قوم میں نسلاً بعد نسل پہنچے گا اور ہمیشہ دِلوں کو گرمائے گا، دماغوں میں جولانی پیدا کرے گا اور لطفِ درد سے آشنا رکھے گا اور یہی شعر کا کمال ہے ٭

---

# مقدمۂ مسدّسِ حالیؔ

## (صدی ایڈیشن)

پچاس برس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ میرے ایک ماموں فیروز پور (پنجاب) میں ملازم تھے اور فیروز پور سے قریب ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ یہ گاؤں انھی کا تھا اور وہاں کے سب سے بڑے آدمی یہی تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کے ختنے کیے اور اس رسم میں اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو مدعو کیا۔ یہ جشن بڑی دھوم دھام سے دو تین روز تک رہا۔ دوسرے دن کا ذکر ہے صبح کا وقت تھا، میدان میں بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا، اور اس میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ مجمع شامیانے سے باہر دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر اُس گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے کسان اور مزدور تھے۔ اتنے میں ایک طوائف اٹھی۔ یہ لاہور سے بلائی گئی تھی۔ نام میں اس وقت بھول گیا ہوں۔ یہ اچھی پڑھی لکھی عورت تھی، شعر بھی کہتی تھی، اور اس کی غزلیں لاہور کے اخباروں میں چھپا کرتی تھیں، اس نے کھڑے ہو کر مجمع پر ایک نظر ڈالی اور یک بارگی 'مسدس' (حالی) گانا شروع کیا ؎

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

جب تک وہ گاتی رہی، سنّاٹے کا عالم رہا۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ آب دیدہ تھے۔ وہ سماں اب تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ اور وہ گانا اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے ؞

اب بھی جب کبھی مَیں 'مسدسِ حالی' پڑھتا ہوں تو یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور مَیں سوچتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اِن اَن پڑھ اُجڈ گنواروں پر اس قدر اثر کیا کہ وہ آب دیدہ ہو گئے ؟

ہندُستان میں ہر چیز آگر ذات بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری کی بھی خاص ذات تھی۔ وہ مخصوص طبقے اور خاص لوگوں کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور وہی اُس کے نکات سمجھ سکتے اور اُس کا لطف اُٹھا سکتے تھے۔ جو ذات باہر تھے وہ اکثر اس سے محروم رہتے تھے۔ حالؔی نے ذات پات کا یہ جھگڑا بالکل اُٹھا دیا اور اُس نے اپنا دردِ دل اُس زبان میں سُنایا جسے اکثر لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ برادری سے خارج کر دیا گیا ؞

شعر یا موسیقی ہے کیا ؟ یہی نہ کہ ہم الفاظ یا آواز کے ذریعہ سے اپنے جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور لوگ اُسے پڑھ کر یا سُن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ دُکھ سے دُکھی اور سُکھ سے سُکھی ہوتے ہیں۔ کیا کسانوں اور گنواروں کے دل نہیں ہوتا ؟ کیا اُن میں عشق و محبّت کا مادّہ نہیں ؟ کیا وہ دُکھ درد کا احساس نہیں رکھتے ؟ کیا اُن میں ہم دردی اور ایثار نہیں ہوتا ؟ رستم کی داستان یا حاتم طائی کا قصّہ پڑھ کر سُنائیے اور پھر ان کے جوش اور ہم دردی کو دیکھیے۔ لیلیٰ مجنوں کا ڈراما کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اُن کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اُن کے گیت سُنے ہیں ؟ کیا چیز ہے جو اُن میں نہیں ہے۔ شجاعت، عشق و محبّت، ہم دردی، عصمت و عفّت، غیرت، ظرافت سبھی کچھ ہے۔ پھر

کیا وجہ کہ آپ یہی چیزیں بیان کریں اور وہ نہ سمجھیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کی زبان تکلفات لایعنی سے پاک ہو۔ اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کرسکیں ٭

'مسدس' اس کسوٹی پر پورا اُترا، ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ بار بار چھپا اور اتنی بار چھپا کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہو اور ہر طبقے میں مقبول ہوا ٭

اس کی روانی حیرت انگیز ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحے کے لیے بھی کہیں رُکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اُس پر ہزار صنائع بدائع قربان ہیں۔ اور ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت پر ہے ادب میں حُسن وخوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے ٭

ہماری شاعری میں 'مسدس' نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس کا نبھانا آسان نہیں ہے اچھے اچھے مشاق شاعر بھی رہ جاتے ہیں اور بھرتی کے مصرعوں سے چول بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیسؔ سا باکمال شاعر بھی مسدس جن کی ملک ہوگئی ہے بھرتی کے بے ربط مصرعے داخل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن حالی کا یہ کمال ہے کہ سارے مسدس میں مصرع تو کیا ایک لفظ بھی بھرتی کا نظر نہیں آتا اور ہر مصرع دوسرے سے ایسا گتھا ہوا ہے کہ چھیوں مصرعے ایک جان اور ایک ذات ہوگئے ہیں ٭

ظاہر سے قطع نظر کرکے باطن کو دیکھیے تو ایسی پُرجوش، ایسی عبرت انگیز اور سبق آموز اور دلوں کو اُبھارنے اور غیرت دلانے والی نظم ہماری کسی زبان میں نہیں۔ مدوجزر اس کا بہت ہی صحیح نام ہے۔ شعر کی نسبت جو یہ کہا گیا ہے کہ اسے حقیقت یعنی زندگی اور واقعاتِ زندگی سے وابستہ ہونا چاہیے وہ اس پر

پوری طرح صادق آتا ہی۔ یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہی، جس میں ہمارے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ پھر حسنِ بیان نے اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہی۔ جہاں اس میں اخوت، ہمدردی، اتفاق، خودداری، حبِ وطن، جفاکشی، بے تعصبی وغیرہ سبق دیتے ہیں وہاں تیر و نشتر بھی ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نشتر غم گسار سرجن کے ہیں نہ کہ بے درد بداندیش کے۔

'مسدسِ حالی' زندۂ جاوید کتابوں میں سے ہی۔ اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گُر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔

# نثر

# مقدمۂ 'معراج العاشقین'

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہٗ کا فیض سرزمینِ دکن پر عام ہے۔ ان کا مزار مرجعِ خلایق ہے اور ان کی تصانیف اب تک لوگ تلاش کر کر کے شوق سے پڑھتے ہیں۔ حضرت اُن بزرگانِ دین میں سے ہیں جن کی تصانیف و تالیفات کثرت سے ہیں اور تقریباً سب کی سب فارسی میں ہیں۔ لیکن تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بعض رسالے ہندی یعنی دکھنی اُردو میں بھی تصنیف فرمائے ہیں۔

حضرت برہان الدین غریب اپنے مرشدِ کامل حضرت سلطان الاولیا خواجہ نظام الدین کے حکم سے چار سو بزرگوں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ ہوئے اور یہاں پہنچ کر دولت آباد (روضہ) میں قیام فرمایا۔ اس مبارک اولوالعزم قافلے میں بندہ نوازؒ کے والدِ بزرگوار سید یوسف معروف بہ شاہ راجو قتالؒ بھی تھے[1]۔ والدِ ماجد کے ساتھ خود حضرت اور ان کی والدۂ ماجدہ بھی تشریف رکھتی تھیں۔ اُس وقت آپ کی عمر چار پانچ سال کی تھی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت آپ کی یہیں ہوئی۔ ابھی آپ کی پندرہ سال کی عمر تھی کہ والد نے رحلت فرمائی۔ حضرت راجو قتالؒ کا مرقد خلد آباد میں اب تک

---

[1] بعض مورخین کو اس سے اختلاف ہے اور لکھا ہے کہ سید یوسف اس کے بعد آئے ہیں۔ ۱۲

موجود ہے۔ والد کے انتقال کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر والدہ ماجدہ کے ہمراہ دہلی واپس تشریف لے گئے۔ سولہ سال کی عمر میں حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرفِ ارادت حاصل کیا۔ علومِ باطنی کی تحصیل حضرت شیخ سے اور علومِ ظاہری کی مولانا شرف الدین کیتھلی سے کی۔ جب حضرت شیخ نصیر الدینؒ کا وقت قریب آیا تو آپ نے خلعتِ خلافت حضرت بندہ نوازؒ کو عطا فرمایا۔ حضرت شیخ نے سنہ ۷۵۷ھ میں رحلت فرمائی اور ان کی بجائے آپ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے اور مریدوں اور طالبوں کو تعلیم و تلقین فرمانے لگے۔ ایک مدت اسی میں مصروف رہے۔ سنہ ۸۰۱ھ میں تیمور نے دلی پر حملہ کیا۔ فتح کے بعد ایک قیامت برپا ہوگئی سیری جہاں پناہ اور پرانی دلی میں آگ کے شعلے بلند ہوئے اور سارے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ اس کشت و خون اور فساد کے عالم میں حضرت مع اہل و عیال کے ترکِ وطن کر کے دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت حضرت کی عمر اسی سال کی تھی۔ بھیلسہ، گوالیار، بھانڈی اور گجرات کے دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے دولت آباد (خلد آباد) پہنچے۔ دولت آباد سے دھارور اور اللند تشریف لے گئے۔ سلطان فیروز شاہ کو جب حضرت کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے امرا و اعیانِ سلطنت کو بھیج کر بڑے عزت و احترام سے گلبرگہ بلایا۔ اور حضرت تا دمِ وصال وہیں مقیم رہے۔ سنہ وفات ۸۲۵ھ ہے۔ وصال کے وقت حضرت کی عمر ایک سو پانچ سال کی تھی۔ حضرت کی زندگی کے یہ چند واقعات اس غرض سے بیان کیے گئے ہیں کہ معلوم ہو کہ ان کا تعلق دکن سے کہاں تک تھا۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ چار پانچ سال ہی کی عمر میں یہاں آگئے تھے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت

بھی یہیں ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک یہیں رہے۔ اور اس کے بعد دلّی تشریف لے گئے۔ اسّی سال کی عمر میں (سنہ ۸۰۱ھ) آپ نے پھر دکن کی طرف مراجعت فرمائی اور اپنی عمر کے آخری پچیس سال یہیں بسر کیے اور اس سرزمین کو اپنی تعلیم و تلقین کی برکت سے فیض پہنچاتے رہے یعنی زندگی کا ابتدائی اور آخری زمانہ دکن ہی میں بسر ہوا۔ صوفیائے کرام کی تعلیم کسی خاص فرقے سے مخصوص نہیں ہوتی، ان کا فیض عام ہوتا ہے۔ بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں زیادہ حاضر ہوتے اور طالبِ فیض ہوتے ہیں اور اس لیے ان کے سمجھانے کے لیے انھیں کی زبان میں ان سے باتیں کرنی پڑتی ہیں اور انھیں کی زبان میں تعلیم و تلقین بھی کی جاتی ہے۔ حضرت کا معمول تھا کہ نمازِ ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث اور تصوف اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے اور گاہے گاہے درس میں کلام اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی اور فارسی سے زیادہ واقف نہ تھے ان کے سمجھانے کے لیے آپ دکھنی زبان میں بھی تقریر فرماتے تھے۔ چوں کہ حضرت کو تصنیف و تالیف کا خاص شوق تھا۔ اور آپ کے قلم سے ایک سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں نکلی ہیں اس لیے یہ قیاس کچھ بے جا نہیں عام لوگوں کے سمجھانے کے لیے آپ نے بعض رسالے دکھنی اردو میں بھی تصنیف کیے ہوں ۔

میرے پاس حضرت کے متعدد رسالے اس زبان میں تصنیف کیے ہوئے موجود ہیں لیکن ان کے شایع کرنے کی جراءت نہیں ہوئی اس لیے کہ ہمارے ہاں قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نام ور بزرگانِ دین سے منسوب کر دیتے ہیں۔ چناں چہ حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور غوث الاعظم حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے نام سے فارسی دیوان شایع اور رائج

ہیں۔ اسی طرح اور بزرگوں کے نام سے مختلف قسم کی کتابیں اور رسالے لکھ کر منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اس بنا پر مجھے ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ جو رسالے میرے پاس موجود ہیں وہ حقیقت میں حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہیں یا نہیں کیوں کہ بعض رسالے جن کی نسبت متعدد ذرائع اور متواتر روایتوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت نے دکھنی میں لکھے تھے تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ اصل فارسی میں موجود ہیں اور یہ ان کا ترجمہ ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت نے بعض رسالے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں تصنیف فرمائے ہوں لیکن جب تک کوئی قطعی شہادت اس کی تائید میں نہ ہو یہ قیاس زیادہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ لیکن مَیں اس سے مایوس نہیں ہوا۔ اور کھوج میں لگا رہا کہ جب کسی رسالے کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے کہ یہ حضرت ہی کی تصنیف ہے تو شایع کروں۔ اس اثنا میں مولوی غلام محمد صاحب انصاری وفا مدیر 'تاج' نے ایک رسالے 'معراج العاشقین' کا پتا ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کے کتب خانے سے لگایا اور جب انھوں نے مجھے یہ نسخہ دکھایا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ نکال کے دیکھا تو ایک ہی کتاب کی دو نقلیں تھیں البتہ کہیں کہیں الفاظ اور عبارت کا اختلاف تھا جو قلمی نسخوں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں ایک بات کام کی نظر آئی کہ اس کے آخر میں یہ تحریر ہے کہ یہ ایک قدیم نسخے سے جس کا سنہ کتابت سنہ ۹۰۶ ہجری تھا نقل کیا گیا ہے اصل عبارت یہ ہے :۔

"نسخۂ شریف را فقیر حقیر سراپا تقصیر سید محمد نصیر در قلعہ نصرت آباد ساگر من مضافات دارالظفر بیجاپور بہ تاریخ ہفتم ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۱۷۶ھ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و شش ہجری از نسخۂ تبرکہ قدیم کہ

مکتوبہ سنہ ۹۰۶ھ نہ صد و شش ہجری بود نقل نمود۔"

اس سے مجھے بہت کچھ اطمینان ہوا اور ایک حد تک اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے زبان بھی قدیم ہے۔ اس کے علاوہ 'عشق نامہ' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ تصوف کی ایک ضخیم کتاب ہے جو حضرت خواجہ صاحب کے مرید محمد عبداللہ بن محمد عبدالرحمٰن چشتی نے احمد شاہ بہمنی (سنہ ۸۲۸ھ تا سنہ ۸۶۲ھ) کے زمانے میں تصنیف کی۔ اس میں حضرت کی تصانیف 'معراج العاشقین' اور 'ہدایت نامہ' کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے۔ اس میں کثرت سے خواجہ صاحب کے ملفوظات اور آپ کے وعظ و تذکار کے حالات درج ہیں۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی نہ کیا جائے تو کم سے کم اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ سنہ ۹۰۶ھ سے قبل کی تصنیف ہے۔ حضرت بندہ نواز کا سنہ وفات ۸۲۵ ہجری ہے۔ یعنی اس رسالے کی کتابت حضرت کی وفات سے ۸۱ سال بعد کی ہے۔ اس سے بھی یہ امر قرینِ قیاس بلکہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ حضرت ہی کی تصنیف ہے۔ اگر ان تمام قیاسات اور شہادتوں سے قطع نظر کر لی جائے تو بھی اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ اگر حضرت کی نہیں تو ان کے کسی ہم عصر یا اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ قدیم اردو کا نہایت قابلِ قدر نمونہ ہے اور اس سے قبل کی تحریری زبان کا نمونہ ملنا دشوار ہے۔ اگرچہ یہ کوئی ادبی کتاب نہیں ہے اور اوّل سے آخر تک سراسر تصوّف ہے تاہم اس زمانے کی زبان کا تھوڑا بہت پتا ضرور لگتا ہے اور موجودہ حالت میں یہ کچھ کم نہیں بلکہ بہت غنیمت ہے۔

جب یہ دو نسخے میرے ہاتھ آ گئے اور مصنف اور زمانے کے متعلق کافی اطمینان ہو گیا تو میں نے حضرت وفا کی فرمائش سے ایک صحیح نسخہ مرتب کرنا

شروع کیا۔ قلمی کتابیں جیسی کچھ غلط لکھی ہوتی ہیں وہ ظاہر ہے لیکن دکنی زبان کی کتابیں (سوائے خاص خاص نسخوں کے) سب پر سبقت لے گئی ہیں عام غلطیوں کے علاوہ جو اکثر بے سواد کاتب کر جاتے ہیں ان کا املا ایسا عجیب وغریب اور خط اس قدر خراب ہوتا ہے کہ صحیح لفظ بھی غلط نظر آتے ہیں اور ان کی صحت میں بھی ایسی ہی دشواری پیش آتی ہے جیسے غلط الفاظ کی صحت میں۔ بات یہ ہے کہ اہلِ علم اور خاص لوگ عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھتے تھے اور دکنی کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے تھے۔ دکنی زبان میں کتابیں ایسے لوگوں کے لیے لکھی جاتی تھیں جو کم علم تھے یا عربی فارسی سے واقف نہ تھے۔ یہی لوگ ان کتابوں کو شوق سے پڑھتے اور نقلیں کرتے تھے۔ ایک نقل سے دوسری نقل میں غلطیوں کا اور اضافہ ہوجاتا تھا۔ اور کتاب غلط در غلط ہوجاتی تھی۔ سوءِ اتّفاق سے یہ دونوں نسخے بہت غلط، بدا ملا اور بد خط ہیں۔ اگرچہ پُرانی دکنی کتابیں پڑھتے پڑھتے مجھے اس کام کی رکان آگئی ہے تاہم ان مسخ شدہ اور غلط نسخوں کی تصحیح میں بہت دقّت پڑی بعض بعض جملوں اور لفظوں کی تصحیح میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ کہیں قیاس سے کام نکل آیا اور کہیں سیاقِ عبارت سے۔ باوجود اس کے اب بھی بعض مقامات مشکوک اور قابلِ تصحیح رہ گئے ہیں۔ اگر اس رسالے کا کوئی اور نسخہ ہاتھ لگ گیا تو آیندہ اس کی تصحیح میں آسانی ہوجائے گی۔ بہ ہر حال بُرا بھلا جو کچھ بن پڑا وہ پیش ہے۔ آخر میں بعض اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی فرہنگ بھی دے دی گئی ہے ؁

---

# مقدّمۂ سب رس

کچھ ہی دنوں پہلے تک ولیؔ اُردو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا تھا اور بعض کو اب بھی اس پر اصرار ہے۔ پُرانی باتیں دل سے نکلتے ہی نکلتی ہیں، لیکن تحقیق سے اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ ولیؔ سے بہت پہلے اردو کے بہت اچھے اچھے شاعر ہو گزرے ہیں۔ اسی طرح اب تک اردو نثر کی پہلی کتاب فضلیؔ سے منسوب کی جاتی تھی اور اس کی 'کربل کتھا' اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں معلوم ہوا کہ فضلیؔ سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں مگر پردۂ خفا میں تھیں تحقیق و جستجو نے اب انھیں گم نامی سے نکالا ہے۔ انھیں میں سے ایک قابلِ قدر کتاب 'سب رس' ہے۔

ہر زبان میں (زمانے کے لحاظ سے) نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ پہلے اردو ناٹکوں کی طرح نظم ہی میں گا گا کر باتیں کرتے تھے بلکہ اس سے یہ مطلب ہے کہ ادبی نثر سے پہلے نظم کہی یا لکھی گئی اور نثر لکھنے کا رواج بہت بعد میں ہوا۔

بات یہ ہے کہ انسان ابتدا میں زیادہ تر جذبات اور جبلّت کا تابع تھا۔ اب بھی جہاں کہیں تمدن نے اپنی پرچھائیں نہیں ڈالی، وہاں لوگ جذبات کی

پوٹ معلوم ہوتے ہیں۔ عقل دیر میں آتی ہے اور مشکل سے آتی ہے اور اس کا جذبات پر غالب آنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ جذبات کا اظہار نظم ہی میں خوب ہوتا ہے۔ انسان کا پہلا کلام گیت ہے۔ گانا اور ناچنا انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے۔ فطرت میں ہر جگہ ناچ اور گانا نظر آتا ہے۔ موزونیت دونوں کی جان ہے اور انسان کے اوّلین جذبات بے تکلفی اور سادگی سے اُنھیں کے طفیل میں ظاہر ہوئے اور اب تک ہر قوم میں متمدّن ہو یا غیر متمدّن، یہ اس کی مسرّت و لطف کا سامان ہیں اور جب تک سائنس جذبات کو بالکل کچل کر اسے مشین کا پُتلا نہ بنا دے یہ یونھیں رہیں گے۔
اگرچہ اُردو کا نشو و نما اُس وقت ہوا جب کہ ملک اعلیٰ درجے کا متمدّن تھا، لیکن یہ فارسی اور ہندی کی پروردہ تھی دونوں شاعری کی زبانیں ہیں یہ بھی اسی رستے پر پڑلی۔ اس کی ابتدا بھی نظم ہی سے ہوئی اور نثر بعد میں آئی، یہاں تک کہ بعض علمی کتابیں بھی نظم ہی میں لکھی گئیں اور یہی تقریباً ہر زبان میں ہوا ہے ؛

'سب رس'، کا مصنّف وجہی ہے۔ یہ عبداللہ قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ قطب شاہی بادشاہوں کے عہد میں دکنی یعنی قدیم اردو کو بہت فروغ ہوا۔ یہ علم و ہنر کے بڑے سرپرست تھے۔ شعرا اور علما ان کے دربار کی رونق تھے۔ خود ان میں سے بعض بڑے پایے کے شاعر ہوئے ہیں۔ سلطان محمّد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ) کا ضخیم کلّیات اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری پر دلالت کرتا ہے۔ اُردو میں اس سے قبل کا ایسا پاکیزہ کلام دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کا بھتیجا اور جانشین محمّد قطب شاہ (سنہ ۱۰۲۰ھ تا سنہ ۱۰۳۵ھ) بھی اُردو کا بہت اچھّا شاعر ہوا ہے اور اس کا دیوان موجود ہے۔ اس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ (سنہ ۱۰۳۵ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ) بھی اپنے باپ دادا کی طرح اُردو کا شاعر تھا۔ اس کے عہد میں علم کا بہت چرچا تھا اور بعض بڑے بڑے فاضل اور شاعر اس کے دربار سے

تعلق رکھتے تھے۔ فارسی لغت کی مقبول اور مشہور کتاب 'برہان قاطع' اسی کے عہد میں لکھی گئی۔ طب کی بعض کتابیں اسی زمانے کی تالیف ہیں اور اسی بادشاہ کے نام سے منسوب ہیں۔ ملا نظام الدین احمد نے 'حدیقۃ السلاطین' اس کے حالات میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کے بہت سے علما نے اپنی کتابیں اسی بادشاہ کے نام سے معنون کی ہیں، جس سے اس کی علم پروری اور علمی ذوق کا پتا لگتا ہے۔ ملا غواصی مصنف 'سیف الملوک' و 'بدیع الجمال' اور ابنِ نشاطی مصنف 'پھول بن' اسی کے دربار کے شاعر تھے۔ یہ کتاب 'سب رس' بھی وجہی نے عبداللہ قطب شاہ ہی کی فرمایش سے لکھی تھی۔ چناں چہ وہ خود اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے :-

"سلطان عبداللہ، ظل اللہ، عالم پناہ، صاحبِ سپاہ، حقیقت آگاہ، دشمن پرور، ثانی سکندر، عاشق صاحبِ نظر، دل کے خطرے تے باخبر۔ . . . صبا کے وقت بیٹھے تخت، یکایک غیب تے رمز پاکر دل میں اپنے کچھ لیا کر، وجہی نادرمن کوں، دریا دل گوہر سخن کوں حضور بلائے پان دیے، بہت مان دیے، ہور فرمائے کہ انسان کے وجود ے چہ میں کچھ عشق کا بیان کرنا، اپنا ناتوں عیاں کرنا، کچھ نشان دھرنا۔ وجہی بھوگنی گن بھریا، تسلیم کر کر سر پر ہات دھریا، بھوت بڑا کام اندیشیا، بہت بڑی فکر کریا، بلند ہمتی کے بادل تے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا، قدرت کے اسراراں برسایا بادشاہ کے فرمائے پر چینتیا، نوی تقطیع بیتیا"۔

'سب رس' کے علاوہ میرے پاس وجہی کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ ایک 'تاج الحقائق' یہ بھی نثر میں ہے اور اس میں اخلاق و تصوف پر بعض مباحث

ہیں اور 'سب رس' کے بعض مقامات سے جہاں اس نے اسی قسم کی بحثیں چھیڑ دی ہیں، بہت ملتے جلتے ہیں۔ دوسری ایک مثنوی 'قطب مشتری' ہے اس میں بادشاہِ وقت ابراہیم قطب شاہ کے بیٹے، سلطان قلی قطب کے عشق و محبت کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف جیسا کہ اس نے خود کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے سنہ ۱۰۱۸ھ ہے۔ ایک بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی کہ اس مثنوی میں وہ ہر جگہ اپنا نام "وجہی" لکھتا ہے۔ البتہ اس مثنوی میں ایک عنوان کے یہ الفاظ ہیں: "وجہی تعریف شعر خود گوید" ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کے نہیں ہو سکتے کسی دوسرے کے ہیں، لیکن 'سب رس' میں جہاں کہیں اس کا نام آیا ہے وہاں "وجہی" لکھا ہے۔ کم سے کم اس کے پانچ نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ان سب میں "وجہی" پایا گیا۔ 'حدیقۂ قطب شاہی' میں جہاں اس کا ذکر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرزند کی تاریخِ ولادت کے ضمن میں آیا ہے وہاں صاف طور پر "وجہی" لکھا ہوا ہے۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "وجہی" اور "وجہی" دونوں طرح اپنا نام لکھا ہے۔ اس مثنوی میں ابراہیم قطب شاہ کی مدح اور سلطان قلی قطب شاہ کی ولادت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا اس نے قطب شاہیہ خاندان کے چار بادشاہوں کو دیکھا تھا اور یہ کتاب اس نے عبداللہ قطب شاہ کے دادا محمد قلی قطب شاہ کے آخر زمانے میں لکھی۔ 'سب رس' کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے۔ چناں چہ خاتمۂ کتاب میں لکھتا ہے "بارے جس وقت تھا ایک ہزار چہل و پنج، اس وقت ظہور پکڑیا یہ گنج" یعنی اس نے 'سب رس' مذکورہ مثنوی سے ۲۷ برس بعد لکھی اُس وقت اُس کی عمر اچھی بڑی ہوگی۔ تعجب یہ ہے کہ اس نے اس کتاب میں کہیں اس

---

[1] وجہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرزند کے تولد ہونے پر یہ تاریخ کہی:
"آفتاب از آفتاب آمد پدید" (۱۰۴۱ھ)

مثنوی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے شاعر ہونے میں شبہ نہیں۔ سب سے بڑی شہادت تو یہ مثنوی ہے۔ دوسری شہادت 'حدیقۂ قطب' سے ملتی ہے اس کے علاوہ وہ 'سب رس' میں بھی اپنے اشعار اور غزلیں جا بہ جا نقل کرتا ہے۔ اب مَیں کتاب کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں:

یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ قصّہ بھی عجیب ہے اور طرزِ بیان بھی عجیب۔ مصنّف نے ایک عام اور عالم گیر حقیقت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور حسن و عشق کی کش مکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصّے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ بڑے مزے کا قصّہ ہے اور کون ہے جو اس کوچے سے نا آشنا ہو اور جس نے اس معرکے میں چوٹ نہ کھائی ہو:

وجہی نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا کہ یہ قصّہ اسے کہاں سے ملا۔ دیباچہ پڑھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اُسی کی ایجاد ہے اور اسی کے دماغ کی اُپج ہے۔ حال آں کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ پُر لطف داستان سب سے پہلے محمّد یحییٰ ابن سیبک فتّاحی نیشاپوری نے لکھی۔ یہ نیشاپور علاقہ خراسان کے مشاہیر میں سے اور شاہ رخ مرزا کے عہد میں تھے۔ انتقال کی تاریخ سنہ ۸۵۲ھ ہے۔ تخلص فتّاحی ہے۔ اس تخلص کے رکھنے میں بھی انھوں نے خاص جدّت اور تکلّف سے کام لیا ہے۔ یہ سیبک سے تراشا گیا ہے جو ان کے نام کا جز ہے۔ سیب کو عربی میں "تفّاح" کہتے ہیں اور تفّاح کو تقلیب کیا تو "فتّاح" بنا اور اس سے "فتّاحی" اپنا تخلص قرار دیا۔ اس کے علاوہ وہ اسراری اور خماری بھی تخلص کرتے ہیں۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ یہ بہت فاضل اور قادر الکلام شاعر تھے لیکن چوں کہ طبیعت میں قناعت تھی اور دربار کی گوں کے نہ تھے۔ اس لیے ان کا کلام زیادہ مشہور نہ ہوا۔ علاوہ دیوان کے ان کی کئی تصنیفات ہیں

ان میں سے ایک "دستورِ عشاق" یعنی "حسن و دل" کا قصہ ہے۔

"دستورِ عشّاق" مثنوی ہے جس میں پانچ ہزار شعر ہیں۔ اس قصّے کو مصنف نے "شبستانِ خیال" اور "حُسن و دل" کے نام سے الگ الگ بھی لکھا ہے لیکن یہ دونوں "دستورِ عشّاق" کے بعد لکھی گئی ہیں۔

"حسن و دل" جو بہت مشہور ہوئی نثر ہیں "دستورِ عشاق" کا خلاصہ ہے۔ اس کی نثر مسجّع اور مقفّٰی ہے اور صنایع اور بدایع کی اس میں خوب داد دی ہے۔ یہ کتاب یورپ میں تین بار چھپی اور ترجمہ ہوئی۔ سب سے پہلے آرتھر برون (ڈبلن) نے سنہ ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا۔ دوسرا ترجمہ ولیم پرائس نے سنہ ۱۸۲۸ء میں شایع کیا اور سب سے آخر میں جرمن ڈاکٹر روڈالف دوراک نے وی اینا (Vienna) اکاڈیمی کی روئداد (سنہ ۱۸۸۹ء، جلد ۱۱۸) میں مع ترجمے کے شایع کیا۔ انگریزی کے دو ترجمے تو یوں ہی ہیں لیکن اس جرمن ڈاکٹر نے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے کتاب پر عالمانہ اور تنقیدی مقالہ لکھا ہے اور قصّے کا خلاصہ بھی لکھ دیا ہے اور ترکی شاعر لامعی (سنہ وفات ۹۳۸ھ یا ۱۵۳۱ء) کی داستان سے بھی جس نے اسے اپنی زبان میں لکھا ہے اس قصّے کا مقابلہ کیا ہے۔ تین اور ترکی شاعروں نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک تو آہی (سنہ وفات ۱۵۱۷ء) اور دوسرا والی ہے جو سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا ہے اور تیسرا صدقی۔ لامعی اور آہی کی کتابیں نثر میں ہیں اور والی اور صدقی کی نظم میں۔ آہی کی کتاب ناتمام ہے اور اس کی نثر نہایت درجہ مسجّع و مقفّٰی اور دقیق ہے۔ سوائے صدقی کے باقی سب نے قصّے میں اپنی طرف سے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔[۱] ہندوستان بھی اس سے خالی نہیں۔ عہدِ عالمگیر میں سنہ ۱۰۹۵ھ میں خواجہ محمد بیدل نے اس قصّے کو پُر تکلف نثر میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ جدت کی ہے کہ قصّے کے اشخاص کو

---

[۱] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف اوٹومن پوئٹری" مصنفہ گب، جلد دوم صفحہ ۲۹۲ تا ۲۹۶

خطابات بھی عطا فرمائے ہیں۔ جس سے تمثیل کا لطف جاتا رہا ہے۔

مذکورہ بالا حالات مَیں نے مسٹر آر۔ ایس۔ گرین شیلڈس (آئی۔ سی۔ ایس) کی کتاب 'دستورِ عشّاق' کے مختصر دیباچے سے اخذ کیے ہیں جو انھوں نے جرمن ڈاکٹر کے مقدمے سے (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) نقل کیے ہیں۔ مسٹر گرین شیلڈس نے اصل فارسی نسخہ سنہ ۱۹۲۶ء میں شایع کیا۔

لیکن ہندوستان میں بھی 'حُسن و دل' کے نام سے اسی قصّے کو ایک شاعر نے فارسی زبان میں نظم کیا ہے جس کا ذکر یورپین مترجموں نے نہیں کیا۔ اس کے مصنّف داؤد ایلچی ہیں جنھوں نے اپنی مثنوی 'حُسن و دل' ۱۰۵۴ھ میں نظم کی۔[۱] یہ کتاب بمبئی یونی ورسٹی کے کتب خانے میں ہے۔ اُردو میں بھی کئی شاعروں نے اسے نظم کیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

---

[۱] کتاب کی وجہ تالیف یہ بیان کی ہے:

بسے ہست منظوم افسانہا — بہ لطفِ عبارت چو دُردانہا
زہر نکتہ سنجی در اطوارِ عشق — بہ طرزے کہ بنماید آثارِ عشق
وے ایلچی با پریشاں دلی — سرے پر ز سودائے بے حاصلی
بری از تکلّف بہ طرزِ غریب — ادا می کند قصۂ بس عجیب

کتاب کے آخر میں یہ اشعار ہیں اور پانچویں شعر میں سنہ تالیف مذکور ہے:

بہ گو حمد للہ کہ ایں گفت گو — بہ سر حدِ انجام آورد رو
دل و حسن گشتند از عشق شاد — گرفتند از وہم کمال مراد
نتائج از ایشاں بسے حاصل ست — شناسد کسے کو بہ حق واصل ست
یکے زاں نتائج بود ایں کتاب — کہ حسن و دلش نام شد از صواب
زہجر نبیؐ زکی در شمار — گزشتہ ہزار ست پنجاہ و چار
کہ ترتیب ایں نظم ترتیب دید — نہ کو داستانے بہ آخر رسید

آخری دو شعر یہ ہیں:

قلم رفتہ رفتہ بہ ایں جا رسید — زسر گشتگی ہائے خود آرمید
درود نبی گشت آخر کلام — علیہ الصلوٰۃ علیہ السّلام

ان تمام مصنّفوں نے اس قصّے کے بیان کرنے میں، خواہ نثر میں ہو یا نظم میں مولانا فتاحی سے خوشہ چینی کی ہے۔ گو مُلّا وجہی نے قصّے کی اصل کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا مگر دونوں کتابوں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجہی نے قصّے کی واردات حرف بہ حرف فتّاحی سے لی ہے اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا ہے تو یہ کہ جا بہ جا موقع بے موقع پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے جس کا اصل کتاب میں نام و نشان نہیں۔

میرا قیاس یہ ہے کہ وجہی کو فتاحی کی 'حسن و دل' جو نثر میں ہے ہاتھ لگ گئی تھی 'دستورِ عشّاق' اُس کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وجہی نے اپنی نثر میں اُسی کا طرز اڑایا ہے اور مسجّع اور مقفّیٰ عبارت لکھی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ جن امُور کا ذکر 'دستورِ عشّاق' میں مفصّل ہے اور نثر کے خلاصے میں سرسری یا برائے نام ہے ان کی تفصیل وجہی کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی مثلاً جب حسن و دل کی شادی ہوتی ہے تو وہاں فتاحی نے دف دگل، چنگ و بنفشہ نرگس و کاسہ چینی کے بڑے پُر لطف مناظرے لکھے ہیں۔ نثر کی کتاب میں ان کا ذکر نہیں، 'سب رس' میں بھی یہ نہیں پائے جاتے، اور اس تقریب میں قامت اور زلف اور دیگر امرا کی طرف سے جو دعوتیں اور مہمان داریاں ہوئی ہیں اس کا بھی کوئی مذکور نہیں۔ اور آخر میں جب گلشنِ رخسار میں خضر سے ملاقات ہوتی ہے تو وجہی نے صرف چند ہی سطروں میں یہ ملاقات ختم کردی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ساری باتیں ہوجاتی ہیں اور زبان سے کسی کلمے کے ادا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن بہ خلاف اُس کے 'دستورِ عشّاق' میں خضر دل کو ایک پُر معنی اور پر معارف تلقین کرتا ہے۔ 'سب رس' میں قصّے کا خاتمہ گھپلا بلکہ مبہم ہو کے رہ جاتا ہے، 'دستورِ عشّاق' میں فتاحی خضر کی زبان

سے تمام اسرار کی حقیقت کھولتا ہے اور بتاتا ہے کہ "تو" کیا ہے۔ زرق، توبہ اور زہد کون ہیں نظر، ہمت، رقیب، قامت، زلف اور غیرہ سے کیا مطلب ہے۔ گلشنِ رخسار اور شہر دیدار کیا ہیں اور عقل اور عشق کی کیا حقیقت ہے۔ غرض تمام تمثیل پر سے جو ہم پڑھتے آئے ہیں آخر میں مجاز کا پردہ اٹھا دیتا ہے اور حقیقت کا جلوہ دکھا دیتا ہے اور جن چیزوں کو ہم قصہ سمجھتے تھے وہ معارف کے رنگ میں نظر آنے لگتی ہیں اور اس ترکیب سے داستان کے تمام اسرار حل ہو جاتے ہیں۔ آبِ حیات جس پر قصے کی بنیاد ہے اور جس کی آرزو میں تمام فتنے اور فساد برپا ہوتے ہیں اور طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی ہیں وہ 'سب رس' میں آخر تک مُعَمّہ سا رہتا ہے اور تمثیل کسی قدر ناقص اور تشنہ رہ جاتی ہے۔ 'دستورِ عشاق' میں خضر نے اس گتھی کو بھی سلجھایا ہے اور تمثیل کی تکمیل کر دی ہے۔ اگرچہ شروع میں ایک جگہ وہ آبِ حیات کے متعلق یہ کہتا ہے ؎

به کف آبے کن از عین شریعت		که این است آبِ حیواں در حقیقت

لیکن فتاحی نے 'گلشنِ رخسار' میں سرچشمہ فم کی نشان دہی کی ہے اور اُس چشمے پر جو سبزہ اگا ہوا ہے اُسے خضر سے تعبیر کیا ہے اور فم یعنی مُنہ ہی وہ جگہ ہے جہاں سخن پایا جاتا ہے اور یہ سخن آبِ حیات ہے۔ وجہی نے بھی مُنہ ہی کو آبِ حیات کا چشمہ بنایا ہے، چناں چہ وہ لکھتا ہے "تماشا دیکھتے دیکھتے رخسار کے گلزار میں آئے، دہن آبِ حیات کا چشمہ پائے۔" ہمت نے بھی یہی پتہ دیا تھا، مگر فتاحی نے اُسے زیادہ صاف کر دیا ہے وہ دہن کو چشمہ اور سخن کو آبِ حیات بتاتا ہے، اور پھر اس کی تعریف میں یوں نغمہ زن ہوتا ہے ؎

سخن رُوح اللہ پاک ست در رسم		زحق القائے او با مریم جسم
سخن دُر لیست از دریائے اعظم		سخن نوریست در مشکاةِ آدم

سخن علمِ لدنی رانشان است کہ از تعلیم علمہ البیان ست
سخن "آب حیات" ست از کرامت کہ زو زندہ ست تا روزِ قیامت

اب اس کتاب "سب رس" کو حسن و دل کا فرزند ہونا سزاوار ہے جس پر قصّے کا خاتمہ ہے۔

قصّے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف عقل اور عشق کا معرکہ ہے اور دوسری طرف دل اور حسن کا۔ عقل مغرب کا بادشاہ اور عشق مشرق کا۔ عقل کا ملک یونان (بہ قول وجہی۔ شبستان)، تھا۔ حسن عشق کی بیٹی ہے اور دل عقل کا فرزند ہے۔ بیٹا جب سیانا ہوا تو باپ (عقل) اُسے شہرِ تن (بدن) کا والی بنا دیتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ دل کا ایک مصاحب آبِ حیات کا قصّہ پڑھ کر سناتا ہے۔

دل کو آبِ حیات کا ذکر سن کر اس کے حاصل کرنے کی دُھن لگتی ہے اور اس کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوتا ہے کہ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ آخر اس کا جاسوس نظر اس کی تلاش میں نکلتا ہے اور رستے میں اُسے ایک خوش منظر اور خوش حال شہر ملتا ہے جس کا نام عافیت اور اس کے بادشاہ کا نام ناموس ہے۔ وہ ناموس سے ملاقات کرتا ہے اور اپنے سفر کا مقصد بیان کر کے رہ نمائی کا طالب ہوتا ہے۔ ناموس کہتا ہے کہ آبِ حیات کی کوئی حقیقت نہیں یہ فسانہ ہے اصل آبِ حیات انسان کی آبرو ہے۔ نظر مایوس ہو کر آگے بڑھتا ہے، چلتے چلتے ایک عظیم الشان پہاڑ کے قریب پہنچتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام زہد ہے اور ایک بڈھے زرق نامی کا آشیانہ ہے۔ اس کی خدمت میں حاضر ہوا آبِ حیات کا نشان پوچھا۔ اس نے کہا کہ آبِ حیات دنیا میں کہاں وہ تو بہشت میں ہے ہاں اگر اس کی تلاش ہے تو عاشقوں کے آنسوؤں میں ڈھونڈ۔ یہ بات اس کے دل کو نہ لگی اور وہاں سے مایوس ہو کر آگے چلا تو ہدایت نام ایک سر بہ فلک کوٹ دیکھا جس کا بادشاہ ہمّت

تھا اس نے البتہ کچھ ہمت بندھائی اور آبِ حیات کا پتا بتایا اور کہا کہ کوہِ قاف کے اس طرف ایک شہر ہے جس کا نام دیدار ہے اس میں ایک باغ ہے جس کا نام رخسار ہے اور اس باغ میں ایک چشمۂ دہن ہے اور اسی چشمے میں آبِ حیات ہے جس کی تجھے تلاش ہے اور ایک سفارشی خط اپنے بھائی قامت کے نام دیا۔ اور یہ بھی کہا وہاں پہنچنا بہت دشوار ہے شہرِ دیدار کا نگہ بان ایک دیو رقیب نامی ہے وہ کسی غیر آدمی کو وہاں گھسنے نہیں دیتا۔ غرض بہ ہزار دقت جب کہ وہ رقیب کے شہر سگسار میں پہنچا تو نگہ بانوں نے اُسے قید کر لیا اور رقیب کے پاس لے گئے۔ رقیب بہت بگڑا اور کہا تو یہاں کیسے آیا؟ نظر نے جب دیکھا کہ جان کا خطرہ ہے تو کہا میں بڑا حکیم اور کیمیا گر ہوں۔ رقیب کو لالچ نے گھیرا اور سونے کی طمع میں اسے بڑی خاطر سے اپنے پاس رکھا۔ جب سونا بنانے کی فرمایش کی تو نظر نے کہا بعض دوائیں صرف شہرِ دیدار میں ملتی ہیں وہاں لے چلو تو سونا بنا دوں گا۔ وہاں گیا تو قامت سے ملاقات ہوئی ہمت کا خط دیا اور اس کی مدد سے چھپ کر رقیب کے پنجے سے رہائی پائی اور شہرِ دیدار کا قصد کیا۔ رخسار کے گلزار میں پہنچا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ قضا کار حُسن کی ایک سہیلی لٹ (زلف) وہاں سیر کرنے کو آئی تھی اس کی آنکھ جو نظر پر پڑی تو برہم ہو کر بولی کہ تو کون ہے اور یہاں کیسے آیا ہے؟ یہ بہت گھبرایا اور بہت منت و عاجزی کی اور کہا میں مصیبت زدہ ہوں، یہاں تک آگیا ہوں، خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ اُسے ترس آیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔ رخصت کرتے وقت اپنے کچھ بال دیے اور کہا جب تجھ پر کوئی مصیبت آئے تو یہ بال آگ پر رکھ دینا میں فوراً تیری مدد کو آجاؤں گی۔ زلف سے وداع ہو کر پھر شہرِ دیدار کی طرف چلا اور تھوڑی دیر میں رخسار کے گلزار میں پہنچ گیا۔ وہاں کا نگہ بان غمزہ تھا۔ غمزہ نظر کا بھائی تھا لیکن بچپن میں جدا ہو گئے تھے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے

غمزے نے جو غیر شخص کو گلزار میں دیکھا تو فوراً جھپٹ کر اسے گرفتار کر لیا اور قتل ہی کرنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر بازوبند پر پڑی۔ ان کی ماں نے بچپنے میں نشانی کے لیے دونوں کے بازووں پر ایک ایک لعل باندھ دیا تھا، دیکھتے ہی وہ نظر سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ دونوں بھائی ملے نظر نے اپنا سب احوال سُنایا۔ غمزہ حُسن کا مصاحب تھا وہ اسے حسن کے پاس لے گیا۔ حسن کے پاس ایک نہایت خوش رنگ بیش بہا لعل تھا جس پر ایک خوب صورت موہنی مورت بنی ہوئی تھی اس نے پرکھنے کے لیے نظر کو دکھایا۔ وہ دیکھ کر حیران ہوگیا اور کہا کہ یہ صورت تو دل کی ہے۔ یہ سنتے ہی حُسن دل پر عاشق ہو جاتی ہے۔ نظر نے کہا کہ دل کو آبِ حیات کی بڑی جستجو ہے اور اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ تمھارے ہاتھ میں ہے یہ مل جائے تو میں دل کو تیرے پاس لیے آتا ہوں۔ حُسن نے اپنے غلام خیال کو نظر کے ساتھ کیا اور ایک یاقوت کی انگوٹھی ان کو دی جس سے آبِ حیات کے چشمے پر مُہر کی جاتی تھی۔ خیال اور نظر شہر بدن میں پہنچ کر دل سے ملتے ہیں دل کو جب یہ حال معلوم ہوتا ہے اور خیال حسن کی تصویر کھینچ کر دل کو دکھاتا ہے تو دل ہزار جان سے حسن پر عاشق ہو جاتا ہے، کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ آخر نظر کے مشورے سے شہر دیدار کے سفر کا قصد کرتا ہے۔ دل کے باپ بادشاہ عقل کا وزیر وہم نامی اپنے آقا کا بڑا خیر خواہ تھا اسے جب یہ خبر ہوئی تو اس نے فوراً بادشاہ سے ساری باتیں جا لگائیں۔ اور کہا کہ نظر جو شہر سے غائب تھا ایک خانہ خراب خیال کو ساتھ لایا ہے اور دونوں شہزادۂ دل کو شہر دیدار کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ یہ ضرور کوئی فتنہ پیدا کریں گے اور ملک میں خلل ڈالیں گے۔ ابھی بادشاہِ عشق کی صلح ہوئی ہے باہم قول و قرار ہوئے ہیں اگر لڑائی ہوئی تو بہت بُرا ہوگا۔ عشق بہت قوی ہے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ عقل اس خبر کے سُننے سے سخت پریشان ہوا اور وہم کے

مشورے کے موافق دل اور نظر کو قید کر دیا اور پہرے بٹھا دیے۔

یاقوت کی وہ انگوٹھی جو حسن نے دل کو اپنے عشق کی نشانی بھیجی تھی جو کسی مصلحت سے دل نے نظر کو دے دی تھی اس کی خاصیت یہ تھی جو کوئی اسے منھ میں رکھ لے تو سب کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ وہ سب کو دیکھے اُسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس انگوٹھی کو منھ میں رکھ کر عقل بادشاہ کے بند سے باہر نکل آیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا اور جلد جا پہنچا۔ سیر کرتے کرتے رُخسار کے گلزار میں گزر ہوا، وہاں ایک چشمہ جسے آبِ حیات کہتے ہیں، لالچ میں آ کر چاہتا تھا کہ ایک گھونٹ پانی پی لے کہ انگوٹھی مُنھ میں سے نکل کر چشمے میں جا پڑی اور آبِ حیات کا چشمہ نظر سے غائب ہو گیا۔ اتنے میں رقیب کی نظر اس پر پڑی وہ تاک میں تھا ہی فوراً جکڑ کر باندھ لیا اور گھرے جا کر قید کر لیا۔ یہ ان کے کرتوت کا نتیجہ تھا۔ سخت پریشان حال اور بے قرار تھا کہ ایک دن لٹ کے بالوں کا خیال آیا، ایک دو بال لے کر آگ پر رکھے، بالوں کا آگ پر رکھنا تھا کہ فوراً لٹ آ پہنچی حال پُوچھا اور کسی حکمت سے قید سے چھڑایا اور شہر دیدار اور رخسار کے گلزار کے رستے پر ڈال دیا۔ نظر وہاں پہنچ کر حسن سے ملا۔ وہ فراق کی ماری تو انتظار ہی میں بیٹھی تھی جب نظر کی زبانی سب حال معلوم ہوا تو مایوس ہوئی اور غمزے کو بلا کر کہا کہ تم اور نظر دونوں جاؤ اور جس طرح بن پڑے تدبیر سے، حکمت سے، جادو سے ٹونے سے دل کو یہاں لے کر آؤ۔

اب نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو ساتھ لے کر شہر بدن کی طرف سدھارے کہتے ہیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند سے نکل بھاگا تو عقل کو اسی وقت کھٹکا ہوا تھا کہ یہ جا کر کچھ نہ کچھ فساد برپا کرے گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی سے سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کر دیے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا ہے اُسے مُلک

سے باہر نہ جانے دیں اور جہاں ملے قید کرلیں۔ زرق کا بیٹا توبہ جو اپنے کوہستانِ زہد میں رہتا تھا اُسے بھی عقل نے تاکیدی احکام بھیجے تھے جب نظر اور غمزہ چلتے چلتے وہاں پہنچے تو قلعے کے دیدبان نے اطّلاع دی کہ نظر لشکر لیے پہاڑی کے نیچے پڑا ہے تو یہ غصّے میں بھرا ہوا فوراً لشکر لے کر چڑھ آیا۔ یہ دونوں بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑے اور توبہ کو مار بھگایا۔ یہاں سے چل کر وہ قلندروں کے بھیس میں شہر عافیت کی طرف چلے اور وہاں کے بادشاہ ناموس سے ملے۔ اس پر کچھ ایسا جادو چلا کہ تخت و تاج چھوڑ کر وہ بھی فقیر ہو گیا؛

ادھر توبہ شکست کھا کر باحال خستہ و تباہ بادشاہ عقل کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس پر گزری تھی کہہ سُنائی۔ بادشاہ نے غمزے کی یہ سفاکی دیکھی تو دل کو طلب کیا، قید سے رہا کیا اور غمزے کی بیداری کا قصّہ سنایا اور نہایت دل سوزی سے موقع کی اونچ نیچ کو سمجھایا اور کہا کہ حُسن کا لشکر بہت سفّاک ہے اس میں وفا نہیں۔ تم اگر ان دغابازوں کی باتوں پر جاؤ گے تو اپنا ملک کھو بیٹھو گے۔ ہماری بات سنو، ہمارا جرّار لشکر حاضر ہے اسے لے کر شہر دیدار کے ادھر چلے جاؤ، اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں، عورت کی ذات بہت مکّار ہوتی ہے نہ معلوم اس عشق کے پردے میں کیا گُل کِھلائے۔ دل کو بھی یہ بات پسند آئی اور سمجھا کہ اگر غالب آیا تو حُسن اپنی ہے اور جو مغلوب ہوا تو معذوری ہے۔ عقل کی باتوں سے عشق کا ولولہ دھیما پڑ گیا؛

غرض شاہ عقل کے سپہ سالار صبر کو ساتھ لیا اور لاؤ لشکر لے کر شہر دیدار کا رُخ کیا۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ ساتھ والے خبر لائے کہ اس جنگل میں جگہ جگہ ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں گویا ہَوا سے باتیں کرتے ہیں۔ دل یہ سُن کر بے تاب ہو گیا، شکار کا شوق سر پر سوار ہوا۔ تیر کمان لے ہرنوں پر گھوڑا ڈالا۔ وہ اصل میں ہرن نہ تھے وہی غمزے کا لشکر تھا، انھیں کون پکڑ سکتا تھا، دور

نکل جاتے تو ٹھیر جاتے اور جو دل قریب آتا قلانچیں بھر کے آگے نکل جاتے۔ عقل کو خبر ہوئی تو محبت نے جوش مارا اور وہ بھی اس طرف راہی ہوا۔ دونوں ہرنوں کے پیچھے سرگرداں چلے اور نظر اور غمزہ انھیں جل دے کر شہر دیدار کے پاس لے آئے۔ حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کارگزاری سنائی وہ سن کر باغ باغ ہوگئی۔

اب سوچ یہ پڑی کہ عقل بادشاہ جو لشکر لیے چلا آرہا ہے اس کی کیا تدبیر کی جائے اور اس آفت کو کیوں کر ٹالا جائے۔ رائے یہ قرار پائی کہ حسن اپنے باپ کو اطلاع دے کہ وہ کسی جتن سے اس بلا کو ٹالے، چناں چہ اس نے اپنے باپ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ میرا ایک وفادار غلام خیال نامی مدت سے غائب تھا اب معلوم ہوا عقل بادشاہ نے گرفتار کرلیا ہے۔ ہم نے طلب کیا تو بہت برہم ہوا اور اب لشکر لیے چڑھا آرہا ہے۔ عشق نے جب یہ مکتوب پڑھا تو مارے طیش کے چہرہ لال ہوگیا اور کہنے لگا کہ عقل کی یہ مجال کہ وہ اس سرزمین پر قدم رکھے، عقل دیوانہ ہے کہ جو عشق سے بھڑنا چاہتا ہے۔

غرض عشق نے اپنے بہادر سپہ سالار مہر کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ عقل یہ فوج دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ فرزند کی نالائقی اور اپنے فعل پر بہت پچھتایا۔ اب لڑائی شروع ہوگئی۔ غمزے نے عقل پر حملہ کیا، خوب دو دو ہاتھ ہوئے، عقل کو سنبھلنا مشکل ہوگیا۔ دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر پر قیامت برپا کردی۔ تیسرے دن رات کو زلف نے شب خون مارا، سوتے ہوؤں کو پچھاڑا، اتنے میں باس (نسیم) پہنچی، اس نے دل کو بہت کچھ ڈھارس دی اور پے در پے حملوں سے غنیم کے لشکر میں کھلبلی مچادی، زلف کو بھگا دیا اور عشق کا لشکر تتر بتر ہوگیا۔

حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت گھبرائی، اپنے خال سے مشورہ کیا۔ اس نے

کہا کوہ قاف میں تیری ایک ہم زاد ہے بڑی چتر اور دلیر ہے حسن و جمال میں بھی لاجواب ہے وہ آگئی تو بیڑا پار ہے۔ حُسن نے کہا وہ کوہ قاف میں، میں یہاں، اس کے آتے آتے تو کام تمام ہو جائے گا۔ خال نے کہا یہ کوئی مشکل نہیں، میرے پاس عنبر کا دانہ ہے، ابھی آگ پر رکھتا ہوں، چٹکی بجاتے میں تیرے پاس آجائے گی۔ خال نے ایسا ہی کیا اور حُسن کی ہم زاد فوراً آپہنچی۔ حسن اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئی، گلے ملی اور اپنی ساری بپتا کہہ سُنائی۔ ہم زاد نے کچھ سوچ بچار کے بعد کہا ڈر مت، عقل کیا چیز ہے وہ ہمارے حملے کی کیا تاب لا سکتا ہے۔ حُسن کی ہم زاد نے اپنا ناز، غمزہ، شیوہ، نخرہ، سپہ سالار مہر کی مدد کو بھیجا۔ حسن کے پاس ایک باکمال تیر انداز بھی تھا، جس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا، اس کا نام ہلال تھا۔ اسے بھی حُسن نے سپہ سالار کی کمک پر بھیجا۔ جب یہ پہنچے تو سپہ سالار کا پلہ بہت بھاری ہوگیا۔ ہلال عقل کے لشکر پر جاپڑا، صفوں کو درہم برہم کرتا ہوا اندر گھستا ہوا چلا گیا اور یک بارگی دل کے پاس جا پہنچا اور ان جان پنے سے ایسا تیر جوڑ کر مارا کہ دل گھوڑے پر سے زمین پر آگرا۔ مارنا کسے چاہتا تھا اور لگ گیا کسے، قضا پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ عقل نے جو یہ دیکھا تو حواس جاتے رہے سارا لشکر تو کہیں، فرار ہو گیا۔ عقل بے چارہ مارا مارا پھرا کہیں ٹھکانا نہ ملا۔

ادھر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ حسن ہزار ہزار شکر بجالائی۔ عقل کو پاس نہ دیکھ کر حسن کے خدمت گاروں نے دل کو گرفتار کر لیا اور حسن کے پاس لے آئے۔ حسن کی نظر جو اس پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور دل سے آہ نکلی، بے تاب ہوگئی۔ مارنے والے کو کوسنے دینے لگی اور خدمت گاروں پر آفت برپا کر دی۔ اب کیا ہو سکتا تھا، خاموش ہو رہی مگر دل کو لگی ہوئی تھی، اپنی دائی ناز کو بُلایا اپنی بے قراری اور بے تابی کا حال سنایا۔ دائی نے کہا جلدی اچھی نہیں مصلحت سے کام لینا چاہیے ورنہ اس میں بڑی بدنامی ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ رخسار

کے گلزار میں ایک کنواں ہے جسے چاہِ ذقن کہتے ہیں، کچھے سونے کا بنا ہوا ہے اور اس کا سواد بھی اچھا ہے فی الحال دل کو وہاں بند رکھا جائے۔ دل بے چارہ یہاں گرفتار، ادھر حُسن بے قرار۔

آخر حُسن سے نہ رہا گیا اس نے اپنی سہیلی وفا کو جو سپہ سالار مہر کی بیٹی تھی، بلا کر اپنے درد دکھ کی داستان بیان کی اور کہا کہ دل سے ملنے کی کوئی تدبیر کرو۔ وفا نے کہا میرے خیال میں ایک بات آتی ہے کہ شہر میں ایک باغ ہے جس کا نام باغ آشنائی[1] ہے اس میں ایک چشمہ ہے جیسا چشمۂ آبِ حیات۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک چھجا ہے جس پر غمزے کے بادل چھائے رہتے ہیں اور ناز کے موتی برستے ہیں۔ اس چھجے میں دو کالی کالی کھڑکیاں ہیں جوان کھڑکیوں کو کھول کے داخل ہو تو وصال کی لذّت پائے۔ حسن نے منّت سے کہا کہ اگر تو یہ کر سکتی ہے تو للہ جلدی کر اور ساتھ ہی زلف کو حکم دیا کہ دل کے پیچ سب کھول دے اور چاہِ ذقن سے باہر نکال لا۔ زلف ناز و ادا سے اکڑتی لچکتی گئی اور دل کو چاہ ذقن سے باہر نکال لائی۔ اتنے میں وفا بھی آپہنچی دل سے گھُل مل کے باتیں کرنے لگی۔ بہت کچھ دلاسا دیا اور کہا حُسن نے جو تجھے بند کر رکھا تھا اس میں مجبوری تھی، باپ کا ڈر اور لحاظ تھا۔ اگر ایسا نہ کرتی تو تیری جان کے لالے پڑ جاتے۔ حُسن نے تیرے ساتھ بڑی مروّت اور عنایت کی ہے تجھے اس کی قدر کرنی چاہیے۔ غرض اس طرح کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس نے دل کو لُبھایا اور محبّت کی گرمائی سے گرمایا۔ کنویں سے نکل کر باغ میں جو آیا تو بہت خوش ہوا۔ بہت دنوں کا تھکا ماندہ تھا وہیں پھولوں کی کیاری پر پڑ کے سو رہا۔ حُسن کو جب یہ خبر پہنچی تو مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، ہوا کی طرح اُڑ کے آئی۔ دیکھا کہ دل کا قرار جی کا آرام دل پڑا سو رہا ہے اور سارا باغ اس کے حُسن

---

[1] یہ نام 'دستورِ عشاق' میں ہے 'سب رس' میں اس کا کوئی نام نہیں دیا۔

کی جوت سے جگ مگ کر رہا ہے۔ دل کی صورت دیکھ حُسن کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے پاؤں پر آنکھیں ملیں، بلائیں لینے لگی اور اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ چند قطرے دل کے رخسار پر جو گرے تو اس کی آنکھ کھُل گئی۔ حیران تھا کہ باغ میں دفعتاً یہ نئی بہار کہاں سے آگئی کہ سارا چمن نور کا عالم ہے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو دُوسرا ہی عالم نظر آیا۔ دل سے آہ نکلی، بے قرار ہو گیا اور محبّت کے جوش میں دوڑ کر قدموں پر گر پڑا۔ اب گلے شکوے اور راز کی باتیں ہونے لگیں اس کے بعد حُسن نے کہا کہ تیرے عشق نے بے تاب کر دیا اور یہاں کھینچ لایا اب اجازت دے جاتی ہوں اور وصال کی تدبیر کرتی ہوں بُرا نہ مان اور میری مصلحت کو پہچان[1] ؎

سرِ شام وفا اور ناز نے چھجّے پر مجلسِ عشق آراستہ کی، نظر اور خیال اور تبسّم چشمے پر صحبت رکھتے تھے۔ حُسن نے وفا کو بُلا کر کہا کہ خیال، نظر اور تبسّم سے کہو کہ دل کو داروئے بے ہوشی پلائیں اور زلف سے کہو کہ دل کو اس چھجّے پر اس طرح لے کر آئے کہ کسی اور کو تو کیا اُسے بھی خبر نہ ہو۔ خیال، نظر اور تبسّم نے حکم کی تعمیل کی اور زلف اسے چھجّے پر اس طرح اُٹھا لائی کہ دل کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ غرض اس طرح روز حُسن دل کو بالاخانے پر لاتی، مزے اُڑاتی اور دل کے ارمان نکالتی ؎

آخر یہ چوری کب تک چھپتی۔ رقیب کی ایک بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا۔ حُسن کے پاس رہتی تھی۔ ظاہر میں دوست پر دل میں کھوٹ تھا۔ اُسے اس کا جلاپا تھا کہ حُسن اکیلے اکیلے کہیں جاتی ہے اور مجھ سے چھپاتی ہے اس کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ ایک روز چپکے سے حُسن کے پیچھے ہولی اور بالاخانے پر ایک کونے میں

---

[1] اس بیان میں اور بعد کے بعض حالات میں 'دستورِ عشّاق' سے خفیف سا اختلاف ہے۔

چھپ کے بیٹھ رہی اور سارے راز سے واقف ہو گئی ؛

ایک شب ایسا ہوا کہ حُسن شہر گئی تو کسی وجہ سے اس کا آنا نہ ہوا غیر موقع پاکر وصال کے بالاخانے پر چڑھ گئی۔ جادو ٹونے میں کمال رکھتی تھی حُسن کا بھیس بدل کر بیٹھ گئی جس طرح حُسن حکم دیتی تھی اسی طرح اس نے بھی حکم دیا۔ داروے بے ہوشی بلا زلف اُسے جوں توں بالاخانے پر لائی۔ اتنے میں خیال جو سو رہا تھا جاگا، دل کو دیکھا تو کہیں نہ پایا۔ بہت پریشان ہوا ڈھونڈتے ڈھونڈتے وصال کے بالاخانے پر پہنچا تو دیکھا غیر دل کی گود میں مست پڑی ہے اور دِل بے خبری کے عالم میں ہے۔ فوراً شہر دیدار کو دوڑا گیا اور جو کچھ دیکھا تھا حُسن سے من وعن بیان کیا۔ یہ سُن کر حُسن کے ہوش جاتے رہے تن بدن میں آگ لگ گئی، جیسے بیٹھی تھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور حسد کی آگ میں جلتی بلتی وصال کے بالاخانے پر آئی۔ غیر اور دل کو ایک جگہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی کوسنے اور گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا اور ایک قیامت برپا کر دی۔ غیر ہکا بکا رہ گئی اور چھپ کے دوسرے رستے سے نکل بھاگی۔ حُسن دل پر بھی سخت برافروختہ ہوئی اور اس کی بے وفائی اور بے مہری سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور طیش میں آکر خیال، نظر اور تبسم کو حکم دیا کہ اس نالائق بے وفا مورکھ کو باغ سے باہر نکال دو ؛

غیر نے ادھر تو حسن اور دل سے یہ فریب کیا، اُدھر اپنے باپ رقیب سے جا لگائی اور حُسن اور دل کے کرتوتوں کی ساری کیفیت سُنائی۔ وہ سُن کر بہت برافروختہ ہوا۔ شہر دیدار میں آیا اور دل کو بندی خانے سے نکال شہر سگ سار میں لے گیا۔ وہاں ہجر نام کا ایک کوٹ تھا، اسی میں قید کر دیا۔ دل بے چارہ سخت پریشان اور جینے سے بے زار تھا، تمام حالات سے بے خبر، جی ہی جی میں یہ کہتا تھا کہ مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی کہ حُسن نے یہ ستم مجھ پر ڈھایا ہے ؛

نہ معلوم غیر کے دل میں کیا آئی شاید دل کے حال پر ترس آیا کہ اس نے حسن کو ایک خط لکھا اور اصل واقعہ کہ سنایا کہ دل غریب بے گناہ ہے اصل قصور میرا ہے، میں تیری صورت بنا کر اس سے ملی، اُسے کیا خبر تھی کہ یہ دغا بازی ہے بے خبر مست پر پاداش لازم نہیں، وہ عاشق صادق ہے اس پر غصہ درست نہیں۔ اس رقعہ کا مضمون پڑھ کر حُسن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، ہوش و حواس جاتے رہے، بال نوچنے لگی سینہ کوٹنے لگی اور اپنے کیے پر بہت نادم ہوئی۔ اسی وقت دل کو اشتیاق بھرا خط لکھا جس میں اپنے فراق اور غیر کی شکایت لکھی اور ہزاروں قسمیں دے کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دلایا خیال کے ہاتھ یہ رقعہ دل کو بھیجا۔ جب یہ نامۂ شوق دل کو پہنچا تو وہ بھی بے تاب ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے جواب میں لکھا کہ تیرا اس میں کوئی قصور نہیں یہ سارا فساد غیر کا ہے میرا دل تجھ سے صاف ہے، وہی محبت وہی چاہ ہے۔ تو اگر مجھے داروئے بے ہوشی نہ پلایا کرتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا، خیر جو ہوا سو ہوا۔

اب دُوسری طرف کا حال سنیے عقل بادشاہ شکست کھا کر شہر بدن میں آیا اور مارے شرم کے کہیں چھپ رہا۔ اور صبر جو عقل کا سرِ لشکر تھا وہ بھاگ کر شہر ہدایت میں آیا اور ہمّت کو اپنی بدبختی اور مصیبت کی ساری داستان سنائی۔ ہمت نے بہت رنج و افسوس کیا اور کہا کہ عقل کا مجھ پر بہت حق ہے، شرط دوست داری یہ ہے کہ اب عقل اور دل کی خبر لوں، نہ معلوم ان بدنصیبوں پر کیا گزر رہی ہوگی یہ کہہ کر تلوار ہاتھ میں لی اور اپنا لشکر ساتھ لے کر شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا۔ رستے میں جہاں جہاں پہنچتا عقل اور دل کا حال پُوچھتا جاتا۔ چلتے چلتے قامت کے بوستاں میں آیا۔ قامت نے کہا، اے ہمّت تو نے خوب کیا، تجھ پہ ہزار رحمت سچّے اور وفادار آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب اس نے بیان کیا کہ دل ایک

سال ہوتا ہی ہجراں کے کوٹ میں بند ہی۔ عقل شہر بدن میں پڑا ہی۔ عشق سے جیتنا مشکل ہی اس سے مل کے رہنے ہی میں مصلحت ہی۔ اب صرف ایک تدبیر ہی کہ عشق کو سمجھا بجھا کر کسی طرح منایا جائے۔ عشق بہت بڑا بادشاہ ہی اگر اس سے التجا کی گئی تو ضرور مان جائے گا۔ اس سے صلح کیے بغیر گزر نہیں۔ ہمت کو یہ مشورہ بہت پسند آیا[1] اور اسی وقت اپنا لاؤ لشکر چھوڑ عشق کی خدمت میں پہنچا۔ اس کی بہت مدح وستایش کی۔ عشق نے بھی اس کا احترام کیا اور شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔ ہمت نے پھر موقع دیکھ کر عقل اور دِل کا ذکر چھیڑا اور ان کی طرف سے ایسی وکالت کی کہ عشق راضی ہو گیا اور یہ قرار پایا کہ عقل عشق بادشاہ کی وزارت قبول کرے۔ عشق کے بعد سب سے بڑا رتبہ اسی کا ہو گا۔ عشق بادشاہ اور عقل وزیر ہوا تو کام خاطر خواہ چلے گا۔

اس کے بعد عشق نے اپنے سر لشکر مہر کو حکم دیا کہ شہر بدن جا کر عقل کو تسلی اور دلاسا دے اور عزت وحرمت کے ساتھ یہاں لائے۔[2] مہر جس قدر جلد ہو سکا شہر بدن پہنچا اور عقل سے ملاقات کی۔ عشق نے جو کہا تھا حرف بہ حرف بیان کیا اور سب اونچ نیچ سمجھائی اور کہا کہ کسی طرح کی فکر نہ کر۔ تیرے اقبال نے زور کیا ہی وہاں جانے کے بعد سب خرخشے دور ہو جائیں گے اور تو امن و آسایش اور بلند اقبالی کے ساتھ رہے گا۔ عقل نے یہ سمجھ کر کہ اب حکومت و دولت جا چکی ہی، یار دوست، مشیر اور مصاحب سب نے منھ موڑ لیا ہی، مصلحت یہی ہی کہ عشق کی بات مان لی جائے۔ غرض اس نے عشق کا فرمانا قبول کیا اور مہر

---

[1] 'دستورِ عشاق' میں یہ قامت کا مشورہ نہیں بلکہ ہمت کی اپنی رائے ہی۔

[2] 'دستورِ عشاق' کی روایت سے عقل لڑائی میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور قید میں تھا اس لیے اس میں مہر کو حکم دیا گیا کہ اُسے قید سے نکال کر شہر بدن میں لے جائے اور پھر ہمارے پاس لائے۔

کے ساتھ عشق کے حضور پہنچا۔ عشق بھی اس سے بڑے احترام اور عزّت کے ساتھ پیش آیا گلے سے لگایا اور ہر طرح خاطر جمع کی اور کہا کہ میں بادشاہ تو وزیر، ملک اور حکومت تیرے سپرد ہے، مجھے ملک داری سے کیا واسطہ، جو تو مناسب سمجھے، کر۔

غرض جب عقل عشق بادشاہ کا وزیر ہو گیا تو عشق نے ہمّت سے کہا کہ دل کو ہجراں کے کوٹ سے چھڑا کر میرے سامنے حاضر کر اور اس کے پاؤں کی بیڑیاں نکال کر رقیب کے پاؤں میں ڈال اور غیر کو جو اس کی بیٹی ہے ایسی جگہ قید کر کہ وہاں سے نکل نہ سکے۔ ہمّت سلام کر کے روانہ ہوا اور دل کو ہجراں کے کوٹ سے لڑ جھگڑ کر باہر لایا اس کی بیڑیاں رقیب کے پاؤں میں ڈالیں اور غیر کو بھی ایک مکان میں بند کر دیا اگرچہ اس پر اس کا دل دُکھا لیکن حکم کی تعمیل واجب تھی۔ غیر نے جیسا کیا تھا ویسا پایا۔ اس کے بعد ہمّت دل کو عشق کے پاس لایا اور عشق کو دل سے ملایا۔ سب ایک دُوسرے کے گلے ملے۔ آخر عقل اور عشق نے باہم مشورہ کر کے یہ ٹھیرایا کہ حُسن کا دل سے عقد کر دیا جائے۔ القصّہ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور دونوں کی مراد بر آئی۔ گھر گھر عیش و عشرت کا سماں تھا اور خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔

ایک روز دل اور ہمّت اور نظر تینوں، شراب پیے رخسار کے گلزار میں پہنچے۔ وہاں آبِ حیات کا چشمہ دہن دیکھا۔ وہاں ایک پیر سبز پوش یعنی خضر آئے۔ ہمّت نے دل سے کہا کہ اس پیرِ روشن ضمیر کی قدم بوسی کر اور اس بزرگ کی دعا لے۔ دل دوڑ کر قدم بوس ہوا، ادب سے نزدیک بیٹھا خضر نے آنکھوں آنکھوں کے اشاروں میں سب راز کھول دیا اور دل خضر کے فیض سے اپنے دل کی مراد کو پہنچا۔ حسن اور دل رہے سہے، پھولے پھلے، بال بچے والے ہوے۔ ان کا سب سے بڑا فرزند یہ کتاب ہے جو اپنے وقت کا

افلاطون ولقمان ہے، روشن ضمیر، صاحب تدبیر ہے۔ جو کوئی صاحبِ نظر ہوگا اسے یہ سخن بھائے گا اور قدر کرے گا ۞

یہ ہے سارے قصّے کا لبِّ لباب۔ عقل وعشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے۔ یہ مہابھارت اور جرمن جنگ سے بھی کہیں زیادہ ہول ناک ہے۔ یہ عالم گیر جنگ ہے جو ہر آن ہر ساعت اور ہر مقام پر برپا ہے اور ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے اور نہ جذبات ہی جذبات۔ اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا اور اگر صرف جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنون ہو جاتا۔ کاش وہ کچھ ہوتا ایک ہوتا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں فتنے موجود ہیں عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف اور دونوں کے رستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں۔ عقل اسے بے راہ روی سے ٹوکتی اور اعتدال کے حدود میں رکھنا چاہتی ہے، عشق جو ہر حد سے آزاد ہے اور جس کے ہاں اعتدال ایک بے معنی لفظ ہے اسے اس تنگ نائے سے نکال کر محبت و جنون کی وسیع اقلیم میں لے جانا چاہتا ہے۔ عقل اسے دنیاداری سکھاتی اور دنیا میں سلیقے اور ہوش مندی سے رہنا بتاتی ہے، عشق دنیا اور دنیاداری کو ٹھکراتا ہے اور اسے ایک ایسے عالم میں پہنچانا چاہتا ہے جہاں نہ تن بدن کی خبر ہے نہ ہوش و حواس کی، جہاں نہ اپنے کی فکر ہے نہ پرائے کی۔ انسان اس دوراہے میں آکر حیران وششدر رہ جاتا ہے اور ایک عجیب کش مکش میں پڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کے ہاتھ پانو بھول جاتے ہیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔

ان دونوں کی ضد میں یہ بے چارہ مفت میں پس جاتا ہے۔ جب توفیق یاوری کرتی ہے تو ایسے نازک وقت پر ہمت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول

ڈال کر لڑاکوؤں کو سمجھانا بجھانا شروع کرتی ہے۔ عشق پر معمولی پند و نصائح کا اثر کیا ہوسکتا ہے اس لیے وہ اسے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایسا لبھاتی ہے کہ وہ صلح پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صلح میں راہِ مستقیم ہے۔ اسی رستے کے چلنے والوں میں کبھی کبھی انسان کامل نظر آجاتے ہیں۔

فتاحی نے اس رزمیہ مثنوی کو بڑی خوبی سے لکھا ہے۔ زبان شستہ، بیان بہت پاک صاف، خیالات اعلیٰ، اشعار میں چستی اور روانی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ صنایع بدایع کا دلدادہ ہے جیسا کہ اس کی دوسری تصانیف سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس مثنوی میں وہ کہیں اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھتا، سوائے ان دو رقعوں کے جو حُسن نے دل کو اور دل نے حُسن کو لکھے ہیں ان میں البتہ اس نے پوری کسر نکالی ہے اور سارے صنایع بدایع ختم کر دیے ہیں۔ رزم کے علاوہ جہاں کہیں بزم کا موقع آیا ہے تو اسے بھی ویسی ہی خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ تو مثنوی کی ظاہری خوبیاں ہیں لیکن وہ باطنی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔ اس نے عقل و عشق اور حُسن کے اعوان و انصار، اُن کے شہروں کے نام، ان کے سر لشکر اور مصاحبوں وغیرہ کے نام تجویز کرنے میں بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ مثلاً عقل کا بیٹا دل، عشق کی بیٹی حُسن، عقل کا شہر بدن اور عشق یا حُسن کا شہر دیدار، عقل کا سپہ سالار صبر اور عشق کا مہر، عقل کا وزیر وہم، دل کے ساتھی نظر، ناموس، توبہ وغیرہ، حُسن کے ساتھی ناز، غمزہ، عشوہ، زلف، خیال وغیرہ۔ اس طرح قصر وصال اور قلعۂ ہجراں وغیرہ یہ سب نام بڑی مناسبت کے ساتھ تجویز کیے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیسا موقع اور محل ہے اُسی کی مناسبت سے ساری گفت گو اور تمام مصلحتیں عمل میں آئی ہیں اور اس معاملے میں وہ بہت کم غلطی کرتا ہے۔ فتاحی شاعر ہی نہیں حکیم بھی ہے۔ جہاں جہاں اس نے موقع سے بعض حکیمانہ

باتیں لکھی ہیں وہ بڑی خوبی سے ادا کی ہیں اور وجہی کی طرح بے جا طوالت نہیں دی ہے۔ تعجب ہے کہ اگرچہ اس مثنوی کی تقلید ترکی اور ہندستان و دکن میں کی گئی لیکن یہ مشہور نہ ہونے پائی۔ حال آں کہ یہ اپنے لطفِ بیان اور خوبیٔ مضمون کے لحاظ سے بڑے پایے کی مثنوی ہے ؀

وجہی نے اگرچہ پورا قصہ فتاحی سے لیا ہے لیکن جہاں کہیں قصے کی واردات میں اختلاف کیا ہے وہیں اس سے غلطی ہوئی ہے۔ بعض خاص اختلافات کا تو میں ذکر کر چکا ہوں، لیکن دو ایک اور اختلافات بھی ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو قصے کی پہلی سطر اور پہلے جملے میں ہے۔ وجہی قصہ یوں شروع کرتا ہے: "ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان۔" 'دستورِ عشاق' میں سیستان کی جگہ یونان ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کی مملکت کے لیے یونان سے زیادہ اور کون سا ملک ہے ؀

نظر جب حُسن کی بارگاہ میں پہنچتا ہے تو فتاحی نے اس موقع پر ان دونوں کا بہت ہی دل چسپ اور پُرلطف مکالمہ لکھا ہے۔ حُسن نظر کی اہلیت اور لیاقت دیکھنے کے لیے مختلف قسم کے سوال کرتی ہے، اور نظر اُسے جواب دیتا ہے۔ سوال و جواب دونوں برجستہ اور مختصر ہیں اور بڑے اچھے انداز میں بیان کیے ہیں۔ 'سب رس' میں یہ پُرلطف چیز نہیں ہے ؀

نظر اور غمزہ جب توبہ کو شکست دے کر شہر عافیت میں قلندروں کا بھیس بدل کر ناموس کے ہاں پہنچے ہیں تو وجہی لکھتا ہے کہ "ناموس بادشاہ انوکوں دیکھتیچ مال ملک سب چھوڑیا، کچھ نہ لوڑیا، قلندر ہوا، سمندر ہوا، فقیر ہوا، بے تدبیر ہوا۔ یہ بات بالکل خلافِ قیاس ہے کہ دو قلندروں کو دیکھتے ہی ناموس بادشاہ فوراً قلندر ہو جائے۔ فتاحی سے ایسی چوک نہیں ہوئی۔ غمزہ ناموس

کی خدمت میں پہنچ کر معارف و حقائق کی ایسی پُراثر باتیں کرتا ہے کہ ناموس کا دل دنیا کے مال و دولت سے اُچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ تاج و تخت چھوڑ کر قلندر بن جاتا ہے۔ اس سے ایک اور ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ وجہی نے "دستورِ عشاق" نہیں دیکھی تھی اس کی نظر سے صرف نثر کا خلاصہ گزرا تھا۔

ایک دوسرا اختلاف وہاں پایا جاتا ہے جب ہمت عقل کی خیر خواہی اور دل سوزی میں دیارِ عشق میں جاتا ہے اور بادشاہ سے ملتا ہے۔ وجہی نے اس ملاقات کا جو ذکر کیا ہے اس میں نہ کوئی بات خلافِ قیاس ہے اور نہ بے موقع۔ حسب معمول ملاقات ہوتی ہے تو موقع پا کر ہمت عقل اور دل کا ذکر چھیڑتا ہے اور اس ڈھنگ سے عشق کو سمجھاتا ہے کہ وہ راضی ہو جاتا ہے اور بس۔ لیکن یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ کیا کہتا ہے اور وہ کیا جواب دیتا ہے اور آخر کن باتوں سے اسے رام کرتا ہے۔ کیوں کہ جو شخص اتنی اہم سفارت پر جا رہا ہے اس سے ضرور یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ ایسے نازک موقع پر اپنی لسانی اور حکمت عملی کے جوہر دکھائے گا۔ فتاحی زیادہ موقع شناس اور آداب داں ہے۔ وہ اس سارے واقعے کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے کہ جب وہ عشق کے شہر میں پہنچتا ہے اور عشق کو اطلاع ہوتی ہے تو اُسے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دیتا ہے یہاں وہ دربار کی شان و شوکت بیان کرتا ہے۔ عشق نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ آدمی قابل اور معزز ہے۔ اسے بیٹھنے کا حکم دیتا ہے اور سفر کی کیفیت پوچھتا اور مزاج پُرسی کرتا ہے (وجہی کی طرح نہیں کہ دربار میں پہنچا تو جھٹ بادشاہ نے ہمت کو گلے لگا لیا) اس کے بعد ایک قصرِ بلند میں ٹھیرانے کا حکم دیا اور مہر کو مہمان داری کے لیے مقرر کیا۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ اسے بزمِ خاص میں بلاتا ہے۔ ہمت خلوت میں پہنچنے کے بعد عشق کی مدح و ثنا کرتا ہے اور اس کی بزرگی و فضیلت اور اس کے سطوت و شان کا بیان کرتا ہے اور آخر میں دلی

زبان سے یہ کہتا ہے کہ خلف باغ خلافت کا نخل ہے اور وہ نہیں ہے اگرچہ بادشاہ کے گنجینے میں ایک ایسا گوہر ہے (یعنی بیٹی) جو سزاوار تاج ہے تاہم اس کے لیے بر کی ضرورت ہے اور یہ پیوند اس کی شان کے شایاں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ میوہ اصل میں ہزار شیریں ہو پیوند سے وہ شیریں تر ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس نے بادشاہ کے دل کی کہی کہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھنے لگا کہ تم بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہو، تم ہی بتاؤ کہ ایسا بر کہاں مل سکتا ہے۔ اب اسے دل اور عقل کا واقعہ بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ غرض سوال و جواب کے بعد عشق یہ کہتا ہے کہ ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ عقل بادشاہ ہے اور اس کا ملک آباد اور لشکر توانا ہے لیکن میں اس کے نسب و اصل سے واقف نہیں اور جب تک یہ معلوم نہ ہو اس کے ہاں رشتہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں ہمت کہتا ہے تاریخ میں ایسا آیا ہے کہ پہلے جس نے اس عالم کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک فتح کیا وہ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا جس کا نام فرد تھا اور دنیا میں اس کے عدل و انصاف کی بڑی شہرت تھی۔ ایک کو تو اس نے مشرق کی حکومت دی اور دوسرے کو مغرب کی اور خود دنیا چھوڑ کر کوہ قاف کے غاروں میں چلا گیا۔ ان دو کی نسل چلی اور ایک مدت کے بعد اس کی نسل سے دو اور شہزادے ہوئے اور ان میں سے ایک کی نسل عقل اور دوسرے کی نسل عشق بادشاہ۔ یہ سن کر عشق بادشاہ اچھل پڑا اور کہنے لگا اوہو، ہم اور وہ ہم جد ہیں، کیا اچھا ہو کہ اب ہم پھر مل جائیں۔ پھر کیا تھا عقل اور دل قید سے رہا ہوئے عزت و احترام سے لائے گئے اور اپنی اپنی مراد کو پہنچے۔

بعض بہت خفیف سے اختلاف اور بھی ہیں لیکن وہ قابلِ ذکر نہیں۔ لیکن جن چند اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے اس سے فتاحی کی ذہانت اور طباعی کا

اندازہ ہوتا ہے۔ وجہی کو اگر یہ اصل کتاب مل جاتی تو یقین ہے کہ وہ ضرور ان تمام امور کو اسی نہج سے بیان کرتا۔

ایک بات البتہ بڑے مزے اور حیرت کی یہ ہے کہ وجہی نے کتاب کی ابتدا میں بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ڈھنگ اسی کا ایجاد کیا ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "غرض بھوت نادر باتاں بولیاں ہوں، دریا ہو کر موتیاں رولیا ہوں، موتیاں کے موجاں کائیں دریا ہوں، تمام موتیاں سوں بھریا ہوں ......... یو کتاب عجائب بند رہی اگر سورج منگتا دگر چندر ہے۔ فرہاد ہو کر دونوں جہاں تے آزاد ہو کر، دانش کے تیشے سوں پہاڑ اُلٹایا تو یہ شیریں پایا، تو نوی بات پیدا ہوئی تو اس باٹ آیا"۔

ناداں اپنی باتاں میں یو بی ایک باٹ کر جانتے، ولے یو باٹ کیوں کاڑی کس وضع سوں نکلی محنت نیں سمجھے مشقت نیں پہچانے، انو کوں نیں کتے زبان اور، یو بولنے جا اور ......... دانا ہمنا رہنما کرے گا ہادی ہو کر پہچانے گا۔ یہ باٹ نہ تھی سو نکلی آنال، تو بھی یکایک چلنی محال"۔

آگے چل کر لکھتا ہے : "یہ بات نہیں یو تمام وحی ہے الہام ہے"......

اس کے بعد اور ایک جگہ لکھتا ہے :

"جکوئی اچایا بنیاد، اوّل آخر وہی اُستاد"۔

غرض اس دعوے کو وہ بار بار طرح طرح سے جتاتا ہے اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ قصّے کا یہ نیا ڈھنگ اس کا نکالا ہوا ہے تو یہ صریح غلط ہے لیکن اگر اس سے یہ مراد ہے کہ تحریر کا یہ اسلوب اُردو زبان میں اس کا ایجاد ہے تو بے شک صحیح ہے۔ لیکن اس سے زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ وہ بار بار یہ بھی کہتا ہے جو اسے موجد اور رہنما اور اُستاد نہیں مانتا وہ جاہل، کمینہ اور چور ہے۔ مثلاً لکھتا ہے کہ "جکوئی باٹ ہماری چلیا وہ ہمارا چ ہے۔ ہر چند فہم داری ہے، چلیا تو کیا ہوا باٹ

ہماری ہے۔ اگر نکتہ کسی۔نے کچھ جانیا، ہم ظاہر ہم باطن اسے نہیں مانیا، تو دو مسلماں نہیں، اُسے ایمان نہیں۔ ایسے سے ڈرنا، بھوت بھوت پرہیز کرنا۔ یوبی ایک چوری ہے، یوبی ایک حرام خوری ہے۔ نمک برحرام، اس کا کیا اچھے گا خام۔ جیسے انصاف کی نہیں سکت، اُسے دل کا ویچ ہیں انپڑے لت۔ جنے انصاف چھپایا، آنے دل کو بے دل کیا کام گنوایا"۔

اس لیے وہ بہت دُور تک کہتا چلا گیا ہے اور اس کا کہنا بالکل درست ہے۔ جو کوئی کسی خیال، کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد ہے اس کا احسان ماننا ضرور ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے اس کا اعتراف کرنا لازم ہے لیکن وجہی کے منہ سے یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس نے سارا قصہ شروع سے آخر تک فتاحی سے لیا اور کہیں اس کا اقرار نہیں کیا اور یہی نہیں بلکہ تحریر کا اسلوب بھی اسی سے اُڑایا ہے۔ یہ مانا کہ وہ فارسی میں ہے اور یہ دکنی میں۔ ایسی حالت میں وہ اخلاقی فرض اور انصاف جس کی تلقین وجہی نے اس طمطراق سے کی ہے کہاں باقی رہا۔ وہ کس منہ سے یہ توقع کر سکتا ہے کہ آیندہ اس رستے پر چلنے والے اُسے موجد مانیں گے اس کی تقلید کرنے والے اسے استاد سمجھیں گے۔ یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ دیگراں را نصیحت خود را فضیحت۔

باوجود اس کے ہم وجہی کو استاد مانتے ہیں اور جو کام اس نے کیا ہے اس کا احسان نہ ماننا حقیقت میں ناانصافی ہے۔ اُس زمانے میں اردو نثر کا نام نہ تھا اور نہ نثر لکھنا کوئی کمال کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ایک دو رسالے جو اس کے قبل کے پائے جاتے ہیں سو وہ اس قابل نہیں کہ محفلِ ادب میں جگہ پائیں 'سب رس' اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔

اور اس کی فضیلت اور تقدّم کو ماننا پڑتا ہے۔ نثر میں قافیے کا التزام بہ ذاتِ خود ایک ایسی چیز ہے کہ تکلّف اور آورد سے بچنا محال ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس پابندی کی وجہ سے بعض بعض مقامات پر عبارت محض تک بندی ہو کے رہ گئی ہے اور ادائے مطلب میں بھونڈا پن نظر آتا ہے اور جو کوئی بھی اس قسم کی پابندی اپنے اوپر عائد کرے گا وہ اس سے نہیں بچ سکتا لیکن اس سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس میں بے حد فصاحت، روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ حال کے زمانے میں جو اسی ڈھنگ پر بعض کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً 'فسانۂ عجائب' وغیرہ ان سے یہ کسی طرح کم نہیں بلکہ میری رائے میں بیان کی سادگی میں اُن سے بڑھ کر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان قدیم ہے اور پُرانے الفاظ اور محاورات آج کل سمجھ میں نہیں آتے، لیکن اس میں مصنّف کا قصور ہے اور نہ اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی حرف آسکتا ہے۔ اس نے اپنے زمانے کی نہایت بامحاورہ اور فصیح زبان لکھی ہے۔ چناں چہ وہ خود بھی کہتا ہے اور اس سے ہمیں کامل اتّفاق ہے؛

"آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندستان میں ہندی زبان سوں
اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملاکر گلا کر نہیں بولیا"۔

دیکھیے کہ وہ اپنی زبان کو دکنی نہیں ہندی کہتا ہے۔ قصّے کے شروع میں بھی وہ "آغازِ داستان زبانِ ہندستان" لکھتا ہے جگہ جگہ نہایت بے تکلفی سے ہندی، دکھنی، فارسی، عربی، مرہٹی ضرب الامثال، دوہرے اور اقوال، اشعار، آیت، حدیث روانی میں لکھتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ وجہی گول کنڈہ کا ہے اور گول کنڈہ اور حیدرآباد تلنگانے میں ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ مرہٹی مثل تو ایک جگہ لکھتا ہے اور ایک آدھ گجراتی لفظ اور شعر بھی استعمال کرتا ہے مگر کہیں تلنگی مثل یا

فقرہ یا لفظ (سوائے درادرائی کے جس کے متعلق ابھی مجھے شبہ ہے) اس کتاب میں نہیں آیا۔ اہلِ ہند سے مراد مصنف کی ہمیشہ شمالی ہند والے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے" بہ قولِ اہلِ ہند پیاسا کیا منگتا پانی" اسی طرح جب اہلِ دکن کی مثل یا قول کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو لکھتا ہے" حوں دکن میں چلیا ہے" (صفحہ ۱۳۶) یعنی جیسا کہ دکن میں مشہور ہے یا "مثلاً ہے دکن میں" (صفحہ ۱۵۶) یا دگنی دوہرا (صفحہ ۲۲۶) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف شمالی ہند اور دکن کی زبان میں فرق کرتا ہے اور یہ پہلا شخص ہے جو اس زبان کو زبانِ ہندستان کہتا ہے اور یہ اشارہ کافی ہے اس امر کے لیے کہ یہ زبان کہاں سے آئی۔ یہی کتابیں ہیں جو زبان کے محقق اور مورخ کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔

اس کے بیان میں ایک نقص ضرور ہے کہ ملا صاحب نے جگہ جگہ پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے اور کہیں کہیں تصوف کے اسرار جواب معمولی باتیں ہو گئی ہیں بیان کرنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ دس پانچ سطریں لکھ دیں بلکہ صفحے کے صفحے رنگ دیے ہیں۔ باتیں معقول ہیں، صاف ستھری ہیں، نصیحتیں کام کی ہیں، بیان اچھا ہے لیکن قصے میں جب وعظ شروع کر دیا جائے تو قصے کا لطف کم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کو اُلجھن ہوتی ہے۔ مثلاً قصے کی پہلی سطر یہ کہ "ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان، اس سیستاں کے بادشاہ کا نام عقل" پس عقل کا نام آنا تھا کہ غضب ہو گیا، کئی صفحے رنگ ڈالے ہیں، عقل کے کارنامے اس کے فیوض و برکات اور نہ معلوم کیا کیا بیان کر ڈالا ہے۔ شہزادہ دل کی شراب نوشی کا ذکر آیا تو شراب نوشی کی تعریف اور بادشاہوں کے لیے مکر و ریا کے مقابلے میں اس کے جواز پر بحث شروع کر دی ہے۔ عشق کے مقام پر عشق پر گفت گو چھیڑ دی ہے، کہیں حیا کی مدح اور سوال

کرنے کی مذمت میں، کسی جگہ آبِ حیات کی خاصیت اور تعریف میں کہیں طمع کی برائی میں، کسی مقام پر ہمت کی تعریف میں، کسی جگہ عشق، عاشق اور معشوق پر طویل بحثیں شروع کر دی ہیں۔ اسی طرح مصیبت، فقر اور صبر، خواب، لڑائی، بہادری، مشیروں اور مصاحبوں کے انتخاب، عورت کی محبت، سوکن کے جلاپے، عشق کی قسموں اور بادشاہت کے فرائض وغیرہ پر اپنے خیالات بے تکلف لکھتا چلا گیا ہے۔ اگر ان تمام غیر متعلق مباحث کو نکال لیا جائے تو مضامینِ وجہی کی ایک اچھی خاصی دوسری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ فتاحی کہیں اس قسم کی بے اعتدالی نہیں کرتا اس نے قصّے کے تناسب کو بڑی خوبی سے قائم رکھا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ 'سب رس' اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئی اور اس کی قبولیت کی ایک وجہ یہی پند و موعظت تھی جو عام لوگوں کو بہت پسند آئی اور چوں کہ عبارت اس کی مقفّیٰ اور سلیس تھی اس لیے عام و خاص سب اسے شوق سے پڑھتے ہوں گے۔ اس وقت لوگوں کو یہ طول بیانی اس وجہ سے پسند تھی اور اب ہمیں یوں پسند ہے کہ اس میں قدیم زبان کے محقق کے لیے بہت سا سامان موجود ہے:

اس طول بیانی میں جو اکثر پرانے زندہ دل لوگوں اور قصّہ گوؤں اور قصہ نویسوں کی عادت تھی، ایک اور فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اس میں بعض اوقات ضمنی طور پر زمانے کی معاشرت کے متعلق بہت سی کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی کتاب میں جہاں مصنّف عقل، دل یا عشق اور حُسن کے معاملات، ان کے دربار اور تفکرات کا ذِکر کرتا ہے تو ایشیائی حکومت کا ڈھنگ، ان کی حکمتِ عملی، اس زمانے کی تہذیب و تمدّن، اخلاق و معاشرت، اطوار و آداب کا منظر نظر آجاتا ہے۔ وجہی عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا اور دربار سرکار کے حالات سے خوب

واقف تھا، اس واقفیت سے اس نے اپنی کتاب میں خوب کام لیا ہے۔ مثلاً شہزادہ دل کی خاطر اس نے شراب کے جواز کی تاویل میں جو نیم رندانہ نیم صوفیانہ تقریر کی ہے اس سے صاف درباری مصاحبت کا رنگ جھلکتا ہے اسی طرح جب وہ دشمن سے جو کسی، دوسروں سے راز داری، جاسوسی کا بیان کرتا ہے تو گویا اپنے زمانے کے واقعات اور خیالات کا چربہ اتارتا ہے ؛

«سب رس» کی زبان سوا تین سو برس پہلے کی ہے اور وہ بھی دکن کی۔ بہت سے لفظ اور محاورات ایسے ہیں جو اب بالکل متروک ہیں اور خود اہلِ دکن بھی نہیں سمجھتے اس لیے کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ لگا دی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ عربی فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ بھی کس کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک کام کی بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض محاورات اس وقت بھی بعینہٖ اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کل۔ مثلاً شان نہ گمان، چیز کرنا، خالہ کا گھر، کہاں گنگا تیلی کہاں راجا بھوج، گھر کے بھیدی نے لنکا جائے (گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے) شرمِ حضوری، دیکھا دیکھی، چائیں مائیں کھیلنا، سونا ہور (اور) سگند، دودھ کا جلیا چھاچھ پھونک پیتا وغیرہ۔ اس سے الفاظ و محاورات کی تاریخ میں بہت مدد ملتی ہے۔ الفاظ و محاورات کے علاوہ اس کتاب سے قدیم دکنی یا اُردو کی صرف و نحو اور بعض الفاظ کے تغیّر و تبدّل کا پتا بھی لگتا ہے اور اس کی صحیح کیفیت نثر ہی کی کتاب سے معلوم ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر چند باتیں لکھی جاتی ہیں :-

۱ - مذکر مؤنث دونوں کی جمع "اں" سے آتی ہے جیسے ہاتاں، جھاڑاں، کتاباں وغیرہ۔ بھائی کی جمع بھائیاں، غمزہ کی جمع غمزیاں وغیرہ ؛

۲ - ایسے افعالِ متعدی جن کی ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی احتمالی

کے ساتھ "نے" آتا ہو تو فعل ہر حالت میں مذکر ہی استعمال ہوتا ہو، خواہ فاعل مؤنث ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن دکنی میں مذکر کے لیے مذکر اور مؤنث کے لیے مؤنث فعل ہوتا ہو۔ جیسے اس عورت نے کہی، لڑکی نے پانی پی ۔

۳۔ "نے" کا استعمال بہت بے قاعدہ ہو۔ اس حرف کے استعمال کے قواعد حال میں منضبط ہوئے ہیں۔ میر و سودا کے زمانے میں بھی یہی بے قاعدگی پائی جاتی ہو ۔

۴۔ فاعل اگر مؤنث جمع ہو تو اصل فعل بھی جمع ہوگا۔ جیسے "اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دُوسرے کوں اپنا حسن دیکھلانا گناہ کر جانتیاں ہیں، اپنے مرد کو ہر دو جہان میں اپنا دین و ایمان کر پہچانتیاں ہیں۔" شمالی ہند کی پرانی اُردو میں بھی یہی استعمال تھا ۔

۵۔ مؤنث کی صورت میں حرف اضافت کی بھی جمع آتی ہو جیسے "دل کے فائدے کیاں بہت پاتاں ہیں" ۔

۶۔ اسی طرح ایسی، جیسی، جتنی کی جمع "ایسیاں، جیسیاں، جتنیاں" آتی ہو ۔

۷۔ ایسے مصادر کی ماضی مطلق جن میں علامتِ مصدر سے قبل ا یا د نہیں ہوتا اس طرح بنتی ہو کہ امر کے آگے ا بڑھا دیتے ہیں جیسے دیکھنا سے دیکھا۔ لیکن دکنی میں بجائے ا کے یا لگاتے ہیں جیسے دیکھیا، ملیا، بھریا، وغیرہ ۔

۸۔ "سی" مستقبل کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ یہ علامت ہندُستان کی کئی زبانوں میں خفیف تغیر کے ساتھ استعمال ہوتی ہو جیسے "نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نا آسی" ۔

۹ - "کر" کا استعمال - یہ میر امّن کے ہاں بھی پایا جاتا ہی - جیسے" دانا ہمنلہ ہنا کرجانے گا "؛

۱۰ - ضمائر میں بھی کسی قدر تغیّر پایا جاتا ہی - یو، وو (یہ اور وہ کی جگہ) انو (انھوں نے) انو کوں (اُن کو) اُنو کا (اُن کا) ہمنا (ہم کو) جنوں (جنھوں نے) جنوں کو (جن کو) جنوں کا (جن کا) یے (یہ کی جمع کے لیے)؛

۱۱ - الفاظ کے آخر میں "چ" تاکید کے لیے اکثر لگا دی جاتی ہی - جس کے معنی عموماً "ہی" کے ہوتے ہیں جیسے "خدا منا کیا سو برے فعلانچ خاطر - یونچ (یونچہ) یار کوں یار کنتے"؛

۱۲ - مانگنا بہ معنی چاہنا - یہ استعمال اکثر انگریزوں کی زبان سے سُنا گیا ہی اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ انھیں کا ایجاد ہی، لیکن قدیم دکنی اردو میں یہ لفظ انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہی - انگریز نے بھی اوّل اوّل مدراس سے سیکھا جیسے "اگر منگتا ہی دل میں محبت بھرے شراب پی - اگر کچھ اُنچا چڑنے منگتا ہی تو شراب پی"؛

۱۳ - الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی کچھ زیادہ خیال نہیں - مثلاً شراب، خبر، صورت، دنیا کو مذکر لکھا ہی ؛

۱۴ - اکثر عربی الفاظ کے املا کو سادہ کر دیا ہی یعنی جس طرح بولتے ہیں ویسے ہی لکھ دیے ہیں - جیسے نفع کو نفا، وضع کو وضا یا وزا، واقعہ کو واقا، منع کو منا، طمع کو طما، معاملہ کو مالمہ، معنے کو مانا - چناں چہ طما (طمع) کا قافیہ جا اور مانا (معنی) کا کھانا لکھا ہی - ایک جگہ پیاس اور میراث کا قافیہ باندھا ہی - ایسا دکنی میں اکثر ہوتا ہی - ان کے ہاں قافیے کی بنیاد صوت پر ہی ؛

۱۵ - اردو کے جس لفظ میں دو ڈالیں یا ایک ڈا اور ٹ ہوتی ہی تو دکنی میں پہلی

ڈال دال بولی جاتی ہے۔ جیسے ڈھونڈھ کو دھونڈھ، ڈانٹ کو دانٹ کہیں گے۔ یہ تلفظ اب بھی یوں ہی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دو "ڑ" یا دو "ٹ" ایک لفظ میں قریب قریب ہوتی ہیں تو وہاں بھی پہلی ڑے رے اور ٹے تے ہو جاتی ہے۔ جیسے تُٹیا، مروڑ ؎

۱۶۔ اُردو میں اکثر الفاظ کا تکرار ہوتا ہے اور یہ تکرار خاص معنی پیدا کرتا ہے، جیسے گھر گھر، در در وغیرہ۔ قدیم دکنی اُردو میں ان دو کے درمیان "ے" کا اضافہ کرتے تھے۔ جیسے گھرے گھر، درے در، ٹھارے ٹھار، رگے رگ وغیرہ کبھی ے کی جگہ "ین" استعمال کرتے ہیں جیسے گھریں گھر؎

مَیں اس ضمن میں یہ لکھنا بھول گیا کہ دکن کے چار اور شاعروں نے بھی اس قصّے کو اپنی زبان میں لکھا ہے اور چاروں منظوم ہیں۔ ایک تو "ذوقی" ہیں جن کا نام شاہ حسین اور لقب "بحرالعرفان" ہے۔ انھوں نے 'حسن و دل' کو سنہ ۱۱۰۹ھ میں نظم کیا اور 'وصال العاشقین' نام رکھا۔ دوسرے "مجرمی" شاہ بیر اللہ ہیں جو بیجاپور کے رہنے والے تھے، انھوں نے اپنی مثنوی سنہ ۱۰۸۶ھ میں نظم کی۔ اس کا نام 'گلشنِ جشنِ دل' ہے۔ یہ دونوں وجہی کے خوشہ چیں معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اس کا کہیں اشارہ نہیں کیا۔ ان دونوں کا ذکر مَیں الگ لکھ چکا ہوں (ملاحظہ ہو 'اُردو'، جلد پنجم ص ۴۹۹ و صفحہ ۵۰۲)

سیّد محمّد ولی اللہ قادری ساکن حیدرآباد نے ایک مثنوی چار سو پچاس بیت کی 'سب رس' کے نام سے لکھی ہے۔ شروع کے تین شعروں میں حمد و نعت لکھ کر پرت (یعنی محبّت) کی تعریف میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

اتا میری سنو یک بات یاراں　　تپستاں ہو پچھیں آیا تھا یاراں

مویاں کوں پھر جلایا تھا خدا تے          ہوئی تھی قادری سب جا پچھانے
ہر یک سبزا اُتّھا اپنے خدا کی          کھڑا کرتا اتھا ہر یک دعا کی
ہوا یو واقعہ شہرِ بدن میں          اتھا مَیں اس وقت ملکِ دکن میں

یہ تماشا دیکھتا چلا جاتا تھا کہ ایک نورانی صورت نظر آئی مَیں نے اس کا نام پُوچھا تو کہا کہ میرا نام 'سب رس' ہے کیوں کہ مجھ میں طرح طرح کے ہزار وں رس بھرے ہیں۔ وہ مجھ سے بڑی مہربانی اور شیریں زبانی سے باتیں کرتی رہی۔ اور کہا کہ مَیں آج تجھے وہ چیز دیتی ہوں جو اب تک کسی کو نہیں دی ہے

رکھی ہوں چیز یک من میں چھپاکر          کہ جیوں رکھتے خزینہ نا دکھاکر
اجھوں لگ مَیں کسی کوں میں دئی ہوں          مگر تیری نذر دو مَیں کری ہوں
عطا کرتی ہوں تجھ پر ای ادب دار          دسیا جو تو، منجھے اس کا خریدار
دو سو ہے راز میرے سب جنم کی          حکایت ہے مری شادی و غم کی
عجائب پُر نزاکت ہے حکایت          سلوک ہے ہور مجازی ہور حقیقت
دلی یو یات تو جس کو سناوے          ہنساوے کئیں اوسے کئیں تو رولاوے
توں اس قصّے کو میرا ناؤں کہناں          دیا رکھ ناؤں اس کا جان جاناں

یہ رُوحِ ناطقہ ہے اور اپنی ساری سرگزشت سناتی ہے کہ مَیں کس طرح ملکِ عدم سے شہرِ بدن میں آئی اور یہاں مجھ پر کیا گزری اور مکروہاتِ دنیا میں پھنس کر عیش وعشرت اور غفلت میں پڑگئی اور اپنی اصل کو اور وعدوں کو بھُول گئی اور اپنے پیا (مالک) سے دُور ہوگئی۔ جب حالت بہت گِر گئی تو اس طرف سے بیم ورجا کے فرشتے میری ہدایت کو بھیجے گئے۔ پھر میں غفلت سے بیدار اور اپنے کیے سے پشیمان ہوئی اور اپنے اصل پیا کی طرف رجوع کی۔ غرض مصنّف نے اس مختصر مثنوی میں اُس سرگزشت کو

بیان کیا ہی جو روح پر اصل سے جدا ہو کر انسانی جسم میں داخل ہونے سے گذرتی ہی ؂

اگرچہ یہ خیال وجہی کی 'سب رس' کے قصّے سے جدا ہی لیکن ہی ماخوذ اسی سے۔ وجہی کی 'سب رس' کا اس میں کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ نظم معمولی ہی۔ کتابت سنہ ۱۱۸۰ھ کی ہی جو تصنیف کے قریب کا زمانہ معلوم ہوتا ہی ؂

دکنی اردو کی ایک اور مثنوی 'حسن و دل' کے نام سے لکھی گئی ہی۔ اس میں پورا قصّہ وہی ہی جو وجہی کی 'سب رس' میں ہی کہیں کہیں خفیف سا تغیّر کیا گیا ہی۔ وجہی نے جو اپنی کتاب میں جگہ جگہ وعظ و نصائح کا دفتر کھولا ہی وہ اس مثنوی کے مصنّف نے حذف کر دیا ہی اور سادہ قصّہ بیان کر دیا ہی ؂

ابتدا میں حمد و نعت میں صرف تین شعر ہیں۔ اس کے بعد قصّہ شروع کر دیا ہی۔ میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں مگر افسوس کہ دونوں آخر سے ناقص ہیں یعنی صرف چند ورق تھیں اس لیے اس کے مصنّف کا نام وغیرہ نہ معلوم ہو سکا۔ زبان اس کی صاف ہی مگر کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ دونوں مثنویاں بارھویں صدی کے اواخر کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ؂

یہ چاروں مثنویاں دکنی شاعروں کی تصنیف ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور مثنوی 'حُسن و دل' کے نام سے خواجہ خیر الدّین المتخلّص بہ خواجہ کی تصنیف ہی۔ یہ ہندُستان (شمالی بھارت) کے رہنے والے تھے۔ اُن کی زبان اس کی صاف گواہی دے رہی ہی۔ علاوہ اس کے اپنی نظموں اور قصیدوں میں اپنے آقا سے وطن جانے کی اجازت طلب کی ہی۔ حیدرآباد دکن میں آکر مقیم ہو گئے ہیں اور نواب میر منوّر علی خاں منوّر الدّولہ منوّر الملک فرزند سکندر جاہ بہادر کے متوسّلین میں سے ہیں چناں چہ اپنی ایک غزل میں لکھتے ہیں :ے

معین ہو یا معین الدین چشتی یہ خواجہ عازمِ ہندوستاں ہی

اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

دکن سے ہند میں مجھ کو بُلا لو مرا جاتا ہوں یا مرشد بچا لو

یا اپنے آقا سے مثنوی کے صلے میں یہ عرض کرتا ہی کہ مجھے خوشی خوشی وطن (ہندُستان) کی اجازت فرمائی جائے۔ حمد و مناجات، نعت، منقبت تقریباً پندرہ صفحے پر ہی اور بیچ بیچ میں مخمس اور مسدس اور مثلث بھی آگئے ہیں۔ اس کے بعد عشق کی شان میں نغمہ سرائی کی ہی۔ اپنے مرشد اور صوفیوں کی ثنا و صفت میں بہت کچھ لکھا ہی۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے بادشاہِ دکن نواب ناصرالدولہ بہادر اور اپنے آقا نواب میر منوّر علی خاں کی مدح اور سبب تالیف کتاب کے بیان میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہی۔ نواب صاحب کی فرمایش پر خواجہ صاحب نے یہ مثنوی لکھنی شروع کی۔ چناں چہ لکھتے ہیں :؎

طبیعت تھی جو ازبس عاشقانہ لکھا ہوں حُسن و دل کا یہ فسانہ

اگرچہ پیش ازیں اس داستاں کو لکھے دکھنی میں استادانِ خوش گو

خصوصاً شیخ ابراہیم ذوقی[1] کیے ہیں کیا ہی موزوں مرد شوقی

لکھے ہیں نثر میں وجدی نے اس کو یہ پر دونوں کی ہی فہمید کس کو

مگر اب تک تو ہندی میں کبھی ہم نہیں دیکھی کبھی واللہ اعلم

چوتھے شعر میں غلطی سے وجہی کی جگہ وجدی لکھ دیا ہی۔ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہی۔ اس کے آخر میں اپنا نام بھی بتا دیا ہی ؎

دعائے خواجہ خیرالدین مسکیں الٰہ العالمیں سو بار آمیں

یہ سب بیان ۷۸ صفحے تک پھیلا ہوا ہی۔ اس کے بعد 'آغازِ داستان'

---

[1] تعجب ہی کہ خواجہ نے ذوقی کا نام شیخ ابراہیم لکھا ہی۔

کا عنوان ہے۔ قصّے کی روداد وہی ہے جو وجہی کی 'سب رس' میں ہے۔ البتّہ کہیں کہیں تفصیلات میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے مثلاً جب عقل کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا فرزند دل حُسن کی محبّت میں بُری طرح مبتلا ہے اور حالت خراب ہے تو صبر کا مشورہ قبول کر کے وہ بادشاہ عشق کے نام ایک نامہ روانہ کرتا ہے اور اس میں حسن اور دل کے عقد کی خواستگاری کرتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ نامہ منزلِ مقصود پر پہنچے اور کوئی جواب آئے بادشاہ کے مصاحب فراست نے کہا کہ صبر نے جو تدبیر بتائی ہے وہ ہے تو اچھّی اور مناسب موقع لیکن اگر اس عرصے میں شہ زادے کی حالت فراقِ حُسن میں خدانہ خواستہ کچھ اور ہو گئی تو پھر کوئی چارہ کارگر نہ ہوگا۔ لہٰذا یہ معاملہ تلوار ہی سے طے ہونا چاہیے۔ وہم نے بھی اس کی تائید کی۔ چناں چہ لشکر کشی کی تیّاری شروع ہو گئی ؛

وجہی نے دل کے والد کا ذِکر نہیں کیا لیکن اس مثنوی میں شروع میں ایک جگہ والد کا بھی ذِکر آ گیا ہے۔ اسی طرح اس مثنوی میں بادشاہ عشق کے وزیر کا نام مہر لکھا ہے اور فوج کے سرداروں کے نام مشقّت خاں، محنت بیگ خاں قزل باش، حسرت بیگ خان بہادر افغان، شیخ استغنا وغیرہ تجویز کیے ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ہیں ؛

جس طرح وجہی نے اپنے قصّے میں جگہ جگہ وعظ و پند کے طومار سے کتاب کا حجم بڑھا دیا ہے، اسی طرح خواجہ صاحب نے بھی موقع بے موقع غزلیں، مخمّس، مسدّس، مثلّث، مسبّع اور تضمینیں لکھ کر کتاب کو طویل بنانے میں کمی نہیں کی۔ مگر ان کی زبان بہت صاف اور اچھّی ہے۔ عاشقانہ مضامین خوب لکھتے ہیں۔ بہت پُر گو اور خوش گو ہیں۔ لکھنے پر آتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں کہیں رُکتے نہیں کلام میں آمد ہے۔ کتاب سنہ ۱۲۶۴ھ کی تصنیف ہے ؛

مدّت ہوئی مجھے 'سب رس' کے دو نسخے دست یاب ہوئے تھے' ایک حیدر آباد میں دوسرا بیجا پور میں۔ ان میں سے ایک تو بہ مقام دولت آباد سنہ ۱۱۱۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا سنہ ۱۱۷۷ھ کا۔ یہ دونوں نسخے صاف لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دو اور نسخے ملے جو ایسے اچھے نہیں تھے اور ایک ان میں سے ناقص ہے۔

اوّل تو قلمی نسخوں کا پڑھنا جن کے رسم خط کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمی ہو جاتی ہے' پھر ایسی پُرانی زبان کا پڑھنا اور سمجھنا جس کے اکثر محاورے اور الفاظ نہ اب بولے جاتے ہیں اور نہ سمجھے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کاتبوں کی اصلاح' یہ ایسی دقتیں ہیں کہ مقابلے' تصحیح اور تحقیق میں بہت وقت صرف ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے میں اتنی دیر ہو گئی۔

# مقدمہ "رانی کیتکی کی کہانی"

سید انشا بلا کے ذہین اور طبّاع تھے، اگر درباری صحبت اور نا روا شوخی اور ظرافت انھیں بے راہ نہ کر دیتی تو وہ اپنا جواب نہ رکھتے۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور جودت کو بُری طرح خراب کیا، اس پر بھی ان کے کلام میں جو جدّت، شگفتگی اور خوشی پائی جاتی ہو وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اُردو زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی بلکہ اس کے پورے نبض شناس اور صحیح سمجھتے اور استعمال کرنے والے تھے، ایک اُردو کیا ہندُستان کی کئی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ آزاد نے خوب کہا ہو کہ ہندُستان کی زبانیں ان کے گھر کی لونڈی ہیں۔ "دریائے لطافت" کہ اس میں بھی انھوں نے شوخی کو ہاتھ سے نہیں دیا، اس کی شاہد ہو؎

یہ کہانی بھی ان کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہو۔ اس میں یہ التزام کیا ہو کہ فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ جو دعویٰ انھوں نے کیا وہ پورا کر دکھایا۔ عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہیں آیا اور پھر لطف یہ ہو کہ آج کل کی سی ہندی بھی نہیں۔ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا، اُردو والا بھی سمجھتا ہو اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں۔ اسی کا نام ہندُستانی ہو۔ یہ بھی ہوشیاری کی ہو کہ قصّہ ہندوانی رکھا ہو جس میں بہت سے ہندی لفظ بے تکلف کھپ گئے ہیں اور ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ قصّے کہانی میں تو ایسی زبان نبھ جاتی ہو (اگرچہ وہ بھی آسان

نہیں) لیکن ادبی اور علمی مضامین ادا کرنے کی اس میں سکت نہیں۔ ہندستانی اگر کوئی زبان ہے یا اگر بنی تو اس کی دَوڑ یہیں تک رہے گی۔ علم و ادب، کے میدان میں اس کا ٹکنا دشوار ہے۔ کہانی میں بعض الفاظ مثلاً کشتیوں اور آتش بازی کے نام ایسے آگئے ہیں جنھیں ہم بھُولتے جاتے ہیں اور آیندہ شاید سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ علاوہ اس کے ہندی کے بعض ایسے خوب صورت تفظ بھی نظر آئیں گے۔ جو آج کل 'اُردو' تحریر میں نہیں آتے۔ انھیں زندہ کرنا اور موقع محل پر کام میں لانا ضروری ہے۔ غرض سید مرحوم کی یہ عجیب یادگار ہے اور اس میں شبہ نہیں یہ بہت قابلِ داد ہے ؛

اس داستان کا ذِکر مدت سے سنتے آتے تھے لیکن ملتی کہیں نہ تھی آخر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی پُرانی جلدوں میں اس کا پتا لگا۔ مسٹر کلنٹ پرنسپل لامارٹن کالج لکھنؤ کو اس کا ایک نسخہ دست یاب ہوا تھا جسے انھوں نے سوسائٹی کے رسالے میں طبع کرادیا۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں ایک حصہ طبع ہوا اور دُوسرا حصہ سنہ ۱۸۵۵ء میں۔ لیکن بہت غلط چھپی تھی مجبوراً اس کی نقل مَیں نے رسالۂ 'اُردو' جلد ششم ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء میں شایع کی اور جہاں تک ممکن ہوا اس کی تصحیح بھی کی۔ 'اُردو' میں شایع ہونے کے بعد میرے عنایت فرما جناب پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے نے ازراہِ کرم اس کا ایک نسخہ جو کبھی لکھنؤ میں ناگری حروف میں چھپا تھا، عنایت فرمایا۔ اس نسخے سے مقابلہ کرکے مزید تصحیح کی گئی اور اب شاید ایک آدھ مقام کے سوا کہیں کوئی لفظ مشتبہ باقی نہیں رہا ؛

میرے شفیق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب پروفیسر الہ آباد یونی ورسٹی نے اسے علاحدہ کتاب کی صورت میں شایع کرنے کی فرمایش کی جس کی تعمیل میں ان چند تمہیدی سطروں کے ساتھ یہ پُر لطف اور عجیب کہانی شایع کی جاتی ہے ؛

# مقدمۂ باغ و بہار

میر امّن کا 'قصۂ چہار درویش' فی الحقیقت باغ و بہار ہے۔ یہ اردو نثر کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں اور شوق سے پڑھی جائیں گی۔ اس کی مقبولیت کا بہت بڑا راز اس کی فصاحت اور سلاست میں ہے ؂

جیساکہ خود میر امّن نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔ یہ "قصّہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری بخش جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلّی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر مٹیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے ان کی طبیعت ماندہ ہوئی تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصّہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی تب انھوں نے غسلِ صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصّے کو سُنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا، جب کہ یہ قصّہ فارسی میں مروّج ہوا ؂

مشہور یہی چلا آتا ہے کہ فارسی 'قصۂ چار درویش'، امیر خسرو کا لکھا ہوا ہے لیکن نہ تو ان کی تصانیف میں کہیں اس کا ذکر ہے اور نہ اس فارسی قصّے میں کہیں اس کا پتا لگتا ہے۔ فارسی نسخے کے شروع میں جو منظوم حمد ہے اس کے مقطع میں

"صفی" تخلص ہے:

"صفی" را زیر بار منت بال ہما مفگن زمشکین طرۂ بخت سیاہش چترِ شاہی دہ

خسرو جیسے زبردست اور پُرگو شاعر سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی دوسرے غیر معروف شاعر کی نظم حمد میں نقل کرتے یہ اُن کی طبیعت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ شبہ اور قوی ہوتا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کا لکھا ہوا نہیں ہے، یہ ممکن ہے کہ انھوں نے حضرت سلطان الاولیاؒ کو بیماری کے زمانے میں یہ قصے سنائے ہوں انھوں نے دعا دی ہو اور اس سے یہ ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو میر امّن کے آخری فقرے سے بھی کہ "جب سے یہ قصہ فارسی میں مروّج ہوا" صاف صاف نہیں معلوم ہوتا کہ یہ فارسی قصہ جو تحریر میں آیا امیر خسرو کی تصنیف ہے بہرحال یہ امر تحقیق طلب ہے:

میر امّن کی "باغ و بہار" اسی کتاب کا ترجمہ کہی جاتی ہے اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں فارسی قصے کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:-

"اب خداوندِ نعمت صاحبِ مروّت نجیبوں کے قدردان جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا، جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹ ہندُستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ قصہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اُردو کی کتاب "نوطرزِ مرصّع" ہے۔ اس کے مولف میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسین اٹاوے کے رہنے والے تھے ان کو فارسی اردو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ وہ بہت اچھے خوش نویس بھی تھے اور اسی بنا پر

ان کا خطاب 'مرصع رقم' تھا۔ علاوہ اس کتاب کے وہ 'انشائے تحسین' 'ضوابطِ انگریزی' اور 'تواریخِ فارسی' وغیرہ کے مؤلف ہیں یہ سب کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ 'نوطرزِ مرصع' کی تالیف کا سبب انھوں نے یوں بیان کیا ہے کہ "ایک مرتبہ نواب مبارز الملک افتخار الدولہ جنرل اسمتھ بہادر صورت جنگ سالار فوج انگریزی کی ہم راہی میں بجرے پر کلکتے کا سفر درپیش آیا خالی بیٹھے بیٹھے دل گھٹنے لگا تو ایک عزیز نے جو ہم راہ تھا یہ قصہ سنانا شروع کیا۔ بہت پسند آیا اور اسی وقت سے 'زبانِ ہندی' میں لکھنے کی دھن لگ گئی کیوں کہ سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہ ہوا"۔ چناں چہ اسی خیال سے لکھنا شروع کیا۔

جنرل اسمتھ چلتے وقت انھیں صوبہ عظیم آباد کی بعض خدمات پر متعین کر گئے۔ وہاں فرصت نہ ملی پھر انقلابات ایسے واقع ہوئے کہ وہاں سے دست بردار ہونا پڑا اور وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ ابوالمنصور خان صفدر جنگ (نواب اودھ) کی سرکار میں پہنچے اور ان کے سایۂ عاطفت میں اس قصّے کو پورا کیا۔ لکھتے ہیں کہ "ایک روز تقریباً دو چار فقرے اس داستان کے کہ اول ذِکر اس بیان کا کر گیا ہوں، بیچ شمع مبارک حضرت ولی نعمت کے پہنچے، ازبس کہ شاہدِ رعنا، اس حکایتِ دل فریب کا جلوہ گری کے عالم میں شوخ و شنگ ہے توجۂ دل سے مقبول خاطر و منظور نظرِ اشرف کے کر کے فرمایا کہ "ازسرتاپا اس محبوب پسندیدہ دل ہا کے تئیں زیورِ عبارت سے آراستہ کر"، اس قلیل البضاعت نے حسب الحکم جلیل القدر کے درخور حوصلہ اپنے اس داستان کے معشوق کو ہلی بندر زیب و زینت کا کر کے چاہتا تھا کہ اس نازنین کے تئیں نظرِ مبارک سے گزرانوں کہ اس عرصے میں زمانے نے اور ہی رنگ دکھایا۔

غرض نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد انھوں نے یہ کتاب نواب آصف الدولہ

کے نام سے معنون کی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی سنہ ۱۷۷۵ء میں ہوئی اس وقت یہ کتاب ختم ہو چکی تھی یعنی اس کی تالیف 'باغ و بہار' سے تخمیناً ۲۹، ۳۰ برس پہلے ہوئی۔

فارسی اور 'نوطرزِ مرصع' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'باغ و بہار' فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ 'نوطرزِ مرصع' ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میر امّن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر 'نوطرزِ مرصع' کا ذکر صاف اُڑا گئے۔ اب مَیں تینوں کتابوں سے بعض مقامات کا مقابلہ کر کے دکھاتا ہوں جس سے میرے بیان کی پوری تصدیق ہوگی۔

اصل یہ ہے کہ ترجمہ ان دو میں سے کوئی بھی نہیں فارسی قصّے کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے، لیکن جہاں کہیں 'نوطرزِ مرصع' اور فارسی کتاب میں اختلاف ہے 'باغ و بہار' میں 'نوطرزِ مرصع' کا اتباع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'باغ و بہار' جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، فارسی قصّے کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ 'نوطرزِ مرصع' ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھ دیے ہیں جو 'نوطرزِ مرصع' میں ہیں۔ اب چند مقامات ملاحظہ ہوں

بادشاہ آزادبخت راتوں کو قبور کی زیارت کرنے جاتا تھا ایک روز اس سیر میں اس کی چار درویشوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ اس کا ذکر فارسی کتاب میں اس طرح ہے کہ دُور سے روشنی دکھائی دی۔ بادشاہ نے دل میں کہا کہ کوئی آوارہ وطن غریب یا ستم رسیدہ بے کس یا صاحبِ دل درویش ہوگا ورنہ ایسے مکان میں بسر کرنا کسی دوسرے کا کام نہیں[1]۔

---

[1] اصل فارسی عبارت یہ ہے "تا درمیان قبرستان نظرش چار طاقے افتاد کہ روشنی چراغ دُور می نمود۔ بادشاہ با خود گفت کہ البتہ دراں مکان غریبے از وطن آوارہ یا بےکسی ستم رسیدہ یا بیچارہ از حادثات فلکی بہ جان آمدہ یا درویش از خلق کنار گرفتہ یا صاحب دلی بہ ارواح اہلِ قبور نسبتے یافتہ خواہد بود۔ والا درچنیں مکان بسر بردن کار دیگرے نیست۔

اب "نوطرزِ مرصع" کا یہی مقام ملاحظہ کیجیے :۔

"اس عرصے میں فرخندہ سیر کے تئیں دُور سے بہ فاصلہ فرسنگ کے ایک چراغ نظر آیا۔ لیکن باوصف استبداد بادِ صرصر کے زنہار استعالہ چراغ کے تئیں سرِ مو حرکت نہ تھی۔ بادشاہ نے اوّل خیال کیا کہ طلسم شیشہ نمائی کا ہوگا یعنی اگر پھٹکری کو گرد فتیلہ چراغ کے چھڑک دیجیے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گُل نہ ہو"۔

میرامّن اسی مقام کو یوں لکھتے ہیں :۔

"ایک بارگی بادشاہ کو دُور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے ستارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی از حکمت نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتّی کے آس پاس چھڑک دیجیے تو کیسی ہوا چلے چراغ گُل نہ ہوگا"۔

ان تینوں عبارتوں کا مقابلہ کیجیے، فارسی اور اردو میں خاصا اختلاف ہے، لیکن "نوطرزِ مرصع" اور "باغ و بہار" کی عبارتیں کس طرح ملتی جلتی ہیں۔ دونوں کی آخری سطریں دیکھیے ایک ہی بات ہے اور ایک ہی سے لفظ ہیں، گویا ایک نے دُوسرے کی کتاب سامنے رکھ کر لکھی ہے۔

پہلا درویش اپنی واردات سناتا ہے اور جب وہ اس مقام پر پہنچتا ہے کہ نازنین کے علاج کے لیے بازار میں مضطرب پھر رہا تھا تو بیان کرتا ہے کہ ایک جرّاح کی دکان نظر پڑی کہ ایک سفید ریش شخص بیٹھا ہے، اور چند نفر شاگرد اس کی خدمت میں مرہم بنانے میں مشغول ہیں [1] (فارسی کتاب)

---

[1] اصل فارسی عبارت یہ ہے "از سرا بیرون آمدہ در بازار مضطرب می گردیدم، بہ درگاہ ربّ العزت حیات آں سرمایہ حیات جاودانی می نمودم کہ دکان جراحے بہ نظر در آمد مرد محاسن سفید ریش نشستہ چند شاگرد در خدمتِ او مشغول مرہم ساختن"۔

'نوطرزِ مرصع' میں یہ مقام یوں بیان کیا گیا ہے:۔

"اور معتمد ہم راہ کے تئیں بیچ خدمت گزاری اس نازنین کے تعیّن کر کے آپ واسطے تحقیقات مکان جرّاح کے حویلی سے باہر آیا۔ چناں چہ زبانی ایک شخص کے معلوم ہوا کہ عیسیٰ نامی جرّاح بہ کمال کسب طبابت جراحی کے کہ اگر مردے کے تئیں چاہے تو عنایات وفضل الٰہی سے زندہ کرے، فلانے محلّے میں رہتا ہے۔ فقیر اس گل بانگ بشارت اندوز سے بسان گل کے شگفتہ وخنداں ہو کر پوچھتے پوچھتے اوپر دروازے جرّاح کے کہ مثال دل بے دار دلوں کے کشادہ تھا جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ متبرک ذات خضر صفات بیچ دہلیز گھر کے رونق افروز ہے":

'باغ وبہار' میں یہ مقام اس طرح ادا کیا گیا ہے:۔

"اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جرّاح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں کاری گر کون ہے؟ ایک شخص نے کہا ایک حجّام جرّاحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں پکّا ہے۔ اگر مردے کو اس پاس لے جاؤ، خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے، وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے میں یہ مژدہ سن کر بے اختیار چلا، تلاش کرتے کرتے اس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مردِ سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھا دیکھا":

فارسی نسخے میں جرّاح کا نام نہیں دیا۔ 'نوطرزِ مرصع' اور 'باغ وبہار' میں ایک ہی نام ہے اور ایک ہی بیان ہے۔

اس کے بعد اسی بیان میں فارسی اور اردو قصے میں ایک بہت بڑا اختلاف ہے۔ فارسی کتاب میں لکھا ہے کہ میرے کہنے سننے اور التجا پر وہ شخص (جرّاح) دکان

سے اُٹھ کر ہم راہ ہولیا اور کارواں سرای میں پہنچ کر جب حجرے میں داخل ہوا اور اس سرو گل اندام کو ملاحظہ کیا تو بہت متفکر ہوا اور ایک لحظے کے بعد میری طرف مُنھ پھیرا اور اس زور سے ایک طمانچہ میری کنپٹی پر مارا کہ آج تک نہیں بھولا ہوں[۵۱]۔ جرّاح کی خفگی اس بات پر تھی کہ تو نے اس نازنین پر یہ آفت ڈھائی ہو۔ درویش اس کے قدموں پر گِر کر کہتا ہو کہ مَیں اس کا باعث نہیں ہوں، یہ مجروح میری ہم شیرہ ہو۔ مَیں یمن کا رہنے والا ہوں اور اس سفر میں ماں باپ، بھائی بہن، رفیق سب میرے ہم راہ تھے کہ ڈاکوؤں نے ڈاکہ مارا سب کچھ لوٹ لیا اور عزیزوں کو ہلاک کر دیا، صرف یہی ایک زخمی بچی جس میں کچھ جان باقی ہو :

'نوطرزِ مرصع' اور 'باغ و بہار' میں وہ پہلے ہی جرّاح سے بیان کر دیتا ہو کہ اس شہر کے نزدیک ڈاکہ پڑا۔ مال و اسباب لُٹ گیا اور اس بی بی ('نوطرزِ مرصع' میں معشوقہ) کو گھائل کیا طمانچے کے مارنے کا کہیں ذِکر نہیں :

فارسی کتاب میں لکھا ہو کہ جرّاح نے دیکھ بھال کے بعد کہا کہ پچاس تومان دیتے ہو تو علاج کرتا ہوں اور یہ کہ حجرے سے نکل کر چل دیا۔ اردو کی دونوں کتابوں میں یہ ذِکر نہیں۔ یہاں بھی میر امّن نے 'نوطرزِ مرصع' کا اتباع کیا ہو :

اچھے ہونے کے کچھ دنوں بعد یہ واردات گزرتی ہو :

---

[۵۱] اصل فارسی عبارت یہ ہو :۔ "آں مرد گفت، منّت دارم، از دکان برخاستہ با من رواں سر اگر دید۔ چوں داخل حجرہ شد، ملاحظہ احوال آں سرو گل اندام کرد متفکر گردید بعد از یک لحظہ رو بہ جانب من کرد و یک طمانچہ از روئے قہر و قدرت و قوّت تمام آں چناں بر بنا گوش من زد کہ ہنوز اورا فراموش نہ کردہ ام" :

"ازبس کہ غرورِ حسن و ریاست کا پیچ دماغ کے رکھتی تھی، میری طرف بہ نظرِ الفتِ شاہدانہ کے رُخ توجہ کا فرماتی اور اکثر اظہار کرتی کہ اگر تیرے تئیں دل داری ہماری منظور رہی تو زنہار ہیچ حرکات و سکنات ہماری کے دخل تفتیش کا نہ کرنا خبر شرط ہی"۔

'باغ وبہار' میں اس بیان کو یوں لکھا ہی "وہ اپنے حُسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی خبردار اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہی تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں بلا عذر کیے جائیو۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو، نہیں تو پچتاوے گا"۔ فارسی میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ دونوں عبارتوں کو دیکھیے صاف معلوم ہوتا ہی کہ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہی۔

فارسی قصّے میں لکھا ہی کہ ایک روز اس نازنین نے ایک خاص کھانے کی فرمایش کی اتفاق سے درویش کے پاس اس روز ایک دینار بھی نہ تھا سب کچھ اس معشوقہ کے علاج اور خاطر تواضع میں خرچ کر چکا تھا۔ فرمایش کا سننا تھا کہ چہرے کا رنگ فق ہوگیا اور وہ حالت ہوئی کہ خدا کسی دشمن کو نصیب نہ کرے 'نوطرزِ مرصّع' میں قصّہ یوں نہیں ہی بلکہ اس میں لکھا ہی کہ "جو کچھ پاس تھا سب خرچ کر چکا اور کچھ نہ رہا تو فکر سے میری حالت نزار ہونے لگی اور کھانا، پینا، سونا حرام ہوگیا۔ وہ نازنین فراست سے تاڑ گئی کہ معاملہ کیا ہی"۔ 'باغ وبہار' نے بھی ہُو بہ ہُو یہی لکھا ہی فارسی کی تقلید نہیں کی ہی۔

فارسی قصّے میں یوسف سوداگر کی معشوقہ نہایت حسین پری پیکر عورت ہی اس کے برخلاف 'نوطرزِ مرصّع' میں کریہ منظر، بدہیئت چڑیل صورت ہی۔ 'باغ وبہار' میں بھی بالکل یہی ہی۔ اسی طرح جب ملکہ اس جوان کی خاطر جس پر وہ عاشق تھی (یعنی یوسف سوداگر

باغ اور کنیز خریدتی ہے تو اُسے 'نوطرزِ مرصّع' میں اس طرح بیان کیا ہے "ایک باغ خوش تعمیر نہایت شگفتگی و طراوت میں روح افزا متصل محل سرا اس جوان کے اور اس کے شامل ایک مغنیہ کہ علمِ موسیقی میں کم و بیش دست گاہ رکھتی ہے، اس طرح جیسے اونٹ کے ساتھ بلّی"۔

'باغ و بہار' میں اسے یوں ادا کیا ہے کہ "ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارت عالی، حوض، تالاب، کوئے پختہ سمیت غلام کی حویلی کے نزدیک ناف شہر میں بکاؤ ہے اور اس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن کہ علمِ موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے لیکن یہ دونوں باہم بکتے ہیں نہ اکیلا باغ، جیسے اونٹ کے گلے میں بلّی"۔

فارسی کتاب میں یہ واقعہ یوں نہیں ہے بلکہ اس نے پہلے باغ کی فرمائش کی ہے اور کچھ دنوں بعد کنیز کی۔ اونٹ کے گلے میں بلّی کا محاورہ 'نوطرزِ مرصّع' سے لیا گیا ہے فارسی کتاب میں اس کا مطلق ذکر نہیں۔

جب پہلے درویش نے ملکہ سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات تھی کہ تمھارے ذرا سے کاغذ کے پرزے پر اس شخص نے اتنی ساری اشرفیاں دے دیں، وہ کون شخص تھا؟ تو ملکہ نے جواب دیا کہ وہ میرا خزانچی سیدی بہار تھا۔ 'نوطرزِ مرصّع' اور 'باغ و بہار' دونوں میں یہی ہے۔ فارسی کتاب میں بجائے سیدی بہار کے کوکنار فروش ہے جسے ملکہ نے بہت کچھ مال و دولت سے سرفراز کیا تھا۔

'نوطرزِ مرصّع' میں اثنائے بیان میں دو ہندی گیت بھی آگئے ہیں میر امّن نے دونوں کتبوں کو بہ عینہٖ نقل کر دیا ہے۔ ایک کبت دُوسرے درویش کی سیر میں ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے:۔

"دنکھ بن گٹا دیکھے، سیس بھاری جٹا دیکھے، جوگی کن پھٹا دیکھے، دیکھے چھائے تن میں"۔

دوسرے کبت کا پہلا مصرع یہ ہی :-

"جب دانت نہ تھے جب دودھ دیو جب دانت دیے کہا آن نہ دسے ہی"

تیسرے درویش کی سیر میں (جو فارسی کے نسخے میں دوسرے درویش کی سیر ہی) اصل فارسی سے جا بہ جا اختلاف پایا جاتا ہی، لیکن میر امّن نے ہر جگہ 'نوطرزِ مرصع' کی تقلید کی ہی۔ وضاحت کی غرض سے چند مقامات کا حوالہ یہاں دیا جاتا ہی :-

"آں گنبد چہار صفہ داشت، در پیش یک صفہ پردہ کشیدہ بودند ۔ آں مرد بہ آں پردہ رفت و بعد از لمحہ آواز گریہ و نالہ بہ گوشم رسید - آں مرد پیر بہ نالۂ حزیں می نالید و می گفت":

اے فلک تا بہ چنداں خوں بارم      رحم آور بہ دین دل دارم

"مرا بر احوال او تعجب آمد، برخاستہ بہ عقب پردہ آمدم و نظر بہ اندرون گماشتم دیدم .........." (فارسی)

"بہ سبب ماندگی و کسل اعضا مکین داران خواب کے اوپر قافلہ بے داری کے تاخت لائے اور متاع گراں بہائے ہوشیاری کو لوٹ لے گئے بعد ایک لمحہ کے آواز گریہ و زاری کی بیچ گوش میرے کے مستمع ہوئی، آنکھ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تن تنہا پلنگ پر لیٹا ہوں و صاحبِ خانہ سے مکان خالی ہی، آگے دالان کے ایک پردہ پڑا ہی اس کے تئیں اٹھا کر ملاحظہ کیا کہ ........ (نوطرزِ مرصع)

"ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اس نیند میں آواز نوحہ زاری کی کان میں آئی آنکھیں مل کر جو دیکھتا ہوں تو اس مکان میں نہ وہ بوڑھا ہی نہ کوئی اور ہی اکیلا میں پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہی۔ چاروں طرف بھیانک ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا۔ وہاں جا کر اسے اٹھایا، دیکھا تو ........ (باغ و بہار)

فارسی کتاب میں تیسرا درویش (شاہ زادۂ عجم) پیر مرد سے پوچھتا ہی کہ یہ صنم کہاں سے آیا، اس کا نام و نسب کیا ہی، وغیرہ وغیرہ تو بوڑھے نے جواب دیا کہ مَیں نہیں جانتا تو خود پوچھ لے۔ اس کے بعد وہ اس نازنین کے پاس جاکر سلام کرتا ہی ؞

'نوطرزِ مرصّع' میں یہ سوال و جواب نہیں، عشق سے ہوس میں آتے ہی وہ نازنین کو سلام کرتا ہی وغیرہ، یہی 'باغ و بہار' میں ہی ؞

جس روز مال و اسباب لے کر ملکِ فرنگ پہنچتا ہی تو شاہی خواجہ سرا آتا ہی اور ملاقات کے بعد کہتا ہی کہ ہماری ملکہ نے مسلمان تاجروں کے آنے کی خبر سُنی ہی جو سامان بادشاہوں کے لایق ہو اسے لے کر چلو۔ وہ مناسب سامان جمع کر کے خواجہ سرا کے ساتھ ہو لیتا ہی۔ (فارسی)

(نوطرزِ مرصّع' میں وہ اس روز ماندگی اور کسل مزاج کا عذر پیش کر کے دُوسرے دن حاضر ہونے کا وعدہ کرتا ہی۔ 'باغ و بہار' میں بھی اسی کا اتّباع کیا گیا ہی ؞

ملکہ دُوسرے روز سامان کی قیمت دینے کے لیے بلاتی ہی جب جاتا ہی تو بٹھاتی ہی اور ایک ساعت کے بعد مٹھائی آتی ہی۔ پھر دسترخوان بچھتا ہی ملکہ رونے لگتی ہی اور چند نوالے کھانے کے بعد دسترخوان بڑھاتے ہیں، اس وقت خلوت میں اپنا حال سُناتی ہی (فارسی)

'نوطرزِ مرصّع' میں مٹھائی اور دسترخوان وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں اور یہی 'باغ و بہار' میں ہی ؞

ملکہ کہتی ہی کہ اگر تو میرا کام کرے گا جو نفع ملکِ فرنگ سے ہونے والا ہی وہ مَیں دے دوں گی۔ اس نے کہا اس کی ضرورت نہیں مَیں ہر خدمت کے لیے

دل وجان سے حاضر ہوں ملکہ نے کہا روپیہ لینا ہوگا۔ ہمیں مفت کا خدمت گار نہیں چاہیے۔ اس نے کہا جو آپ کی مرضی ؏

'نوطرزِ مرصع' اور 'باغ وبہار' میں یہ گفت گو مطلق نہیں ؏

اس کے بعد ملکہ کا یہ کہنا کہ دریا اس پار جو شہر ہے وہاں چلا جا اور اپنا مال و اسباب بھی لے جا، ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کو خبر ہو جائے تو تیرا مال وجان خطرے میں ہو اگر تو، ادھر رہا اور تیرے پاس کوئی چیز نہ ہوئی تو فوراً ادھر جا سکتا ہے۔ اور اس طرف تجھ پر کوئی ظلم زیادتی نہ ہوگی۔ پانسو تومان دیتی ہے اور وہ کارواں سرا میں آتا ہے اور اپنے سب ساتھیوں کو اس شہر کے بادشاہ کے ظلم سے ڈراتا ہے اور ادھر لے جاتا ہے ؏

یہ 'نوطرزِ مرصع' میں ہے نہ 'باغ وبہار' میں ؏

اس درویش کے سیر میں اس قسم کے بہت سے اختلافات ہیں جن کی تفصیل باعثِ طوالت ہوگی، لیکن ہر موقع پر میرامّن نے 'نوطرزِ مرصع' ہی کی تقلید کی ہے ؏

اس درویش کے بیان میں جب بہزاد خاں ملکہ اور شاہ زادے (تیسرے درویش) کو بھگا کر لے جاتا ہے اور بادشاہی فوج تعاقب کر کے پہنچتی ہے تو وہ انھیں پُل کے پاس کھڑا کر دیتا ہے۔ 'نوطرزِ مرصع' کی عبارت یہ ہے :-

"بہزاد خاں رستم تواں نے ملکہ اور شہ زادے کو زیرِ دیوار ایک پُل کے کہ بارہ پُلی سے کم نہ تھا کھڑا کیا"

میرامّن نے یہ غضب کیا ہے کہ اس کے ساتھ جون پور کے پُل کا بھی اضافہ کر دیا، جو شہ زادۂ عجم کے مُنھ سے بھلا نہیں معلوم ہوتا :-

"بہزاد خاں نے ملکہ کو اور اس فقیر کو ایک در میں پُل کے کہ بارہ پُلی اور

جون پور کے پُل کے برابر تھا، کھڑا کیا"۔

اسی بیان میں کو کا ملکہ سے شاہ زادے کی سفارش اور اس کا حالِ زار بیان کرتے ہوئے جہاں سب کچھ کہتا ہے وہاں یہ فقرہ بھی ہے "سائیں تیرے کارن چھوڑا شہر بلخ"۔ اسی موقع پر یہی فقرہ میر امّن نے بھی نوطرزِ مرصّع سے نقل کر دیا ہے۔ یہ مزید ثبوت اس بات کا ہے کہ 'باغ و بہار' کا اصل ماخذ نوطرزِ مرصّع ہے نہ کہ فارسی نسخہ۔

لیکن 'نوطرزِ مرصّع' اور 'باغ و بہار' کے طرزِ بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ 'نوطرزِ مرصّع' کی عبارت نہایت رنگین اور سر تا پا تشبیہات و استعارات سے مملو ہے یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے۔ تحسین نے اپنے بیان میں عام قصہ گوؤں کا طرز اختیار کیا ہے۔ آج کل اس کا پڑھنا طبیعت پر بار ہوتا ہے۔ زبان کا ڈھنگ پُرانا ہے اور فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے بھرپور ہے۔ 'باغ و بہار' سے اسے کچھ نسبت نہیں۔ نمونے کے طور پر چند سطریں نقل کی جاتی ہیں جن میں اس کے طرزِ بیان کا اندازہ ہوگا:-

"بعد ایک لمحے کے وہ ماہ شبِ چہار دہم رونق افزا حدیقۂ فردوس نما کے ہوکر اوپر مسندِ زربفت نقروی کے جلوہ آرا ہوئی وہ جی واہ جس وقت وہ قمر طلعت داخل باغچہ نمونہ جنّت کی ہوئی، عطر گلاب رخسارہ زلیخائے شب مہ تاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہوگیا۔ یوسف عکس بیاض نگینہ ہائے الماس انجم کا اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمین خلد آئین کے زیب افزا دیدۂ نورانی کا ہوا۔

کن نے کیا خرام چمن میں کہ اے صبا
لائی ہے بوئے یار سے بھر بھر کے جھولیاں

نوعروسانِ شبوگیں اور فرش چاندنی کے لباس نقرہ سے بہار افروز بزم دل فریبیٔ
دل ربائی کے تھیں اور ماہ رویان نسترن آگیں اوپر بساط چمن کے خامتِ سیمیں
سے رونق افروز خوب روئی وخوش نمائی کے تھیں"۔

'باغ وبہار'، اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے میر امن خاص دلّی کے رہنے والے ہیں اور ان کی زبان ٹھیٹ دلّی کی زبان ہے اور ان کا لکھا سند ہے۔ چناں چہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا شہر بے سر ہو گیا سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی ایک بارگی تباہی پڑی رئیس وہاں کے، میں کہیں تو کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت سے ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور رہے، وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے"۔

اُردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے۔ اس وقت اور اس وقت کی زبان میں بہت بڑا بل ہے تاہم 'باغ وبہار'، اب بھی ویسی ہی

دل چسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی۔ مصنّف کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور وہ ہر موقع پر اسی کے مناسب ٹھیٹ الفاظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ ایسی خوبی کے ساتھ کھینچتا ہے کہ اس کے کمال انشا پردازی کی داد دینی پڑتی ہے نہ بے جا طول ہے نہ فضول لفاظی ہے۔ سادہ زبان لکھنا سخت مشکل ہے۔ سادگی بعض وقت عامیانہ یا بے مزہ ہو جاتی ہے۔ سادگی کے ساتھ فصاحت اور لطفِ بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے۔ میر امّن اس امتحان میں پورے اُترے ہیں اور یہی وجہ ان کی کتاب کی مقبولیت کی ہے۔

ہماری زبان فارسی الفاظ اور ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں میں ایسی رچی ہوئی ہے کہ ان سے بچنا مشکل ہے اور خواہ مخواہ بچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ خواہ مخواہ دوسروں کے چبائے ہوئے لقموں کو چبانا اور آنکھ بند کر کے دوسروں کے لکھے ہوئے کو نقل کر دینا بھی انشا پردازی نہیں۔ میر امّن نے نے اس میں بڑا اعتدال برتا ہے وہ بدیسی لفظوں اور چیزوں کی شان و شکوہ سے مرعوب ہو کر دیسی سادہ اور میٹھے لفظوں کو نہیں بھول جاتے اور قدیم فارسی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ ساتھ اپنے بے تکلّف اور لطیف استعارے اور تشبیہیں بھی استعمال کر جاتے ہیں جو بڑا لطف دے جاتی ہیں، مثلاً گل کرسٹ صاحب کو دعا دیتے ہیں کہ "ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے" یہاں دجلہ و فرات اور جیحوں، سیحوں کے بدلے گنگا جمنا کے لفظ کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے فقرے اس کتاب میں بہت سے ملیں گے۔

زبان کی قدرت کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ ہر حالت اور موقع کے لیے نہایت مناسب استعمال اور کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبان کوتاہی کرتی ہے مثلاً آتش بازی کھانے، بحری سواریاں مختلف خدمات کے ملازم اور مختلف ساز و سامان کے لیے

اس قدر کثرت سے لفظ لاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جب کہیں گفت گو یا مکالمے کا موقع آتا ہے حفظ مراتب اور موقع محل کے لحاظ سے اسی قسم کی زبان لکھتے ہیں موقع موقع سے ہندی لفظ اس حسن و خوبی سے کھپاتے ہیں کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کہیں تصنّع یا تکلّف نظر نہیں آتا بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہے اور باتیں بھی ایسی میٹھی اور پیاری کہ آدمی سنتا رہے اور جی نہ بھرے۔ لفظ کو اس کے صحیح مفہوم میں ٹھیک موقع پر استعمال کرنا اصل انشاپردازی ہے اور اس میں میر امّن کو بڑا کمال حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت کی سادگی بے لطف نہیں ہونے پاتی۔ یہاں اس کی عبارت کے ایک دو نمونے لکھتا ہوں ؛

شروع ہی میں خدا کی حمد و ثنا ہے، اگرچہ یہ مضمون بہت پامال ہے اور اس میں جدّت پیدا کرنا مشکل ہے لیکن دیکھیے کہ وہ اپنی شیریں زبان میں اسے کس طرح لکھتے ہیں :۔

"سبحان اللہ! کیا صانع ہے! کہ جس نے ایک مٹّھی خاک سے کیا کیا صورتیں پیدا کیں، باوجود دو رنگ کے ایک گورا ایک کالا اور یہی ہاتھ پاؤں سب کو دیے ہیں تس پر رنگ بہ رنگ کی شکلیں جُدی جُدی بنائیں کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول ملتا نہیں، کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیے پہچان لیجیے۔ آسمان اس کے دریائے وحدت کا ایک بلبلا ہے اور زمین پانی کا بتاشا لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے، پر اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا جس کی یہ قدرت اور سکت ہو، اس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے کہے تو کیا کہے۔ بہتر یوں ہے کہ جس بات میں دم

نہ مار سکے چُپکا ہو رہے"

لیکن ایک جگہ فضول خرچی کا انجام بتایا ہے۔ دیکھیے کن الفاظ میں مفلسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کیٗ قسمیں نوکروں کی بیان کر گئے ہیں جنھیں اب کوئی جانتا بھی نہیں:۔

"اس ورخرچی کے آگے اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے، کافور ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر خدمت گار بہیلیے ڈھلیت، خاص بردار ثابت خوانی سب چھوڑ کر کنارے لگے، کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے کہ یہ تمھارا کیا حال ہوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھیرا۔ اب مڑی کی ٹھنڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں، دو تین فاقے کڑاکے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا"

دیکھیے انتقام کی جھل کیوں کر دکھائی ہے "جس طرح اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی دونوں کے پُرزے پُرزے کروں تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ نہیں تو اس غصّے کی آگ میں پُھک رہی ہوں، آخر جل جل کر بھوبھل ہو جاؤں گی"۔

ہر موقع اور محل کی زبان اور بات چیت ویسی ہی لکھی جیسی ہونی چاہیے۔ ملاحظہ ہو:—

"ای بچے! جس نے تجھے تیر مارا، میری آہ کا تیر اس کے کلیجے میں لگیو، وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اُسے میرا سا دُکھیا بنا دے"۔

یا ایک بڑھیا کی دعا اور گفت گو دیکھیے :-

"الٰہی تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے، اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے۔ میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں۔ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں دردِ زہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں، کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں۔ اگر مر گئی تو گور و کفن کیوں کر کروں گی اور جیے تو دائی جنائی کا کیا دوں گی۔ اور جچا کو ستھوارا اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی۔ آج دو دن ہوئے ہیں کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے۔ ای صاحب زادی اپنی خیر کچھ ٹکڑا پارچہ دلاتو اس کو پانی پینے کا اُدھار ہو۔"

اگرچہ میر امّن قصّے روم و شام، چین و ایران کے لکھتے ہیں لیکن جب موقع آتا ہی تو ہمارے مرثیہ گو شاعروں کی طرح آداب و رسوم اپنے ہی دیس کے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وزیر زادی کے کھیل تفریح کا بیان دیکھیے :-

"اتفاقاً جس دن مریض کو حبوس خانے میں بھیجا وہ لڑکی اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا اور ڈھولک پکھاوج لیے ہوے رت جگے کی تیاری کر رہی تھی اور کڑاھی چڑھا کر گلگلے اور رحم تلتی اور بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اس کی ماں روتی پیٹتی سر کھلے پانو ننگے بیٹی کے گھر میں گئی اور دو ہتڑ اس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی کاش کہ تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔"

ایسے موقعے اس کتاب میں بیسیوں آئے ہیں۔ میر امّن نے ہر جگہ اپنے ہی ہاں کے ساز و سامان، کھانے، پوشاک اور رسم و رواج کا ذکر کیا ہے۔ اس

کے پڑھنے سے اس زمانے کی بہت سی ایسی باتیں اور چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو اب معدوم ہوگئیں یا مٹتی جاتی ہیں :

رہا زبان کا معاملہ تو اس کی فصاحت اور خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ جو بات دیکھنے کی ہے یہ ہے کہ اس میں سیکڑوں محاورے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے بعض تو ایسے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو جانے اور نہ جاننے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے۔ ہماری زبان کا دار و مدار اب تک شاعروں پر رہا اور شاعری کا میدان زیادہ تر غزل کے لیے وقف تھا، وہ ایسا تنگ کہ اس میں زبان کی کہاں تک کھپت ہوتی۔ جس طرح شاعر شاعر سے سند لیتا ہے عام پڑھے لکھے لوگ بھی شاعری کی زبان کو زبان مانتے ہیں۔ لغت نویسوں نے بھی اکثر انھیں کی پیروی اور دیوانوں کو ٹٹول کر الفاظ اور محاورے جمع کر دیے۔ بعض لفظ یوں ہی پڑے رہ گئے اور کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے، گم نامی سے نکال کر کام میں لایا جائے مثال کے طور پر چند لفظ یہاں لکھے جاتے ہیں :۔

"جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹھا ہے" گھر سینا بہت اچھا محاورہ ہے بیاری سینا اب بھی بولتے ہیں ::

"جتنے آدمی وہاں کے ہزاری بزاری نظر پڑے" یعنی خاص و عام امیر و غریب

"منہ پر ردہٹ آئی ـــــــ یعنی رونق

"بت کھاؤ"                    بات چیت

"گھوڑے کو ٹنگیانا"                    ایڑ دینا

"تیسرا درویش کوٹ باندھ بیٹھا" نشست کی خاص صورت۔

"جب پرچھا ہوا" بھیڑ چھٹ گئی، لوگ ادھر اُدھر ہوگئے۔

اس قسم کے بیسیوں لفظ ہیں جو غور اور استعمال کے قابل ہیں۔

زمانے کے ہاتھوں ہر چیز میں تغیّر ہوتا رہتا ہے زبان کو بھی اس سے مفر نہیں۔ بہت سے لفظ اور محاورے متروک ہو جاتے ہیں، بہت سے نئے داخل ہوتے رہتے ہیں۔ بعض زبانیں تو اس کی دست برد سے بالکل مٹ گئیں اور صرف کتابوں میں رہ گئی ہیں۔ لیکن تغیّر صرف الفاظ و محاوروں ہی میں نہیں ہوتا بلکہ صرف و نحو میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ بعض لفظ جو مذکّر تھے مونّث ہو جاتے ہیں اور مونّث مذکّر، جملوں کی ترتیب اور ترکیب میں فرق آجاتا ہے۔ بعض اوقات لفظوں کے معنی بدل جاتے ہیں یا ان کے استعمال میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح کے بہت سے خفیف تغیّر پیدا ہو جاتے ہیں۔ 'باغ و بہار' کو لکھے سوا سو برس کے قریب ہوتا ہے لیکن اس عرصے میں بھی بہت کچھ تغیّر ہو گیا ہے۔ چند باتیں جو صرف و نحو کے لحاظ سے نیز محاورے کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ غور ہیں، یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

۱۔ جمع مونّث اسم کے ساتھ فعل کی جمع، ان سے یا امدادی فعل کے ساتھ اصل فعل کی بھی جمع۔ جیسے:۔

"دو کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گزرانیاں۔"

"یہ باتیں ہوتیاں تھیں۔"

"گھوڑے کی باگیں ڈال دیاں۔"

۲ - "نے" کا استعمال یا ترک بعض افعال کے ساتھ جو اب حال کے محاورے کے خلاف ہی اور دکن میں اب تک رائج ہی :-

"القصہ رات کو چپکے یہ دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اس پہاڑ پرے گئے"؛

"ذرا سرت آئی تو میں اپنے تئیں مردہ خیال کیا"

"اس پروانگی کے سنتے ہی جوان نے آداب بجالایا"

۳ - "جب تلک" کا استعمال بغیر "نہ" کے جیسے :-

"پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تلک وہ راضی ہوا" یہ فارسی کا تتبع معلوم ہوتا ہی "وِالّا" نہ کے ساتھ جیسے :-

وِالّا نہ جیسا کرے گا ویسا پائے گا یہ "ورنہ" کے بجائے ہی اور غالباً اسی سے دھوکا ہوا ہی ؛

۴ - شک اور غور موٗنث استعمال ہوئے ہیں - غور کو اب بھی بعض پرانے لوگ موٗنث لکھتے ہیں - سرسید احمد خاں نے بھی غور کو موٗنث ہی لکھا ہی :-

"اب میرے تئیں شک آئی"؛

"خم" کو بھی موٗنث لکھا ہی "خمیں سونے کی"

۵ - "رنڈی" بہ معنی عورت اور "یتیم" بہ معنی غلام استعمال کیا ہی ؛

۶ - ایک جگہ "تم کو" کی جگہ "تمھوں کو" لکھا ہی ؛

"شاید تمھاری محنت پر توجہ کر کے تمھوں کو بخش دے"؛

۷ - "ہوا نرم نرم بہتی تھی" ہوا بہنا پرانا محاورہ ہی "نماز کر رہا تھا" "نماز کردن" کا ترجمہ ہی، اور پہلے نماز کرنا بھی استعمال ہوتا تھا ؛

۸ - بعض الفاظ کے املا میں بھی فرق پایا جاتا ہی یعنی جیسے بولتے ہیں ویسے

ہی لکھے ہیں ؛

جمیرات (جمعرات) مرصّے (مرصّع) لیکن ایک جگہ اصل لفظ ہی لکھ دیا ہی" کہو تو صحیح " اب اس کی جگہ "سہی" لکھتے اور بولتے ہیں ؛

۹۔ اکثر اردو مضاف مضاف الیہ فارسی طرز پر استعمال کیے گئے ہیں اور اردو حروف اضافت آخر میں لکھے ہیں جیسے موافق معمول کے تقریر و خوش گوئی اس کی۔ ایک جگہ تو اضافت توصیفی لکھ کر موصوف کی جمع بنائی ہی اور وہ خانہ زاد موروثیوں کی قدر سمجھے گا "؛

اگر خانہ زاد کی اضافت کاتب کی غلطی بھی سمجھی جائے تو بھی "موروثیوں" آج کل کی بول چال کے لحاظ سے صحیح نہیں ہی ؛

۱۰۔ "سار" کا لفظ جیسے یا مانند کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہی "تم سار" کا محبوب "تجھ سار" ہی لفظ ہی جو دکن میں "سرِی" ہوگیا ہی۔ اور شمالی ہند میں اب بھی بعض جگہ ایک آدھ لفظ کے ساتھ استعمال میں آجاتا ہی ؛

ایک اور کتاب 'نوطرزِ مرصّع' کے نام سے محمّد عوض زرّیں نے لکھی ہی جس میں اُنھیں چار درویشوں کے قصّے بیان کیے ہیں، چناں چہ وہ خود لکھتا ہی :-

"اس خاک پائے درویشاں حق بیں محمّد عوض خاں زرّیں نے قصّۂ چار درویش زبانِ فارسی میں ترتیب دیا اور عبارت شگفتہ سے گل دستۂ مجالس کیا۔ راجا صاحب سراپا حلم و تمکین راجا رام دین کہ اس عالی نش کے برادرِ بزرگ خداوندِ عدل و داد راجا سیتل پرشاد اور برادر میانہ فیاضِ زمانہ راجا بھوانی پرشاد ادام اللہ اقبالہم ہیں، اس نحیف کی تصنیف مطالعہ فرماتے اور حظِ وافر اٹھاتے۔ ایک روز فرمایا

کہ اگر کلام زبان ہندی میں انتظام پائے مسامع کو بہ سہولت سرور
آئے۔ مَیں نے خوش نودیٔ آقا کو بہبودیٔ دنیا و عقبیٰ جان کر سر رشتۂ
ادب کو ہاتھ سے نہ دیا اور زبانِ اردو میں قلم بند کیا"۔

میر امّن کی طرح زرّیں نے اپنی کتاب کا سنہ تاریخ "باغ و بہار" سے نکالا ہے
(۱۲۱۷ھ) اس میں قصّے بہت مختصر کر دیے ہیں، حالات وہی ہیں ایک آدھ جگہ فارسی
نسخے اور 'نوطرزِ مرصّع' سے خفیف سا اختلاف پایا جاتا ہے، اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ
کہ زرّیں کی نظر سے تحسین کی 'نوطرزِ مرصّع' گزری تھی یا نہیں، البتّہ نام سے شبہ
ہوتا ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی۔ دیباچے میں کتاب کے نام کا کہیں ذکر نہیں ممکن ہے
کہ مطبع والوں نے یہ نام ('نوطرزِ مرصّع') خود رکھ دیا ہو عجیب بات یہ ہے کہ اس نے
بھی تاریخ 'باغ و بہار' ہی سے نکالی ہے۔ اس سے میر امّن کی 'باغ و بہار' اور اس
کتاب کی تالیف ایک ہی سنہ کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی عبارت سادہ ہے، تحسین کی
'نوطرزِ مرصّع' کی طرح رنگین اور تشبیہ و استعارہ سے مملو نہیں ہے مگر عبارت اور
بیان میں کوئی خاص لطف نہیں۔ ایک بات اس کتاب میں یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ
زرّیں نے اس قصّے کو فارسی میں بھی لکھا تھا اور اس سے ظاہر ہے کہ اس قصّے کو
فارسی میں بھی کئی شخصوں نے تالیف کیا ہے۔

'باغ و بہار' میں ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ میر امّن نے اپنی کتاب کے
دیباچے میں کتاب کا اور اپنا حال بیان کرتے ہوئے اُردو زبان کی حقیقت کا بھی
ذکر کیا ہے۔ یہ بیان انھیں روایتاً بزرگوں سے پہنچا ہے۔ میر امّن ہندیوں میں پہلے
شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کے بننے اور اس کے نشو و نما کا حال لکھا ہے اس کا
خلاصہ یہ ہے "ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری
اور لودھی بادشاہ ہوئے اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبان نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی

"آخر امیر تیمور نے ہندستان کو لیا ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا"۔ . . . "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب اقوام قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہ جہاں صاحب قرآن نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا . . . . تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا . . . . اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّیٰ خطاب دیا"۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالم گیر ثانی کے وقت تلک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی، ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی"۔

گریرسن نے اس زبان کی مشہور اور جامع کتاب[1] میں کوئی علاحدہ حیثیت قائم نہیں کی اور اسے مغربی ہندی کی ایک شاخ قرار دے کر چھوڑ دیا ہے۔ ان کے دوسرے مقلدین نے یہی راہ اختیار کی ہے۔ اور اس پر فارسی عربی زبان کا اثر جو مختلف حیثیتوں سے ہوا ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مخلوط زبان ہے جس نے بالکل نئی اور علاحدہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اور اس نظر سے بھی اس کا دیکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک علاحدہ مسئلہ ہے جس پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔

---

[1] LINGUISTIC SURUEY OF INDIA

# مقدّمۂ حیات النّذیر

(مؤلّفہ مولوی سیّد افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم)

یہ بھی اردو علمِ ادب کی ترقّی کی علامت ہی کہ مشاہیر ملک کے حالات پر بہت سی اچھّی اچھّی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ اب تک زیادہ تر اُن قدما کے حالات لکھے گئے ہیں جو بہ لحاظ تقدّس و دیگر کارہائے نمایاں پہلے ہی سے ہیرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے سوانح قدیم عربی کتب میں جابجا پائے جاتے ہیں یا اُن کے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں اور ان کی عزّت و وقعت صدہا سال سے ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہی۔ ان مؤلّفین کو یہ آسانی ہوتی ہی کہ مواد تیار ملتا ہی البتہ مختلف کتابوں سے حالات جمع کرنے اور ترتیب میں ادل بدل کرکے اُردو زبان میں پیش کرنے کی زحمت ضرور گوارا کرنی پڑتی ہی۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب عمدہ اور زبان فصیح ہوتی ہی تو ان کا مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ لوگ پہلے ہی سے مقبولِ خاص و عام ہیں۔ مگر ہم عصر مشاہیر کے حالات کا لکھنا اس کے مقابلے میں بہت کٹھن ہی۔ اوّل تو تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے بعد کیریکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ایسی دشواری ہی جسے اس کا جی جانتا ہی جس کو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہی۔ دوسرے صدہا

شخص ایسے زندہ موجود ہیں جو اس نام ور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور اُنھوں نے اس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے اور اس کے متعلق خاص رائے رکھتے ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اُس کی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے ہاتھ میں جانے والی ہے اور اس لیے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لیے بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مؤلفِ 'حیات النذیر' نے ہماری قوم کے ایک علامہ کا قول نقل کر کے آج کل کے طریقۂ تحریر سوانح عمری اور اس پر پُر زور بحث کی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سا ایسا زمانہ تھا جب کہ یہ پُر فریب طریقہ رائج نہ تھا۔ علامہ موصوف کو کبھی کسی ہم عصر نام ور شخص کی (بہ شرطے کہ وہ کسی ہم عصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ انھیں اس سے زیادہ دشواری پیش آتی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انھوں نے اب تک انھیں قدمائے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جنھیں لوگ ایک زمانے سے پوجتے آتے ہیں اور جن کی تنقید اور نکتہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اس "پر فریب طریقہ" سے پاک صاف ہیں؟

بات یہ ہے کہ بڑے آدمی کی بڑائی صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے تعلقات، گرد و پیش کے حالات اور قومی و ملکی معاملات سے تلے بلے کی طرح ایسے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُس کی ذات کو اُن سے جُدا کرنا قریب قریب ناممکن کے ہوتا ہے، ورنہ بڑا آدمی کچھ بڑا نہیں رہتا۔ اس لیے سوانح نگار کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اس شخص کے کیریکٹر کو ان تمام گرد و پیش کے واقعات و حالات کی روشنی میں دکھائے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اختلاف رائے ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ہم عصر مشاہیر کے متعلق بعض غلط فہمیاں عام طور پر پھیل جاتی ہیں۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں اور

غلط بیانیوں کو صحیح اور سچے واقعات اور اس کے وسیع تعلقات اور اصلی خیالات کے اظہار سے جن پر عام لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی، رفع کرے اور اپنی رائے اور صحیح قیاس

. . . . . . . . . . . .

کے اظہار سے دریغ نہ کرے اور محض مخالفوں کے ڈر سے یا اُن کی خوشی کے لیے عامیانہ مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر پہلو نہ بچائے۔ انصاف پسند لوگ سوانح نگار کی اس محنت کی داد دیں گے اور اس کے ممنون ہوں گے اگرچہ بدبین لوگوں کو اس سے تکلیف ضرور ہوگی۔ نرے خالی خولی ذاتی حالات کا بیان کردینا کافی نہیں ہے۔ اور کوئی سوانح نگار اس طور پر اپنے فرض سے سبک دوش نہیں ہوسکتا۔ جس قدر جو شخص بڑا ہوگا اسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ وسعتِ تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف اُلجھن پیدا ہوتی ہے بلکہ غلطی واقع ہوجاتی ہے اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد و پیش کے حالات کا اثر اُس پر اور اُس کا اثر اُن حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر غلطی و صحت کے اس کی نیت کا اندازہ کرنا پڑے گا اس کے اصلی اور اندرونی خیالات کو دیکھنا پڑے گا۔ اس کے برتاؤ، اس کے طرزِ کلام و طرزِ تحریر، اس کی عام روش اور رجحان کی تلاش کرنا پڑے گی۔ غرض سوانح نگار اس تمام چھان بین، کرید، جستجو اور تلاش کے بعد صحیح قیاس اور رائے قائم کرسکے گا اور اس سے اس کی اپنی نیز اور لوگوں کی بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوجائیں گی۔ اگر سوانح نگار ایسا شخص ہو جو اس بڑے شخص کی خوبیوں کا قدردان نہیں تو کیا وہ اس اہم فرض کو ادا کرسکتا ہے؟ مثلاً اگر وہی کتاب جسے علامہ موصوف نے ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری فرمایا ہے خود اُن کو لکھنے کے لیے دی جاتی تو ناظرین سمجھ سکتے کہ وہ کیا ہوتی۔

یہ بحث ممکن ہی کہ بعض حضرات کو گراں گزرے لیکن اس موقع پر مجھے اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ مولوی افتخار عالم صاحب نے ہمارے زمانے کے ایک ایسے نام ور شخص کی سوانح عمری لکھی ہی جن کے مخالف بھی بہت سے لوگ موجود ہیں اور جن کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی خاص وعام میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مَیں نہایت مسرت کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ مؤلف 'حیات النذیر' نے اس اہم فرض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہی اور ممکن ہی کہ بعض کٹ حجّت لوگ اُن کے فیصلے کو تسلیم نہ کریں لیکن جب وہ بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو کم سے کم اپنی رائے میں جھوجھرے ضرور ہو جائیں گے۔

شمس العلما ڈاکٹر مولانا نذیر احمد مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فردِ بے نظیر گزرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اُردو زبان زندہ ہی ان کا نام بلاشبہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت واستقلال اور قابلیت سے دنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ایک ادنیٰ طالب علم سے اعلیٰ درجے کے فاضل ہو گئے اُن کی زندگی سیلف ہلپ (اپنی مدد سے آپ بڑھنے) کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہی انھوں نے معلّمی سے زندگی شروع کی اور آخر عمر تک معلّم رہے۔ اُن کی تعلیم اُن کی تصانیف کے صفحات میں موجود ہی۔ ان کا کلام اصلاحِ معاشرت (سوشل ریفارم) ہی یعنی یہ کہ دنیا میں خوش کام یاب اور بے لوث زندگی کیوں کر بسر کرنی چاہیے۔ ایک بڑا کمال ان کی تصانیف میں یہ ہی کہ انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرُونی معاشرت کی تصویر ایسی سچّی اور بے لاگ کھینچی ہی کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہی اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شبہہ ہوتا ہی کہ کہیں اسی کے خاندان کے پترے تو نہیں کُھل رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے اردو میں اس زمانے

ایسے ایسے باکمال انشا پرداز ہوئے اور اب بھی زندہ موجود ہیں جو اُردو زبان اور اپنی قوم کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ مثلاً کسی نے تاریخی واقعات کی چھان بین کر کے عجیب حالات کا انکشاف کیا ہے۔ کسی نے دربارِ شاہی کی شان و شوکت یا جنگ کے خوں ریز منظر کا مرقع کھینچا ہے۔ کسی نے قوم کے گزشتہ جاہ و جلال پر فصاحت کے دریا بہا دیے ہیں۔ کسی نے قومی ادبار و مذلت پر پُر درد نوحہ پڑھا ہے۔ لیکن روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں اُن کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہوا اور بیان بھی کیسا؟ ایسا پُر لطف ایسا سچا اور سلجھا ہوا کہ دل میں کھب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آجائیں۔ ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں صحرا بھی ہو دریا بھی ہو آسان ہے لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشیا تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اُسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بہ درجۂ کمال موجود تھی۔

مولانا کا احسان تعلیمِ نسواں پر بھی کچھ کم نہیں بلکہ میرے خیال میں حامیانِ تعلیمِ نسواں کی تقریروں، لیکچروں، تحریروں اور قیامِ مدارس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان لوگوں نے پڑھنے کی ترغیب دی اور اس کے وسائل بہم پہنچائے مگر مولانا نے لڑکیوں کو پڑھنا سکھایا اور یہی نہیں بلکہ پڑھتے میں جو ایک مزہ ہے وہ دلوں میں پیدا کیا۔ مرحوم اگر "مراۃ العروس" کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشا پرداز مانے جاتے اور ان کی حیاتِ جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ ایک بڑی خوبی اس میں (اور ان کی دوسری کتابوں میں بھی)

یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور ان کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ خود عورتیں قائل ہو جاتی ہیں۔ یہ بات مرحوم کے سوا اُردو کے کسی دوسرے مصنّف کو حاصل نہیں ؛

مولانا اپنی طرزِ تحریر کے آپ موجد تھے اور یہ انھیں کی ذات سے مخصوص ہے اس میں بڑی بے تکلفی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ انشاپرداز کو بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ جو خیال اس کے دل میں آیا ہے اُسے اُسی قوت اور شان کے ساتھ الفاظ میں ادا کرے اور اس لیے اُسے اکثر اوقات تشبیہ و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو کبھی ایسی دقت محسوس نہیں ہوئی وہ کبھی تشبیہات و استعارات سے کام نہیں لیتے اور ایسے ٹھیٹ جان دار اور چسپاں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اُن سے بہتر اس خیال کے اظہار کے لیے سمجھ میں نہیں آتے۔ زبان پر انھیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ شاید آج تک کسی اُردو انشاپرداز کو نصیب نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا خیال کبھی تشنہ نہیں رہتا۔ آمد کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے ان کی طبیعت قدرتی طور پر پُرزور واقع ہوئی تھی اور یہی زور ان کے تمام خیالات اور الفاظ میں ہے۔ جو قوت اور زور اُن کی عبارت میں ہے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اُنھیں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا تشبیہات و استعارات سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں۔ وہ اسی زبان میں سے جسے ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں' ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ گویا وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لیے بنے ہیں اور پھر اس پر ظرافت سونے میں سہاگے کا کام دیتی ہے۔ اُن پر یہ اعتراض کیا گیا ہے اور وہ ایک حد تک بجا اور صحیح بھی ہے کہ وہ بعض اوقات رکیک اور مبتذل الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو وہی ہے جو میں ابھی بیان کر چکا

ہوں یعنی وہ ہیر پھیر اور تشبیہات واستعارات سے کام لینا نہیں جانتے۔ دُوسرے طبیعت قدرتًا واقع ہوئی تھی پُرزور وہ اپنے خیال کو اسی زور اور شان کے ساتھ ادا کرنے کے لیے الفاظ کی پروا نہیں کرتے تھے جن الفاظ میں ان کا اصلی خیال صحیح طور سے ادا ہوسکتا تھا اُن کے استعمال میں کبھی نہ چوکتے تھے اور یہ فعل ان کا کوئی ارادی نہ تھا بلکہ طبیعت کی افتاد ہی ایسی تھی۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت میں آورد نہ تھی بلکہ سراسر آمد تھی۔ علاوہ اس کے آدمی تھے صاف گو اور آزادہ رو، جو دل میں تھا وہ زبان پر اور اس پر شوخی وظرافت اور غضب تھی یہی وجوہ ہیں کہ ان کی ایک کتاب پر اس قدر شور وغل مچا۔

مرحوم جیسے اعلیٰ درجے کے محرّر تھے ویسے ہی مقرّر بھی تھے۔ لوگ ان کے لکچروں میں اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے جیسے قحط کے مارے کھانے پر گرتے ہیں۔ ہم نے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں خود دیکھا ہے کہ گرمی کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہے ہزاروں بندگانِ خدا دھوپ میں بیٹھے ہیں مگر کیا مجال کہ پہلو تک بدلیں۔ کلام میں تاثیر بھی وہ تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جب چاہا رلا دیا۔ آواز بھی ایسی ملی تھی کہ سب جگہ یکساں پہنچتی تھی اور اس میں ایک خداداد اثر تھا۔ شوخی وظرافت خاص کر ان کے لیکچروں میں دیکھنے اور سننے کے قابل تھی۔ ایسا اعلیٰ درجے کا مقرّر ہمارے مُلک میں پیدا نہیں ہوا۔ وہ سارے مُلک پر چھا جاتے تھے اور حاضرینِ مجلس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے سحر کردیا ہو۔ مسٹر مارٹین کی جو رائے مؤلف نے لکھی ہے وہ بالکل صحیح اور بے مبالغہ ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مدرسہ طبّیہ دہلی ہمیشہ ان کے لکچروں کے شرمندۂ احسان رہیں گے۔ ان کے لکچروں کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں کے کہیں چلے جاتے تھے۔ یہ اعتراض شاید کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ

جیسی اُن کی طبیعت، ان کی تحریر، ان کی عبارت، ان کے الفاظ اور ان کی تقریر پُرزور تھی ویسے ہی ان کا خیال بھی پُرزور تھا اور تخیل کے پرواز میں دُور تک پہنچ جاتے تھے لیکن اتنی دُور نہیں کہ نظر سے غائب ہو جائیں۔ جولانیٔ طبع انھیں اِدھر سے اُدھر ضرور لے جاتی تھی لیکن تاہم بحث کے آس پاس ہی رہتے تھے ؎

ہمارے اس زمانے کے اہلِ قلم سوائے ایک دو کے زیادہ تر ترجمان ہیں، انگریزی کے یا عربی کے۔ مگر مرحوم میں جدت پائی جاتی ہے اور وہ اپنے خیالات اور تحریرات کے لیے کسی دُوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور یہ ان کی اعلیٰ دماغی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ان کی اصل تصانیف، ان کی جدت طرازی، ان کے پرزور تخیل اور مشاہدے کے نتائج ہیں۔ وہ نقل نہیں ہیں بلکہ اصل ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ انوکھی اور دل آویز ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول خاص و عام ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ جو لوگ اردُو سیکھنا اور اپنے خیالات انگریزی نما اُردُو میں نہیں بلکہ ٹھیٹ اردُو میں ادا کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے مولانا کی تصانیف کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے کیوں کہ اپنے خیال یا مافی الضمیر کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچنا ان پر ختم ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ ان کا پُورا پورا تتبع کریں۔ کیوں کہ یہ نہ صرف مشکل ہے بلکہ شاید مفید بھی نہ ہو مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم ان کی تصانیف کے مطالعے سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ؎

اس جدید زمانے میں مسلمانوں میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوئے ہیں خواہ وہ کسی خیال اور کسی رنگ کے ہوں سرسید علیہ الرحمہ سے لے کر شمس العلما مولانا شبلی نعمانی تک (بہ استثنا شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ مرحوم) سب میں زیادہ تر دینی لگاؤ تھا۔ ان کی تان دین ہی پر ٹوٹتی ہے اور یہی ان کے خیالات اور اعمال کا مرکز ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ یوں تو ان کی اکثر

تصانیف میں یہ لگاؤ نظر آتا ہے لیکن انھوں نے خاص خاص کتابیں مثلاً 'رویائے صادقہ'، 'اجتہاد'، 'الحقوق والفرائض'، 'امہات الامہ' لکھ کر اور خاص کر ترجمہ قرآن مجید سے ایسی عظیم الشان دینی خدمت ادا کی کہ مسلمان ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کی دینی خدمت کے متعلق یہاں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا، مؤلف 'حیات النذیر' اس پر خوب دل کھول کر لکھ چکے ہیں۔ لیکن ترجمہ قرآن مجید کے متعلق چند الفاظ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ترجمے کی تمام خوبیوں کا گنوانا تو میری طاقت سے باہر ہے لیکن اس سے بڑھ کر اور کیا خوبی ہوگی کہ ہزارہا مسلمان جو اب تک قرآن پاک کے سمجھنے سے قاصر تھے اب بلا تکلف قرآن کے مطالب سمجھنے لگے اور خدا کے احکام خود اسی کے کلام کے ذریعے سے جاننے لگے۔ اُردو ترجمے اس سے پہلے بھی موجود تھے لیکن ترجمے کیا تھے الفاظ کے گورکھ دھندے تھے خاک سمجھ میں نہیں آتے تھے اور سمجھ میں آئیں تو کیوں کر، مکھی پر مکھی ماردی جاتی تھی اور جو طبیعت پر زور دے کر کچھ سمجھے بھی تو وہ لطفِ فصاحت کہاں جس کے لیے قرآن سارے عالم میں مشہور رہے۔ قرآنِ پاک کا یہ پہلا اردو ترجمہ ہے جس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علاوہ زبان کی سلاست اور فصاحت کے جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قائم رہے۔ مولانا چوں کہ عربی اور اردو کے بے مثل ادیب تھے اور زبان کا خاص ذوق تھا اس لیے ترجمے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہونی چاہییں۔ مسلسل پڑھتے جائیے سارے مطالب سمجھ میں آتے جاتے ہیں اور فصاحت اور ادبیت کا لطف ایسا کہ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اس سے بڑھ کر اور دینی خدمت کیا ہوگی اور یہ صرف دینی ہی خدمت نہیں بلکہ اردو ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

اب تک بعض لوگ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ مولانا شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ

سب ترجموں سے افضل ہے اور مرحوم کا ترجمہ اس سے لگا نہیں کھاتا۔ اس میں اب بحث کی ضرورت نہیں عام مقبولیت نے ثابت کر دیا ہے کہ مرحوم کا ترجمہ ایسا مطلب خیز، فصیح اور شگفتہ ہے کہ موجودہ ترجموں میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک بات میں البتہ شاہ صاحبؒ کے ترجمے کو فضیلت ہے اور یہ فضیلت غالباً اسے ہمیشہ رہے گی وہ یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر عربی الفاظ کا ترجمہ انھوں نے ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ میں کیا ہے کہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ خصوصاً جہاں کہیں ایسے الفاظ آ گئے ہیں کہ ان میں اشتراکِ معانی کی بحث آ پڑی ہے تو انھوں نے ہندی کے بھی ایسے ہی لفظ چُن کر رکھے ہیں کہ ان میں بھی اشتراک کا وہی لطف باقی رہتا ہے اور یہ ان کے کمالِ ادبیت کی دلیل ہے۔ مگر اس کا لطف صرف ادیب ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ مطالبِ قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ بامحاورہ، فصیح اور شگفتہ ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے اس ترجمے کے ضمن میں ایک مزے کی بات اور کہنی ہے جس سے ہماری قوم کے علما کی حالت کا پتا لگتا ہے۔ مولانا کے ترجمے کا شایع ہونا تھا کہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ ان حضرات کے ترجمے بھی شایع ہونا شروع ہوئے اور اکثر یہ اعتراضات اس نیّت سے کیے گئے تھے کہ مولانا کے ترجمے کی طرف سے لوگ بدگمان ہو جائیں اور ہمارے ترجمے بکنے لگیں۔ افسوس اس سے قبل کسی کو ترجمے کی ضرورت کا خیال نہ ہوا اور اب جو مولانا کا ترجمہ شایع ہوا اور اس کی شہرت ہوئی تو یہ بھی لگے منہ چڑانے۔ لیکن مولانا کے ترجمے کے سامنے کسی کو فروغ نہ ہوا۔ ان اعتراضات یا اسی قسم کی تحریرات میں جہاں کہیں مرحوم کا نام آتا تو یہ مولوی مارے جلن کے ان کے نام کے ساتھ کبھی مولوی کا لفظ نہ لکھتے بلکہ ہر جگہ ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے تھے یہ کم ظرفی کی بات نہیں تو کیا ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص باوجود عالم، حافظ اور مترجم قرآن ہونے کے بھی ان مولویوں کے نزدیک مولوی کہلانے کا مستحق نہیں جن کے علم و فضل کی ساری پونجی مسلمانوں کے ارتداد و کفر کے فتوے لکھنے میں صرف ہوتی ہے۔

بڑے اور نام ور لوگوں پر اکثر اپنے ہم عصروں کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں مولانا بھی آخر عمر میں اس سے نہ بچے۔ 'امہات الامہ' کا شایع ہونا تھا کہ دلّی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مولوی تو پہلے ہی ان سے جلے بیٹھے تھے ان کی بن آئی خوب جلے پھپولے پھوڑے۔ مخالفت میں رسالے چھپوائے، طرح طرح کے بہتان باندھے، کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہو گئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ یہ غدر دلّی سے اٹھا اور دوسرے مقامات تک پہنچا۔ لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلما کا جو اجلاس دلّی میں ہوا اس میں علمائے کرام تو موجود تھے ہی انھوں نے باہم "مسکوٹ" کر کے 'امہات الامہ' کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوادی تھیں اور بکری موقوف کرادی تھی، منگوائیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا اور ان میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لیے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کہہ کر آگ لگا دی۔ اُس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور اُن کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوف ناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خوں خوار درندے یا سنگ دل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانائے مرحوم بھی اس

آگ میں جھونک دیے جاتے۔ یہ منظر قابلِ دید تھا، مولویوں کا یہ حلقہ زمانۂ وسطیٰ کے اُن پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنھوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بےگناہ انسان زندہ دہکتی آگ میں جھونک دیے، کڑکڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دیے، گلوں میں پتھر باندھ کر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیے، کتوں سے پھڑوا دیے اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب و غریب شکنجوں میں کس کس کر سسکا سسکا کر مار ڈالے۔ اُن کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودۂ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا، یہ راکھ اس قابل تھی کہ اس کی ایک ایک چٹکی بہ طور ایک یادگار کے شیشوں میں بند کر کے رکھ لی جاتی تاکہ آیندہ نسلیں اسے سامنے رکھ کر ان علمائے کرام و مصلحانِ ملک و ملت کی ارواحِ پاک پر فاتحہ دلاتیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں۔

اس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوسِ مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجاتِ اخروی کا باعث ہوگی۔ یہ اُن بزرگوں کا کام ہے جنھوں نے چشمِ بد دُور مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں جب مَیں انگریزی تاریخوں اور دُوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلائل اور پرزور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہوگئی اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے۔ مگر جب مجھے اس واقعے کی خبر لگی اور خصوصاً جب مَیں نے بہ

سُنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کارِ خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا۔ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانۂ اسکندریہ جلادیا ہو:

اس واقعے کا ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ جب مرحوم کے فرزندِ رشید نے مدرسۃ العلوم مسلمانانِ (علی گڑھ) سے اپنے پدرِ بزرگوار کی یادگار قائم کرنے کی درخواست کی اور خود بھی اس میں معقول امداد دینے کا وعدہ کیا تو کالج کے سنڈی کیٹ نے بڑی ڈھٹائی سے مولویوں کے ڈر کے مارے صاف انکار کردیا اور انکار کی وجہ مرحوم کے معتقدات قرار دی جو ان کے زعم شریف میں خلافِ اسلام تھے۔ کوئی ممبرانِ سنڈی کیٹ سے پوچھے کہ تم کسی کے مذہب پر رائے دینے والے کون! اور اس معاملے کو مذہب سے تعلق! سر ولیم میور اور میکڈانلڈ جیسے لوگوں کی تو یادگار قائم کی جائے اور ایک حافظ، عالم، مترجمِ قرآن، محسنِ کالج کی یادگار قائم کرنے میں یہ انکار اور انکار بھی کیسا ناروا اور شرمناک! خصوصاً جب کہ ارکانِ سنڈی کیٹ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کتاب "اُمہات الامہ" کو بالاستیعاب پڑھا ہو صرف مولویوں کے خوف سے یہ فیصلہ کردیا۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ کارکنانِ کالج میں مداہنت اور بزدلی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہی حال رہا تو جس غرض سے بانیٔ کالج نے یہ کالج قائم کیا تھا وہ فوت ہوجائے گی اور اس کا وجود بے سود ثابت ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بعد میں اپنے کیے سے پچھتائے اور اس کی تلافی اس طرح کی کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے متعلق رزولیوشن پاس کیا غنیمت ہے۔ دیکھیں ہمارے علما کیا کرتے ہیں؟ تلافی تو خیر وہ کیا کریں گے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے خلاف فتویٰ نہ لکھ ماریں:

مرحوم کے حق میں یہ صریح بے انصافی اور سخت ظلم ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ

انصاف پسند اصحاب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس محسنِ ملک وقوم کی یادگار قائم کرنے میں سعی بلیغ فرمائیں گے ورنہ ہماری قوم پر یہ بڑا دھبا رہ جائے گا۔

قابل مؤلف نے مرحوم کے کیریکٹر کے متعلق مفصل اور کافی بحث کی ہے اس کے بعد اس پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مرحوم میں بڑی بڑی خوبیاں تھیں اور سب سے بڑی صفت ان کی معاشرت میں اعتدال اور کفایت شعاری کی تھی جس کی آج کل ہمیں بڑی ضرورت ہے اور ہماری تمدنی اصلاح کا بڑا دارومدار اسی پر ہے۔ لیکن اس سے حاصل؟ کیا عمر بھر کی کفایت شعاری کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے کہ اس کا سارا مال اولاد باہم تقسیم کرے؟ کیا اس میں قوم کا کوئی حصہ نہیں؟ خصوصاً جب کہ اولاد کھاتی پیتی اور مرفہ الحال ہو۔ ایثار کی تلقین کرنا اور بات ہے اور اس پر عمل کرنا اور۔ کسی شے کا علم عمل کے لیے کافی نہیں۔ اعمال پر تربیت اور خاص کر ابتدائی تربیت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے الاماشاءاللہ۔ البتہ اس زمانے میں مولوی کرامت حسین صاحب کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے جو ہر طرح قابلِ تحسین اور لائقِ تقلید ہے۔ انھوں نے بھی اپنی عمر کفایت شعاری میں بسر کی لیکن اس کے ساتھ ہی اپنا سارا اندوختہ قوم کی نذر کر دیا۔

گزشتہ اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایام میں ترقیٔ اردو کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا اس میں علاوہ دیگر تجاویز کے ایک یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ محسنینِ اردو کی سوانح عمریاں لکھوائی جائیں۔ اس میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا نام بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی جب یہ معلوم ہوا کہ مولوی افتخار عالم صاحب اس کام کو کر رہے ہیں بلکہ کر چکے ہیں تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور حسنِ اتفاق سے چند ہی روز بعد اُن سے ملاقات بھی ہو گئی تو میں نے ان کی خدمت میں مبارک باد

عرض کی اور اپنی بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بڑا کام کیا اور بڑا احسان کیا ہے اور جس محنت، جاں فشانی اور لگاتار کوشش سے اس فرض کو انجام دیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے سوانح عمری کا حق ادا کیا ہے۔ مرحوم کی یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ انھیں ایسا سوانح نگار ملا جس نے اس کام کو نہایت ہم دردی، دل سوزی اور صداقت کے ساتھ پورا کیا ہے۔ طرزِ تحریر بھی فصیح اور شگفتہ ہے۔ بعض جگہ تو مجھے شبہ ہو جاتا تھا کہ کہیں مرحوم کی عبارت تو نہیں۔ امید ہے کہ پبلک اور خاص کر مرحوم کی تصانیف کے دل دادہ ضرور اس کی قدر کریں گے۔

قابل مؤلف نے اس کتاب کو علیا حضرت ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کے چھوٹے صاحب زادے حمید اللہ خان بہادر کے نام معنون کیا ہے۔ صاحب زادہ صاحب مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہونہار اور لائق نوجوان ہیں۔ ہم دردی قدردانی اور فیاضی میں اپنی والدۂ ماجدہ کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ اگلے زمانے میں مؤلفین و مصنفین کو امرا اور رؤسا کے درباروں سے ایسے ایسے صلے ملتے تھے کہ وہ عمر بھر کو نہال ہو جاتے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ لائق مؤلف کی جاں کاہی اور محنت کی قدر ان کی لیاقت کے موافق کی جائے گی۔

# مقدّمۂ مکتوباتِ حالی

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب، ہم اُن عالی حوصلہ اور الوالعزم مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت انگیز جدوجہد، قربانیوں اور عظیم الشّان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم وکلام نے ایک عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح دنیا سے تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم اُن سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ اُن کے پاس سے جو اُٹھا کچھ لے کر اُٹھا اور۔ اُن کے پاس جو گیا وہ کچھ بن کر آیا۔ مولانا حالی اُن پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور ان سے محبت بھی۔ اُن کے کلام نے اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور یہ اُسی کا طفیل ہے کہ آج اردو شاعری کا قدم ترقّی کی طرف نظر آتا ہے۔ اور اسی طرح ان کی متین اور جچی تُلی نثر اور تنقید نے اردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے یہ چیزیں ہمارے دل میں ان کا ادب واحترام پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف ان کی سیرت ہے اُن کے پاکیزہ

اخلاق و اطوار، ان کی دل سوزی اور ہم دردی کا دلوں پر اثر پڑتا ہی۔ وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر اُن کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بہ خود ان کی طرف کھنچ جاتے تھے۔ وہ کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے روکتے رہتے تھے، یہاں تک کہ جن لوگوں نے اُن پر سخت اور بے جا تنقیدیں کیں اُن کو بھی انھوں نے سراہا۔ اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا، جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے۔ ہم دردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھ کر خود تڑپنے لگتے تھے۔ باوجود ایک اعلیٰ پایے کے ادیب اور شاعر ہونے کے مزاج میں بے حد انکسار اور فروتنی تھی۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو دلوں میں گھر کر لیتی تھیں اور ان کی طرف سے محبت پیدا کرتی تھیں۔ اگرچہ خطوں کے اس مجموعے میں جو اب چھپ کر شایع ہوا ہی زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روزمرّہ کی معمولی باتیں، آئے دن کے آلام و افکار، اپنی اور دوسروں کی بیماری و مصیبت کا ذکر ہی مگر اُن میں بھی ایک بات پائی جاتی ہی علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہم عصروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں ان کے دلی خیالات اور اُن محاسن کا پتا لگتا ہی جن کا ذکر ہم نے کیا ہی۔

ان میں سے اکثر خط اس وقت کے لکھے ہوئے ہیں جب وہ سرسید مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ اس قابلِ قدر اور بے مثل کتاب کے لکھنے میں انھوں نے بے حد جاں فشانی اور کاوش سے کام کیا اور باوجود اپنی بیماری، خانگی پریشانیوں اور جھگڑوں اور ایک نواسے کے لاعلاج مرض کے جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ وہ برابر اُسے لپٹے رہے اور کئی سال تک خونِ جگر کھانے

کے بعد اسے تمام کیا۔ جو کتاب اس قدر دماغ سوزی، زحمت اور مسلسل کوشش اور جگر کاوی کے بعد لکھی گئی تھی جب وہ شایع ہوئی اور ان لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی جن سے خاص طور پر یہ توقع تھی کہ وہ اس کی قدر کریں گے اور جو سرسیّد مرحوم کے فدائی، ساتھی اور ہم درد تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس کا قلق ہوا۔ چناں چہ وہ ایک صاحب کو جو نواحِ علی گڑھ کے رئیس اور روشن خیال، صاحبِ ذوق اور صاحبِ علم ہیں، لکھتے ہیں:۔

"ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ 'حیاتِ جاوید' کی جلدیں تینوں قسم کی ڈیوٹی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے منگوالی ہوگی، کیوں کہ اگر مصنّف قابلِ وقعت نہ تھا تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہیے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنّف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا میں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا اگرچہ اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدر دانی سے وہی شخص خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا کوئی اور مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسیّد کا کوئی دوست اس کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔

اور اخباروں کو جانے دیجیے 'علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'، جس کو سرسیّد کی یادگار کہا جاتا ہے اور جس کا اہتمام محمڈن کالج کے آنریری سیکرٹری اور

سرسید کے جانشین اور ان کے زبدۂ احباب کے ہاتھ میں ہے آج تک "حیاتِ جاوید" کی نسبت اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارِ گراں کو اپنے ذمے لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرضِ کفایہ سے سبک دوش کیا ہے اور اس لیے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سرسید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو بھی اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے مگر آج تک کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب متوقّع ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃً پیش کی جائے۔ . . . . صاحب نے سرسید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پان صد رُپے کی کتابیں خرید کر کالج کو دوں گا مگر میں سرسید کو اور اپنے تئیں بڑا خوش قسمت سمجھوں گا جب یہ سنوں گا کہ انھوں نے کوئی کاپی ڈیوٹی سے خرید فرمائی ہے اور اس کو مطالعے کے لائق سمجھا ہے۔ آپ یقین جانیے کہ میں اس زمانے کی لٹریری ترقّی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو جو میری طرح محض اردو اور فارسی کے مردِ میدان ہیں لاشی محض جانتا ہوں مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں منتہائے طاقت صرف کرتی ہے وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ اُن سے بھی زیادہ گراں قدر تصوّر کرتی ہے"۔

یہ مولانا کے انتہائی رنج اور صدمے کا اظہار ہے ورنہ وہ ایسے نیک مزاج اور شریف النّفس تھے کہ تحریر میں تو کیا زبان پر بھی کسی کی شکایت نہیں آتی تھی اور

یہ بھی انھوں نے ایک خانگی خط میں لکھا ہے اور وہ بھی ایک ایسے صاحب کو جو اُن کے اور اچھی کتابوں کے قدر دان تھے اور جن سے ایک حد تک بے تکلفی بھی تھی اور پھر وہ ایک عام حالت کا نقشہ ہے جس کا بیان کرنا کچھ ایسا معیوب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس خط سے رنج اور صدمے کا اظہار ہوتا ہے اور ایک طرح کی شکایت بھی پائی جاتی ہے لیکن دیکھا جائے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کے لیے دل شکن ہو۔ اگر ان کے بعض نام ور ہم عصر مصنّفین کی تحریروں یا خطوں سے مقابلہ کیا جائے جو انھوں نے ایسے موقعوں پر لکھی ہیں تو یہ تحریر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے صدمے اور رنج کی انتہا یہ ہو وہ کیسا پاک سیرت ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ سر سیّد کی دل سے قدر کرتے تھے اور سر سیّد کو مرے بھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ابھی سے ان لوگوں کا جو سر سیّد کی محبّت اور جاں نثاری کا دم بھرتے تھے یہ حال ہے تو انھیں بہت شاق گزرا۔ گھاؤ تازہ تھا پھوٹ پڑا ۔

اس خط میں ایک دوسری حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا ہے جو بہت ہی قابلِ افسوس ہے۔ ہمارے ہاں کے متموّل اور صاحبِ ثروت لوگ کسی تصنیف کی قدر کرنا تو کجا خرید کر پڑھنا بھی نہیں جانتے اور اس بات کے متوقّع رہتے ہیں کہ مصنّف اُن کی خدمت میں اُس کا نسخہ ہدیۃً پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کی بہتر سے بہتر کتاب بھی اتنی نہیں بِکتی جتنی دوسرے ممالک میں معمولی درجے کی کتابیں فروخت ہو جاتی ہیں۔ سر سیّد کے احباب کی اس بے اعتنائی کا اُن کے دل پر اس قدر اثر تھا کہ انھیں تاریخوں میں ایک خط میں جو انھوں نے اپنے ایک نیاز مند کے نام لکھا ہے اس دکھڑے کو پھر رویا ہے۔ چوں کہ یہ ایسی بپتا ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں اس لیے اس خط کے ایک حصّے کی نقل کرنے کے لیے کسی معذرت کی

ضرورت نہیں معلوم ہوتی :-

"میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگریفی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے بلکہ مجھے اپنی کم زوریاں اور لغزشیں بہ خوبی معلوم ہیں۔ اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیوگریفی کا حق ادا نہیں ہوسکا۔ لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کسی متنفس نے قلم یا درم سے بہ راہِ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی (الا ماشاء اللہ) پس اگرچہ یہ کام فی نفسہٖ کچھ قدر کے لائق نہ ہو مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے ضرور توجہ کے لائق ہے ....

..... میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، جب میں نے مسدس' مد و جزرِ اسلام' کا پہلا اڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سرسیّد مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اُس کے متعلق مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو، فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں۔ میں نے جواب لکھ بھیجا۔ انھوں نے اسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیج دو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنّف کے پاس بھیج دیجیے۔ چناں چہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں سب فروخت ہوگئیں اور دوسرا اڈیشن چھپوانے کی ضرورت ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اُن کے بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقّع ہیں کہ ان کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔ بعضے قیمت بہت گراں بتلاتے ہیں اور یہ تو

کسی سے بھی امید نہیں کہ مصنّف کی محنت کی داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے ؎

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نہ شد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بے جا سوختیم "

یہ خط بہت پُر درد ہے۔ خط کیا ہے ہماری قوم کی ناقدردانی کا مرقّع ہے۔ اگرچہ اس خط کو لکھے چوبیس برس ہوئے ہیں اور ملک کے خیالات میں بہت کچھ تغیّر و تبدّل ہو گیا ہے لیکن علمی قدردانی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

" جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم "

علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھیں کمال ہم دردی تھی، ان معاملات میں قلمے، درمے، قدمے ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان کی تائید اور ہم دردی میں ایسی ایسی بے مثل اور بیش بہا نظمیں لکھی ہیں کہ ان کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ ان کا ایک ایک شعر ہزاروں اور لاکھوں رُپے کے چندے پر بھاری ہے۔ ان خطوں میں بھی کالج اور کانفرنس کا جابجا ذکر آتا ہے اور جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے اس کے کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ خود شریک ہوتے ہیں دوسروں کو شرکت پر آمادہ کرتے ہیں۔ چندے کرتے ہیں، رائے دیتے ہیں۔ دوسروں کو رائے دینے اور کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ انھیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد شغف تھا اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بغیر تعلیم کے یہ قوم کبھی نہیں پنپنے کی۔ اپنے وطن پانی پت میں انھوں نے تعلیم کی بہت کچھ اشاعت کی۔ اپنے خاندان والوں کے سوا دوسروں کو بھی تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور اُن کے لیے آسانیاں پیدا کیں اور ہر قسم کی امداد

دی۔ پانی پت میں ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا۔

اِن خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتا چلتا ہی اور جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انھیں پڑھ کر بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کس قدر ہم دردی اور شفقت تھی۔ جب اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھ لغزش ہو گئی ہی یا کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ہی تو وہ اس قدر نرمی اور محبّت سے سمجھاتے تھے یا اس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سُننے والے کو کبھی بُرا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ ان کے کہنے کا اثر ہوتا تھا۔ مثلاً وہ اپنے ایک دوست کے فرزند کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"معلوم نہیں کہ انھوں نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہیں۔ اُن کو خدا تعالیٰ نے ایسی لیاقت دی ہی کہ ملک و قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور چوں کہ عنایتِ الٰہی سے تلاشِ معاش کی ضرورت نہیں ہی اس لیے اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک صرف کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی ناقدردانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائگاں کھونا ہی۔ اس موقع پر مَیں اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ عزیز موصوف بھی اس کو پڑھیں اور اگر وہ درحقیقت سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ہیں تو اس رباعی پر عمل کریں :۔

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ — موقع ہی اخیر فکر انجام کا یہ
بس حبِّ وطن کا جپ چکے نام بہت — اب کام کرو وقت ہی کام کا یہ

مولانا کا ایک نواسہ ہی جو ایک لاعلاج مرض میں مبتلا تھا اور جوں جوں اس کے دورے بڑھتے جاتے تھے اُس کا مزاج نازک ہوتا جاتا تھا۔ مولانا اُس کی اس طرح

ناز برداری کرتے تھے کہ ماں باپ بھی نہیں کر سکتے۔ دنیا بھر کا کوئی علاج ایسا نہ تھا جو انھوں نے نہ کیا ہو۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا تو کیا ذکر ہی اُن میں سے تو شاید ہی کوئی چھوٹا ہو اگر کسی عطائی کو بھی سُن پاتے کہ وہ اس بیماری کا علاج کرتا ہی تو وہاں جا پہنچتے۔ اگر کسی عامل کو سُن پایا تو اُس کے پاس دوڑے۔ کسی نے کوئی نسخہ بتا دیا تو اُس پر عمل کرنے پر آمادہ، غرض اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی تلخ تھی۔ وہ ایک بار اپنے چچا کے ہاں جاتا ہی اُس وقت مولانا نے اسے ایک خط لکھا ہی جس میں انھوں نے ددھیال اور ننھیال والوں کے برتاؤ کا فرق بتایا ہی اور پھر کس کس طرح یہ سمجھایا ہی کہ اسے وہاں کس طرح رہنا چاہیے۔ اس میں ایسی کام کی، تجربے کی، دوُر اندیشی کی باتیں لکھی ہیں کہ ایک بچّہ بھی پڑھ کر سمجھ لے اور اثر قبول کرنے افسوس کہ یہ خط کسی قدر طویل ہی اور ہم اُسے یہاں نقل نہیں کر سکتے، اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں لیکن انھیں چیزوں سے ایک انشا پرداز کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہی:

اپنے ایک نیاز مند کو لکھتے ہیں:۔

"اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت لطف آیا۔ نہایت پُرزور مضمون لکھا ہی . . . . . . . آپ ہی کا حصّہ تھا، مگر برٹش فارن پالیسی پر اس میں جا بہ جا نوک جھوک کی گئی ہی وہ سراسر خلافِ مصلحت ہی . . .

. . . مَیں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصّہ باقی رہا ہی۔ اُس میں ہندُستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو للّٰہ آپ اس سلسلے کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے"۔:

نصیحت کی تلخی کو کس طرح تعریف کی شیرینی سے گوارا کر دیا ہی:

ایک دوست کی بی بی کا انتقال ہو جاتا ہی، تعزیت کا خط لکھا ہی اُس میں تحریر

فرماتے ہیں :-

"اگرچہ یہ موقع نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہی مگر مَیں اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ خدا کے تمام کام مصلحت و حکمت سے بھرے ہوتے ہیں بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے حق میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں اتفاقاتِ تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہوگئی ہو اس کی قدر کرنی چاہیے اور اس سے کچھ کام لینا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہو کہ سید احمد خاں صاحب نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم کی نظر میں حاصل کی اس کا کیا سبب ہی؟ مَیں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ اُن کی اہلیہ اُن کی جوانی میں مرگئی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے دوسری شادی کی صلاح دی مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور اپنے بچّوں کو اپنے کنارِ شفقت میں لیا اور اُن کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور اپنی دماغی طاقتوں سے جو بہ سبب تجرّد کے اور زیادہ سرسبز اور شگفتہ ہوگئی تھیں وہ کام لیے جنھوں نے آج ان کو تمام ہندستان بلکہ تمام دنیا میں مشہور اور نامور کر دیا۔ اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہرگز یہ رتبہ ان کو حاصل نہ ہوتا۔ آپ کے لیے یہ نہایت عمدہ موقع ہو کہ آپ ہمہ تن اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جائیے اور نوکری بھی چاہے کرو چاہے نہ کرو اور اگر زیادہ ہمّت ہو تو خود بھی تحصیلِ علم کرو اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ پھر نہ اولاد کی تم کچھ خبر لے سکو گے اور نہ اپنی زندگی کا کچھ مزہ اٹھاؤ گے بلکہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور اولاد بے علم رہ جائے گی اور اُن کو آپ سے کچھ محبّت و الفت نہ رہے گی۔ اگر ان کو اپنا قوّتِ بازو

بنانا چاہتے ہو اور اپنی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتے اور اولاد کو علم و ہنر سکھانا چاہتے ہو تو کمال صبر و سکون اور عفت و پاک دامنی کے ساتھ تجرد اور آزادی میں بسر کرو" :-

جب کوئی اُن کی تعریف و ستائش کرتا تو اس کا جواب یا شکریہ تو لکھتے مگر بڑی خوبی سے ٹال جاتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے متعلق بھی رائے دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کیے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہمارے اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرف دار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہوسکتیں بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کون سی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست و نہ دانم کہ کدام است "

اسی شخص نے جب 'حیاتِ جاوید' پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

" 'حیاتِ جاوید' پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں اُن کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہ ہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہلِ ایران یار فروشی

کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں"۔

ایک عزیز کو اکسٹرا اسسٹنٹی کا عہدہ ملا تو انھوں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ یہ انھیں کی سعی اور محنت کی بدولت ہے، مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں، یہ محض تمھاری سعادت مندی اور کسی قدر تمھاری نادانی کی دلیل ہے۔ بہ فرضِ محال میری کوشش کو تمھاری کام یابی میں کچھ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کام یابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں ہے کیوں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آج کل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں۔ غیروں کے بچّوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ اپنی بساط سے زیادہ ان کی امداد کرتے ہیں، تمام قوم کے لیے ویسی ہی کوشش کرتے ہیں جیسے کسی خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لیے کرتا ہے۔ اپنی جان اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ قوم کی طرف سے اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دُھن میں لگے ہوے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم کو دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہیے اور انھیں کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہم دردی کا خیال پیدا ہو گیا ہے"۔

مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف، چناں چہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ چناں چہ وہ نواب محسن الملک مرحوم کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے"۔

یا وہ اپنے ایک نیاز مند کو لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ کا آرٹیکل جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ 'پیسہ اخبار' میں نکلا ہے، میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور، سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی ........ کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا سب سے سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ جب کسی بدصورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو وہ بھی ان قہقہوں میں شریک ہو جائے چوں کہ میں بھی ننگِ ٹرسٹیاں ہوں اس لیے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں اُن کے ساتھ شریک ہوتا ہوں"۔

چوں کہ مولانا ایک مشہور اور نام ور شخص تھے اس لیے اکثر عزیز اور احباب انھیں سفارشوں کے لیے تنگ کرتے رہتے تھے ایک ایسی ہی فرمایش پر وہ لکھتے ہیں:۔

"شاید تم اور لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے مجھے ہندستان کے اطراف میں ہر طرف آدمی جانتے ہیں۔ اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش کردوں گا وہ ضرور کام یاب ہوگا۔ لیکن ای عزیز یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دنیا دار المعاوضہ اور دار المکافات ہے جو شخص کسی کے ساتھ کوئی سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلے کی توقع پر کرتا ہے۔ میں تمھاری ایک سفارش اس لیے منظور کرتا ہوں کہ مجھے تم سے دس فرمایشیں کرنے کا موقع ملے۔

پس ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کا عوض متوقع نہ ہو کیوں کر کارگر ہو سکتی ہے۔ جب میں زمانے کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امرا اُس کی خاطر کرتے ہیں اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی اُسے ہر جگہ مل جاتی ہے لیکن اگر گھر بیٹھے وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارشیں کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلا التفات نہیں کرتا۔ یہی میرا حال ہے ........"

مولانا نے ایک ال نامہ بھی لکھا تھا، جو ان کی زندگی میں شایع نہیں ہوا کیوں کہ اس میں ہر فرقے اور ہر گروہ پر چوٹ ہے۔ چند جملے انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں مثلاً :۔

| | |
|---|---|
| المذہب | اعلانِ جنگ |
| الدین | تقلیدِ آباو اجداد |
| العلم | قسمے از جہلِ مرکب |
| الامتحان | آزمایش لیاقت ممتحان |
| الیونی ورسٹی | کارخانہ کلرک سازی |
| العلی گڑھ پارٹی | شہیدِ وفا |
| العلی گڑھ کالج | پرورش گاہِ طفلان بہ دست مائندران |
| الکمیشن | وجہ موجّہ برائے فیصلہ یک طرفہ |

ان خطوں میں کہیں ادبی نکات بھی ملتے ہیں مگر بہت کم، یہ زیادہ تر کاتب یا پوچھنے والے پر منحصر ہے۔ کسی نے کوئی بات پوچھی ہے تو اس کا جواب معقول دے دیا ہے، علاوہ اس کے یہ مجموعہ کامل نہیں ہے۔ بہت سے ایسے خط ہوں گے جو تلف

ہو گئے ہیں یا قابل مرتب کے ہاتھ نہیں لگے ؎

اِن خطوں سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ 'جواہراتِ حالی' میں جو حال میں شیخ محمد اسمٰعیل صاحب نے پانی پت سے شایع کی ہو، بعض نظمیں چھوٹے بچّوں کے لیے مولانا کے نام سے درج ہیں، ان میں سے اکثر نظمیں مولانا کی لکھی ہوئی نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہو کہ مولانا کے خلف الرشید خواجہ سجّاد حسین صاحب سے اُن کے انسپکٹر تعلیمات نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کی فرمایش کی۔ انھوں نے حامی بھرلی اور مولانا کو لکھا، مولانا کو طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑا۔ لیکن اُس زمانے میں مولانا علیل تھے اور علالت نے طول کھینچا تو انھوں نے یہ نظمیں مولوی محمّد سعید مرحوم مدرّس اوّل عربی و فارسی بورڈ ہائی اسکول دہلی سے لکھوا دیں اور کہیں کہیں مناسب اصلاح کر دی ؎

آخر زندگی میں مولانا خانگی جھگڑوں اور فکروں سے بہت عاجز آگئے تھے اور چاہتے تھے کہ کہیں فراغت اور اطمینان سے بیٹھ کر کچھ علمی کام کریں، لیکن افسوس کہ یہ فراغت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ بلکہ اسی پر حیرت ہو کہ ان تمام حالات میں انھوں نے اتنا بڑا کام کیوں کر کر لیا۔ اردو ادب کے متعلق دو ایک کام ان کے پیشِ نظر تھے جن کا مسودہ انھوں نے خوب غور کر کے اپنے دل میں قائم کر لیا تھا۔ ان کی دِلی تمنّا تھی کہ اپنی زندگی میں انھیں پورا کر دیں لیکن اس کا موقع نہ ملا اور وہ سارے مسوّدے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ آخر میں ان کا ارادہ تھا (جیسا کہ ان خطوں سے معلوم ہوگا) کہ اورنگ آباد میں رہ کر کچھ کام کریں لیکن حالات نے اجازت نہ دی اور اسی علالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تاہم وہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ کر گئے ہیں کہ اگر وہ کسی اور ملک اور کسی اور قوم میں بھی ہوتے تو ان کی ہستی قابلِ فخر سمجھی جاتی۔ ان کی زندگی

علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایسی پاک صاف، خالص اور بے ریا ہے کہ ہمیشہ اہلِ وطن کی رہ نمائی کرے گی۔ اردو زبان پر تو اُن کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اہلِ زبان اس سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

ادب میں سیکڑوں دل کشیاں ہیں، اس کی بے شمار راہیں اور اَن گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بہ شرطے کہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایسا حُسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں۔ بہ شرطے کہ اس میں صداقت ہو۔ اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ہمارے خمیر میں ہے یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے، جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔ یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دل کش سی دل کش نظم اور دل چسپ سے دل چسپ ناول کو اُٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف ہماری ہر علمی و ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آئی ہے غیروں کے لیے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی۔ اس لیے مصلحتِ وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے، تکلّفات بھی برتنے پڑتے ہیں، خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ نہ دُوسروں سے چوکتا نہ اپنے آپ

کو چھوڑتا ہی۔ اس وقت نہ اسے خوفِ لائم ہوتا ہی اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہی جو دلوں کو بھالیتی ہی اور یہی وجہ ہی کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہی وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہی۔ جو خیال جس طرح اُس کے دل میں ہوتا ہی اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہی، نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہی۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو۔ جس میں ہمدردیِ بنی نوعِ انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہو گی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہی:

# مقدّمۂ ڈاکٹر بجنوری

## سنہ ۱۹۱۸ء

مرحوم بجنوری پر کچھ لکھتے ہوئے دل دکھتا ہی، اور جب کبھی اس عزیز کا خیال آتا ہی تو دل پر عجیب کیفیت گزرتی ہی جو بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ ہماری قوم کے اُن چند نوجوانوں میں تھے، جنھوں نے یورپ کی تعلیم سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا تھا ورنہ اکثر یہ ہوا کہ ظاہری نمود و نمائش بے معنی اور مہمل رسمیں مذموم آداب خوشی سیکھ کر آگئے اور اسی کو سرمایۂ علم سمجھ بیٹھے۔ مرحوم یورپ میں رہے مگر مشرقی اخلاق اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مغرب سے وہ باتیں سیکھیں جو یہاں میسّر نہ تھیں علم و ادب سے لگاؤ انھیں پہلے سے تھا، تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حسّاس اور نظر بہت وسیع تھی دُنیا کے ادبی شاہ کار بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہو گئی تھی جو ان کے مضامین سے صاف ظاہر ہی:

تعلیم کے مسئلے سے انھیں خاص شغف تھا۔ ممالک یورپ کے تعلیمی طریقوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ یہاں آکر انھوں نے ایک کالج قائم کرنے کا ڈول

ڈالا تھا جس میں جدید طریقوں پر صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اس تجویز کی تفصیل سُن کر اس کی سرپرستی فرمائی اور معقول رقم جمع کر دی۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے بھی ایک رقم اس کے لیے عطا فرمائی۔ لیکن مرحوم کی بے وقت موت نے اس منصوبے کو ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا۔ شعیب قریشی صاحب اور عبدالرحمان صدیقی صاحب اس منصوبے میں اُن کے ہم خیال اور ہم کار تھے اور ان تینوں باہمت نوجوانوں نے اپنی زندگی اُس کے لیے وقف کر دینے کا تہیّہ کر لیا تھا لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز جب زیرِ بحث تھی تو ان کے مشورے بہت کار آمد ثابت ہوئے ؂

جامعہ عثمانیہ کے قائم کرنے کا ڈول بھی اسی وقت ڈالا جا رہا تھا دار الترجمہ قائم ہو چکا تھا۔ مختلف فنون اور علوم پر کتابیں ترجمہ اور تالیف ہو رہی تھیں دو برس کی مسلسل محنت کے بعد اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ میٹریکولیشن اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں تمام مضامین اُردو کے ذریعے پڑھا سکیں ۔اب جامعہ کی ابتدا ہونے والی تھی، پرنسپل کی تلاش تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد قرعہ ڈاکٹر بجنوری کے نام پڑا۔ عین اُس وقت جب عرض داشت بہ غرض منظوری اعلیٰ حضرت حضور نظام کی پیش گاہ میں پیش ہونے والی تھی، اجل نے ہم سے اس جوہرِ قابل کو چھین لیا ؂

مرحوم کبھی کبھی کسی خاص حالت یا منظر سے متاثر ہو کر شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی نظم "شوجی کا رقص" بہت مقبول ہوئی۔ نظم کے ایک ایک لفظ سے نرت کی حرکت اور جنبش ہویدا ہے۔ اگر نظم پڑھتے ہوئے شوجی کی نرت کی تصویر بھی سامنے ہو تو عجیب سماں پیدا ہو جائے لیکن شعر گوئی سے بڑھ کر ان میں شعر فہمی کا مادہ تھا۔ غالب پر ان کی تنقید اس کی شاہد ہے کہ انھوں نے مرزا کے اشعار کی تشریح میں کیسے کیسے نکات پیدا کیے اور سربستہ راز آشکارا کیے ہیں ؂

جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوج دار خاں کو نذر کیا تھا مرحوم کی نذر پڑا تو مارے خوشی کے بے تاب ہو گئے اور اس اصلی نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابک دست مصوّر سے تصویروں کی فرمائش۔ ان کا یہ انہماک دیکھ کر اُن کے بعض دوست بھی اس شاہ کار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے، لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا؛

وہ دیوان بعد میں 'نسخۂ حمیدیہ' کے نام سے شایع ہوا جیسے اور کتابیں معمولی طور پر شایع ہوتی ہیں۔ جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے وہ کسی دُوسرے کے بس کی نہ تھی؛

ڈاکٹر عبدالرحمان کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع نظری اور علم وفضل کو دیکھ کر دل میں عزّت واحترام پیدا ہوتا تھا۔ لیکن جب اُن کے اخلاق پر نظر ڈالیے اور ان کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، رواداری، انکسار ادب اور شفقت دوستی اور محبّت، حیا اور خودداری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار ان کی طرف کھنچتا تھا اور ان سے محبّت ہونے لگتی تھی۔ اُن کے اخلاق کو دیکھ کر غیر بھی اپنے ہو جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دل آزاری کفر تھی لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے؛

ایسے جوہرِ قابل کا عین عالمِ شباب میں اُٹھ جانا اس کے خاندان اور اس کے احباب ہی کے لیے ایک المناک حادثہ نہ تھا بلکہ درحقیقت ایک قومی سانحہ تھا۔ اس کا دل اور دماغ بہت لطیف اور نازک تھا وہ ایک نازک پودا تھا جو سمومِ زمانہ کی تاب نہ لاسکا اور وقت سے پہلے اس دنیا سے مُنھ موڑ کر چلا گیا؛

یادگارِ بجنوری سنہ ۱۹۵۱ء

# مقدمۂ سی پارۂ دل

(مصنفہ خواجہ حسن نظامی)

اردو زبان میں نثر کا دور تھوڑے ہی عرصے سے شروع ہوا ہے اس کی ابتدا بھی مثل بعض زبانوں کے شاعری ہی سے ہوئی اور کیوں نہ ہوتی۔ اُس نے برج بھاشا کا دودھ پیا ہے جو گویا شاعری ہی کے لیے بنی تھی۔ اس زمانے میں سب سے پہلے میر امن نے نثر کا سکّہ جمایا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کی کتاب اب بھی اپنے رنگ میں بے مثل ہے۔ اس کے بعد مرزا نوشہ پھر سید احمد خاں، مولانا حالی، نذیر احمد، مولانا آزاد اور مولانا شبلی نے اس کا وہ رتبہ بڑھایا کہ نثر نظم پر سبقت لے گئی۔

آج کل خواجہ حسن نظامی صاحب نے اس میدان میں اشہبِ قلم دوڑایا ہے اور کوس النثر نثری بجایا ہے۔ ان کا رنگ سب سے نرالا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اُڑایا ہے، یہ صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے اس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہو جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں مگر اس کے بجائے سوز و گداز ہے۔ مرزا کے فقرے

ظرافت کے ساتھ محبت میں گھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے مضمون درد سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی عبارت میں چوچلا بھی ہی جو سیدھی سادھی بات کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیتا ہی۔ مرزا ایک ذرا سی ترکیبِ لفظی یا ایک جملے میں وہ کچھ لکھ جاتے ہیں کہ آدمی مزا لیتا ہی۔ خواجہ صاحب اپنے مضمون میں ایک ایک جُز کو الگ الگ کر دکھلاتے ہیں۔ اور وہ گُل کاری کرتے ہیں کہ آدمی عش عش کرے ؞

جو حکیمانہ اسرار اور فلسفیانہ نکات چاہتے ہیں یہ تحریریں ان کے لیے نہیں یہ ان کے لیے ہیں جو دل رکھتے ہیں جو عقل وحکمت سے رازِ دہر کی جستجو میں ہیں اُن کی نظروں میں شاید یہ نہ جچیں گی لیکن جو دردِ دل اور عشق ومحبت کے توسّل سے وہاں پہنچنا چاہتے ہیں انھیں اس میں لطف آئے گا؞ یہ اخلاقی مضامین نہیں لیکن اخلاق کا رنگ ان سے ٹپکتا ہی ان میں تصوف کا دعویٰ نہیں لیکن تصوّف کی بُو ان میں پائی جاتی ہی۔ یہ معاشرتی تحریریں نہیں لیکن معاشرت کی اصلاح ان میں نظر آتی ہی، یہ حکیمانہ رسائل نہیں لیکن حکمت ان کی تہ میں ہی، ہر کوُچے کی سیر کی ہی اور ہر گلی کی خاک چھانی ہی۔ کہی اوران کہی سب کچھ کہہ دی ہی، آگے پڑھنے اور سمجھنے والے کی صلاحیت پر موقوف ہی ؞

ان مضامین میں کہیں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں کہیں راز ونیاز ہی کہیں دردِ دل کی داستان ہی اور اپنا اور ہمارا دکھڑا رو رہے ہیں۔ کون ہی جو "ایک عرب کے گھر" کو دل تھامے بغیر پڑھ سکتا ہی۔ کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا ہی۔ کہیں نثر میں شاعری کی وہ شان دکھائی ہی کہ نظم مقفّیٰ ہیچ ہی۔ کہیں ذرّے کو آفتاب بنایا ہی اور کہیں آفتاب کو خاک۔ غرض عجیب گل دستہ ہی

جس میں ہر رنگ کے پھول اور ہر پھول میں نئی خوش بو ہی گو سب کچھ ہی مگر سُر وہی ہی اور لَے میں فرق نہیں آیا ہی ؛

لیکن معترض یہ پوچھتا ہی کہ آخر اُس کی غرض کیا ہی، خواجہ صاحب کیا چاہتے ہیں، اُن کا مشن کیا ہی، کوئی خاص غرض و غایت بھی ہی یا یوں ہی تُک بے تُک جو جی میں آتا ہی کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ "میں مدینہ نگری سے پریم کا سندیسہ لایا ہوں"۔ اور یہ کہہ کے چُپ ہو جاتے ہیں اور اُن کی چپ سے جی گھبراتا ہی ؛

بعض لوگ کہیں کہیں مضمون کی طوالت سے گھبرائیں گے۔ کہیں کہیں وہ بہ ظاہر بے ربطی سی پائیں گے کہیں مضمون وطرزِ تحریر کی یکسانی سے اُکتائیں گے کہیں عامیانہ باتوں پر ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر عامیانہ باتوں میں کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ عرفی نے خوب کہا ہی "ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است"، ہاں نظر ہونی چاہیے ؎

اس کی خوبی کے تو کیا کہنے مگر دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

(داغ)

آپ پڑھ کے دیکھیے اور خود اندازہ کیجیے کسی کے کہنے پر نہ جائیے جی کو لگے تو کہنے والے کی محنت کی داد دیجیے نہیں تو خاموش ہو رہیے شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا ؛

زبان کی نسبت کچھ کہنا فضول ہی۔ ظاہر ہی عیاں ہی۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اچھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں کیا پڑھوں! میں نے کہا اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اُردو، اور دلی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ

دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے۔ اس میں کسے انکار ہو سکتا ہے ۞

آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لیے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بے چاری اردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کی متحمّل نہیں ہوتی۔ یہ اُردو کی ترقّی نہیں تنزّل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُردو سب میں مقبول ہو مگر ان تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے وہ ان پیچیدہ اور معلق تحریروں میں کہاں۔ یہ گُر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے ۞

مَیں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ عقل نے اجازت نہیں دی اور مصلحت نے قلم روک دیا اور کہا کہ "بس" ۞

# مقدمۂ 'تمدّنِ ہند'

## مترجم کا مختصر تذکرہ

شمس العلما ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی مرحوم ہندُستان کے عہدِ جدید کے ان نام وَر علما میں سے ہیں جنھوں نے علوم و السنۂ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدّن، علمی ترقّی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت جدید تعلیم کے رہ بر و رہ نما ہیں اور ان کے متعلّق وہ شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی جو اس وقت انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے متعلّق عام طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدیم علوم و تہذیب سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں جس سے حمیّتِ قومی میں ضعف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجّہ اس نقص کی طرف جلد مبذول ہو گئی۔ اور اس کی اصلاح کی ہر طرف کوشش کی جا رہی ہے۔

مرحوم بلگرام کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے۔ اور یہ خاندان مسلمانوں کے ان معدودے چند خاندانوں سے ہے جنھوں نے ایسے زمانے میں جب کہ ہند میں مختلف قوتیں کام کر رہی تھیں اور باہمی کش مکش سے ملک میں بے اطمینانی تھی، زمانے کا رُخ پہچانا اور عاقبت اندیشی اور دُور بینی سے کام لے کر

ادھر کو چلے جدھر زمانہ جا رہا تھا اور جہاں آخر سب کو جھکنا پڑا ؛

ان کے آباو اجداد شہرِ واسطہ سے جو عراق عرب میں بغداد و بصرہ کے درمیان واقع ہی چھٹی صدی میں ہندُستان آئے اور اودھ میں مقیم ہوئے۔ ان کے جدِّ امجد مولوی سید کرم حسین خاں بہادر وائس رائے کے دربار میں شاہ اودھ کی طرف سے قائم مقام تھے۔ بعد الحاق ان کے والد اور چچا دونوں انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ اور معتبر خدمات پر سرفراز رہے ؛

ان کے چچا سید اعظم الدین حسین خاں لارڈ ولیم بنٹنگ کے مصاحب (اے۔ڈی سی) اور اورینٹل انٹرپریٹر (ترجمان السنۂ مشرقیہ) تھے اور بعد میں سندھ میں پولٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور دریاے سندھ کی نگرانی بھی انھیں تحویل کی گئی۔ یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سواے انگریز کے کسی دُوسرے کو ملنی محال تھی لیکن چوں کہ امیرانِ سندھ اپنے ہاں انگریز کا آنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے اعظم الدین حسین خاں کا انتخاب کیا گیا جس سے ان کی وقعت اور قابلیت کا اندازہ ہوسکتا ہی۔ آنریبل نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) برسبیلِ تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اہلِ سندھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سید ہیں تو ان کے بنگلے پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بہ وجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے اور بیماروں کے لیے تعویذ مانگتے تھے۔ چناں چہ ان کا قاعدہ تھا کہ فرصت کے بعد عربی کے اشعار یا قرآن کی آیات جو اس وقت یاد آتیں کاغذ کے پرچوں پر لکھ لکھ کر ٹوکرے میں ڈالتے جاتے تھے اور دُوسرے روز لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان میں سے اکثر اچھے بھی ہو جاتے تھے انگریزی خوب جانتے تھے لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی تاکہ لوگ بدگمان نہ ہو جائیں۔ مگر بدگمانی سے نہ بچ سکے۔ چوں کہ

بہت وجیہ گورے چٹے تھے۔ لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ دراصل یہ انگریز ہیں لیکن مسلمان بنا ہوا ہے اس لیے وہاں عام طور پر برہمی پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی انھیں بھی اس کی اطلاع ہوگئی اور راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ دوبار بنگال لیجس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور سٹلمنٹ افسر (افسرِ بندوبست) دیسی طبقے میں سی۔ ایس۔ آئی کے پہلے گروہ میں سے تھے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے آرہ ہاؤس کے بچانے میں کنور سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مشہور آرہ گارِیسن ہاؤس کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم کے والد سید زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدے پر مامور رہے اور سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۸۷۵ء تک اپنی خدمات کے فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا اور پنشن پانے کے بعد ریاست حیدرآباد میں کمشنری انعام کی خدمت پر تقرر ہوا۔ مرحوم کے چچا اور والد مشرقی علوم والسنہ کے عالم اور فاضل تھے۔ بعد ازاں انھوں نے مدرسۂ عالیہ میں جو وارن ہسٹنگز نے کلکتہ میں قائم کیا تھا، تعلیم پائی۔ ہندستان میں یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

مولوی سید علی مرحوم اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۵۱ء میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کے سن سے چودہ برس تک علومِ عربیہ حاصل کیے۔ کہتے ہیں کہ حافظہ ان کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں عربی فارسی تعلیم سے فارغ ہو کر سنہ ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی انھوں نے خوب ترقی کی، دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک

ہوئے اور سنہ ۱۸۵۴ء یعنی کل آٹھ سال میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ کالج کے مدرّس اور پروفیسر مرحوم کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔ اس کے بعد تین سال تک قانونِ ملکی کا مطالعہ کیا اور سال بھر بعد امتحان نیٹو سول سروس میں کام یاب ہوے اور کل ضلع بہار میں نمبر اوّل رہے۔ بعد ازاں طامسن اسکالرشپ پاکر وہ رڑکی کے انجینرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ ابھی پورے چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ حیدر آباد دکن کے نام ور مدبّر اور عالی دماغ وزیر نواب مختارالملک سر سالار جنگ بہادر اوّل نے جن کی قدر دانی اور جوہر شناسی مشہورِ آفاق ہے، انھیں حیدر آباد میں طلب کرکے اپنے پرسنل اسٹاف میں داخل کیا اور ولایت جاتے وقت اپنے ساتھ لے گئے اور لندن کے شاہی مدرسۂ معدنیات میں داخل کر دیا۔ اور بجائے تین سال کے دو سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان بہ درجۂ اعلیٰ پاس کیا اور علمِ طبقات الارض میں (مرچی سن) تمغہ پایا۔ علاوہ اس کے کیمسٹری، طبیعیات، مخانیک، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیوٰۃ وغیرہ علوم میں دست گاہ وافر حاصل کی۔ پروفیسروں نے ان کی لیاقت و ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور اعلیٰ درجے کے صداقت نامے دیے ہیں۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے بہ زمانۂ قیامِ انگلستان ایسے ماہرینِ فن اور علمائے نام ور سے تلمذ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے مثلاً پروفیسر ہکسلے، پروفیسر جڈ، پروفیسر گتھری، پروفیسر ٹنڈل وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ اس سے قبل انھوں نے سنہ ۱۸۷۹ء میں لندن یونی ورسٹی کا امتحان میٹری کولیشن بہ درجہ اعلیٰ پاس کیا تھا اور اس امتحان میں ان کی اختیاری

زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں ⁂

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا اور اٹالین زبانوں اور علوم کی تحصیل کے لیے کچھ مدت اٹلی میں قیام کیا۔ اور اس طرح علومِ مغربی و مشرقی سے بہرہ ور ہوکر حیدرآباد واپس آئے جہاں سرکارِ عالی نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اور ہوم سیکرٹری بھی رہے ⁂

مرحوم مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے۔ مرحوم پہلے مسلمان تھے جو بار بار مدراس یونی ورسٹی کے امتحان ایم۔اے کے سنسکرت کے ممتحن مقرر ہوئے اور ویدوں اور وید ک علمِ ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کیے۔ میں نے کئی پنڈتوں سے یہ سُنا ہے کہ ان کا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے وید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہے۔ اور یہ تو ہم نے خود دیکھا ہے کہ وہ جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلا تکلف پڑھتے چلے جاتے تھے ⁂

مرحوم آخر عمر تک (بہ استثنا بعض عارضی تقررات کے) معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے۔ سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی وزارت میں بعض انقلابات سے بد دل ہوکر انھوں نے امتحانِ وکالت کی تیاری اس وقت کی جب کہ کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحان بی۔ایل میں صرف چار مہینے باقی رہ گئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس امتحان میں تمام یونی ورسٹی میں اوّل رہے اور طلائی تمغہ، یونی ورسٹی لا اسکالرشپ اور رچی انعام کتب حاصل کیا۔ اس سے پہلے کلکتہ یونی ورسٹی

ہیں کسی مسلمان طالب علم کو قانونی امتحان میں یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ امتحان انھوں نے نومبر سنہ ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔ اس سے مولوی سید علی مرحوم کے خداداد حافظے اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہی۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں گورمنٹ ہند نے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا اور بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے ؎

سنہ ۱۹۰۱ء میں بعض پولٹیکل وجوہ سے ایک پیش قرار وظیفہ (لعہا ماہانہ) لے کر خدمت سے علاحدہ ہو گئے اور انگلستان میں جا کر مقیم ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونی ورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرار مقرر کیے گئے۔ اسی سال انڈیا آفس میں عربی فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور ہوے۔ یہ بہت بڑا ذخیرہ ہی جس کی تعداد چھ ہزار سے کم نہیں۔ اس کی فہرست کا ترتیب دینا معمولی کام نہ تھا بلکہ ایک بڑا اور اہم کام خیال کیا گیا۔ انڈیا آفس لائبریری کا ایک حصّہ "دہلی مینوسکرپٹ" (قلمی نسخہ ہاے دہلی) کے نام سے مشہور ہی۔ یہ دلّی کا شاہی کتب خانہ تھا جو غدر کے بعد لندن بھیج دیا گیا ؎

شاہ جہاں نے پورب کو شیراز کہا تھا، لیکن پورب میں بلگرام کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ یہ عجیب مردم خیز خطہ ہی۔ اسی قصبے سے سیّد مرتضیٰ صاحب تاج العروس، علامہ سیّد عبدالجلیل، مولانا آزاد وغیرہم جیسے فاضل پیدا ہوے اور اس آخری دور میں شمس العلما مولوی سیّد علی مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولوی سیّد حسین نواب عماد الملک بہادر سی۔ ایس۔ آئی کا شمار بھی انھی باکمال علما میں ہو سکتا ہی ؎

مولوی سیّد علی مرحوم بلاشبہ مختلف علوم والسنہ کے عالم تھے لیکن جب ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہی تو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہی کہ اُن کے علم کے مقابلے میں اُن کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہی کہ وہ

طبعاً جفاکشی اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے، دوسرے دکن کی آب وہوا اور خاص کر یہاں کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کرسکا اور خاص کر علمی کاموں کو زیادہ راس بھی نہیں۔ یہ سرزمین آج سے نہیں بلکہ صدہا سال سے کچھ ایسی انقلاب انگیز واقع ہوئی ہو کہ ہر دور میں ایک نہ ایک طوفان بپا رہا ہو۔ گو اب جنگ وجدل کا زمانہ نہیں رہا۔ طوائف الملوکی اور غارت گری کا دَور ختم ہوچکا ہو مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ نکل آتا ہو کہ چین سے بیٹھنا اور اطمینان سے کام کرنا نصیب نہیں ہوتا اور خصوصاً مرحوم کی سی بے چین اور متلوّن طبیعت کے لیے اس دلدل سے نکلنا دشوار تھا لیکن باوجود اس کے مرحوم علمی کام کی طرف سے غافل نہ رہے۔ اگرچہ اُن کا کام زیادہ تر بلکہ کُل کا کُل ترجمے تک رہا لیکن اس زمانے میں بہ نسبت ناقص اور فضول تالیف تصنیف کے غیر زبانوں کی عمدہ تصانیف کا ترجمہ بسا غنیمت اور قابلِ قدر ہو۔ کیوں کہ ہندستان کی اور خاص کر مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہو اسے مدِّ نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہو کہ علمی بیداری کا پہلا دَور ترجمہ ہی ہو۔ اگر غیر زبانوں کی علمی اور اعلا تصانیف کے ترجمے ہوجائیں تو یہ آیندہ دَور کی تالیف وتصنیف کے لیے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہوگا۔ یہاں ہم مرحوم کی تالیف وتراجم کی فہرست پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ 'مڈیکل جورس پروڈونس'، یعنی اصول قانون متعلق بہ طب۔ یہ کتاب علاوہ اطبّا و وکلا اور حکّامِ عدالت کے عام ناظرین کے لیے بھی دل چسپ ہو (ڈاکٹر مسٹر گنی نگری کتاب کا ترجمہ ہو) اس کتاب میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو پڑھ کر بہت عبرت حاصل ہوتی ہو۔ یہ زمانہ وُزارت سر آسمان جاہ مرحوم سرکار نے مترجم کو چھ ہزار رُپے بہ طور صلہ عنایت فرمائے

اس کتاب میں ایک امر یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔

۲ - رسالہ در تحقیق تالیف کتاب 'کلیلہ ودمنہ' اس میں مرحوم نے مشہور و معروف کتاب 'کلیلہ ودمنہ' کے متعلق بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور اس امر کے پتا لگانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں یہ کتاب کہاں کی ہے، پھر کہاں کہاں گئی اور کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیرات عمل میں آئے۔ مرحوم کی یہ مختصر تالیف بہت دلچسپ اور قابلِ قدر ہے۔ اسے مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں پڑھا تھا۔ مرحوم فرماتے تھے کہ بہ زمانۂ قیامِ لندن ایک علمی سوسائٹی میں مسلمانوں کے تمدن اور علم و ادب کا ذکر تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ اسی میں مرحوم نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے تمام آثار اور اُن کے کارنامے دنیا سے نابود بھی ہو جائیں اور دو کتابیں 'کلیلہ ودمنہ' اور 'الف لیلہ' باقی رہ جائیں تو ان کے کارہائے نمایاں کے لیے کافی ہیں۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ 'کلیلہ ودمنہ' کی طرح ایک رسالہ 'الف لیلہ' پر بھی لکھیں اور اس کے لیے دو الماریوں بھر کتابیں جمع کی تھیں۔

۳ - فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بہ مقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

۴ - غارہائے الورہ کا گائڈ۔

۵ - حیدرآباد کے اقتصادی و طبقاتِ ارضی معدنیات۔

۶ - 'تمدنِ عرب'، موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اُردو ترجمہ جو ہندستان میں بہت مقبول ہوا۔ درحقیقت یہ کتاب عربی اور اسلامی تمدن پر

بہت دل چسپ اور مفید کتاب ہی۔

۷ - 'تمدنِ ہند' یہ کتاب بھی موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہی۔ جس کا مفصل ذکر اس دیباچے کے دوسرے حصّے میں کیا گیا ہی۔

۸ - مرحوم نے موسیو سدیو کی کتاب 'تمدنِ عرب' کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اُردو میں کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے یہ سُنا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہوگیا ہی تو اس کو طبع نہیں کرایا۔ حال آں کہ اگر یہ ترجمہ شایع ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا اس لیے کہ عربی میں کامل کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا بلکہ صرف اس کا خلاصہ شایع کیا گیا ہی[1]۔

مرحوم نے حیدر آباد سے ایک عربی سہ ماہی رسالہ "الحقایق" نامی سنہ ۱۸۸۹ء میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ اس رسالے میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے۔ لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی، علامہ مولوی سید علی شوستری، ڈاکٹر لائٹنر، مولوی سید کرامت حسین صاحب جیسے فاضل اور عالم لوگ تھے لیکن افسوس ہی کہ استقلال کے ساتھ کام نہ ہوا اور رسالہ کچھ عرصے کے بعد بند ہوگیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہی۔ کیوں کہ ہندُستان اور دیگر اسلامی ممالک میں تعلّقات و روابط قائم رکھنے اور ایک کو دوسرے کے خیالات و حالات سے آگاہ کرنے کا ذریعہ عربی زبان ہی ہو سکتی ہی۔ نیز یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آیندہ اسلام کی ترقّی و عروج میں عربی زبان کو بہت بڑا دخل ہوگا اس لیے کہ اس وقت مختلف اسلامی ممالک میں باوجود موجودہ انحطاط و انتشار کے باہمی اتحاد اور ہم دردی قائم رکھنے والی علاوہ دیگر اسباب کے ایک عربی زبان بھی

---

[1] اس کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہی۔ انشاء اللہ ناظرین 'الناظر' جلد اس سے مستفید ہوں گے۔

ہے اور آیندہ چل کر یہی بکھرے ہوئے شیرازے کو یک جا کرنے میں مدد دے گی۔ مسلمانوں کو اس زبان کی تحصیل سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ہماری مذہبی، علمی، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی ترقی بغیر اس زبان کے ناقص اور ناکمل رہے گی ۞

اپنے زمانۂ ملازمت میں مرحوم نے ایک بہت قابلِ قدر کام کیا تھا اور اگر وہ جاری رہتا اور قاعدے سے چلایا جاتا اور اس کا چلانے والا ایسا شخص ہوتا جس کے دل میں علمی ترقی اور قومی ہمدردی کی آگ ہوتی تو وہ بڑی برکت اور خیر کا باعث ہوتا۔ مرحوم نے نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدردان امیر تھے، ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اُردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے۔ مرحوم اس سررشتے کے نگراں مقرر ہوئے اور ان کی زیرِ نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لیے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا۔ لہٰذا اُنھوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمتِ ناظم سررشتۂ علوم و فنون پر بہ مشاہرۂ للعما، ہوا۔ درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اس سلسلے میں شایع ہوئیں لیکن مُلک کی بدنصیبی سے یہ سررشتہ ٹوٹ گیا اور کام اب تک بند ہے۔ جس ضرورت سے یہ سررشتہ قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے اور جب سے شمالی ہند و دیگر حصصِ مُلک میں اُردو پر لے دے ہوئی ہے، ضرورت اور نمایاں طور پر محسوس ہو رہی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد اُردو کی سرپرستی دو مقامات پر خاص طور پر ہوئی، ایک تو پنجاب میں، دوسرے حیدر آباد دکن میں۔ پنجاب میں اس کے بانی ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہال رائڈ تھے۔ ان صاحبوں کی تحریک سے پنجاب یونی ورسٹی نے بیش بہا

گراں قدر انعامات کے ذریعے سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو زبان میں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ لیکن حال میں اس عام مرض کی وجہ سے جو ملک کی بدقسمتی سے ہر جگہ شایع ہو گیا ہے بعض حضرات نے وطن پرستی کے پردے میں پنجابی کو اردو کا حریف بنا کر لا کھڑا کیا ہے اور پنجاب یونی ورسٹی نے اردو کی سرپرستی سے کسی قدر اپنا ہاتھ روک لیا ہے۔ اب اردو کو صرف ایک دولتِ آصفیہ کا آسرا رہ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کو علاوہ اس کے کہ دکن نے اس کی نشو و نما میں ابتدا سے بہت بڑا حصہ لیا ہے اور مختلف وجوہ سے بھی دولتِ آصفیہ پر بہت بڑا حق حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکارِ عالی نے عربی، فارسی، اردو تصانیف کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور اب بھی جاری ہے، لیکن خاص اصول اور جوش کے ساتھ یہ کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ اب کہ سب کی طرف سے مایوسی ہے سرکارِ عالی کا یہ فرض ہے کہ اس مسئلے پر غور کر کے اس مفید اور ضروری کام کو اصول کے ساتھ چلائے اور نہیں تو کم سے کم پنجاب یونی ورسٹی کی طرح متعدد بیش قدر انعامات مقرر کر کے عام طور پر اشتہار دے اور علمی کتابیں اردو میں لکھوائے یا ترجمہ کرائے تاکہ مؤلفین و مترجمین کی ایک حد تک حوصلہ افزائی ہو سکے۔ اس پر توجہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی پبلک میں اس قدر قدر شناسی کا مادہ پیدا نہیں ہوا کہ مصنفین و مؤلفین اس کے بھروسے پر بڑے بڑے کام کر سکیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک زمانے تک اس کے سر پر دولت کا ہاتھ رہے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا چناں چہ ایک نہایت عمدہ کتاب خانہ چھوڑا ہے، جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یوں تو قریباً ہر فن اور علم کی کتاب ہے لیکن خاص کر وہ تمام مطبوعات جو یورپ میں اسلامی علوم و علم ادب پر اس زمانے میں شایع ہوئی ہیں، بڑے شوق اور محنت سے جمع کی ہیں۔ صرف ان کتابوں

ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں کے وہ موقت الشیوع رسالے بھی جمع کیے ہیں جن میں اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شایع ہوئے ہیں اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندستان میں کسی دوسری جگہ ایسا بے بہا مجموعہ موجود نہیں۔ کاش کوئی خدا کا بندہ جس کے دل میں درد ہو یہ کتاب خانہ خرید کر مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی نذر کر دے تاکہ کالج جب حقیقی یونی ورسٹی بن جائے تو یہ اس کے لیے باعثِ رونق وافادہ ہو اور اس محسن کو زندگیٔ جاوید حاصل ہو۔

مرحوم ہمیشہ عمدہ اور نادرالوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ چناں چہ 'کتاب الوصایا لابو حاتم السجستانی' کا قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف 'ریحانۃ الادب' و امام عبدالقادر بغدادی مصنف 'خزینۃ الادب' کے دست خط تھے، کیمبرج یونی ورسٹی کے کتب خانے میں تھا، فرانس کے کسی عالم نے بہ غرض طبع طلب کیا کیوں کہ دنیا میں اس کتاب کا اور کوئی نسخہ نہیں ہے۔ جب کتاب کتب خانے کی الماری سے نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اس قدر بوسیدہ ہوگئی ہے کہ فرانس پہنچتے پہنچتے آٹا ہو جائے گی تو یہ رائے قرار پائی کہ اس کا فوٹو لے لیا جائے چناں چہ دس کاپیاں بہ ذریعہ فوٹو لی گئیں۔ مرحوم کے ولایت پہنچنے سے چار روز پہلے سب کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ مرحوم کو جب معلوم ہوا تو پروفیسر کے پاس پہنچے جس نے فوٹو لیا تھا اور جا کر بہ منت اصرار کیا کہ ایک نسخہ مجھے بھی عنایت ہو۔ پروفیسر موصوف نے عذر کیا کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں سوائے ایک کتاب کے جو میرے ذاتی کتب خانے کے لیے ہے مگر چوں کہ آپ مجھ سے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں لہٰذا وہ نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ چناں چہ وہ نسخہ اب تک مرحوم کے کتاب خانے میں موجود ہے اس کی جلد بھی بہت قیمتی ہے۔

مرحوم نے 'جمہرۃ اللغہ لابن درید' جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پان سو رُپے میں خریدی۔ ان کے ایک معزز دوست جو حیدر آباد میں ایک اعلا خدمت پر مامور تھے ان سے مستعار لائے اور کچھ عرصے بعد کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں ڈیڑھ دو ہزار کو فروخت کر دی۔ مرحوم بھول گئے تھے، چار سال بعد جو ایک روز کتب خانے میں آئے اور اس کتاب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانے میں بھی موجود ہے دیکھنے کے لیے طلب کی تو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ تو انھیں کا ہے اور جب اس کے فروخت کی کیفیت سُنی تو بہت رنج ہوا آخر بڑی احتیاط سے اس کی ایک نقل لی اور جب برلن گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی اسے بے حد پسند آئی چوں کہ رُپے کی ضرورت تھی لہٰذا پندرہ ہزار میں فروخت کر دی۔

'تزکِ بابری' کا کامل ترکی نسخہ اب تک دنیا میں کہیں طبع نہیں ہوا اصل ترکی نسخہ ایک سینٹ پیٹرز برگ میں ہے اور دوسرا فرانس میں لیکن دونوں ناقص ہیں۔ مرحوم نے ترکی تزک کا کامل نسخہ نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانے میں دیکھا اور وہ اسے انگلستان جاتے وقت اپنے ساتھ لیتے گئے۔ یورپ کی علمی سوسائٹیوں میں جب تزک کا ذکر آیا تو مرحوم نے اس قلمی نسخے کو پیش کیا بعد مقابلے اور تحقیق کے یہ ثابت ہوا کہ سوائے اس نسخے کے باقی جس قدر نسخے دنیا میں اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں ناقص ہیں۔ کیوں کہ تصحیح کے لیے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں تاخیر بھی بہت ہوتی ہے لہٰذا یہ قرار پایا کہ گب میموریل فنڈ کی طرف سے کل کتاب کا فوٹو لے لیا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور یہ تمام کیفیت عکسی نسخے میں درج ہے۔ چوں کہ اس زمانے میں جاگیر نواب سر سالار جنگ مرحوم محکمۂ مال گزاری میں تھی، بعض حسّاد نے محکمۂ مال گزاری

میں شکایت کر دی کہ مولوی سید علی ایک نایاب کتاب کتب خانے سے لے گئے ہیں ان کو لکھا جائے یا تو کتاب واپس کریں ورنہ ان کے وظیفے سے اس کی قیمت وضع کر لی جائے۔ چناں چہ محکمۂ مال گزاری کی طرف سے یہی لکھا گیا۔ مرحوم نے اس کے جواب میں اصل نسخہ اور ایک جلد اس کے عکسی نسخے کی معتمد مال گزاری کی خدمت میں بھیج دی اور لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب کا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اسے زندہ کر دیا ہے۔

مرحوم کو ابن عرب شاہ مصنف "تاریخِ تیموری" کی ایک دوسری نادر الوجود کتاب جو مصر کی تاریخ پر مشتمل تھی ولایت میں دست یاب ہوئی۔ مرحوم نے اسے "جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی" میں طبع کرانا شروع کیا لیکن دورانِ طبع میں وجع مفاصل کا مرض لاحق ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

مرحوم کو اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحقیقِ علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں۔ ایک مرتبہ ان کی رائے ہوئی کہ حاجی خلیفہ کی کتاب "کشف الظنون" کی ترتیب بدل دی جائے۔ موجودہ کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ کُل کتب کی حروفِ تہجی پر تقسیم کی گئی ہے۔ اس ترتیب میں یہ خرابی ہے کہ جب تک کوئی پوری کتاب نہ پڑھے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فلاں مصنف کی اس میں کون کون سی کتابوں کا ذکر ہے اور کن کن مقامات پر ہے۔ مرحوم نے یہ تجویز کی تھی کہ کُل کتاب کے مصنفین کو حروفِ تہجی پر مرتب کیا جائے اور ہر مصنف کے نام کے ذیل میں اس کی تصانیف لکھ دی جائیں تاکہ جب کوئی کسی مصنف کا تذکرہ دیکھنا چاہے تو اس کے حالات اور تصانیف ایک جگہ مل جائیں۔ چناں چہ اس کام کے انجام دینے کے لیے ایک شخص کو مامور کیا اور تقریباً دس برس تک پندرہ رُپے ماہانہ خرچ کرتے رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ چوں کہ مرحوم میں استقلال نہ تھا اس لیے یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔

اسی طرح مرحوم کو اگسٹس فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ عالم موصوف نے ایک جلد میں قرآن مجید کو اصل عربی میں اور دُوسری میں اس کا قیمتی انڈکس یورپ میں شایع کیا ہے۔ جس کے طفیل میں قرآنِ پاک کی ہر سورت اور آیت آسانی سے نکل آتی ہے جو مصنفین و مؤلفین کے لیے نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ لیکن اس میں ہر آیت اور سورت کے لیے صرف ہندسوں کا نشان ہے۔ مرحوم یہ چاہتے تھے کہ بجائے ہندسوں کے سورۃ کا نام لکھ دیں۔ چناں چہ اس طریقے پر انڈکس مرتب کرلیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ بیروت میں طبع کرا کر کم قیمت پر فروخت کیا جائے لیکن افسوس کہ طبع کی نوبت نہ آئی۔

مرحوم اہلِ علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب ایسے لوگوں میں سے کوئی ان سے ملنے جاتا تو اس سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے خواہ کیسے ہی ضروری کام میں صرف ہوں۔ اور اگر اس اثنا میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک غریب صاحب علم سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے فرزند نواب ولی الدین خاں بہادر تشریف لائے ہیں۔ مرحوم نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کرو کہ مَیں ایک عالم سے گفتگو کر رہا ہوں جس کو آپ کی خاطر ترک نہیں کرسکتا، اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہے تو دو گھنٹے انتظار فرمائیے اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے ملوں گا۔

یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے۔ وہ نہ صرف اہلِ علم کی قدر و منزلت کرتے تھے بلکہ ان کے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چناں چہ مولانا حالی کی ان کے دل میں بہت وقعت تھی۔ چناں چہ جب

انھیں یہ معلوم ہوا کہ 'حیاتِ جاوید' چھپ چکی ہے اور مولوی عبداللہ خاں صاحب کے پاس کچھ نسخے آئے ہیں تو رات کے آٹھ بجے کتاب منگوائی اور اسی وقت مطالعہ شروع کیا اور بہت سا حصہ پڑھ ڈالا اور دوسرے دن بغیر ختم کیے نہ چھوڑی۔ ایک روز یہ واقعہ بیان کیا کہ علامہ نولڈکی کی ہشتاد سالہ سال گرہ پر اس کے شاگردوں اور اس کے مداحوں نے اس کی یادگار میں مختلف علمی رسائل لکھ کر ایک کتاب کی صورت میں طبع کرائے جو ایک ایسے فاضل کی یادگار کے لیے نہایت موزوں اور عمدہ یادگار ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ تجویز کی کہ ہم لوگوں کو چاہیے کہ مولانا حالی کی علمی خدمات کی شکرگزاری کی یادگار میں ایک رسالہ لکھیں اور خود بھی ایک رسالہ لکھنے کا وعدہ کیا اور راقم سے بھی تحریک کی اور اس کتاب کے اخراجاتِ طبع وغیرہ کی خود ذمہ داری لی۔

جس زمانے میں 'تمدنِ ہند' کا ترجمہ کر رہے تھے تو اول صبح کو اٹھ کر چند ورق 'حیاتِ جاوید' کے پڑھ لیتے تھے اور اس کے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے۔

ایک بار 'حیاتِ جاوید' کے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ جب ہماری زبان میں ایسی کتاب موجود ہے جو ہادی اور راہ بر کا کام دے سکتی ہے تو پھر ان لاطائل بحثوں میں پڑنا محض تضیع اوقات ہے۔ زبان دلی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں ان کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی۔

مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو بہت پسند کرتے تھے۔ چناں چہ 'تمدنِ عرب' میں جا بہ جا آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اس ترجمے سے لیا ہے۔ ایک روز مولوی عبداللہ خاں صاحب نے جن سے مرحوم کو بہت خصوصیت تھی اور ہم کو ان سے

مرحوم کے اکثر حالات معلوم ہوے ہیں آیت استوا علی العرش پڑھی اور کہا کہ مولوی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "عرش پر جا براجا" مرحوم پھڑک اٹھے اور کہا کہ استوا کا ترجمہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا ؞

مرحوم جب نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے ساتھ شملہ تشریف لے گئے تو مولوی سید احمد مؤلف 'فرہنگِ آصفیہ'، نے اپنی تالیف 'ارمغانِ دہلی' کے بعض اجزا پیش کیے۔ مرحوم نے ان کی بہت تعریف کی اور سفارش کر کے پچاس رُپے وظیفہ مقرر کرا دیا اور انعام کے لیے خود گزارش لکھ کر سرکار میں پیش کی۔ سرکارِ عالی سے بعد ازاں مؤلف کو گراں قدر انعامات عطا ہوے ؞

مولوی صاحب موصوف پر ایک بار کئی ہزار رُپے کی ڈگری ہوئی جس سے وہ بہت پریشان تھے انھوں نے مرحوم کو اطلاع دی۔ مرحوم نے کل رقم ان کے پاس بھجوا دی ؞

مرحوم بہت بامروّت تھے۔ اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اسی شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد برآری میں کوشش کرتے یہاں تک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامّل نہ تھا بہ شرطے کہ وہ سچا قدر دان ہو خاص کر طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے۔ چناں چہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں، مرحوم کے یہاں مدعو تھے۔ بارہ بجے کھانے کے بعد چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے، جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر فوراً 'کامل مبرد' کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستّر رُپے ہے، مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو کتابوں کا

شوقین ہو اہلِ علم کی درخواست رد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہو کہ سنہ ۱۹۰۳ء میں جب سر سید مرحوم آخر بار حیدر آباد تشریف لائے اور بشیر باغ میں سرکارِ عالی کے مہمان ہو کر فروکش ہوئے تو چوں کہ مرحوم کو اپنے کتب خانے کی نادر کتب کے دکھانے کا شوق تھا، سر سید کو اپنے مکان پر لے گئے اور کتابیں دکھانی شروع کیں۔ من جملہ دیگر کتب ایک بیش بہا کتاب ایسی تھی کہ اس میں اوّل سے آخر تک اسپین کی اسلامی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں۔ سر سید مرحوم نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہو کہ کالج کی لائبریری میں رہے تاکہ مسلمان اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ مرحوم نے کہا بے شک اسی قابل ہو اور چلتے وقت وہ نسخہ سر سید کی گاڑی میں رکھ دیا ؛

مرحوم نے "ردالمنطق لابن تیمیہ" اپنے خرچ سے نقل کروا کر مولوی شبلی کی نذر کی تھی۔ انگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہو آپ وہ نسخہ بھجوا دیجیے۔ مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چوں کہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لیے آپ طلب کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا یہ جواب دیا کہ پان سو روپے کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں۔ چناں چہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکارِ عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کے مرتب کرنے کے لیے حیدر آباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے ملے نہیں لیکن کتب خانے کے جلسۂ انتظامی میں اتفاق سے جب مٹھ بھیڑ ہو گئی تو مرحوم اسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا ؛

جب اہلِ علم میں سے کوئی شخص حیدر آباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو ان کی

یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا مہمان ہو۔ چناں چہ مولانا شبلی جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً پہنچے اور اپنے گھر لے گئے لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اُٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا اور یہ رنج ان کے خطوط سے صاف مترشح ہوتا ہے۔

مرحوم اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی رُکاوٹ یا مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات حیرت انگیز کام کر جاتے تھے۔ چناں چہ من جملہ دیگر واقعات کے ہم ایک واقعے کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ مرحوم کے والد سید زین الدین خاں صاحب کی عمر کا اکثر حصّہ پٹنہ میں صرف ہوا تھا، اور مولوی خدا بخش خاں صاحب کے مرحوم سے بہت تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولوی خدا بخش خاں صاحب مرحوم کسی مقدمے میں وکیل ہو کر حیدرآباد تشریف لائے اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے مرحوم ہی کے مکان پر ٹھہرے۔ انھیں ایام میں ایک بار انھوں نے مرحوم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا وکیل ہوں اگر آپ کی سعی سے سرکارِ عالی مجھے وکالت درجۂ اوّل کی سند عطا کر دے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ مرحوم نے نہایت خوشی سے مقدور بھر کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دُوسرے ہی روز وہ میر افضل حسین مرحوم میر مجلس عدالت العالیہ (چیف جسٹس ہائی کورٹ) کے یہاں پہنچے اور بہت منّت و لجاجت سے اظہارِ مطلب کیا اور کہا کہ مولوی صاحب ہمارے والد کے دوست اور ہمارے بزرگ ہیں، اگر آپ کی عنایت سے ان کا یہ کام نکل جائے جو کوئی بڑی بات نہیں، تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ مگر میر صاحب مرحوم نے کچھ ایسا غیر متوقع اور دل شکن جواب دیا کہ اس کے بعد مرحوم نے مولوی خدا بخش خاں کا ان سے تعارف کرانا بھی پسند نہ کیا اور بغیر ملائے ساتھ واپس لے گئے، جب راستے میں

تمام واقعہ مولوی صاحب سے بیان کیا تو مولوی صاحب مرحوم کو بے انتہا رنج اور مایوسی ہوئی۔ مرحوم نے کہا آپ دل شکستہ اور مایوس نہ ہوں، اگر میر افضل حسین صاحب نے سند نہیں دی تو کچھ مضائقہ نہیں، انشاءاللہ اب ہم کوشش کریں گے کہ آپ خود میر مجلس ہو جائیں اور دوسروں کو سندیں عطا کریں۔ چناں چہ مرحوم نے جان توڑ کوشش کی اور آخر مولوی خدابخش خاں صاحب کو میر مجلس کر کے رہے ؛

مرحوم کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی علمی کام یا تجارت کے لیے روپیہ طلب کرتا تو وہ حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ چناں چہ حیدرآباد کے ایک صحاف نے اُن سے آکر کہا کہ مجھے آپ کوئی کتاب جلد باندھنے کے لیے دیجیے۔ مرحوم نے ایک کتاب دی اور کہا اگر تم عمدہ جلد باندھو گے تو ہم تمھیں اور کام دیں گے۔ جب وہ جلد باندھ کے لے گیا تو مرحوم نے بہت پسند فرمائی اور اس کے کام کی تعریف کی۔ صحاف نے کہا۔ سرکار یہ کیا کام ہے افسوس سامان نہیں، اگر میرے پاس سامان ہوتا تو پھر آپ میرا کام دیکھتے۔ مرحوم نے فوراً اسے دو ہزار روپے کا سامان اور ضروری مشینیں منگوا دیں۔ مطبع شمسی (حیدرآباد) اسی قبیل سے ہے اور مرحوم کے فیض کی یادگار ہے۔ کبھی کبھی وہ طالب علموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے رہتے تھے ؛

مرحوم اگرچہ شیعہ خاندان سے اور شیعہ والدین کی اولاد تھے اور اسی سے شیعہ بھی کہے جاتے تھے، لیکن وہ تعصب سے بالکل بری تھے اور شیعہ سنی کی تفریق کو بہت بُرا خیال کرتے تھے۔ حال آں کہ مرحوم کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا یہ عجیب بات ہے کہ اس میں اس مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی ؛

چناں چہ جب مرحوم کتب خانہ دیکھنے کے لیے رام پور گئے تو نواب صاحب رام پور سے بھی کتب خانے کے متعلق ذکر آیا۔ نواب صاحب نے کسی قدر فخر سے

فرمایا کہ "ہم نے وہ کام کیا جو ہمارے اجداد نے نہیں کیا تھا یعنی اس کتاب خانے میں سنّی مذہب کی کتابیں تو جمع تھیں ہی، لیکن ہم نے مذہب شیعہ کی کتب بھی جمع کی ہیں، خصوصاً ملّا محمد باقر مجلسی کی 'بحار الانوار' کی پچپن جلدیں جو حال ہی میں طبع ہوئی ہیں ہم نے منگائی ہیں" مرحوم نے فرمایا کہ "شیعوں کی مذہبی کتب محض بے کار ہیں اور ہرگز قابلِ استدلال نہیں۔ جب 'بخاری' و 'مسلم' جیسی کتابیں جن کے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی ہے استقام و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو ملّا باقر کی کتاب کس شمار میں ہے"۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ اور کچھ نہیں اتنا تو ضرور ہے کہ اہلِ بیتِ نبوی کے فضائل جو سنّیوں نے خصوصاً 'بخاری' و 'مسلم' کے جامعین نے قلم انداز کر دیے ہیں وہ اس میں درج ہیں۔ مرحوم نے کہا "یہ بھی ایک مہمل بات ہے۔ نبیؐ روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہلِ بیت کے محامد بیان کرنے کے لیے ایک معمولی تمیز دار شریف آدمی بھی اپنے اہلِ بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلافِ آداب سمجھتا ہے۔ نبیؐ کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلافِ قیاس ہے"۔

ایک روز مرحوم نے فرمایا کہ کیمبرج یونی ورسٹی میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی جو پڑھا لکھا اور عالم شخص تھا۔ مَیں نے پوچھا "تم حضرت عمرؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟ ایرانی عالم نے جواب دیا کہ "ہم حضرت علیؓ کی پیروی کرتے ہیں"۔ اس پر مَیں نے کہا کہ "حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے تو وہ اپنی بیٹی امّ کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کبھی نہ کرتے۔" ایرانی نے تعجب سے پوچھا "اس واقعے کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟" مرحوم نے اپنے

کتب خانے سے فوراً 'تاریخِ یعقوبی' مصنفۂ ابنِ واضح کاتب عباسی جو کہ شیعہ مذہب کا عالم ہی لاکر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی ہی اور جس کے دیباچے میں مصنف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہی۔ ایرانی عالم اس کتاب اور واقعے کو دیکھ کر تائب ہوگیا اور عہد کیا کہ آیندہ کبھی حضرت عمرؓ کو بُرا نہ کہوں گا اور تعجب کیا کہ ہمارے لوگ ان باتوں کو کیوں چھپاتے ہیں ؛

قیامِ بلدۂ حیدرآباد میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ایک روز راقم مولوی عبداللہ خاں صاحب اور ظہیر الدین فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب' مرحوم کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے شیعہ مولوی تشریف لائے۔ مرحوم نے عبداللہ خاں سے کہا کہ ذرا 'یعقوبی' کی تاریخ' جلد دوم نوادر سے لے کر آؤ۔ جب وہ کتاب لے کر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ آپ اس میں کیا ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو مرحوم نے ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک مقام پر سے پڑھ کر سنانی شروع کی۔ یہ وہی مقام تھا جس کا اوپر ذکر ہوا ہی۔ اس شیعہ عالم نے مخاطب ہوکر کہا کہ "آج کئی روز سے ہم میں اور ہماری بیوی میں بحث ہو رہی ہی، وہ میری اس بات کو قبول نہیں کرتیں کہ حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا اور اس قدر مہر مقرر ہوا تھا اور ان سے ایک بیٹا مسمّی زید پیدا ہوا تھا۔" اس پر حاضرینِ جلسہ میں سے ایک صاحب نے کہا کہ علمائے شیعہ اس واقعے کے منکر نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جبر و اکراہ کا نکاح تھا۔ مرحوم نے نہایت تعجب سے کہا کہ "یہ خیال نہایت جاہلانہ اور ذلیل ہی دنیا میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ فاطمہؓ کی لڑکی کو علیؓ سے چھین سکے یا اس سے زبردستی نکاح کرے؟" آخر مولوی صاحب خفیف سے ہوکر رہ گئے اور کچھ جواب نہ بن پڑا ؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ خلفائے اربعہ کے مناقشات اور خانگی جھگڑوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ مرحوم نے فرمایا کہ خلفائے اربعہ میں کوئی ذاتی عداوت یا دشمنی تو تھی نہیں اگر تھی تو اتنی جتنی ہم میں اور مولوی عزیز مرزا صاحب میں۔ مثلاً اگر کوئی جگہ خالی ہو اور اس کے لیے مولوی عزیز مرزا بھی کوشش کریں اور ہم بھی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم دونوں میں دشمنی یا عناد ہے اگر اس مقام یا موجودہ ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد دوسری جگہ چلے جائیں تو ہم لوگوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی اور اپنے حق کے لیے کوشش کرنا کوئی دشمنی کی بات نہیں ہے؛

شیعہ سنّی کے جھگڑے کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ یہ پولٹیکل جھگڑا ہے۔ ان کے پاس ایک عالم جرمن کی کتاب بھی تھی جس میں اس پر خوب بحث کی ہے مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کر دیں۔ لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا؛

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک معزّز ممبر نے انھیں لکھا ہے کہ "میرا ارادہ ہے کہ آپ کا نام اب کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے تجویز کروں اور مجھے قوی امید ہے کہ سب ممبر اسے خوشی خوشی قبول کر لیں گے۔ آپ کے انتخاب کے لیے تین بڑے وجوہ ہیں۔ اوّل آپ شیعہ ہیں دوسرے عالم ہیں تیسرے صاحبِ مال و جاہ ہیں" مرحوم نے جواب میں لکھا ہے کہ "جو وجوہ آپ نے میرے انتخاب کے لیے لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا فرمانا ہے کہ مَیں عالم ہوں یہ غلط ہے۔ میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ مال دار ہوں یہ بھی صحیح نہیں، البتہ اتنا ہے کہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں تیسرے یہ کہ مَیں شیعہ ہوں یہ سچ ہے لیکن مَیں سنہ ۱ ہجری کا شیعہ ہوں اس سے آگے بڑھنے کی مَیں نے ذرا بھی کوشش نہیں کی ہے۔ علاوہ اس کے مَیں اس قسم کی

کانفرنسوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جب کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہو اور اسی لیے میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پریسی ڈنٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔"

ایک دفعہ شمس العلما مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے کیوں عداوت ہے۔ حال آں کہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی، بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر۔ فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اُٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے۔ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے۔ اگر اسی طرح آپ کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں"۔

مذکورہ بالا واقعات سے مرحوم کے مذہبی خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے زیادہ تصریح کی حاجت نہیں۔

مرحوم 'صحیح بخاری' کے بڑے مدّاح اور قدردان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ 'ہدایہ' کے بھی وہ بہت ثناخواں تھے اور جس قدر مختلف نسخے ان کے پاس بکنے آتے وہ خوشی خوشی انھیں خرید لیتے حال آں کہ متعدد نسخے موجود تھے۔

اگرچہ مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیتِ قومی ان میں ضرور تھی اور اسلام و بانیٔ اسلام پر دل سے یقین کرتے تھے مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصّبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے

قیامِ انگلستان میں وہ اکثر ہندستانی اور دیگر بلادِ اسلامی کے طلبا اور مقیم اصحاب کی دعوتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے باڈی گارڈ کو دعوت دینے کا خیال کیا اور بہ ذریعۂ ٹیلی فون ان سے دریافت کیا۔ ان کے افسر نے نہایت خوشی کے ساتھ دعوت قبول کی اور کہا کہ یہ تو ہمارے لیے بڑی عزّت و فخر کی بات ہے کہ عالمِ سیّد نے ہماری دعوت کی ہے۔ دعوت کے دو گھنٹے پہلے اس افسر نے ٹیلی فون کے ذریعے سے پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مولوی صاحب کو جو ہمارے ساتھ ہیں لیتے آئیں کیوں کہ ہم لوگ جاہل ہیں آپ سے کیا باتیں کریں گے۔ مرحوم نے فرمایا آپ ایک نہیں بلکہ جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔ ہندستان کے ان مسلمانوں سے تعارف پیدا کرانے کے لیے ترکی اور ایرانی قونصلوں کو بھی دعوت دی اور اس بے تکلفی کی وجہ سے کسی انگریز کو دعوت میں نہ بلایا۔ شام کے وقت جب سب لوگ کھانے کی میز پر آئے تو باڈی گارڈ والوں کے مولوی صاحب نے جو غالباً پنجابی تھے کہا کہ کھانے سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کے پاس گوشت کہاں سے آیا ہے۔ مرحوم نے پوچھا اس سے آپ کا کیا مقصد ہے۔ مولوی صاحب نے کہا لندن میں کہیں حلال گوشت نہیں ملتا؛ سب حرام ہوتا ہے اس لیے میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کروں گا، کبھی گوشت نہ کھاؤں گا۔ مرحوم نے غصّے سے تلخ لہجے میں جواب دیا کہ افسوس آپ جاہل ہیں اور دینِ اسلام سے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ ایک مسلمان کے دسترخوان پر آپ کو اس قسم کے فاسد خیالات و شبہات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا آپ کو لَا تَجَسَّسُوْا کا قول یاد نہیں ہے؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ جب غیر قوموں کے ساتھ معاہدہ کرتے تھے تو من جملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ جو مسلمان وہاں وارد ہو اس کی تین دن

تک دعوت کریں۔ کیا ان مسلمان مسافروں کے لیے مسلمان ذبح کرتے تھے یا مسلمان باورچی ہوتے تھے؟ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی شے کے حرام ہونے کا علم نہ ہو اُسے حلال سمجھنا چاہیے۔" چوں کہ یہ گفتگو مرحوم نے کسی قدر تلخ اور درشت لہجے میں کی تھی اور سوائے ہندستانیوں کے دُوسرے اسے سمجھ نہیں سکتے تھے اس لیے باقی لوگ حیرت سے مرحوم کا منھ تک رہے تھے۔ آخر ترکی قونصل نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ مرحوم نے سارا قصّہ دہرایا اور کہا کہ یہ ہندُستان کے مسلمانوں کا نمونہ ہے اس سے آپ ان کی اخلاقی حالت کا اندازہ کر لیجیے۔ یہاں یورپینوں نے اوّل ہی میرا دم ناک میں کر رکھا ہے، کوئی پوچھتا ہے۔ "تمھارے مذہب میں پردہ کیوں ہے؟" کوئی کہتا ہے "تمھارے پیغمبرؐ نے تعدّدِ زوجات کی اجازت کیوں دی ہے؟ کوئی سوال کرتا ہے "تمھارے نبیؐ نے عورتوں کے مارنے کا کیوں حکم دیا ہے؟" ان اعتراضات اور سوالات کا جواب دیتے دیتے ہم تنگ آگئے ہیں اور پھر جب یہ مولوی صاحب اور ان کے ہم خیال یہاں کی سوسائٹی میں رہ کر اس قسم کی رکیک باتیں کرتے ہیں تو مسلمانوں کے متعلق غیر قوموں کے خیالات کیا ہوں گے۔ ایسے شخص کے زہریلے خیالات کا اثر تمام قوم اور ملک پر پڑتا ہے۔ ترکی قونصل نے کہا اگر واقعی ہندُستان کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے تو نہایت قابلِ افسوس ہے۔ جب اہلِ فوج کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے مولوی صاحب نے سیّد صاحب کی دل آزاری کی ہے اور انھیں رنج پہنچایا ہے تو ان سب نے بالاتّفاق مولوی صاحب سے یہ کہا کہ وہ سیّد صاحب کے قدموں پر سر رکھیں اور معافی مانگیں ورنہ ہم اپنی جماعت سے خارج کر دیں گے۔ چناں چہ مولوی صاحب نے اٹھ کر معافی مانگی اور مرحوم نے خندہ پیشانی سے معاف کر دیا اور جب رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب کو گلے لگایا اور اُلٹی معافی مانگی اور سَو رُپے کا چیک ان کی نذر کیا اور یہ نصیحت

کی کہ ایسے شخصی اور ذاتی خیالات سے ملک اور قوم بدنام ہوتے ہیں آیندہ کبھی کسی سوسائٹی میں ایسی گفت گو، نہ فرمائیے گا ورنہ تمام ہندُستان کے مسلمان غیر قوموں کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے ؛

مرحوم ہندُستان کے مروّجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدّد زوجات کے حامی تھے ؛

پارسی قوم کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ قوم پچاس سال میں فنا ہو جائے گی. کیوں کہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں ؛

مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چناں چہ اس زمانے میں جب کہ وہ "تمدّنِ ہند" کا ترجمہ کر رہے تھے انھوں نے اپنے ایک دوست کو وہ باب سُنانا شروع کیا جس میں دڑاوڑی قوم کا (جو ہندُستان کی ایک قدیم وحشی قوم تھی) ذِکر تھا۔ جب مرحوم پڑھنا ختم کر چکے تو اس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے مِلنے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں ؛

مولوی محمد سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین ہیں مرحوم سے ایک کتاب بہ غرضِ نقل مستعار طلب کی، کتاب تھی نادر، مرحوم کو دینے میں تامّل تھا مگر مروّت کے مارے صاف صاف انکار بھی نہ کر سکتے تھے، کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بے شک عمدہ ہے مگر اس کی جلد سُؤر کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لاحول ولا قوۃ کہ کر کتاب وہیں

میز پر پٹک دی ؛

ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آگھیرا۔ مرحوم نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرے ہوئے ہو میں تو وہابی ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ سب چھوڑ کر الگ ہو گئے ؛

مرحوم بہ زمانۂ طالب علمی نیز بعد ازاں پنشن لینے کے بعد انگلستان میں کئی سال مقیم رہے اور انھیں اعلا سوسائٹی میں جانے اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم جب جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے اور اُسے صرف رُپیہ کمانا اور صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دُوسرے کی بات کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے ؛

زندگی کے آخر زمانے میں مرحوم کو بعض وجوہ سے حیدر آباد دکن کا قیام ترک کرنا پڑا۔ اس وقت انھیں اس کا رنج بہت تھا۔ کیوں کہ یہاں اُن کے مکانات تھے، کتب خانہ تھا، بیوی بچے سب یہیں تھے اور دو بیٹوں کی ملازمت کا سلسلہ بھی یہیں ہو گیا تھا، دُوسرے عمر کا بہترین حصّہ یہیں کٹا تھا اور دنیا کے نشیب و فراز اور ادبار و اقبال کے تماشے یہیں دیکھے تھے۔ لہٰذا اس کی محبّت وطن سے کم نہ تھی۔ لیکن جب یہاں سے جا کر انھوں نے ہردوئی میں قیام کیا (جہاں انھوں نے ایک بڑا مکان اپنے رہنے کے لیے خرید لیا تھا) اور پھر وہاں سے مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں آنے جانے لگے اور قوم کی خدمت میں وقت صرف ہونے لگا تو اس وقت آنکھیں کُھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ اس سے پہلے عمرِ عزیز بے کار بکھیڑوں اور تفریح میں گزری۔ زندگی کا لطف اب آئے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یونی ورسٹی کا مسئلہ چھڑ گیا۔ جس میں

انھوں نے بڑے شوق اور جوش سے کام شروع کیا اور یونی ورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب بھی انھیں کے تفویض ہوئی جس کے لیے وہ خاص طور پر موزوں تھے۔ اس میں انھوں نے بڑی محنت کی اور قابلِ قدر کام کیا۔ آخر وہ وقت جو اگرچہ معیّن نہیں ہے مگر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا آگیا اور بے وقت اجل سر پر آن پہنچی اور دفعتہً ہر دوئی میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے بہ تاریخ ۳ رمبئی سنہ ۱۹۱۱ء انتقال ہو گیا۔ اور قوم کا ایک برگزیدہ فرد اُٹھ گیا۔

مرحوم علاوہ عالم فاضل ہونے کے متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور افسوس کہ اب قوم میں کوئی شخص ان کا جانشین نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم پر حبِ دولت و جاہ غالب تھی لیکن جب رُپیہ ان کے پاس آتا تو اس کے دینے میں بھی بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک اور چلتے پرزے ہوتے یا اشاعتِ شہرت میں مدد دیتے تھے۔ مرحوم علما اور طالب علموں کی قدر کرتے تھے اور خواہ ان کی دنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنا کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں اُن سے بڑی مروّت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے اُن کی صحبت سے خوش ہوتے تھے اور اس لیے اکثر اُن کے ہاں علمی تذکرے اور چرچے رہتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی دیکھ کر عربوں کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ممالک کے سیّاح اور علما کے لیے ان کا عالی شان مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ حقِ میزبانی ادا کرتے تھے۔ جب جایئے ان کے مکان پر کوئی نہ کوئی ہندی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی، امریکن، ترکی یا مصری سیاح یا عالم نظر آتا تھا، دوسروں کی بھلائی اور مقصد برآری کے لیے

ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بےکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے۔ نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دست گیری کرنا فرض ہے۔ چناں چہ ایک زمانے میں محکمۂ تعمیرات و معدنیات و ریلوے میں سب کے سب یوروپین، یوروشین اور دیسی عیسائی تھے، مسلمان اِکّادُکّا نظر آتے تھے۔ لیکن جب مرحوم کا تقرر اس عہدے پر ہوا تو مسلمان رفتہ رفتہ داخل ہونے شروع ہوئے اور اب معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مرحوم کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی۔ چناں چہ جب وہ حیدرآباد سے وظیفہ لے کر انگلستان گئے تو وہ بھی ان کے شریکِ سفر تھیں، جس زمانے میں مولانا شبلیؔ مرحوم کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ اُلٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اُسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلوّن مزاج تھے اور بعض اوقات وہ خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حبِ جاہ میں بعض ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔ خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے تھے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا یہ ان میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔ مرحوم اگر اپنے فضل و کمال سے کام لیتے تو وہ بہت بڑے آدمی ہوتے، لیکن افسوس کہ حیدرآباد کی گوناگوں دل فریبیوں اور مجبوریوں نے اُن کے وقتِ عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصہ غصب کر لیا۔ اور جاہ طلبی کے بکھیڑوں نے وہ الجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب

نہ ہوا کہ وہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مصروفیت رکھتے جس کے وہ ہر طرح موزوں اور اہل تھے۔ انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لیے وہ دن رات سرگرداں و حیران رہا، وہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا اور وہ کوششیں جن کے لیے اس نے اپنی جان تک کھپادی، پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائے دار اور لکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں۔ اور کچھ انھیں کاموں کو بقا حاصل ہی جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور شاید محض ضمنی طور پر کیے گئے تھے۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہی، بہت مشکل ہی کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ کمال کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلقِ خدا کو ان سے فائدہ پہنچے۔ وقت ایک نعمت ہی اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی قدر نہیں کرتا اور قدر اس وقت ہوتی ہی جب کہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہی۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو، جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں اور جو لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔ مرحوم نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں بہت سے کام کیے لیکن اکثر ایسے ہیں جیسے ہوا کا جھونکا کہ آیا اور گیا، لیکن یادگار دنیا میں وہی رہیں گے جن کا اثر دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا اور یہ ان کی بعض تحریریں ہیں جو اُن کے قلم سے نکلیں ملک میں پھیلیں اور سورج کی روشنی کی طرح سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو ان کے قدردانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

(۲)

# 'تمدّنِ ہند'

یہ مرحوم کی آخری کتاب ہے اور یہ بھی 'تمدّنِ عرب' کے مشہور مصنّف موسیو لیبان کی تصنیف ہے۔ مرحوم نے ان دو ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے کہ ان کا نام بہت عرصے تک یاد رہے گا۔ کیوں کہ یہ دونوں کتابیں اہلِ ملک کے لیے مفید اور دل چسپ ہیں۔ عربی تمدّن کو جس طرح اشاعتِ اسلام کی وجہ سے خاص وسعت حاصل ہوگئی ہے، اسی طرح ہندی تمدّن اپنی قدامت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ تمدّن کی نشو و نما میں ہزاروں مختلف اثرات کام کرتے ہیں جن کا سراغ لگانا امکان سے باہر ہے لیکن ایک ظاہری اور بڑا سبب خود ملک اور اس کی آب و ہوا ہے۔ ہندستان بلحاظ خلاصۂ عالم ہے۔ کیا ہے جو یہاں نہیں ہے، اور کون سی اس کی ایسی ادا اور دل کشی ہے کہ جس کی دنیا بھر دل دادہ اور شیدائی نہیں۔ سر بہ سر بہ فلک پہاڑ کھڑے پہرہ دے رہے ہیں، قدموں کے نیچے بحرِ زخّار موجیں مار رہا ہے۔ ملک کے ایک حصّے میں اس قدر گنجان آبادی ہے کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں دوسرے حصّے میں لق و دق بیابان پڑے ہیں۔ آب وہوا کو دیکھیے تو ایک طرف وہ کڑاکڑ اتے جاڑے پڑتے ہیں کہ دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں۔ اور لہو بدن میں جم جاتا ہے اور دوسری طرف وہ قیامت کی گرمی ہے کہ لہو پسینہ ہو کر بہ جائے اور پھر بعض مقامات پر وہ اعتدال ہے کہ انسان بھولے سے بھی جنّت کی ہوس نہ کرے۔ تہذیب کا یہ عالم ہے کہ ایک جگہ کمالِ تمدّن کی وہ انتہا نظر آتی ہے کہ دنیا کی اعلا سے اعلا تہذیب و تمدّن

کی آنکھیں نیچی ہو جائیں، اور دوسری جگہ وہ وحشی اقوام آباد ہیں کہ جنھیں دیکھ کر حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کی طرزِ معاشرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ مال و دولت اور زر و جواہر کی یہ حالت ہے کہ ابتدا سے اب تک بڑے بڑے تاج دارانِ عالم کی للچائی ہوئی نظریں اس پر پڑتی رہیں اور خدا ہوس کا بھلا کرے کہ اب بھی بڑے بڑے شہنشاہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور سوتے جاگتے اسی محبوبۂ دل ربا کے خواب نظر آتے ہیں۔ زمین ہے کہ بے چھیڑے سونا اُگل رہی ہے اور چھوتے ہی بھبک اُٹھتی ہے۔ پیداوار کی وہ بہتات کہ اس مُلک کو حدیقۂ عالم اور باغِ کائنات کہا جائے تو بجا ہے۔ ہزاروں قسم کے درخت، جڑی بوٹیاں، پھُول پھل، میوے، اجناس اور غلّے اس افراط سے کہ جن کی نظیر دنیا میں نہیں۔ پھر حیوانات کی ویسی ہی کثرت کہ بھانت بھانت کے جانور پکھیرو درندے چرند پرند کہ بجائے خود ایک عجائب خانہ ہے۔ مختلف اقوام اتنی کہ دنیا کی شاید کوئی نسل ایسی ہو کہ اس کی یادگار یہاں نظر نہ آتی ہو۔ زبانیں اور بولیاں سیکڑوں اور اس قدر مختلف کہ اگر ملک کے ایک حصّے کا آدمی دوسرے حصّے میں پہنچ جائے تو اس قدر اجنبی معلوم ہو کہ گویا دنیائے مریخ سے کوئی اُتر آیا ہے۔ مذاہب کی وہ شان کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک طرف اور یہاں کے ایک طرف۔ غرض ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک جتنے انقلابات ہوے، جتنی ترقیاں ہوئیں، جتنے نشیب و فراز ہوے، انسان نے جتنے چولے بدلے، جتنی کروٹیں لیں، اُن سب کے سچّے نشان اب تک الگ الگ موجود ہیں۔ یہاں آکر تمدّن کی سچی تعریف اور اصلی قدر معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ یورپ باوجود اس ترقّی و تہذیب کے تمدّن کی صحیح

تعریف سے قاصر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمدّنِ ہند کی تاریخ تمدّنِ عالم کی تاریخ ہے اور اسی لیے جو کوشش اس کے متعلق کی جائے وہ قابلِ قدر اور لایقِ شکر ہے۔

تمدّنِ ہند کی تاریخ گویا تین ہزار سال کی تاریخ ہے اور اسے کئی قرنوں میں تقسیم کیا گیا ہے:-

قرنِ اوّل یعنی رگ وید کا زمانہ اس میں آریوں کے زور و قوّت اور جنگ و فتح کا آغاز ہے۔ جس میں وہ ملکیوں سے لڑائی بھڑائی میں مصروف رہے۔ یہ لوگ بعد کے ہندوؤں سے بالکل مختلف تھے جو گیان دھیان اور فلسفۂ الٰہیات میں مگن رہتے تھے۔ اس وقت کا علمی کام صرف رگ وید کے ۱۰۱۷ اگیت ہیں جو اگرچہ مذہبی ہیں مگر ان سے ابتدائی زندگی کی حالت منترشح ہوتی ہے اور دنیا کے ابتدائی فلسفے کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ یہ گویا پندرہ سو سال قبلِ مسیحؑ کا زمانہ ہے۔

قرنِ دوم۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ وہ ستلج تک پہنچے اور گنگا جمنا تک بڑھے۔ اس میں انھوں نے اپنی فتوحات کی تکمیل کی اور ملک کے اصلی باشندوں کو بالکل مغلوب و محکوم کر لیا۔ اسی زمانے میں وید تصنیف ہوئے اور کورو اور پانچالوں کی جنگ ہوئی یہ زمانہ پندرہ سو قبلِ مسیحؑ سے ایک ہزار سال قبلِ مسیحؑ تک ہے۔

قرنِ سوم۔ اس میں آریوں نے اپنے فتوحات کو اور وسیع کیا۔ یہ زمانہ جنگی اور علمی کارناموں سے ممتاز ہے۔ فلسفے کا خاص کر زور ہوا اور ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوا جو دنیا میں اب تک عالم گیر ہے یعنی بدھ مذہب کی بنیاد پڑی۔ اس زمانے کو ایک ہزار سال قبل مسیح سے ۳۲۰

قبلِ مسیحؑ تک سمجھنا چاہیے ÷

قرنِ چہارم - یہ مذہبِ بُدھ کا زمانہ ہے۔ اس میں بُدھ حکومت اور بُدھ مذہب کا زور شور رہا۔ علوم و فنون کو رونق ہوئی - شاعری، صرف و نحو، قانون، نجوم، فلسفہ وغیرہ کی تالیف و تصنیف کا بازار گرم ہوا اور ہندو تمدّن جنوبی ہند و سیلون وغیرہ میں پھیلا - یہ زمانہ ۳۲۰ قبلِ مسیحؑ سے ۵۰۰ سنہ عیسوی تک شمار کیا جا سکتا ہے ÷

قرنِ پنجم - جدید برہمنی مذہب پھر اُبھرتا ہے اور بدھ مذہب کو مغلوب کر لیتا ہے - یہ پولٹیکل اور علمی کارناموں کا زمانہ ہے جو ۵۰۰ سے ایک ہزار سنہ عیسوی تک یعنی محمود غزنوی کے حملے تک ÷

قرنِ ششم - مسلمانوں کا عہد ÷

قرنِ ہفتم - یوروپی عہد ÷

ہند کے قدیم تمدّن پر اگر ابتدا سے غور کیا جائے تو تحقیق ہو سکتا ہے کہ انسانی تمدّن کیوں کر بنتا، بڑھتا، نشو و نما پاتا اور پھلتا پھولتا ہے - اوّل اوّل آب آریہ خانہ بہ دوش گلہ بانوں کی طرح ملک میں داخل ہوے اور پھر آخر میں رفتہ رفتہ سارے مُلک پر چھا گئے اور ان کی معاشرت، نظامِ سیاست، علم و فضل اور قوت و عظمت کو عروج و کمال حاصل ہوا - جب اوّل سے آخر تک یہ تمام قرون اپنی مختلف نیرنگیوں کے ساتھ ہماری نظر سے گزرتے ہیں تو سب سے پہلے قدیم خیالات، معتقدات اور توہّمات کا وہ خاکہ آتا ہے کہ ان پر غور کیا جائے تو ان کی دھند میں واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ پتا لگ سکتا ہے کہ انسان جب تمدّن کی اوّل سیڑھی پر قدم رکھنے کو ہوتا ہے تو اس کی کیا حالت اور حیثیت ہوتی ہے اور آیندہ مدارج کیوں کر طے کرتا ہے ÷

ہمیں اس زمانے کی حالت ویدوں سے کیا معلوم ہوتی ہی؟ آریہ جب شمالی ہند میں داخل ہوے تو انھیں اپنے پیش رُو تورانیوں اور یہاں کے اصلی وحشی باشندوں سے مقابلہ کرنا پڑا اور مدت تک اسی جنگ وجدل میں بسر ہوئی آخر رفتہ رفتہ دشمن پسپا ہوے اور آریاؤں کا قبضہ شمالی مُلک پر ہو گیا۔ ان کی حالت اس وقت ویسی ہی تھی جیسی ایک جنگ جو فاتح قوم کی ہوتی ہی۔ فاتح وید کی شوکتوں میں اپنی فتح ونصرت کے گیت گاتے، حصولِ دولت وثروت اور پامالئ دشمن کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس وقت نہ مندر تھے نہ بُت۔ اور سوائے آریاؤں اور اصلی باشندوں کے کوئی ذات پات کا امتیاز نہ تھا۔ وہ آگ، پانی، آسمان اور سورج سے التجائیں کرتے اور ان کے بھجن گاتے ہیں۔ ایک ایسی قوم کے لیے جو دنیا میں اوّل اوّل میدانِ تمدّن میں قدم رکھ رہی ہی یہ بات کوئی خلافِ عقل یا خلافِ فطرت نہیں ہی۔ مثلاً جب وہ آندھیوں سے التجا کرتے ہیں کہ تم تھم جاؤ یا آسمان سے گڑگڑا کر یہ کہتے ہیں کہ مینھ برساؤ یا سورج سے درخواست کرتے ہیں کہ نکل اور چمک تو یہ ایسی باتیں ہیں جو اب بھی بعض سادہ لوح فرقوں میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہی ہندستان میں آکر جب انھوں نے قدرت کے عظیم الشّان مظاہرے دیکھے تو وہ ان کے آگے پرستش کے لیے جُھک گئے جو ایک امر فطرتی ہی:۔

یہاں ویدی زمانے کے دیوتاؤں کے متعلق مختصر سا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہی۔ کیا آریہ اس وقت خدا کو مانتے تھے؟ ان کا خدا ایک تھا یا کئی؟ رگ وید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہی کہ خدا کا مفہوم ان کے ہاں نہیں ہی۔ وہ متعدّد دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ان دیوتاؤں کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:۔

(۱) اکاش کے دیوتا۔ (۲) پرتھوی یعنی زمین کے دیوتا۔ (۳) پانی کے دیوتا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے گیارہ گیارہ تھے گویا کُل ۳۳ دیوتا ہوے اور بعضوں نے ۳۳ سے تین ہزار تین سو تینتیس تک پہنچا دیے ہیں۔ بعض ان میں سے سودمندی اور فائدے کے خیال سے دیوتا مانے گئے اور بعض خوف اور ڈر کی وجہ سے۔ مثلاً از روے رگ وید اگنی (آگ) برق سے آئی اور دو لکڑیوں کی رگڑ سے پیدا ہوئی۔ آگ کا دریافت کرنا ابتدائے تمدّن کے لیے نہایت ضروری ہے اور یہ ترقّی کا ممدّ و معاون ہے۔ لوگ بجائے کچّی چیزیں کھانے کے پکا کے کھانا شروع کرتے ہیں۔ اس کی مدد سے وہ رات کو بھی کام کر سکتے ہیں۔ جاڑوں میں وہ انھیں اکڑ کر مرجانے سے بچاتی ہے اور جو سورج اور صبح صادق میں نظر آتی ہے اور زمین و آسمان کو روشن کرتی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی شے کو جو آسمان سے زمین پر آتی اور انسان کے اتنے کام کرتی ہے، دیوتا نہ سمجھیں۔ آندھی اور رعد و برق خوف کی وجہ سے دیوتا مانے گئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے بڑا دیوتا اِندر ہے جو نیلے آسمان کا دیوتا، بادلوں کا جمع کرنے والا، مینھ کا برسانے والا، گرج کا کڑکانے والا، تاریکی کا مٹانے والا اور روشنی کا لانے والا اور قوّت، حیات اور تازگی بخشنے والا ہے۔ لیکن ان سب کے پیچھے ایک خیال ہے جو حیات سے پرے ہے اور جس کا نام مذہب ہے ؎

ویدی زمانہ زیادہ تر اس لیے قابلِ مطالعہ ہے کہ یہاں ہمیں زبان و خیالات کی پہلی صورت، مذہب و توہمات و رسوم کی بنیادِ اوّلین، فلسفیانہ خیالات کی ابتدائی جھلک اور خاندانی، دیہی اور سیاسی زندگی کی سعی نخستین نظر آتی ہے۔ لیکن ان سب کی بنیاد مذہب پر ہے جو فطرت کی سب سے پہلی تعبیر ہے۔

اور مذہب کی نشو ونما کی ابتدائی حالت جیسی یہاں معلوم ہوتی ہو وہ کسی دوسرے ملک کے لٹریچر میں نظر نہیں آتی - یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے ہاں یہ مفقود ہو، جو لوگ انسان کے ابتدائی حالات وخیالات کی تحقیق کے لیے وحشی اقوام کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں رگ وید کا مطالعہ بھی ناگزیر ہو ؛

ایک سوال اس کے متعلق تحقیق طلب ہو اور وہ یہ کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہو کہ رگ وید کا زمانہ ۱۵۰۰ برس قبل مسیح یعنی اب سے تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا تھا تو کیا آریا اس وقت فنِ تحریر سے واقف تھے؟ اگر نہیں تھے تو یہ کب معرضِ تحریر میں آیا اور نیز تحریر کا رواج آریاؤں میں کب سے شروع ہوا ؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ آریا لوگ اُس وقت فنِ تحریر سے بالکل ناآشنا تھے اور چوتھی صدی قبلِ مسیحؑ سے اوّل ہندستان میں تحریر کا کہیں پتا نہیں ملتا۔ ہندُستان بھر میں کہیں کوئی کتبہ ایسا نہیں پایا گیا جو تیسری صدی قبلِ مسیحؑ کے وسط سے قبل کا ہو - سب سے قدیم کتبے زمانۂ بدھ کے ہیں جو راجا اشوک کے عہد میں نصب کیے گئے تھے یہ راجا سلوقس کا ہم عصر تھا اور اس کا سفیر راجا کے دربار میں کئی سال تک رہا۔ اس راجا نے اپنی وسیع سلطنت میں مختلف مقامات پر کتبے نصب کرائے اور اس کی حکومت کا زمانہ ۲۵۹ - ۲۲۲ (ق-م) تک تھا۔ ان کتبوں کی یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ دو قسم کے ابجدوں میں لکھے ہوے ہیں - ایک تو سیدھی طرف سے بائیں جانب کو جیسے فارسی عربی لکھی جاتی ہو اور اس سے ثابت ہوتا ہو کہ یہ ابجد سامی ہو اور ہندی ابجد میں سے ماخوذ ہو۔ اور دوسری بائیں جانب سے داہنی جانب کو جیسے ہندی یا انگریزی وغیرہ مگر یہ بھی سامی ابجد سے حاصل کی گئی ہو مگر اسے حسبِ ضرورت اپنے

طور پر بنالیا گیا ہو۔ یہ دُوسری قسم کی ابجد تمام ہندی ابجدوں کا ماخذ ہوئی۔ اس سے پورے طور پر یہ ثابت ہو کہ فنِ تحریر کتبوں تک میں تیسری صدی (ق۔م) سے قبل استعمال نہیں ہوا تھا۔ میگھاستینز (سفیر سلوقس) نے صحیح لکھا ہو کہ ہندی لکھنا نہیں جانتے اور ان کے قانون تحریر میں نہیں آئے تھے[1]

جب یہ ثابت ہو کہ چوتھی صدی (ق۔م) سے پہلے فنِ تحریر کا رواج ہندُستان میں نہیں ہوا تو ظاہر ہو کہ وید سینہ بہ سینہ چلے آئے اور تقریباً تین ہزار سال تک حافظے میں محفوظ رہے کیوں کہ سب سے قدیم نسخہ رگ وید کا سنہ ۱۵۰۰ء کا ہو۔ اہلِ یورپ کے لیے شاید یہ امر باعثِ حیرت اور تعجّب ہو مگر ہم ایشیائیوں کے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو۔ اس وقت ہندوؤں میں وید اور مسلمانوں میں قرآن حفظ کیا جاتا ہو اور مطبوعہ نسخوں سے نہیں بلکہ ان اساتذہ سے جنھوں نے سلسلہ بہ سلسلہ اپنے اساتذہ سے اسی طرح حفظ کیا تھا ؛

چوں کہ یہ بات مصنّفِ 'تمدّنِ ہند' سے رہ گئی تھی لہٰذا یہاں اس کا لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دُوسری بات کا بیان کر دینا جو اس واقعے سے مستنبط ہوتی ہو فائدے اور دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم ابھی ذِکر کر چکے ہیں کہ قدیم سے قدیم کتبہ اشوک نبیرہ چندرگپت کے عہد کا ہو؟ اس کی حکومت ۲۵۹ - ۲۲۲ قبلِ مسیح تک رہی۔ لیکن ان کتبوں کی زبان کیا ہو؟ کیا وہ وید کی سنسکرت ہو؟ ہرگز نہیں۔ کیا وہ برہمنوں اور سوتروں کی مابعد کی سنسکرت ہو؟ بالکل نہیں۔ بلکہ یہ کتبے مقامی بولیوں

---

[1] انڈیا۔ پروفیسر میکس مولر

میں لکھے ہوے ہیں جو اس وقت ہندستان میں بولی جاتی تھیں اور وہ نحوی سنسکرت سے بالکل مغائر ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ (۱) قدیم ویدی زبان تیسری صدی (ق-م) سے قبل ہی رخصت ہو چکی تھی۔ (۲) مابعد کی علمی و نحوی سنسکرت کا رواج اُٹھ چکا تھا اور لوگ اس کے بولنے اور سمجھنے سے قاصر تھے۔ غرض یہ کہ سنسکرت بدھ کے مبعوث ہونے سے قبل اس مُلک کی زبان نہیں رہی تھی۔ اور اس لیے قدیم ویدی سنسکرت کا شباب بدھ مذہب کی پیدائش سے کہیں پہلے ہو چکا تھا۔ بدھ غالبًا سنسکرت جانتا ہوگا لیکن شاگردوں کو سخت تاکید تھی کہ وہ اس کی تعلیم کی تلقین لوگوں کو مُلک کی عام زبان میں کریں تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ویدی زمانے کے بعد ایک دوسرے زمانے کا آغاز ہوا جس کے خاص اور امتیازی کارنامے یہ تھے:-

(۱) جنگ وجدل اور فتوحات۔

(۲) برہمنوں کی قوت اور ذات کا زور۔

(۳) معاشرتی اور علمی ترقی۔

(۴) اپنشد یعنی رُوحانی تعلیم۔

اس زمانے میں آریا ستلج کو عبور کر کے گنگا جمنا کے دوآبے اور گنگائی میدانوں میں آئے، انھوں نے اصلی باشندوں سے ایک مدت تک لڑائی بھڑائی کر کے انھیں نکال باہر کر دیا یا غلام بنا لیا اور اس زرخیز خطّے میں بہ خوبی آباد ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں اس زمانے میں جنگ وجدل کر کے اپنی فتوحات کو وسیع کرنا پڑا۔ لیکن جب وہ یہاں کے

باشندوں کو مغلوب کر چکے، ملک فتح کر لیا اور آبادیاں قائم کر کے انھیں "ہندوا" چکے تو انھوں نے معاشرت و تمدّن کی طرف توجّہ کی۔ دنیا میں کون سا ملک اور کون سی قوم ہے جو بغیر جنگ و جدل اور بغیر تلوار اٹھائے اس منزل تک پہنچی ہو۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے مخالفوں پر غالب آ چکے تھے لیکن ابھی تک ان میں جنگ جوئی کا جوش باقی تھا جو باہمی مخاصمتوں میں بھڑک اُٹھا۔ چناں چہ مہابھارت اور رامائن کے جنگ نامے اس زمانے کی یادگار ہیں۔ اگرچہ یہ کتابیں مبالغے سے مملو اور دُور از کار باتوں سے بھری ہوئی ہیں تاہم اس زمانے کی معاشرت کا ضرور پتا لگتا ہے۔ رامائن تاریخی لحاظ سے بالکل ہیچ و پوچ ہے۔ رام اور سیتا وغیرہ خیالی ہیرو ہیں اگرچہ حسنِ نظمِ بیان نے انھیں واقعی اشخاص قرار دیا ہے اور ہندُستان میں سب ہندو مرد عورت انھیں سچ مچ کے تاریخی اشخاص سمجھتے ہیں اور کتاب کے اخلاقی نتیجے سے متاثّر ہوتے ہیں۔ یہ کتاب مہابھارت کے بعد کے زمانے کی ہے مگر عام طور پر اسے قدیم زمانے سے منسُوب کیا جاتا ہے۔ غرض یہ زمانہ دیکھا جائے تو برہمنوں کا زمانہ ہے۔ نظم و نسقِ سلطنت، جنگ و صلح، معاشرت اور مذہب، علم و فنون ہر شے میں برہمن پیش پیش ہیں اور ہر جگہ ان ہی کا زور ہے۔ اس عہد میں ہندوؤں نے بہ نسبت ویدی زمانے کے ہر شعبے میں بہت کچھ ترقّی کی۔ بادشاہی ٹھاٹھ، عیش و عشرت کے سامان، معقول عمارتیں ہر طرف نظر آنے لگیں اور انتظامِ مملکت، عدالت، زراعت، فنِ جنگ، قانون، صرف و نحو، منطق، فلسفہ، ہندسہ، نجوم، مختلف پیشوں اور علمِ ادب کے بعض شعبوں میں نمایاں ترقّی ہو گئی۔ اس زمانے کے کارناموں میں اپنشد کی تصنیف ہے جو ایک قسم کا فلسفہ یا تصوّف ہے اور جو اس زمانے کی عام روش سے بالکل نرالی

چیز ہی جس پر آیندہ فلسفۂ مذہب یا تصوّف کی بنیاد قائم ہوئی۔ اپنشد بہت سے ہیں اور مختلف علما کی تصنیف سے ہیں۔ اس کی تعلیم کا اصل اصول ایک عالم گیر رُوح ہی جو سب میں ساری ہی اس میں اور توحید میں فرق ہی، توحید میں خالق اور مخلوق الگ الگ ہیں مگر اپنشد کی تعلیم میں خدا ایک عالم گیر ذات ہی، باقی سب اسی سے ہی یا اس کا جزو ہی اور اس میں مِل جائے گا اور اس سے علاحدہ ہستی نہیں رکھتا۔ اسے مذہب ہمہ اوست سمجھنا چاہیے۔ یہی اصول ہندو فلسفے کی جان ہی جو آگے چل کر نشو و نما پاتا اور یوگ اور ویدانت میں نئے اور لطیف پہلوؤں سے ظاہر ہوتا ہی۔ اس کے بعد دُوسرا اصول تناسخ کا مسئلہ ہی۔ جو اس وقت کے بعد سے ہندو فلسفے اور مذہب کا رکنِ رکین ہوگیا۔

لیکن اس زمانے کا امتیازی مسئلہ ذات ہی۔ ذات کا امتیاز دنیا میں ہر جگہ تھا اور اب بھی پایا جاتا ہی خصوصاً تاریخِ روم میں یہ فرق نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہی۔ وہاں کھانے پینے اور شادی بیاہ کے معاملے میں امرا اور عوام میں وہی سدِّ سکندری حائل تھی جسے ہم ہندوؤں میں ذات کہتے ہیں۔ اور کیا اب یورپ میں وہی امتیاز اور فرق نہیں ہی؟ مگر بات اتنی ہی کہ وہاں یہ امتیاز بدلتا رہتا ہی اور ایک حالت پر قائم نہیں رہتا کیوں کہ اس کا دار و مدار سوشل حالت پر ہی مگر ہندی ذات کا مدار مذہب پر ہی اور اس لیے وہ اٹل اور قائم ہونے والی ہی۔ اس میں شک نہیں کہ امارت اور غربت، شرافت و رذالت کے امتیازات ہر جگہ تھے اور ہیں مگر یہ آتے اور جاتے ہیں اور پرچھائیں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ غلامی سی شے جس کی جڑیں مشرق سے مغرب تک دنیا کے تمام مختلف تمدّنوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ پتال

تک پہنچ گئی ہیں آخر دنیا سے اُٹھ گئی، مگر نہ اُٹھی تو یہ ذات کی غلامی۔ درحقیقت ہندوؤں کے تمدن پر یہ ایسا بُرا دھبہ ہے کہ گویا ملک ہزار ترقی کر جائے مگر یہ نظروں میں ہمیشہ کھٹکتا رہے گا۔ بدھ مذہب اور اسلام نے مساوات اور اخوت کا ڈنکا بجایا، ذات سے بہت کچھ بیزاری ظاہر کی اور اگرچہ ان کا قیام صدیوں تک رہا مگر کچھ نہ ہو سکا اور ذرا ظہور اصلاح ہوئی بھی تو وہ برائے نام اور عارضی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ذات کے امتیاز سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کم سے کم آریاؤں (برہمنوں) کی نسل مخلوط نہیں ہوئی لیکن جس حالت میں کہ نیچ ذات والے رکھے گئے ہیں اور جس تنفر اور حقارت کا برتاؤ ان سے کیا جاتا ہے وہ نہایت شرم ناک ہے۔ نیچ قوم یادگار ہے فاتح کے جبر اور مفتوح کی مظلومی کی۔ غلامی ہر جگہ سے اُٹھ گئی مگر یہ غلامی جو سب سے قدیم ہے، مذہب کے پردے میں اب تک باقی ہے۔ علاوہ ذات کی اُلجھن کے ایک بڑی مصیبت اس زمانے میں یہ تھی کہ برہمنوں کا زور تمدن کے ہر شعبے میں روز بہ روز بڑھتا جاتا تھا۔ جس طرح کھڑے پانی پر کائی اور درخت پر اکاس بیل چھا جاتی ہے اسی طرح برہمن بھی بے طرح تمام ہندوؤں اور ان کے نظامات پر چھائے ہوئے تھے اور خاص کر مذہب میں تو وہ افراتفری مچا رکھی تھی کہ خدا کی پناہ، مختلف عبادتوں، نئی نئی قسم کی پرستشوں، طرح طرح کے چڑھاووں، منتوں اور اعمال کا ایک ایسا مسلسل تار بندھا ہوا تھا کہ اس سے چھٹکارا پانا ایسا ہی محال تھا جیسے مکڑی کے جالے سے غریب مکھی کا۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کسی وقت بے جان رسوم اور اُکتا دینے والے اعمال سے فرصت نہ تھی۔ گویا یہی مذہب تھا یہی عبادت تھی اور یہی معاشرت اور اس کا حاصل اور یہی راہِ نجات تھی۔ اور طرّہ یہ کہ دن بہ دن یہ زنجیریں اور کڑی ہوتی جاتی تھیں اور ان میں وہ نزاکتیں اور

باریکیاں پیدا کی جاتی تھیں کہ یہ نام کا مذہب وبالِ جان ہوگیا تھا۔ ان بے جا اور حوصلہ شکن قیود اور جکڑ بند کی شدت سے لوگ عاجز آ گئے اور صبر و تحمل کا پیالہ لبریز ہوگیا اور سختی اس انتہا کو پہنچ گئی جب کہ زنجیریں خود بہ خود تڑ خنے لگتی ہیں۔ آخر وہ وقت آیا کہ اس طوفانِ بے تمیزی میں تزلزل پیدا ہوا جابروں کے حواس پراگندہ ہوے اور قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کٹ کے گرنے لگیں۔ اور وہ دھند جو ملک پر چھائی ہوئی تھی، آفتابِ صداقت کے طلوع ہوتے ہی کافور ہوگئی۔ بعثتِ بدھ علیہ السلام نے ایک نئی روح پھونک دی ہندستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس سرزمین پر اس رحمتِ باراں کا نزول ہوا جس کا یہاں پتا پتا اور ذرہ ذرہ تشنہ لب تھا۔ اس نے مردہ دلوں کو شگفتہ کر دیا، مایوسوں کو آس دی، امیر و غریب، برہمن، شودر، سب کو ایک نظر سے دیکھا، مساوات اور اخوت کی صلاے عام دی اور یہی اس کی کامیابی کا بڑا راز تھا۔ جو لوگ برہمنوں کے سخت شکنجے میں نیم جان ہو رہے تھے ان کی جان میں جان آگئی، ذات پات کا امتیاز اُٹھ گیا، ویدوں کے دیوتا اور برہمنوں کے مہمل اعمال اور بے معنی ریاضتیں بالاے طاق رکھ دیں۔ اس کی عام ہمدردی، ذاتی نیکی اور نیکی کی تلقین نے سب کو برابر کر دیا اور بُرے بھلے، چھوٹے بڑے سب اس کی طرف جھک گئے۔ اس کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی ایک مصیبت ہے اور زندگی اور اس کی لذات کی خواہش اس مصیبت کا باعث ہیں۔ اس خواہش کا مٹانا مصیبت کا کم کرنا ہے۔ اور یہ خواہش پاک زندگی سے مٹ سکتی ہے۔ ہمیشہ صداقت، نیکی، ہمدردی، مہربانی اور خیر پر قائم رہنا چاہیے اور بُرے جذبات اور نفسانی لذات پر غالب آنا چاہیے۔

غرض تزکیۂ نفس اس تعلیم کا بڑا اصول ہے۔ اس دنیا میں پاک اور نیک زندگی بسر کر کے بلا لحاظ سزا و جزا تزکیۂ نفس حاصل کرنا اس کا اصل مقصد ہے اور یہی بے گناہ اور پاک زندگی نرواَن ہے۔ دنیا میں اوّل بار بدھ نے یہ تعلیم دی کہ انسان بلا احتیاج دیوتاؤں اور خدا کے اسی زندگی میں نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس طرح اس نے انسان کا رتبہ بڑھا دیا۔

بدھ ایک طرح سے تناسخ کا قائل ہے لیکن اس کے اور برہمنوں کے تناسخ میں فرق ہے۔ بدھ رُوح کا قائل نہیں۔ اور جب رُوح نہیں تو تناسخ کیسا۔ اس کا جواب اس کے ہاں یہ ہے کہ انسان کے اعمال فنا نہیں ہو سکتے۔ جب انسان مر جاتا ہے تو اعمال کے لحاظ سے نیا وجود پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ہاں آیندہ کی سزا و جزا کوئی چیز نہیں اور نہ اس کے ہاں جنّت کا وعدہ اور جہنّم کی وعید ہے۔ پاک زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اور یہی نرواَن یا نجات ہے۔ نیکی اپنا صلہ خود ہے اور پاک زندگی مذہب کا اعلا اور آخری مقصد ہے۔ اگر زندگی میں نرواَن حاصل نہ ہوا تو کرم یا اعمال کے رُو سے وہ نئے جنم لے گا یہاں تک کہ تزکیۂ نفس کامل ہو اور نروان حاصل ہو جائے۔

تین صدی تک اس تعلیم کی تلقین ملک میں ہوتی رہی لیکن نہ تو چندر گپتا اور نہ اس کے بیٹوں نے اس مذہب کو قبول کیا مگر اس کا جانشین بندو سارا جو ۲۶۰ ق م میں گدی نشین ہوا اس مذہب کے حلقے میں آیا اور اس کا بہت بڑا حامی اور داعی ثابت ہوا، جس نے نہ صرف ہندُستان میں بلکہ ہندُستان کے باہر بھی اس کی دعوت دی۔ راجا اشوک کا نام والگا سے جاپان اور سائبیریا سے سیلون تک مشہور اور عزّت سے لیا جاتا ہے۔ اس کے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دُعاتِ ہندُستان کے مختلف صوبوں میسور،

مدراس، پنجاب، کشمیر، ٹراونکور اور ان کے علاوہ سیلون، شام، مصر، مقدونیہ وغیرہ میں بھیجے۔ خود اس کی سلطنت تمام شمالی ہند میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے کتبے دہلی، الہ آباد، پشاور اور گجرات، اڑیسہ اور میسور میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو سیلون بھیجا اور مہندا نے وہاں کے بادشاہ اور رعایا کو بدھ مذہب سے مشرف کیا۔ یہاں تک کہ یہ مذہب سیام اور جاوا میں بھی پہنچا۔ دوسری صدی قبلِ مسیح میں بدھ مذہب کی کتابیں شہنشاہِ چین کے پاس پہنچیں اور ایک دوسرے شہنشاہِ چین نے سنہ ۶۲ مسیحی میں اور کتابیں منگوائیں اور بدھ مذہب وہاں پھیلنا شروع ہوا یہاں تک کہ چوتھی صدی مسیحی میں وہاں کا عام مذہب ہوگیا۔ چین سے کوریا پہنچا (سنہ ۳۷۲ء) اور وہاں سے جاپان (سنہ ۵۵۲ء) اور کوچن چین، فارموسا، منگولیا میں چوتھی اور پانچویں صدی میں گیا۔ اور کابل سے اس مذہب نے تاشقند، بلخ و بخارا تک رسائی حاصل کی۔

علاوہ بدھ کی تعلیم کے جس میں نیکی، عام ہمدردی اور تزکیۂ نفس کی تلقین تھی بدھ مذہب کی اشاعت اور ترقی کا بڑا باعث یہ خیال کیا جاتا ہے کہ راجا اشوک نے اس مذہب کو اختیار کرلیا جس کی وجہ سے یہ راج دھرم (یعنی سلطنت کا مذہب) ہوگیا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اس کی اشاعت میں بڑے جوش اور شد و مد سے کام لیا۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو یہی واقعہ اس کے ضعف کا بھی باعث ہوا، کیوں کہ شاہی اثر سے لوگ کثرت سے برائے نام اس میں داخل ہوگئے اور خصوصاً اُن صوبجات سے جو نئے نئے سلطنت میں شریک ہوے تھے اور جہاں ہندوؤں نے بہت کم ترقی کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عظیم الشان اور عالم گیر اصلاح میں بجائے

قوت کے ضعف پیدا ہونے لگا اور قدیم خالص مذہب کا یہ ضعف نومذہبوں کے پسندِ خاطر ہوا اور رفتہ رفتہ بہ وجہ اس اختلاط کے بدھ مذہب اور برہمنی مذہب میں فرق کم ہوتا گیا۔ روح کے عقیدے میں پھر ترقی ہونے لگی۔ اور عام پسند رسوم اور توہمات کا رواج خود بدھوں میں بڑھتا گیا۔ اصلی خیالات کی جگہ جدید خیالات نے لینی شروع کی۔ یہاں تک کہ دیوی دیوتا اور چڑھاوے وغیرہ کی رسوم بھی رخصت ہوگئیں لیکن اس کے ساتھ ہی بدھ مذہب میں بھی زوال آگیا۔ یہ زوال ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور جدید برہمنی مذہب نے پھر اپنا زور قائم کرلیا۔ چناں چہ گیارھویں صدی میں صرف کشمیر اور اڑیسہ میں رہ گیا اور مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ اور اب ایک طرف صرف نیپال میں اور دوسری طرف سیلون میں پایا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بدھ مذہب بہ نسبت اپنے جنم بھوم کے غیر ممالک میں زیادہ پھیلا اور قائم رہا۔ افغانستان، نیپال، مشرقی ترکستان، تبت، منگولیا، منچوریا، جاپان، چین، مشرقی جزائرِ ہند، سیام، برہما اور سیلون سب اس کے زیرِ نگیں تھے اور اب بھی دنیا کی آبادی کا ایک تہائی حصہ اس کے نام لیواؤں میں ہے۔ اور اس کی خانقاہیں کاسپین سے بحر کاہل تک برابر چلی گئی ہیں اور سلطنتِ روس کے حدود تک پہنچتی ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ مذہب دنیا کی عظیم الشان تحریکات اور حیرت انگیز انقلابات میں سے ہے اور گو اسے مدت ہوئی ہندوستان سے دیس نکالا مل چکا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کی یادگار جین مذہب میں اب تک باقی ہے جو محقق نہیں۔ مگر درحقیقت اس کی یادگار کسی خاص

مذہب یا فرقے میں نہیں، بلکہ اہلِ ملک کے مذہب و معاشرت اور اخلاق میں پائی جاتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہندو مذہب اور ہندوؤں پر مفصلۂ ذیل خاص اثرات اس مذہب کے ہوئے جو اس وقت بھی پائے جاتے ہیں :-

(۱) طبائع میں خاص نرمی، لینت اور انکسار پیدا ہوا جس کا اثر نہ صرف انسانوں کے باہمی تعلقات پر ہوا بلکہ بے زبان جیوانوں تک پہنچا :-

(۲) بدھ سے قبل ہندوؤں کے تمام خیالات اور علوم کا دارومدار ویدوں پر تھا لیکن بدھ کے بعد اُن کے فلسفے اور علوم کا تعلق ویدوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ یہاں تک کہ جدید برہمنی مذاہب (پُرانی مذہب) ویدوں کا مذہب نہ تھا بلکہ ایسے دیوتاؤں اور بُتوں کی پرستش رائج ہوگئی جن کا ویدوں میں ذکر تک نہیں :-

(۳) ذات پات کا امتیاز اُٹھ جانے سے مختلف فرقوں میں میل جول بڑھ گیا۔ اور مساوات کا خیال پیدا ہوا اگرچہ ذاتیں قائم رہیں مگر جدید برہمنی مذہب نے اسے پھر دبا دیا :-

(۴) گوشت خوری کا رواج اُٹھ گیا :-

(۵) لوگوں میں جنگ جوئی کا مادہ کم ہوگیا :-

زمانۂ بدھ کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جو اب تک اس کی یادگار کے طور پر قائم ہے۔ وہ اس زمانے کی تعمیر اور سنگ تراشی ہے جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔ اور درحقیقت ان لوگوں نے اس فن کو پایۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس زمانے سے قبل پتھر صرف فصیلِ شہر یا پُلوں وغیرہ کی تعمیر میں استعمال ہوتا تھا لیکن بدھ کے زمانے سے بڑی بڑی عمارتوں میں کام آنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فنِ تعمیر ہندی اور ان کا طبع زاد ہے۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ بعض بعض عمارتوں میں جو پنجاب

میں اب دریافت ہوئی ہیں صاف طور سے یونانی فنِ عمارت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ بدھ مذہب نے ہندوؤں کو جہاں اور چیزیں ارث میں دی ہیں وہاں فنِ عمارت بھی ہے۔ بدھی اور ہندوانی عمارتوں میں فرق یہ ہے کہ بدھی پہاڑ کو کھود کر غار بناتے اور اس میں اپنا کمالِ سنگ تراشی و فنِ تعمیر دکھاتے۔ لیکن ہندو پتھر صاف کر کے پہاڑ کے رو بہ رو اپنی عمارت تیار کرتے تھے۔ یہ فرق خاص کر ایسے مقامات پر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جہاں ساتھ ساتھ اُس زمانے کی عمارتیں موجود ہیں جب کہ بدھ مذہب برہمنی مذہب میں محو ہو چلا تھا اور بُت پرستی عام ہو گئی تھی ؎

بہ لحاظ علوم کے اگرچہ بدھ کا زمانہ کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا لیکن ایسا بھی نہیں کہ ناقابلِ توجہ ہو۔ پتنجلی کے یوگ اور ویاسا کے ویدانت کا آغاز اسی زمانے میں ہوا اگرچہ بدھ مذہب کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں منو کا شاستر بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ لیکن بڑی چیز علمی لحاظ سے اس زمانے کی یہ ہے کہ علمِ نجوم میں معتد بہ کام یابی ہوئی اور اس کام یابی میں یونانیوں کا بھی حصّہ ہے جنھوں نے اس میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ ہندوؤں نے اس فن میں اُن سے بہت کچھ اکتساب کیا۔ طب کو بھی ترقی ہوئی۔ کیوں کہ بدھ مذہب کے اثر سے انسانوں اور حیوانوں کے لیے ملک میں جابہ جا شفاخانے قائم کیے گئے تھے ؎

نیز اس زمانے میں علم کا چرچا ضرور تھا۔ ہیون سانگ مشہور چینی سیّاح نے اپنے سفرنامے میں بعض بدھ دارالعلوموں کا ذکر کیا ہے۔ نالندا کی خانقاہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس میں ایک بہت بڑا دارالعلوم تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں کئی ہزار مانک (بدھ درویش) تھے جو بہ لحاظ علم و فضل

خاص امتیاز رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بہت وقعت و توقیر کرتے تھے۔ اور یہ دن رات بحث مباحثہ اور تکرارِ علمی میں مصروف رہتے تھے۔ دُور دُور کے علما وفضلا وہاں آکر شریک ہوتے اور نالندہ کی شرکت سے شرف حاصل کرتے تھے۔ نالندہ کا طالب علم ہونا یا وہاں سے تعلق رکھنا باعثِ عزت سمجھا جاتا تھا۔ گویا اسے وہی عزت تھی جو کبھی مسلمانوں میں قرطبہ و بغداد یا فرانس میں کلونی اور کلرہ کو حاصل تھی یا جیسے آج کل علی گڑھ کالج کے طلبا کو حاصل ہے۔

وہ مذہب جو اخلاق و خیالات کی اصلاح کے لیے آیا تھا اور جس نے انسان کا رتبہ دیوتاؤں سے بڑھا دیا تھا اور جس نے اپنی پاک تعلیم کے سامنے مہمل مذہبی رسوم اور دیوتاؤں بلکہ روح و خدا تک کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ آخر وہ برہمنی توہمات اور باطل پرستی کا ایسا شکار ہوا کہ بُت پرستی خود اس کا شعار ہوگئی، بدھ دیوتا مانا گیا اور دُوسرے بُتوں کی طرح اس کی بھی پرستش ہونے لگی اور رفتہ رفتہ برہمنی مذہب نے اسے اس ملک سے ایسا ناپید کیا جیسے یہ کہیں کہ کسی شے کا بیج مارا گیا۔ برہمنی مذہب کو پھر عروج ہوا اور اس عروج کے ساتھ اس نے اپنے قیود کی جکڑ بند کو اور سخت کر دیا۔ اس جدید برہمنی دَور کو پرانوں کا عہد اور پرانوں کا مذہب سمجھنا چاہیے۔ ویدی اور پرانی مذہب میں بڑا فرق یہ تھا کہ ویدی مذہب میں قوائے فطرت مثلاً اندر، اگنی، سریا، درونا وغیرہ کی پرستش تھی اور پرانی مذہب میں یہ دیوتا ہوگئے اور برہما، وشنو اور شو کی پرستش کا رواج ہوا بڑی خصوصیت اس جدید عہد کی مُبتوں کی پُوجا ہے۔ قدیم سے دیوتاؤں کے چڑھاوے آگ پر چڑھائے جاتے تھے لیکن بدھ مذہب کے بعد سے یہ چڑھاوے بُتوں کے سامنے پیش ہونے لگے اور اس بت پرستی میں طرح طرح

کی رسوم اور سیکڑوں قسم کے باطل عقائد اور توہمات کو زور ہو گیا۔ یہ تغیر بہت بُرا ہوا۔ بُتوں کی پرستش انسان کے دل پر کبھی پاک اثر پیدا نہیں کرتی اور اس وجہ سے بہت سی خرابیاں اور بُرائیاں ہندوؤں میں پیدا ہو گئیں۔ ابتر تخیّلات اور توہمات غالب آ گئے اور بُت پرستی نے شان و شوکت دھوم دھام کی رسمیں بڑھا دیں اور اس ضمن میں سنگ تراشی، شاعری، موسیقی اور فنِ تعمیر اور ظاہری رسوم اور ظاہری عبادت اور اندھا دھند تقلید نے ترقّی پائی۔ اور ذات کا امتیاز اور مختلف فرقوں کا اتّفاق درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔ ذات نے برہمنوں کی قوّت اور وقعت کو بے شک بڑھا دیا۔ لیکن باقی تمام پیشہ وروں اور دست کاروں کو ذلیل اور کمین بنا دیا۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ طبیبوں، سُناروں، لوہاروں، جولاہوں، رنگ سازوں، اسلحہ سازوں اور عطاروں کا شمار چوروں اور رنڈیوں کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ اس سے قوم میں نفاق اور منافرت پیدا ہو گئی۔ برہمنوں کے عروج کے لیے ساری قوم کو ذلیل ہونا پڑا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ زمانہ بھی عظمت سے خالی نہیں۔ گویا یہ قدیم زمانے کا آخری دَور تھا۔ بکرماجیت اور اس کے نورتن اسی زمانے کی مشہور یادگاریں ہیں، جس کی شان و شوکت کی داستانیں اب تک ملک میں مشہور ہیں۔ راجپوت بھی اوّل بار میدانِ تمدّن میں اسی زمانے میں نظر آتے ہیں۔ منو کا مشہور 'شاستر' بھی اسی دَور کی تصنیف ہے اور اس زمانے کی معاشرت و رسوم اور مذہب کے سمجھنے کے لیے بڑی کار آمد ہے۔ کالی داس اور بھوا بھوتی جو ہندُستان کے سب سے بڑے مشہور شاعر اور ڈراما نویس گزرے ہیں، اسی زمانے میں پیدا ہوئے اور ایک دنیا اب تک ان کے کمال کی عزّت کرتی

ہو۔ شاعری اور ڈراما اس زمانے کا اصلی حُسن تھا۔ اس کے علاوہ فنِ نجوم و طبابت میں بھی ترقّی ہوئی۔ اور یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ کچھ اُوپر دو ہزار سال پہلے اسکندرِ اعظم کے لشکر میں ہندو طبیب موجود تھے اور گیارہ صدی ہارون الرشید کے دربار میں بھی دو ہندو طبیب (منکا اور سالا) نظر آتے ہیں۔

فاضل ابوریحان بیرونی جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہندستان آیا اور یہاں رہ کر اس نے ہندوؤں کے حالات و علوم کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ اس نے اس مبحث پر ایک بے مثل کتاب لکھی ہو جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ گیارھویں صدی میں ہندو زوال کی حالت میں تھے۔ مذہب برہمنوں کی مِلک تھی، عوام جہالت و باطل توہمات میں مبتلا تھے۔ علوم و سائنس کا چرچا مٹتا جاتا تھا اور جو چند لوگ جاننے والے تھے وہ بتانے میں بڑا بخل کرتے تھے مگر باوجود اس کے اپنے ملک اور قوم پر بڑا فخر و ناز تھا۔ دُوسرے ممالک اور اقوام کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مُلک ہو تو ان کا، قوم ہو تو ان کی اور علوم و فنون ہیں تو ان کے اور باقی سب ہیچ اور مہمل ہو۔ ذلّت اور غلامی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ویشوں (صنّاع اور دستکاروں وغیرہ) کا شمار شودروں میں ہونے لگا تھا۔ اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے محروم کر دیے گئے تھے اور بجائے علوم و فنون کے مہمل روایات اور فضول قصّے کہانیاں رائج ہوگئی تھیں۔ پولٹیکل قوّت میں بھی ضعف پیدا ہوگیا تھا اور ذات کی قیود نے اتحاد سے بیگانہ کر دیا تھا۔

ہندستان پر اس وقت ہر طرف انحطاط و زوال چھایا ہوا تھا۔ اور آفتابِ تمدّن لبِ بام تھا کہ جھُٹ پٹے کے وقت ایک جدید عہد کا آغاز ہوا۔ مغرب کی تاریکی میں قدیم راہ سے ایک غیر قوم نے سرزمینِ ہند میں قدم

رکھا اور صبح ہوتے سارے ملک پر مسلط ہو گئی ؛

یہ مسلمانوں کی قوم تھی جو اوّل سندھ میں پہنچی اور بعدازاں افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ اور کئی صدی تک اس ملک پر حکم راں رہی ؛

اس سے پیش تر آریا اور برہمنی تمدّن پر اندر اور باہر سے مختلف اور متعدّد حملے ہو چکے تھے ؛

۱۔ ایرانیوں نے پانچویں صدی قبلِ مسیح میں اس ملک پر حملہ کیا ؛

۲۔ یونانیوں نے چوتھی صدی قبلِ مسیح میں یورش کی ؛

۳۔ اس کے بعد اہلِ باختر کے حملے تیسری یا پانچویں صدی تک ہوئے ؛

۴۔ پانچویں صدی ق م میں بدھ مذہب کا بڑا حملہ برہمنی مذہب اور تمدّن پر ہوا ؛

۵ غیر آریا اقوامِ ہند اور نیچ اقوام کے حملے خصوصاً غیر آریا سلطنتوں کی طرف سے ساتویں اور آٹھویں صدی میں ؛

۶۔ ادنا اعتقادات اور وحشیانہ رسوم کی برہمنی مذہب سے کش مکش جس سے شنکراچاریہ کی تعلیم سے آٹھویں نویں صدی میں فلسفی فرقہ شیو کی بنا پڑی اور اس مذہب کے دیگر مصلحوں کے ذریعے بارہ سے سولھویں صدی تک نشوونما ہوئی ؛

۷ مسلمانوں کے حملے گیارھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک ؛

۸۔ انگریزی عہد ؛

لیکن نہ یونانی اس کا کچھ کر سکے نہ ایرانی، نہ بدھ مذہب قائم رہا نہ غیر آریا اقوام کا۔ یہاں خود بہ خود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس سے آریا قوم ان تمام مخالف اثرات پر غالب آئی اور باوجودے کہ اس کی اکثر ہم عصر اور ہم سر قومیں دنیا سے مٹ گئیں لیکن وہ اب تک قائم ہے اور نہ

صرف قائم ہے بلکہ اس میں پھر بڑھنے اور عروج کرنے کے آثار موجود ہیں۔ اہلِ بابل اور ان کا تمدن کہاں گیا؟ اہلِ فینشیا اور ان کی تہذیب و تجارت کدھر گئی؟ مصریوں کی مشہور آفاق قوت کیا ہوئی؟ ایرانیوں کی شان و شوکت کہاں ہے؟ یونانیوں کی عالم گیر عظمت کا نام رہ گیا مگر وہ عظمت والے ناپید ہو گئے۔ رومہ کی شوکت و جلالت کے افسانے صرف تاریخوں میں رہ گئے۔ مگر خود ایسے مٹے کہ پھر ویسے جانشین نصیب نہ ہوئے۔ لیکن ہندو اب بھی کم و بیش اسی تمدن و تہذیب کے ساتھ باقی ہیں اور اقوامِ عالم میں بڑھنے کا دم خم رکھتے ہیں۔ آخر اس کے وجوہ کیا ہیں؟ میرے خیال میں اس کے بڑے اسباب یہ ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ ہندو رشیوں کی روحانی اور علمی ریاضت ؛

۲۔ ان کا مضبوط نظامِ تمدن ؛

۳۔ ان کی رواداری ؛

۴۔ ان کی عورتوں کی وفاداری اور جاں نثاری ؛

انھیں خوبیوں کے اثر نے انھیں ابھی تک دنیا میں باقی رکھا ہے اور اگر انھوں نے ان کے زندہ رکھنے کی کوشش کی تو وہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلامی عہد سے قبل جس نے اس پر تسلط کیا اور اپنا اثر ڈالنا چاہا وہ یا تو خود مٹ گیا یا اس میں ضم ہو کر فنا ہو گیا۔ رہے انگریز سو انھوں نے سرے سے ایسا ڈھنگ ڈالا ہے کہ وہ ہندیوں کی سوسائٹی سے ایسے الگ تھلگ رہتے ہیں جیسے کوئی امراضِ متعدی سے۔ نیز فاتح کا غرور مفتوح کے میل جول کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہ وہ ہم میں مل سکتے ہیں اور نہ وہ یہاں رہ سکتے ہیں، ان میں ہم میں ایک نہیں

کئی سمندر حائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے تمدّن اور تعلیم کا اثر ہم پر ضرور پڑے گا اور پڑ رہا ہو لیکن ہم میں ان میں حقیقی اتحاد اور میل جول پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ وہ چاہتے نہیں۔ اور افتاد ایسی آ کے پڑی ہو کہ ہم بھی اس کے کچھ ایسے خواہاں نہیں۔ اور اگر کبھی انھوں نے اس کا خیال کیا بھی تو ان کی ہستی بھی اسی طرح مٹ جائے گی جیسی بعض اور قوموں کی جو یہاں آکر بسیں اور اگر رہے بھی تو انھیں ہندُستان کی سب سے ذلیل قوم بن کر رہنا پڑے گا۔ اس زمانے کے حکیم شاعر نے ہندُستان کو "غارت گر اقوام و اکال الامم" کا بہت صحیح خطاب دیا ہو۔ اس کی حالت ایک سمندر کی سی ہو۔ مختلف دریا اس میں آآ کے گِرتے ہیں اور اپنی ہستی فنا کر کے اسی میں مِل جاتے ہیں۔ الّا مسلمانوں کے، جو اگرچہ فاتح کی حیثیت سے آئے مگر بھائیوں کی طرح گھُل مِل کے رہے اور باوجود صدیوں کے قیام، کثرتِ اختلاط اور بے تکلف میل جول کے ان دونوں قوموں میں اب تک گنگا جمنی شان نظر آتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ ہندُستان کے مسلمان ایک حد تک "ہندوا گئے" ہیں۔ مگر اپنی قومی حیثیت اور قومی شان کو اب تک لیے ہوئے ہیں۔ ہندُستان میں مختلف قسم کے تمدّن آئے مگر کسی کا اثر باقی نہ رہا اور رہا تو اس طرح کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ مگر مسلمانوں کے تمدّن کے آثار نمایاں طور پر باقی رہیں گے۔ اور اہلِ ہند پر اس کا ایسا گہرا اثر ہو کہ زمانہ اسے مٹا نہیں سکتا۔ ہم یہاں نہایت سرسری طور سے چند اثرات کا نام لیتے ہیں :۔

(۱) مسلمانوں نے ہندوؤں کے مذہب و خیالات پر بڑا بھاری اثر ڈالا ہے خصوصاً خالص توحید کا اثر سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہو؛

(۲) کھانے پینے رہنے سہنے اور دوسرے عام معاشرتی طریقوں میں

ترقّی دی ؛

(۳) بے ہودہ رسوم اور توہمات کا زور کم کیا ؛

(۴) فنِ عمارت کو خاص طور پر ترقّی دی ؛

(۵) فنِ جنگ میں بھی خاص ترقّی ہوئی اور توپ اور بارود کو رواج دیا ؛

(۶) بعض علوم مثلاً علم النجوم، طبابت اور خاص کر تاریخ و جغرافیہ کا ذوق پیدا کیا ؛

(۷) نئے نئے پھل پھول لائے باغ بانی اور فلاحت کو بڑھایا اور عام ذوق میں اصلاح کی ؛

(۸) اور سب سے بڑھ کر ایک نئی زبان کا بننا ہے جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ ایک قوی وجہ ہے کہ اُردو کو اس ملک کی عام زبان ہونے کا دعوا ہے ؛

غرض دونوں قومیں ایک دُوسرے کے تمدّن و معاشرت اور خیالات اور دیگر اثرات سے اس قدر متاثّر ہوئی ہیں کہ اب اگر کوئی چاہے کہ ان اثرات کو مٹادے تو ناممکن ہے۔ گویا قسمت میں یہ بدا تھا کہ یہی دونوں قومیں اس ملک کی وارث ہوں گی اور اس کی قسمت انھیں دونوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان کے ایکے میں اس کی بہبودی و فلاح اور ترقّی و عروج ہے اور ان کی پھوٹ میں اس کی ذلّت و خواری اور نکبت و غلامی ہے۔ جب اٹھیں گے تو مِل کر اٹھیں گے اور اگر گریں گے تو اپنی نااتّفاقی کی بدولت۔ دنیا میں کوئی فردِ بشر ایسا نہیں ہے جو بے عیب ہو اسی طرح کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو عیوب و نقائص سے خالی ہو مگر دنیا میں شاید یہی دو قومیں ایسی ہیں جو ایسے اوصاف اور عیوب سے متّصف ہیں کہ اگر یہ اتحاد کر لیں تو ایک کے عیوب پر دُوسرے کی خوبیوں سے پردہ پڑ جائے گا اور ایک کے ضعف کو دُوسرے

کی قوت سنبھال لےگی۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندو ایک ایسی قوم ہی جس کے گزشتہ کارنامے اس عالم کی بہترین اور اعلا یادگاروں میں سے ہیں اور اس میں اب بھی بڑائی کے آثار اور دنیا میں ایک اعلا قوم بننے کی صلاحیت موجود ہی۔ اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ مسلمان وہ قوم ہی جس نے اپنی عالم گیر فتوحات کے ساتھ علم و اخلاق کی روشنی دنیا میں پھیلائی اور گو اب انحطاط میں ہی مگر اب بھی اس کی سلطنتیں دنیا میں قائم ہیں اور اگر وہ عقل سے کام لے تو اس میں اتنی سکت باقی ہی کہ وہ پھر دنیا کی نامآور قوموں میں سے ہو جائے۔ اسے خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ ان دو قوموں کا سنگم ایک ایسے ملک میں ہوا ہی جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اگر یہ دونوں قومیں نفسانیت اور خود غرضی کو چھوڑ دیں اور تھوڑا سا جبر اور تھوڑا سا صبر اختیار کریں تو ان کے اتحاد کی بہ دولت ایک ایسے تمدن کی بنیاد قائم ہو جائے اور یہ خود ایک ایسی قوت بن جائیں کہ اس کی نظیر نہ ہو اور ایک دنیا ان کے قدموں تلے ہو۔ تاریخِ عالم کو چھوڑ دو، کیا صرف ہندستان کی تاریخ اس سبق کے لیے کافی نہیں ہی، کیا صدہا اور ہزارہا سال سے وقتاً فوقتاً جو آفات و مصائب کا نزول اس بدنصیب ملک پر ہوا ہی وہ کافی شہادت اس بات کی نہیں ہی کہ نا اتفاقی گناہ اور اتفاق ایک بڑی نیکی ہی؟ کیا اس سبق کے سیکھنے کے لیے ابھی اور ذلتوں، مصیبتوں اور ٹھوکروں کی ضرورت ہی؟ ٹھنڈے دل سے تعصب کو برطرف کر کے اگر تاریخ کا مطالعہ کرو اور واقعات و حالات کو سوچو تو اصل راز کا خود بہ خود انکشاف ہو جائے گا۔ مولوی سید علی مرحوم نے درحقیقت بڑا کام کیا کہ 'تمدنِ عرب' اور 'تمدنِ ہند' جیسی کتابوں کا ترجمہ اُردو زبان میں کر دیا تاکہ ہم ایک دوسرے کے محاسن اور کارناموں سے واقف ہو کر ایک دوسرے کی عظمت و وقعت کریں اور اپنے عیوب و نقائص پر اطلاع

پاکر اصلاح کے درپے ہوں۔ اور اصل یہ ہے کہ 'تمدّنِ عرب' کے بعد مولوی صاحب مرحوم کا فرض تھا کہ وہ 'تمدّنِ ہند' کا بھی ترجمہ کریں اور ہم خوش ہیں کہ وفات سے قبل وہ اس فرض کو انجام دے گئے۔

لیبان کی 'تمدّنِ ہند' کے علاوہ ایک اور کتاب اسی مبحث پر ہندی فاضل مسٹر رومیش چندر دت مرحوم کی تصنیف ہے۔ یہ کتابیں دو تین سال کے تفاوت سے ایک ہی زمانے میں لکھی گئیں۔ مسٹر دت کی کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور مستند ہے لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے خاندان کے حالات اپنے خاندان والوں کے لیے لکھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ تصویر کے روشن اور تاریک رُخوں کے دکھانے میں بڑی استادی سے کام لےگا۔ مسٹر دت نے تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن چوں کہ ہندوؤں کو تاریخ سے دل چسپی نہ تھی اس لیے تمدّن و معاشرت کے حالات دکھانے میں قصوں اور افسانوں میں تمدّنی حالات کے دکھانے میں کس قدر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ بہ خلاف اس کے لیبان ایک غیر شخص ہیں مگر ہند اور اہلِ ہند کے قدیم تمدّن سے ہم دردی رکھتا ہے۔ اس نے جہاں محاسن دکھائے ہیں وہاں ان کے ضعف کو بھی جتا دیا ہے۔ اپنی اور غیر کی نظر میں جو فرق ہوتا ہے وہ محتاجِ صراحت نہیں۔ اگر کوئی ہم درد ہمیں ہمارے نقص بتائے تو وہ درحقیقت ہمارے شکریے کا مستحق ہے۔ کیوں کہ اس سے ہمیں اپنی اصلاح میں بہت بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ اس کے لیبان نے یہاں کی مختلف اقوام کے حالات و اصل و خصائص پر بھی بحث کی ہے اور ان اقوام کے باہمی اختلاط سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بھی دکھائے ہیں، جو دل چسپی و افادے سے خالی نہیں۔ بہ مقابلہ مسٹر دت کے اس نے ہند کی عمارات کا حال بھی زیادہ تفصیل سے لکھا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس سے

خاص دلچسپی ہے۔ اگرچہ ہندی تجارت کا مجمل ذکر کیا ہے لیکن ہندی جہازرانی کے متعلق ہر دو مصنّفین ساکت ہیں حال آں کہ جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ فنِ جہازرانی ہندُستان میں قدیم سے ہے۔ علاوہ جہازوں کی اُن تصویروں کے جو اجنٹا اور مدورا اور تری کے مندروں میں موجود ہیں اور عہدِ اندھراں کے ان سکّوں کے جن پر جہاز کی تصویر بنی ہے، ہندوؤں کا جاوا اور سیلون میں آباد ہونا اور بدھ داعیوں کا جاپان اور چین جانا اور تجارتی تعلقات کا مصر و روم و دیگر ممالک سے ہونا اور رومی اور چینی سیّاحوں کا یہاں کی بندرگاہوں اور تجارت کا ذکر کرنا کافی اور قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اہلِ ہند فنِ جہازرانی سے قدیم سے واقف تھے۔ نیز اس نے ہند کی موجودہ حالت (انگریزی عہد) سے بحث کی ہے لیکن اس ضمن میں اس نے ہندُستان کی موجودہ تعلیم اور تعلیم یافتہ اصحاب پر بڑی سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے اور موجودہ انگریزی تعلیم کو اہلِ ملک اور حکامِ ملک دونوں کے لیے خطرناک بتایا ہے۔ لیبان کی یہ رائے بعض دیگر یورپی سیّاحوں اور اینگلو انڈین مصنّفوں کی سی ہے۔ اگرچہ اس میں کسی قدر جدت پائی جاتی ہے لیکن صاف بوے تعصب آتی ہے۔ فاضل مصنّف نے اس تنقید کے وقت دو باتوں کا لحاظ نہیں رکھا ورنہ وہ ایسی سخت رائے نہ دیتا:

اوّل یہ کہ ایک ایسے مُلک میں جو صدہا سال سے ایک خاص نہج پر چلا آرہا ہے اور جو اپنا خاص تمدّن اور اپنے خاص علوم رکھتا ہے جب اس میں ایک جدید تمدّن اور اجنبی زبان و علوم کو رواج دیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ دلوں میں بےچینی اور دماغوں میں پراگندگی اور انتشار پیدا ہوگا اور ابتدا میں اس کے نتائج کبھی اچھے پیدا نہ ہوں گے:

دُوسرے لیبان نے اس وقت کے طریقۂ تعلیم پر غور نہیں کیا۔ تعلیمی نتائج کی

خرابی زیادہ تر طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ چناں چہ اس نقص کو ملک کے اہل الرائے اور خود گورمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے اور اس کی اصلاح پر برابر توجہ کی جا رہی ہے اور اب کچھ تو مرورِ زمانہ سے اور کچھ جدید اصلاح سے بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اور ہمیں قوی امید ہے کہ موجودہ تعلیم اگر صحیح طریقے سے دی گئی تو ملک اور گورمنٹ دونوں کے لیے مفید ثابت ہو گی۔ لیبان نے ایسی ہی بعض اور خفیف غلطیاں کی ہیں جو عموماً یورپی سیاحوں سے سرزد ہو جاتی ہیں مثلاً اس نے مثل منوشی و بعض دیگر یورپی سیاحوں اور مصنفوں کے بیگم کی اصل بیغم بتائی ہے۔

غرض مصنف کے بعد ہمیں مترجم کا ممنون ہونا چاہیے جن کی وجہ سے یہ کتاب صحیح اور فصیح اردو میں ہم تک پہنچی اور اردو علم ادب و تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہو گیا۔

---

# مقدمۂ ماثرالکرام

(مصنفہ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی)

حسان الہند[1] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ان علمائے ہند میں سے ہیں جن کا نام اس ملک میں ہمیشہ یاد رہے گا وہ نرے مُلّاہی نہ تھے بلکہ ادیب و شاعر، مورخ و محقق بھی تھے اور ان کی تالیفات و تصنیفات خود اس امر کی شاہد ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندُستان کے عہدِ اسلامی میں ایسی ایسی تاریخیں لکھی گئی ہیں کہ جن کی نظیر فارسی زبان میں نہیں ملتی۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ صحیح فنِ تاریخ نویسی میں انحطاط شروع ہوگیا تھا۔ البتہ مولانا غلام علی آزاد نے اس فن کی لاج رکھ لی اور آخر وقت میں بھی ذوقِ صحیح کی داد دی۔ ان کی تصانیف میں سے زیادہ تر فنِ تاریخ کی اس شاخ کے متعلق ہیں جسے فنِ اسماء الرّجال کہتے ہیں اور آزاد نے اس بات پر فخر ظاہر کیا ہو کہ ہندُستان میں پہلے وہی ہیں جنھوں نے اس فن پر قلم اُٹھایا

---

[1] حسان الہند میر غلام علی آزاد بن سید نوح بلگرامی یک شنبہ سنہ ۱۱۱۶ھ بیں ۲۵ ماہِ صفر قصبۂ بلگرام میں پیدا ہوے اور سنہ ۱۲۰۰ھ میں بہ مقام روضہ جو نواح اورنگ آباد دکن میں ایک مشہور مقام ہے چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی ۔ و پیش از من احدے آستین سعی بہ این درجہ نشکستہ و کمر خدمتِ بزرگان صنف وتمت بہ این جدّ وجہد نہ بستہ (دیکھو دیباچہ کتاب)

ہی۔ اگرچہ ان سے پہلے صاحبِ 'تاریخِ نظامی'، مُلّا عبدالقادر بدایونی اور علامہ ابوالفضل اپنی اپنی تاریخوں میں اپنے اپنے عہد کے امرا و علما کملا کے حالات لکھ چکے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہی کہ مولانا آزاد نے اس میں خاص اہتمام کیا ہی اور اس فن کی طرف خاص توجّہ کی ہی۔ ان لوگوں نے اپنے عہد کے مشاہیر کے حالات اپنی تاریخوں میں ضمیمے کے طور پر لکھے تھے۔ آزاد نے اسے الگ فن قرار دے کر مختلف رسالے لکھے ہیں[1]۔

'ماثر الکرام' جو اب پہلی بار مولوی عبداللہ خاں کی سعی سے طبع ہوئی ہی اسی فن کے متعلّق ہی۔ یہ کتاب عموماً ہندستان اور خصوصاً فقرا و علمائے بلگرام کے حالات میں ہی۔ آزاد نے اس کتاب کی تالیف سے نہ صرف اپنے وطن کا حق ادا کیا بلکہ فنِ رجال میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہی۔ بلگرام ایک مردم خیز بستی ہی اور اس معدنِ علم و فضل سے ایسے ایسے بے بہا لعل نکلے ہیں جن کے نام اس سرزمین میں ہمیشہ روشن رہیں گے اور خوشی کی بات ہی کہ یہ فضیلت اسے اس وقت تک حاصل ہی۔ یوں بھی قصبات اور شہروں کی حالت میں بہت تفاوت ہی۔ آب و ہوا کی خوبی اور صفائی، اخلاق کی سادگی و بے ریائی، تکلفات اور تصنع سے بری، مسابقہ اور منافسہ کی کش مکش سے محفوظ، مسلک کی پختگی اور بعض اور وجوہ ایسے ہیں کہ جن کے سبب اہلِ قصبات کے جسم و دماغ اہلِ شہر کی نسبت زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔ اگرچہ شہر کی ترغیبات ان میں سے اکثر کو اسی منڈی میں کھینچ لے جاتی ہیں جہاں چند نسلوں کے بعد

---

[1] 'سروِ آزاد'۔ شعرا کا تذکرہ۔ 'یدِ بیضا'، شعرا کا تذکرہ۔ 'خزانۂ عامرہ'، ان شعرا کے حالات ہیں جن کو دربارِ شاہی سے صلے ملے ہیں۔ 'روضۃ الاولیا'، صوفیہ کے حالات ہیں۔ 'سبحۃ المرجان'، علما کے تذکرے ہیں۔ 'ماثر الکرام'، علما و صوفیا کے حالات ہیں۔ نیز نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی بے نظیر تالیف 'ماثر الکرام' کی تکمیل و تہذیب میں جو سعی آزاد نے کی وہ بھی بہت قابلِ قدر ہی۔ دیکھو دیباچہ 'ماثر الامرا'؛ نیز آزاد کے ان خطوط سے جو مولوی سید احمد صاحب زید بلگرامی مرحوم کے پاس تھے، یہ امر ظاہر ہی۔

ان میں اختلاط شروع ہوجاتا ہی۔ اگر علما و فضلا و دیگر مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ قصبات کا ملک پر بہت بڑا احسان ہی۔ کاش مولانا آزاد کی طرح دُوسرے اہلِ قصبات بھی اس بات کا خیال رکھتے اور اپنے اپنے قصبے کے علما و فضلا و صوفیا و دیگر مشاہیر کے حالات قلم بند کرڈالتے تو ہندُستان کی تاریخ کو اس سے بہت بڑی مدد ملتی۔ ہندُستان میں بہ کثرت ایسے قصبات[1] ہیں کہ اگر وہاں کے حالات یا تاریخ لکھی جائے تو ایسی مفید معلومات اس سے حاصل ہوسکتی ہیں جن کا بڑی بڑی مبسوط تاریخوں میں پتا نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں مولانا نے خاص محنت کی ہی اور صرف کتبِ تاریخِ متداولہ ہی تک تلاش وجستجو کو محدود نہیں رکھا بلکہ "اہالی وموالیٔ شہر" سے بھی حالات دریافت کیے نیز "مجلّاتِ شرعیہ" سے جو بزرگوں کی یادگار رسے باقی تھے استفادہ کیا ؞

یہ کتاب اوّل بلگرام میں لکھنی شروع کی تھی لیکن درمیان میں یعنی سنہ ۱۱۵۱ھ میں حج کے قصد سے مکّہ چلے گئے۔ زیارتِ حرمین الشّریفین سے واپس ہوکر دکن میں قیام کیا اور وہیں نامکمل مسودہ منگواکر اختتام کو پہنچایا۔ تاریخ اختتامِ کتاب "ختامہ مسک" سے نکلتی ہی ؞

۱۱۶۶ھ

افسوس ہی کہ مولانا آزاد نے اس کتاب میں کسی قدر اختصار کو مدِّنظر رکھا ہی۔ اگر وہ اس زمانے کی صحبتوں اور معاشرت اور طریقۂ تعلیم و تعلّم پر ذرا اور وسیع نظر ڈالتے تو یہ کتاب بہت زیادہ دل چسپ اور مفید ہوجاتی۔ لیکن تاہم جو کچھ انھوں نے لکھا ہی وہ بہت قابلِ قدر اور قابلِ تقلید ہی۔ زمانۂ حال

---

[1] مثلاً پانی پت، بدایوں، خیرآباد، امیٹھی، سوہان، سرہند، سہالی وغیرہ وغیرہ ؞

گزشتہ کے حالات اور خصوصاً اُن لوگوں کے تذکرے جو اس کارزارِ حیات میں جہاں قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے اپنی ہمت اور ریاضت، سعی اور شفقت سے پایۂ کمال کو پہنچتے ہیں، انسان کے اخلاق پر عجیب وغریب اثر ڈالتے ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طلبہ تحصیلِ علم کے شوق میں بے زادراہ شہر بہ شہر پھرتے ہیں کھانے کی پروا ہے نہ کپڑے کی فکر۔ مگر تحصیلِ علم کی ہفت خواں طے کر کے عین سرچشمے پر پہنچتے اور سیراب ہو کر واپس آتے ہیں۔ اور اس کے بعد جو کچھ حاصل کیا ہے اس سے دوسروں کو فیض پہنچاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اسے ثواب کا کام خیال کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر وہ کسی شاہی خدمت وغیرہ پر مامور ہو گئے ہیں تو بھی فرصت کے وقت سلسلۂ درس وتدریس جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی تالیف وتصنیف بھی ہوتی رہتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں اور آج کل کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں۔ جب کہ علم کا چرچا گھر گھر ہے تو ہمیں ایک عجیب فرق نظر آتا ہے۔ محنت اور ریاضت اب بھی غالباً اتنی ہی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن تحصیلِ علم کی وہ چیٹک اور وہ دُھن جو پہلے لوگوں میں تھی آج کل اس کے مقابلے میں کم ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے حصولِ علم میں آزادی تھی اور آج کل یونی ورسٹی کی پابندیوں نے ایسا جکڑ دیا ہے کہ اگر کچھ شوق ہوتا بھی ہے تو دب جاتا ہے۔ دوسری ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل علم زیادہ تر حصولِ ملازمت سرکاری کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ علم کو علم کی خاطر شاذ ونادر ہی کوئی پڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حال آں کہ آج کل طلبا کی کثرت ہے مگر حقیقی علم یا علم کا حقیقی شوق کم ہے۔ اور اگر ہے بھی تو اس کی چنداں قدر نہیں۔ کون ہے جس کے دل میں قاضی عضدالحق کے تذکرے کے پڑھنے سے جو اسی کتاب میں ہے جوش اور ولولہ پیدا نہ ہوگا۔ لکھا ہے کہ سلطان

محمد بن تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو ولایت فارس میں قاضی یحییٰ کے پاس بھیجا اور یہ عرض کرائی کہ آپ ہندستان تشریف لے چلیں اور متن مواقف کو سلطان محمد کے نام سے معنون فرمائیں۔ سلطان ابو اسحاق والیٔ شیراز کو جو یہ معلوم ہوا تو دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ یہ سلطنت حاضر ہے اسے لے لیجیے اور جو خدمت آپ فرمائیں اس کے بجالانے کو مَیں حاضر ہوں مگر للہ آپ یہاں سے نہ جائیے۔ ایسی قدردانی کی نظیر مشکل سے ملے گی اور شاید یہ شخصی سلطنت ہی میں ممکن ہے۔ غالباً شخصی سلطنت کے نام سے ناظرین کے کان کھڑے ہوں گے لیکن اصل یہ ہے کہ حکومت کی کوئی صورت بُری نہیں۔ بہ شرطے کہ صحیح اصوُل کو پامال نہ کیا جائے لیکن اگر صحیح اصول پر نظر نہیں تو حکومت کی ہر صورت خواہ قیاسی طور سے کیسی ہی اعلا کیوں نہ ہو مذموم ہے۔

حصولِ علم کے شوق میں ایک اور بات بھی مضمر ہے جو سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ انسان کو انسان بنانے والی یعنی اس کا کیریکٹر سنوارنے والی جو شے ہے وہ شوق وسعی اور ریاضت و محنت ہے۔ خصوصاً جب کہ مدعا حصولِ اغراضِ نفسانی نہ ہو۔ ان لوگوں کے کیریکٹر میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صرف اُنھیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے دِلوں میں کسی اعلا مقصد کے حاصل کرنے کی لَو لگی ہوتی ہے اور جو اس دُھن میں دِن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات، مصیبت کو مصیبت خیال کرتے ہیں نہ راحت کو راحت، مگر راہِ طلب میں برابر قدم بڑھائے ہوے چلے جاتے ہیں اور گو آخر میں گوہرِ مقصد ہاتھ آئے یا نہ آئے مگر ایک ایسی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو اس سے زیادہ نایاب اور اُس سے کہیں بیش بہا ہے یعنی انسانیت یا دُوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ صفائیِ باطن۔ کون ہے کہ جس کے دل پر شاہ رحمت اللہ بلگرامی قدس سرہٗ

کے تذکرے کے پڑھنے سے جو اس کتاب میں درج ہی ایک خاص اثر یا ایک خاص کیفیت طاری نہ ہوگی۔ ان کے دوسرے حالات کے ضمن میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ان کے ایک عزیز کی زبانی منقول ہی کہ میں اور شاہ نعمت اللہ صاحب قدس سرہٗ قصبہ سانڈی سے بلگرام جا رہے تھے، دیکھتے کیا ہیں کہ سانڈی کے باغستان میں کسی نے چور کو مار کر درخت سے لٹکا دیا ہی۔ یہ دیکھتے ہی شاہ صاحب نے فرمایا ذرا ٹھیرو اور آگے بڑھ کر چور کے پاؤں چوم لیے۔ میں نے پوچھا۔ حضرت یہ کیا؟ فرمایا کہ اس چور نے اپنے شیوے کو پایۂ کمال تک پہنچا دیا۔ خدا تعالیٰ ہر شخص کو اپنی اپنی راہ میں اسی طرح ثابت قدم رکھے۔

ایسے بزرگوں کے تذکرے جنھوں نے اپنے تن من دھن کو تحصیلِ علم، تزکیۂ نفس یا رضاجوئی باری تعالیٰ میں وقف کر دیا تھا اس زمانے کے لیے جب کہ ہر طرف سے مادیت کا شور، دنیا دنیا کی پکار اور پیٹ کی دہائی سنائی دیتی ہی بہت کار آمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ پند و نصائح اور اخلاقی کتب اس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر ان لوگوں کے تذکرے جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے۔ وہ صرف باتیں ہیں اور یہ کام، وہ صرف مردہ الفاظ ہیں اور یہ زندہ اعمال۔ لہٰذا اس کے اُس کے اثر میں بہت بڑا فرق ہی۔

مولانا آزاد نے اپنے وطن کے علاوہ اپنے صوبے کی بھی بہت کچھ تعریف کی ہی اور ان کی تعریف بجا ہی۔ درحقیقت جیسا کہ انھوں نے لکھا ہی پورب قدیم الایام سے معدنِ علم و علما رہا ہی۔ علم و فضل کے چرچے اب تک وہاں جاری ہیں۔ ترویجِ علم کے لیے سلاطین و حکام کی طرف سے وظائف زمین و مدد معاش مقرر تھی اور اس غرض کے لیے مساجد، مدارس، خانقاہیں بنوائی جاتی تھیں، طلبہ دور دور سے آتے تھے اور صاحبِ توفیق ان کی

خاطر تواضع اور خدمت کو سعادتِ عظمیٰ سمجھتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہو کہ شاہجہاں کا یہ قول تھا کہ "پورب شیراز مملکت ماست"، لیکن سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مدارس اور خانقاہوں پر اوس پڑگئی، درس و تدریس کا بازار سرد پڑگیا اور وہ جوش دھیمے ہوگئے۔ ہندستان میں پہلے عام طور پر تعلیم کا یہی طریقہ تھا جس کے نشان اب بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اب نیا دَور شروع ہوا ہی اور زمانے نے دُوسرا رنگ بدلا ہی اور مشرق کی ہر چیز میں مغرب کا جلوہ نظر آرہا ہی:

لیکن جہاں ہمیں اُس زمانے کے علمی ذوق وشوق کو دیکھ کر مسرّت ہوتی ہو وہاں ایک بات کا افسوس بھی ہوتا ہی۔ اُس زمانے کے نصابِ تعلیم پر جب نظر ڈالی جاتی ہی تو معلوم ہوتا ہی کہ جو حلقہ کہ کچھ عرصے پہلے علما نے کھینچ دیا تھا اس سے باہر قدم رکھنا انھیں قسم تھا۔ فقہ و حدیث و تفسیر و منطق و فلسفہ و علمِ کلام پر سارا زور تھا۔ ساری طبّاعی اور ذہانت اسی پر ختم تھی۔ یہاں تک کہ کتابیں بھی زمانہ دراز سے ایک ہی چلی آتی تھیں اور انھیں پر حاشیے پر حاشیہ اور شرح پر شرح اضافہ ہوتی جاتی تھی۔ علومِ طبیعیات کا تو کیا ذکر ہی تاریخ و جغرافیہ بھی جس میں مسلمانوں نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا خارج از بحث تھا۔ غرض صدہا سال سے ہمارے ہاں کی تعلیم حالتِ جمود میں تھی۔ سال ہا سال کی بربادی اور تباہی کے بعد اب کہیں جا کے ہمارے علما کی آنکھیں کھلی ہیں اور آنکھیں کیا کھلی ہیں دعا دینی چاہیے اس باہمت اور عالی دماغ شخص کو جس نے اس زمانے میں مسلمانوں کے سر سے بہت سی بلاؤں کو ٹالا اور مسلمانوں کو ان کی نازک اور پُرخطر حالت سے آگاہ و خبردار کیا۔ یہ اُس کا طفیل نہیں تو اور کیا ہی کہ اسی کے صحبت یافتہ اور اسی کے

دارالعلوم کے تربیت یافتہ ایک بزرگ عالم نے قدیم سلسلۂ تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہی۔ چناں چہ اس کے لیے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں۔ خدا اس کی ہمت میں برکت اور اس کے مقصد میں کام یابی عطا فرمائے۔ اس کام میں کام یابی یقینی ہی کیوں کہ یورپین السنہ و علوم سے جو نفرت مسلمانوں کے دل میں تھی وہ مرحوم ریفارمر بڑی جاں کاہی سے رفع کر گیا ہی اور وہ طوفانِ بے تمیزی جو اُس وقت برپا ہو گیا تھا اب فرو ہو گیا ہی اور راستہ خس و خاشاک اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہی اور لوگ اس تغیّر کے لیے آمادہ ہیں۔ عام لوگ تو اسے دینی کام خیال کر کے اس کی امداد باعثِ ثواب جانتے ہیں اور انگریزی تعلیم یافتہ یا دُوسرے لوگ جو زمانے کی ضروریات سے واقف ہو چلے ہیں اس کی اہمیت کو مان کر اس کے ساتھ ہیں۔ کیا تعجّب ہی کہ اس تحریک کا یہ نتیجہ ہو کہ علومِ مشرقیہ و مغربیہ کو سمو کر ایک نیا کورس تیّار کیا جائے۔ جو ہماری ضروریات اور حالت کے زیادہ مناسب اور زیادہ کار آمد ہو۔ البتّہ اس قدر افسوس ہی کہ ہمارے علما نے واجب التّعظیم محرّک کے ہاتھ بٹانے میں بہت کم مدد دی ہی بلکہ جنھیں اندرُونی حالات سے واقفیت ہی وہ جانتے ہیں کہ بہ نسبت علما کے غریب دنیاداروں سے زیادہ امداد ملی ہی اور انھیں کے سہارے پر اب تک سارا کام چل رہا ہی۔

ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرے میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہی وہ یہ کہ اُن علما و فضلائے بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہی ایک بھی اہلِ تشیع میں سے نہیں اس سے معلوم ہوتا ہی کہ شیعہ مذہب نے وہاں بعد کے زمانے میں رواج پایا۔ اور اگر ان علما میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہی اور وہ شیعہ مذہب پر ہی یا اُن کے نسب ناموں میں اُن علما کے نام

نکلیں تو ہمارا یہ خیال اور بھی قوی ہو جائے گا۔ یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے۔ چناں چہ جون پور و دیگر مضافاتِ لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقّن کو پہنچ جاتا ہے جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اندیشناک ہو جاتی ہے۔ میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلطنتِ اودھ نے مذہب کے معاملے میں کبھی جبر و تعدّی سے کام لیا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیّت کو جو اعتقاد کے کچّے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔ ایسا ہر جگہ ہوا ہے اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا اور قصبہ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانے میں اہلِ تشیع وہاں نہ تھے اور اگر تھے تو خال خال لیکن بعد کے زمانے میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہنچا ہے۔

آزاد نے حسب عادت میر سیّد محمد الترمذی کے تذکرے میں شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کی کتاب 'تسویہ' کا اُچٹتا ہوا سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کا واقعہ بڑا دل چسپ ہے اور اس لیے ہم اسے یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ اورنگ زیب انار اللہ برہانہ' کی جزئیات پر بھی ایسی ہی نظر تھی جیسی کلیات پر۔ دوسرے یہ معلوم ہوگا کہ بعض باخدا لوگ ایسے بھی موجود تھے کہ وہ اورنگ زیب جیسے سخت گیر اور پُرجلال شہنشاہ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ تیسرے اس سے دینیات کے ایک معرکۃ الآرا مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

رسالۂ 'تسویہ' شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کی تصنیف سے ہے جو ایک درویش اور صوفی تھے۔ اس میں علاوہ اور امور کے جبرئیلؑ و وحی کی حقیقت

کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

"جبرئیلِ محمدؐ در ذاتِ محمدؐ بود صلی اللہ علیہ وسلم و ہم چنیں جبرئیلِ باہر پیغمبرے در ذاتِ وے بود و آں قوتِ باطنی ای شان بود کہ در غلبۂ آں قوتِ وحی ای شان نازل می گردید و لہذا جبرئیلِ باہر پیغمبرے بہ زبانِ وے سخن گفتہ"

جب یہ رسالہ (جو عربی زبان میں ہے) شاہ اورنگ زیب کی نظر پڑا تو انکارِ عظیم کیا۔ شیخ اس زمانے میں رحلت کر گئے تھے لیکن اُن کے مریدوں میں سے دو شخص پایۂ تخت میں موجود تھے۔ ایک میر سید محمد جو ملازمِ شاہی اور امرائے دربار میں سے تھے، دوسرے شیخ محمدی جو لباسِ درویشی و زہد میں تھے۔ اوّل بادشاہ نے میر سید محمد سے "تسویہ" کی اس عبارت کی شرح دریافت کی۔ سید نے شیخ کی مریدی سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں شیخ محمدی کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تمھیں شیخ کی مریدی کا اقرار ہے تو احکامِ شرع شریف سے اس رسالے کے مقدمات کو مطابق کر کے بتاؤ اور اگر مطابق نہیں کر سکتے تو اس کی مریدی سے استغفار کرو اور کتاب کو آگ میں ڈال دو۔ شیخ محمدی نے جواب دیا کہ نہ مجھے ان کی مریدی سے انکار ہے نہ استغفار کی ضرورت۔ لیکن جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں ہے جس وقت میں اس رتبے کو پہنچ جاؤں گا تو آپ کی درخواست کے بہ موجب اس کی شرح لکھ بھیجوں گا۔ اور اگر بادشاہ نے اس رسالے کا جلانا ٹھان لیا ہے تو اس فقیر متوکل کے گھر سے کہیں زیادہ شاہی مطبخ میں آگ موجود ہے حکم دیا جائے کہ یہ رسالہ اور اس کی جس قدر نقلیں دست یاب ہوں آگ میں جھونک دی جائیں۔ بادشاہ اس جواب کو سُن کر ساکت رہ گئے۔[1]

---

[1] "مراۃ الخیال" (تذکرۂ محمد بیگ) نسخۂ قلمی کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن صفحہ ۲۶۶ نیز ملاحظہ ہو "مآثرالامرا" جلد سوم صفحہ ۶۰۶ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ۔

اس کے پڑھنے کے بعد ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اگر سید احمد خاں مرحوم نے ملائکہ وغیرہ کی نسبت اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تو کون سی ایسی خطا کی۔ ایک ابلہ فریب عالم نما مولوی اپنی تفسیرِ قرآن میں جس میں اس نے عوام اور جہال کے خوش کرنے کا بہت کچھ سامان جمع کیا ہے لکھتا ہے کہ سرسید نے یہ خیالات برہمو سماج سے لیے۔ اور اپنی نیک نیتی سے ضمناً اس عامیانہ خیال کو بھی تحریر میں لایا ہے کہ سرسید نے انگریزوں کو اطمینان دلایا کہ میں مسلمانوں کو نہ صرف مطیعِ سرکار بناتا ہوں بلکہ ان کے مذہب کی بیخ و بنیاد بھی کھو کھلی کیے دیتا ہوں۔ افسوس اس نام کے مولوی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ سلف صالحین میں سے بعض نامور بزرگ اور شیوخ ان مسائل پر اس قسم کے خیالات صاف و صریح الفاظ میں بیان کر چکے ہیں چناں چہ مولانا 'بحر العلوم' میں فرماتے ہیں :-

"جبرئیلؑ کہ مشہور رسل علیہم السّلام است و وی از جانب حق می رساند آں حقیقت جبرئیلیہ است۔ است کہ قوتے از قوائے رسل بود متصوّر شدہ در عالم مثال بہ صورتے کہ مکنون بود در رسل شہود می شود مرسل می گردد و پیغام حق می رساند پس رسل مستفیض از خود اند نہ از دیگرے" [۱]

اسی طرح مولانا روم اور شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

اس کتاب کی فصلِ ثانی کے دیباچے میں جس میں علم پر بحث ہے آزاد نے ایک مہمل اور غلط قصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ایران کے کتب خانوں کے جلانے کا بھی لکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب سعدؓ بن وقاص نے ملکِ فارس کو فتح کیا اور وہاں فلسفے کی بے شمار کتابیں ہاتھ لگیں تو انھوں نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ انھیں کیا کیا جائے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر ان میں

[۱] سوانح مولانا روم مؤلفہ شبلی نعمانی صفحہ ۱۲۶

ہدایت ہی تو خدا نے ہمیں بھی اس سے بڑھ کر ہدایت دی ہی اور اگر ضلالت ہی تو خدا ہمارے لیے کافی ہی انھیں پانی یا آگ میں ڈال دو ؎

اوّل تو اس میں ایک صریح تاریخی غلطی یہ ہی کہ سعدؓ بن وقاص نے ملکِ ایران کو فتح نہیں کیا اور یہی غلطی مشہور مورّخ ابنِ خلدون نے کی ہی[1] غالباً مولانا آزاد کا ماخذ بھی ابنِ خلدون ہی کیوں کہ بہ عینہٖ یہی الفاظ اس میں ہیں۔ دوسرے مسلمانوں نے جب ایران کو فتح کیا تو وہاں اس قدر کتب خانے کہاں تھے۔ علم کا چرچا ایران سے بہت زمانہ پہلے سے اُٹھ چکا تھا۔ یہاں تک کہ جب سکندر نے ایران فتح کیا تو اس وقت بھی کتب خانوں کا نام و نشان نہ تھا ؎

البتّہ یہ قصّہ اسکندریہ کے متعلق متعدّد تاریخوں میں بیان کیا گیا ہی اور ابنِ خلدون نے اور بعد میں آزاد نے غلطی سے اس قصّے کو ایران سے منسوب کیا ہی لیکن شمس العلما مولانا شبلی اس کی تردید نہایت تحقیق و تنقید کے ساتھ کر چکے ہیں اور اب اس کے متعلق کچھ لکھنا بے سُود ہی۔ تاہم ایک دو باتیں اس کے متعلق کہنا ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے بڑی شدّومد اور تحقیق سے یہ امر ثابت کیا ہی کہ اس قصّے کا ماخذ ابو الفرج ہی۔ سب سے اوّل اسی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہی اور اس سے دوسروں نے نقل کیا۔[2] لیکن ایک بات کھٹکتی ہی وہ یہ کہ ابو الفرج سے قبل عبداللطیف بغدادی اپنے رسالہ 'افادۃ الاعتبار' میں ضمناً اس واقعے کی طرف اشارہ کر چکا ہی۔ مولانا نے نہایت سختی سے جھنجلا کر اس کی تردید کی ہی اور ثابت کیا ہی کہ عبداللطیف بغدادی نے اس کا ذکر مورّخانہ حیثیت سے نہیں کیا بلکہ ضمناً تذکرہ کیا ہی اور جن یورپین مورّخوں کا یہ بیان ہی

---

[1] دیکھو 'مقدمہ ابن خلدون'۔ [2] 'رسائلِ شبلی' (کتب خانہ اسکندریہ) صفحہ ۱۳۱ و ۱۳۲ [3] یوحنا ابو الفرج سنہ پیدائش سنہ ۶۲۳ھ سنہ وفات سنہ ۶۳۷ھ موافق الدین عبداللطیف بن یوسف بغدادی سنہ پیدائش

کہ سب سے اوّل عبداللطیف نے اس کو اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ان کا بڑی حقارت سے ذکر کیا ہے اور ان پر فریب دہی اور تدلیس کا الزام لگایا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ عبداللطیف نے مورخانہ حیثیت سے اس کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ "یذکر" کے تحت میں اس کو لکھا ہے، اس کا بھی اعتراف ہے کہ اس کے ساتھ جس قدر واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب بازاری گپیں[1] ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ واقعہ عبداللطیف کی کتاب میں ابوالفرج سے قبل مذکور ہے اور کم سے کم "یذکر" کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عبداللطیف کے زمانے میں لوگوں کی زبان زد ضرور تھا اور بلاشبہ ابوالفرج سے قبل مشہور تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ جس شان سے اور نمک مرچ لگا کر اس نے بیان کیا ہے اس سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا اور اس سے بعد کے مورّخین نے بے سوچے سمجھے نقل کر کے سب جگہ پھیلا دیا۔ لیکن اس کا پتا لگانا ابھی باقی ہے کہ یہ واقعہ مشہور کیسے ہوا اور ابوالفرج سے پہلے اس کا چرچا کیسے تھا۔ غالباً باہمی عناد اور تعصّب اس قصّے کی ایجاد کا باعث ہوا ہے۔ مفتوح قوم فاتح قوم پر اکثر ایسے الزام بعد میں قائم کر دیا کرتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے جس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے علاوہ اس کے مولانا شبلی نے اس رسالے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ سوائے عبداللطیف ابوالفرج، مقریزی اور حاجی خلیفہ کے کسی اور کتاب میں اس قصّے کا ذکر نہیں۔ اور اسی کے ساتھ متعدد کتابیں جو مصر و اسکندریہ کے حالات میں لکھی گئی ہیں نام بہ نام گنوائی ہیں کہ ان میں سے کسی میں اس کا حوالہ نہیں۔ حال آں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ انھیں کتابوں میں سے ایک تاریخ الحکما[2] المقفطی ہے جس میں یہ قصّہ

---

[1] رسائل شبلی (کتب خانہ اسکندریہ) صفحہ ۱۳۸ و ۱۳۹ [2] تاریخ الحکماٗ جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف المقفطی مطبوعہ لیپ سک سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۵، ۳۵۶

منقول ہے۔ غالباً یہ کتاب حال ہی میں چھپی ہے اور اس لیے مولانا کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس کے علاوہ دوسری کتاب 'مفتاح السعادۃ'[1] ہے جو ایک ترکی عالم و فاضل طاش کبریٰ زادہ (پیدائش سنہ ۹۰۱ھ وفات ۹۶۸ھ) کی تصنیف سے ہے۔ افسوس کہ یہ بیش بہا کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی لیکن ان کتابوں میں اس قصّے کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ ان دونوں صاحبوں نے بغیر کسی تحقیق کے ابوالفرج سے لفظ بہ لفظ نقل کر لیا ہے یا ممکن ہے کہ طاش کبریٰ زادہ نے قفطی سے نقل کیا ہو۔ عبارت سب کی ایک ہے ؂

خاک بلگرام میں ایک اور ایسا جیّد فاضل ہو گزرا ہے جسے فخر علمائے ہند کہنا بجا ہوگا۔ علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں علّامہ سید مرتضیٰ صاحبِ 'تاج العروس' کا تذکرہ نہ ہو۔ یہ آزاد بلگرامی کے ہم عصر تھے۔ ہمارے دل نے ہرگز یہ گوارا نہ کیا کہ یہ کتاب جو علمائے ہند اور خصوصاً علمائے بلگرام کا تذکرہ ہے اس فاضلِ بے عدیل کے حالات سے خالی رہے لہٰذا یہ تذکرہ آخر کتاب میں اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے اس شخص کے تبحر اور کمالاتِ علمی کا حال معلوم ہوگا ؂

---

[1] نسخہ کتب خانہ آصفیہ صفحہ ۳۸۲

# مقدّمہ خطوطِ عطیہ بیگم

آپ نے اپنی عنایت سے مولانا شبلی مرحوم کے جو خطوط[1] مجھے بھیجے ہیں۔ مَیں نے انھیں بڑے شوق سے پڑھا۔ اور جب تک مَیں شروع سے آخر تک سب نہ پڑھ چکا مَیں نے انھیں ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ چند روز بعد مَیں نے دوبارہ پھر انھیں پڑھا اور مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا شوق اب بھی کم نہ ہوا۔ بڑا ظلم ہوگا اگر یہ خط یونھیں پڑے پڑے ردّی میں مِل جائیں اور تلف ہو جائیں اور دنیا اِس نعمت سے محروم رہ جائے :۔

خانگی خطوں میں اور خاص کر اُن خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دل چسپی ہوتی ہے جو دُوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلّف کا پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشۂ لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دُوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنّع ان خیالات کو بیان

---

[1] مَیں نے یہ خطوط خود جناب عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ سے حاصل کیے تھے :۔
مولف

کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں جنھیں نہ انشا کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کے رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مرزا غالب کی شاعری سے پورا لطف حاصل نہیں کر سکتے یا وہاں تک نہیں پہنچ سکتے جہاں شاعر کا خیال پہنچا ہے لیکن کون پڑھا لکھا ایسا شخص ہے جو ان کے رقعات کو شوق سے نہیں پڑھتا اور مزے نہیں لیتا۔ عالم اور عامی، بوڑھے اور بچے سب ان سے یکساں لطف اُٹھاتے ہیں، جہاں وہ اپنی جوانی کی رنگین تصویر کھینچتے ہیں اور اسے حسرت بھرے الفاظ میں یاد کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ بڑھاپے کا پُر الم نقشہ دکھاتے ہیں۔ یا جب اپنی رند مشربی اور مصیبت کی داستان بیان کرتے ہیں یا اپنے دوستوں سے ان کے رنج و غم میں ہمدردی کا اظہار فرماتے ہیں، یا دلی کی بربادی اور اس کا مرثیہ پڑھتے ہیں یا اپنے روزمرہ کے حالات سادگی سے اپنے خاص طرزادا میں بیان کر جاتے ہیں یا لکھتے لکھتے باتیں کرنے لگتے ہیں اور اپنے دوستوں اور عزیز شاگردوں کو محبت بھرے الفاظ میں یاد کرتے ہیں یا اپنی بیماری اور ضعف کا ذکر اس طریقے سے کرتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے، یا ادبی نکات بتاتے اور سمجھاتے ہیں۔ کون ہے جو انھیں پڑھ کر مرزا کی ظرافت اور ذہانت، ان کا طرزِ ادا، ان کی بے تکلفی اور آزادہ روی، محبت اور خلوص سے متاثر ہو کر ان کی داد نہ دے گا۔

یہ سب رقعے اُردو زبان کا زیور ہیں اور جب تک اردو زبان زندہ ہے یہ اُسی شوق سے پڑھے جائیں گے اور ادب کے شائق ہمیشہ ان سے لطف حاصل کریں گے۔ زبان میں بہت سی تبدیلیاں ہوں گی، اسلوب بیان بہت کچھ

بدل جائیں گے، لیکن ان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کبھی کم نہ ہو گی۔ ان کے الفاظ اور جملے مصری کی ڈلیاں اور آبِ حیات کے گھونٹ ہیں۔ یہ سچے موتی ہیں جن کی آب دِلوں کو لبھاتی اور دماغوں کو تازہ کرتی ہے؛

مرزا غالب کے حالات اور کلام پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ مگر کہیں ان کی زندگی اور سیرت کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا جو ان کے رقعوں میں ہے۔ ان رقعوں میں اس عجیب و غریب شخص نے اپنی روح بھر دی ہے۔ جو اس خوب صورت اور پاک صاف نہر کی مانند ہے جو قدرتی چشمے سے بلا تکلف بہتی ہے۔ اگر خدا نہ خواستہ یہ رقعے تلف ہو جاتے تو اصلی مرزا ہماری نظر سے ہمیشہ کے لیے چھپ جاتے؛

علاوہ ان وجوہ کے جن کا میں نے اوپر ذِکر کیا ہے، مَیں مولانا شبلی کے ان خطوط کو جو انھوں نے زہرا بیگم صاحبہ اور عطیہ بیگم صاحبہ کے نام لکھے ہیں، کئی لحاظ سے قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔ ایک تو ان کا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دل چسپ ہے جو ان کی دُوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا۔ دُوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذِکر انھوں نے فرمایا جس کی وجہ مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بُو آتی ہے جو ان کے دُوسرے رقعات میں نہیں ہے اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دل چسپی اور قدر کی ہے؛

مولانا کے ایک ارشد تلامذہ نے حال ہی میں 'شعر العجم' کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے کہ "وہ واقعات کی کھتونی نہیں حسن و عشق کی داستان ہے۔ گویا واقعات شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے

کہ "شعرالعجم" واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصوّر ان کے ذہن میں تھا وہ "شعرالعجم" میں نہیں، ان خطوط میں ہے۔ اُس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک دستۂ گُل تیّار کیا ہے اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ نقل ہے اور یہ اصل، وہ جگ بیتی ہے اور یہ آپ بیتی۔ اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی میں کہاں ؛

ان خطوط سے ایک بات بڑے کام کی معلوم ہوتی ہے اور ہمارے ہم وطنوں کے لیے قابلِ غور ہے کہ شایستہ اور تعلیم یافتہ خاتونوں کی صحبت کا اثر قابل مرد پر بھی کس قدر اچھا ہوتا ہے۔ عورتوں کے متعلّق جو بعض خیالات مولانا نے اِن خطوط میں ظاہر فرمائے ہیں کیا وہ بغیر اس فیضِ صحبت کے انھیں حاصل ہو سکتے تھے؟ البتہ مولانا نے کبھی ان خیالات کا اعلان نہیں کیا اور نہ کبھی ان پر عمل کرنے کی جرأت کی۔ عطیہ بیگم صاحبہ نے ایک بار اسی بات پر انھیں کم ہمّتی کا الزام دیا ہے اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں "تم کہتی ہو کہ مَیں بہت بدہمّت ہوں۔ میری زندگی کے دو حصّے ہیں پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمّت کا اندازہ کر سکتیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ مَیں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے ؛

پبلک کام سے مراد ندوہ کے کام سے ہے۔ یہ مولانا کی کمزوری ہے اور اس کمزوری کے لیے ان کے پاس عذر بھی ہے۔ اکثر مصلحین اور مدبّرین کو عوام کی مرضی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے پاک نفوس دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں جو صداقت کی خاطر آبرو، دولت اور جان کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہی

وہ لوگ ہیں جو مجدّد اور اولیا کہلاتے ہیں۔ مَیں مولانا کے اس عذر کو قابلِ قبول خیال کرتا ہوں، یہ کم سے کم صداقت پر ضرور مبنی ہے، اگرچہ دُور بینی پر نہیں اگر وہ ان خیالات کو ظاہر کرنے یا ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے جو ان کے فہم و یقین میں صداقت پر مبنی ہیں تو کیا ندوہ نہ چلتا؟ کیا اب ندوہ نہیں چل رہا؟ بات یہ ہے کہ وہ مولویوں کے گروہ سے بھی الگ ہونا نہیں چاہتے تھے اور اصلاح بھی چاہتے تھے اور یہ ممکن نہ تھا:

مَیں ان خطوں میں سے بعض خیالات کو مختصراً اس لیے نقل کرتا ہوں کہ معلوم ہو کہ شایستہ اور تعلیم یافتہ خاتونوں کی صحبت کا کس قدر عجیب اثر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی سے پختہ کار اور فاضل شخص بھی نہ بچ سکے۔ جو لوگ اس کے مخالف ہیں، انھیں کم سے کم غور کرنے کا ضرور موقع ملے گا:

مولانا نے ایک خط میں تعلیمِ نسواں کے نصاب پر بحث کی ہے اور بعض دُوسرے خطوں سے بھی ان کے خیالات کا پتا لگتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ خاتونوں کی تکمیل کے لیے کن امُور کی ضرورت خیال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عورتوں کے لیے الگ نصاب ہو یہ اصوُلی غلطی ہے جس میں یورپ مبتلا ہو رہا ہے کوشش ہونی چاہیے دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ اور بڑھتا جائے اور بات چیت رفتار گفتار نشست برخاست مذاق زبان سب الگ ہو جائیں۔ یونھیں تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں دو مختلف نوع ہو جائیں گے۔ البتّہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت، پرورشِ اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں اضافہ ہونے چاہییں۔ یا ایک دُوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "عورتوں کے متعلق تمھاری رائے ہے کہ وہ دینوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن

یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دستِ نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیوپیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پُرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان چھوئی موئی اور رذی کا گلا ہونا چاہیے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری اور دیوپیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔" ہاں یہ اعتراض صحیح ہے کہ "موجودہ طرزِ تعلیم سے بچّے خاندان سے اجنبی ہو جاتے ہیں لیکن خاندان سے زیادہ چسپیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں"۔

مولانا اور لوگوں کی طرح موسیقی کو بُرا نہیں سمجھتے بلکہ انھوں نے بار بار عطیہ بیگم صاحبہ کو اس کے باقاعدہ سیکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ مثلاً وہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں و انا اوّل العابدین"۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :۔

"گانے کے ذِکر پر ایک بات یاد آئی جو مدّتوں سے دل میں تھی مگر کہنے کی جرأت نہ تھی۔ مَیں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سُنے۔ تم کو خدا نے خوش آواز عطا کی ہے اور نہایت موثر آواز ہے۔ لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندُستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔ اس لیے تم بالکل بے سُرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معلومات ضرور ہیں۔ ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ بار ہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رُک گیا کہ تمھاری گٹکری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔ بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ جن کا پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں"۔

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں۔ فرمایا ہے "گانا میں خود نہیں جانتا۔ لیکن سمجھ سکتا ہوں یعنی جو گانا خلافِ فنِ موسیقی ہوگا میں بتا سکوں گا کہ خلافِ قاعدہ ہے۔ گرام فون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں ان کو سنو، پلیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں مثلاً دادرا، جنجھوٹی وغیرہ ان سے اندازہ ہو سکے گا۔ کہ گانے میں کس قسم کے سُر اور تان اور گٹکری ہیں۔ یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو بےکار جاتی ہے۔ البتہ رواں طور پر مثنوی یا اور اشعار کے پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے مولانائے مرحوم دوسرے علما کی طرح تنگ خیال اور تنگ نظر نہ تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس زمانے میں عورتوں کے لیے کن کن صفات اور خوبیوں کی ضرورت ہے۔ عورتوں کے متعلق ان کے خیالات زیادہ ہمدردانہ اور وسیع معلوم ہوتے ہیں۔ چناں چہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میری اسکیم یا تجویز جو آپ کے متعلق ہے وہ یورپ سے آنے کے بعد قابلِ اظہار ہوگی۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ اُن مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں جو انگریزی اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ لیکن اُردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پُرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں۔ اس لیے اب جو کچھ ہو کمال کے درجے پر ہو"۔

مولانا بے پردگی کو کچھ ایسا معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ان خطوط میں کہیں بے پردگی کے خلاف ایک حرف بھی نہیں لکھا بلکہ اوپر کے اقتباس کے آخری جملے کس خوبی سے اُسے نبھا گئے ہیں۔ اس کی تائید

دوسرے خطوں سے بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ ایک خط میں لکھا ہے کہ "جناب بیگم صاحبہ نے ندوہ کی جو اعانت کی بہ دل اس کا مشکور ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ دارالعلوم کی جدید عمارت اُن کے ہاتھ سے کھلتی۔ لیکن قوم میں اتنی وسیع الخیالی نہیں آئی عطیہ کو لوگوں نے جلسے میں نہ آنے دیا تو وہ تجویز کب منظور کریں گے۔ حال آں کہ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ ایک دوسرے خط میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے "ان باتوں کے ساتھ عام مخالفت اور مولویوں کی برہمی الگ"۔ عطیہ بیگم صاحبہ نے ندوۃ العلما کے سالانہ جلسے میں آنے کی خواہش ظاہر کی تھی مولانا کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر مولوی مخالف تھے نہ آسکیں۔ اسی طرح مولانا کی بڑی تمنا تھی کہ بورڈنگ ہوس کا بنیادی پتھر بیگم صاحبہ جنجیرہ کے ہاتھ سے رکھوائیں مگر مولویوں کے ڈر سے انھیں اس تجویز کے پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ اپنی ایک تمنا کا اظہار کرتے ہیں "اصل یہ ہے کہ میں چاہتا تھا کہ میرے کسی کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو۔ اس کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمھارے نام ڈیڈی کیٹ کرتا لیکن افسوس نہیں کرسکتا۔ جن حالات میں گھرا ہوں تم سمجھتی اور جانتی ہو کہ اس سے دفعتہً ان قومی کاموں کو نقصان پہنچے گا جو میرے ہاتھ میں ہیں"۔ ایک دوسرے خط میں اسی مضمون کو لکھتے ہیں "عطیہ! تم سے زیادہ مجھ کو خوشی ہوگی اگر میں کوئی کتاب تمھارے نام سے معنون (ڈیڈی کیٹ) کرسکوں۔ یہ وقت ضرور آئے گا لیکن کب آئے گا اس کا فیصلہ آج نہیں کرسکتا"۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ساتھ یورپ جانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں "اب جنجیرہ کا آنا یقینی ہے اب نہ سہی پھر سہی۔ یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں۔ ممکن ہے ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں"۔ ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے

خیالات ان معاملات میں کس قدر آزادانہ اور وسیع تھے مگر حالات سے مجبور تھے، مصلحت مانع آتی تھی ؂

ان خطوط سے جیسا کہ میں شروع میں لکھ چکا ہوں محبت اور خلوص کی بو آتی ہے۔ اس سے قبل مولانا کے رقعات کی دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں لیکن وہ اس داستان سے خالی ہیں۔ محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف لینا ہو تو ان رقعات کو پڑھنا چاہیے۔ یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں کے کلام میں مشکل سے ملیں گے۔ اور اگر ہیں بھی تو یا تو فرضی اور بناوٹی یا پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں یہاں چند جملے نقل کرتا ہوں جس سے آپ کو میرے قول کی تصدیق ہوگی:۔

"رگِ سنگم شرارے می نویسم کفِ خاکم غبارے می نویسم

قرۃ عینی۔ تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔ افسوس دیر تک ملنے کی امید نہیں۔ میں وطن، احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی کام کیوں کر چھوڑ دوں۔ ورنہ بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر تھے۔ زہرا صاحب نے تھوڑی سی ردّ و کد کے بعد منظور کر لیا کہ پھر کبھی لکھنؤ آئیں۔ لیکن تم اتنی غریب نوازی کیوں کرو گی؟"

ایک دوسرے خط میں کیا مزے کی بات لکھی ہے اس ادا کی داد دیجیے اور لطف حاصل کیجیے :۔

"شعرا اور اہلِ ادب عموماً کنایے سے کام لینا نہایت بلاغت اور لطافت خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ جہاں گیر بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے۔ عموماً نور جہاں کا نام لاتے تھے لیکن ہمیشہ کنایتہً کبھی کسی نے

تصریح نہیں کی۔ مثلاً سعیدہ کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ای سایۂ خدا ز تو پُر نور شد جہاں
بادا ہمیشہ نورِ خدا سائبان تو

اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتہً تمہارے لیے خیر مقدم وغیرہ سب کچھ لکھ چکا ہوں اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے میرا ہر رونگٹا اور ہر موے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے"۔

زہرہ بیگم صاحبہ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "عطیہ کو میں نے خدا حافظ نظم میں لکھا تھا آپ نے دیکھا یا نہیں، نہ دیکھا ہو تو چند شعر لکھ بھیجوں۔ اس شعر پر "بہ سلامت روی و باز آئی" مصرعے لگائے تھے ایک شعر یہ تھا ؎

بہ روی سوئے پیرس و لندن     وز رہِ کعبہ و حجاز آئی

اشعار میں جو دعائیں مانگی تھیں اُن میں سے ایک اسی کے قبول نہ ہونے کا کھٹکا ہے"۔

اس ادا کو ملاحظہ کیجیے "وہ کتابیں میں نے مخصوص نواب بیگم صاحبہ کے لیے بھیجی تھیں خط بھی تھا لیکن وہ کیوں پہنچا ہوگا؟"

ایک اور خط میں کس حسرت سے لکھتے ہیں کہ "ندوہ کا جھگڑا نہ ہوتا تو میں بمبئی کو گھر بنا لیتا"۔

دیکھیے کس کس طرح محبت کا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "میں بارِ خاطر ہونے سے بہت پرہیز کرتا ہوں۔ جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرا نہ گئی ہوں۔ یہی حالت خطوط لکھنے کی ہے اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداءً نہیں آتے بلکہ میرے جواب میں آتے ہیں تو

سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار زحمت دوں اور زبردستی جواب حاصل کروں۔ بہرحال مختصر نویسی کا یہ سبب ہے ورنہ مَیں دفتر لکھ کر بھی سَیر نہ ہوں"۔

ایک دُوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں "عزیزی عطیہ کو سلام کہنا لیکن پھر وہی خیال ہوتا ہے۔ ناخواندہ مہمان کیوں بنوں؟"

اب ذرا راز و نیاز کی بھی دو ایک باتیں سُن لیجیے "آپ کے زمانۂ قیام میں عطیہ کا ایک غضب آلود خط آیا تھا مَیں نے اس کا معذرت آمیز جواب لکھا تھا"۔

"عطیہ صاحبہ کی مہربانی کا آپ اس وقت اندازہ کر سکتی ہیں جب آپ سب خطوط دیکھتیں یعنی میرا خط بیگم صاحب کے نام اور عطیہ صاحب کا میرے نام اور میرا خط اس کے جواب میں۔ مَیں نے ایک بات لکھی تھی اور خود لکھ دیا تھا کہ یہ ایک خیال ہے، نہ پسند آئے تو جانے دیجیے گا۔ اس پر اس قدر برہمی اور عتاب، خیر اس کی شکایت کیا"۔

لیکن سننے اور مزہ لینے کی بات یہ ہے "کل اتّفاق سے مولوی مشیر حسن قدوائی ملنے آ گئے تھے۔ ان سے آپ کے لکھنؤ آنے کا ذِکر آ گیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ میری مہمان ہوں گی۔ اس لیے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر آپ لکھنؤ آ کر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو مَیں اس زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا"۔

اس پر مولانا کو اس قدر اصرار ہے کہ اس بات کو وہ ایک دُوسرے خط میں دہراتے ہیں "مولوی مشیر حسین صاحب نے تمھارے ارادۂ سفر کی خوش خبری سُنائی لیکن وہ فقرہ یاد رہے کہ میرے ہوتے اور کہیں ٹھیرو گی تو مَیں لکھنؤ سے نکل جاؤں گا"۔

عطیہ بیگم صاحبہ ولایت تشریف لے جانے والی ہیں، دِل تقاضا کرتا ہے

کہ بمبئی جاکر خدا حافظ کہیں۔ جب رخصت کے سمے کا خیال آتا ہی تو ہمت نہیں پڑتی۔ اس خط کے لفظ لفظ سے سچی محبت کا اظہار ہوتا ہی۔ فرماتے ہیں "میرا ارادہ اور قطعی ارادہ تھا کہ تمھاری روانگی کے وقت بمبئی میں موجود ہوں گا اور تم کو خدا حافظ کہ سکوں گا لیکن پھر خیال آیا اور غالباً نہ آسکوں گا کسی عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت کا مَیں تحمّل نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہی بہتر ہی کہ مَیں دُور سے خدا حافظ کہوں۔ خدا کرے جب واپس آؤ تو مَیں وہاں موجود ہوں۔ وہ البتہ مسرت بخش حالت ہوگی"۔ ایک دُوسرے خط میں اس دلی کیفیت کا اظہار کن درد بھرے الفاظ میں کیا ہی"۔ باوجود اس کے کہ ولایت کی عین روانگی کے وقت مَیں بمبئی میں رہنا نہیں چاہتا تھا تاہم چاہتا ہوں کہ بمبئی آؤں اور روانگی سے پہلے اور کہیں چلا جاؤں"۔

وداعیہ نظم لکھ چکے ہیں پھر خط لکھا ہی اور الوداع کہا ہی آخر میں یہ شعر ہی:۔

می روی و گریہ می آید مرا    ساعتے بہ نشیں کہ باراں بہ گزرد"

ایک خط کے آخر میں بڑے شوق اور پیار سے لکھتے ہیں "مَیں وہی شبلی نعمانی ہوں"۔

ولایت کے سفر سے واپسی پر تحریر فرماتے ہیں "ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد قبول کرو۔ میری زندگی کا یہ سخت افسوس ناک واقعہ ہی کہ یہ مبارک باد میرے لب کے بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہی۔ تہنیت کی غزل الگ مرسل ہی جس کے ساتھ ایک اور مختصر ہدیہ ہی کیا تم ان دونوں حقیر چیزوں کو قبول کر سکتی ہو۔ شہنشاہ اڈورڈ اور پریسیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبے سے

اُتر نہیں سکتا۔ ہاں یہ سچ ہی۔ لیکن یاد رکھو آفتاب ذرّے پر بھی چمکتا ہی۔ میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی ایک تصویر جو ۳۰ برس کی عمر کی ہی اتفاق سے ہاتھ آگئی ہی بھیجتا ہوں وہ میری قائم مقامی کرے گی۔" (افسوس[۱] کہ دوسری جانب سے اس تصویر کا اشتیاق ظاہر ہوا اور نہ بھیجنے کی نوبت آئی) اس کے بعد کے ایک خط میں محبّت بھرے مایوسانہ الفاظ میں لکھتے ہیں "میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بالاتر کر دیا ہی اس لیے یہ توقع رکھنا کہ اب آپ اسی طرح ہم سے ملیں یا ان اطراف کا قصد کریں جیسا کہ وعدہ کیا تھا اب صحیح نہیں۔ خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خوددارانہ ہی۔ بہ ہر حال حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس"۔

یہ سب باتیں تھیں مگر مولانا عطیہ بیگم صاحب کی خوبیوں کے قائل اور دل دادہ تھے۔ چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اب تو تمھارے خط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سُناتا ہوں اور لوگ سر دُھنتے ہیں۔ پالیٹکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے حیدرآباد اور الہ آباد بھیجے"۔

لیکن وہ دل سے چاہتے تھے کہ جو دو ایک نقص اُن میں ہیں اُن کی اصلاح ہو جائے اور وہ سخن سنج، شعر فہم، ادیب، انشا پرداز اور اُردو کی عمدہ مقرر ہو جائیں اور اس کے لیے وہ ہر طرح کی مدد دینے کے لیے آمادہ تھے۔ حال آں کہ مولانا شبلی ان لوگوں میں سے تھے کہ وہ ایسی باتوں میں اپنا ایک منٹ بھی ضایع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ بہت بڑا ایثار تھا اور اس سے اُن کے خلوص اور محبّت کا ثبوت ملتا ہی۔ چناں چہ اپنے خطوں میں

---

[۱] اشتیاق تو ہوا لیکن تصویر ہی نہ ملی۔ محمد امین

اس خیال کا بار بار اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں "میری اسکیم یا تجویز جو آپ کے متعلق ہے وہ یورپ سے آنے کے بعد قابلِ اظہار ہوگی یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں جو انگریزی اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں لیکن اُردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پُرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے آپ تو اس میدان میں آچکیں اس لیے اب جو کچھ ہو کمال کے درجے پر ہو"۔

"عطیہ بیگم! مجھ کو معلوم نہیں کہ اب کب ملنے کا اتّفاق ہو سکتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ موقع پھر ملا تو میں چاہوں گا کہ میں تمھاری کچھ علمی خدمت کر سکوں تم کو فارسی پڑھاؤں اور اُردو کی انشا پردازی سکھاؤں معلوم نہیں تم اس کو اپنی تحقیر تو خیال نہ کروگی"۔

"معاف کیجیے میں "آپ" کے بجائے "تم" کا لفظ لکھوں گا، آپ کے لفظ میں بیگانہ پن ہے"۔

ایک دُوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "جو خط ضایع ہو گیا اُس میں تم سے ایک پرائیویٹ بات پوچھنا چاہتا تھا یعنی یہ کہ تم نے اپنی زندگی کا ایم (مقصد) کیا قرار دیا ہے۔ کیا فارمیشن یا اشاعتِ تعلیم یا تصنیف و مضمون نگاری اس میں پہلے مقصد کے سوائے جس کا میں اہل نہیں ہوں باقی تمھارے مقصد میں تم کو کافی مدد دے سکتا تھا۔ اس کے متعلق اور تفصیل لکھی تھی"۔

"تم شعر خود کہتی نہیں لیکن شعر کہنے سے سمجھنا زیادہ مشکل ہے اور یہ وصف تم میں موجود ہے۔ میں نے تو ظرافت میں وہ اشعار لکھے تھے۔ ہاں زبان صاف تھی"۔

"میں تم کو بار بار ٹوکتا ہوں ممکن ہے کہ تم کو گراں گزرے لیکن جی نہیں مانتا

کہ تمہاری اردو کے روشن چہرے پر داغ رہنے پائیں - پس دو چار بار کی اور کسر ہے"۔

"ولایت سے آجاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا اُستاد بنا دوں گا خود شاگردی کے قابل بھی نہیں"۔

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں "آج یہ خیال آیا کہ اگر خاص آپ لوگ بمبئی سے ایک زنانہ اخبار یا رسالہ نکالیں تو بہت مفید ہو ئیں بھی اس میں مضامین وغیرہ کی مدد دے سکتا ہوں"۔

مولانا شبلی جیسے اکل کھرے اور تنک مزاج یہ لکھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے اخلاص و محبت کی نوبت کہاں تک پہنچ گئی تھی۔

ایک اور خط کی عبارت ہے "باربار جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھا دوں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے۔ تاج گنج کی صناعیوں سے ایک گنوار بھی لطف اُٹھاتا ہے لیکن وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو ایک انجنیر اور ماہرِ فن کو ہوتی ہے۔ بوئے گل، بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں معلوم ہو جائیں لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں عرش (جزیرہ) تک پہنچ نہیں سکتا۔ تم عرش سے اُتر نہیں سکتیں، تاہم ناامیدی نہیں، کبھی تو ندوہ کے جھگڑوں سے فرصت ملے گی"۔

ان خطوں میں ایک اور بات بھی بہت قابلِ قدر ہے وہ ادبی نکات ہیں جو کہیں کہیں ان کے قلم سے نکل گئے ہیں اور ان میں سب سے دلچسپ وہ تنقید ہے جو اپنے کلام کے متعلق نہایت بے تکلفی اور سچائی سے کر جاتے ہیں۔ یہ بات کہاں نصیب ہوتی ہے کہ خود مصنّف اپنی زبان یا قلم سے اپنے کلام کے متعلق رائے لکھے۔ اکثر اس بات کے معلوم کرنے کی تمنا رہتی ہے کہ فلاں اعلا مصنّف یا شاعر

اپنی تصنیف کے متعلق کیا خیال رکھتا تھا یا وہ اپنی کس کتاب یا نظم کو سب سے بہتر سمجھتا تھا۔ مصنف اکثر اس معاملے میں بہت شرمیلے ہوتے ہیں اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے، اس میں خودنمائی اور تعلی ہوتی ہے۔ مولانا شبلی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے لیکن یہاں معاملہ دوسرا ہے وہ کسی غیر کو نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہیں۔ چند جملے نمونے کے طور پر نقل کرتا ہوں :۔

"بہاول پور کے عطیے کا کاغذ میں نے عطیہ کو بھیجا ہے آپ بھی دیکھیے گا۔ کسی قدر لٹریچر کا بھی مزہ ہے"۔

"میرا چھوٹا سا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے برعکس نہند نام زنگی کافور' ان کانٹوں کا نام 'دستۂ گل' رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لیے ان کا پردے ہی میں رہنا مناسب ہے"۔

یہ اپنے کلام کی کیا فارسی شاعری کی تنقید ہے۔ چناں چہ ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں "دیوان تو نہ بھیجوں گا لیکن وقتاً فوقتاً معتدل غزلیں نکال کر بھیجتا رہوں گا"۔ ایک اور خط میں یہی مضمون لکھا ہے "'بوئے گل' کہیے تو بھیج دوں' 'دستۂ گل' کی نسبت مہذب ہے"۔ ایک تیسرے خط میں صاف صاف کہہ دیا ہے "چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے تیاری پر بھیج دوں گا۔ افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر معتدل واقع ہے۔ اور میں بھی اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ بہ ہر حال مضامین کچھ ہوں لیکن زبان ایران کی ہوگی"۔

"'موازنۂ انیس و دبیر' اگر دیکھ سکو تو دیکھا کرو ان سے اردو میں بصیرت ہو سکتی ہے۔ آزاد کی 'سخن دانِ فارس' کا حصہ دوم جواب شائع ہوا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ وہاں نہ ہو تو بھیج دوں۔ 'شعر العجم' کا دوسرا حصہ جو زیرِ تحریر ہے تمھارے دیکھنے کے

قابل ہے"۔

ایک فارسی قطعہ لکھ کر بھیجا ہے اس کے شروع میں لکھتے ہیں " زبان کی سلاوگی اور بے تکلفی قابلِ لحاظ ہے"۔

ایک خط میں 'بوئے گل' کے بعض اشعار لکھ کر اس کی تصریح کی ہے وہ اشعار خاص لطف رکھتے ہیں۔ چناں چہ ایک خط میں بڑے مزے سے لکھتے ہیں کہ "مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی کہ تم نے میری تشریحِ اشعار کو اور خود اشعار کو پسند کیا۔ ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہو سکتا ہے"۔

آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا۔ وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔ لیکن بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انھیں میں یہ خطوط بھی ہیں جو بہ منزلہ سدابہار کے ہیں، اس لیے کہ یہ تکلف اور بناوٹ سے بری ہیں۔ یہ دلی جذبات اور خیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں ہیں جن کے ادا کرنے میں اَدَبی تکلفات اور انشا پردازی کے داؤں پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، پڑھنے والوں کے دل لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔ اگر یہ خط نہ چھپے[1] تو اس کا الزام آپ کے سر رہے گا اور اُردو زبان کی عدالت میں آپ سب سے بڑے مجرم سمجھے جائیں گے۔

---

[1] خطوط زیرِ طبع ہیں اور دفتر 'ظل السلطان' بھوپال سے مل سکیں گے۔ محمد امین

# مقدمہ اُردو تنقید کا ارتقا

جب کبھی میں یہ کہتا یا لکھتا ہوں کہ ہمارے تعلیمی نظام میں انگریزی کی بجائے ذریعۂ تعلیم اردو ہونا چاہیے تو اکثر حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی کا مخالف ہوں میں انگریزی کا کیا کسی زبان کا بھی مخالف نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انگریزی حکومت میں بڑا ظلم یہ ہوا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار پائی اور ہماری زبان نصاب سے خارج کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں انگریزی تعلیم سے فائدے کی نسبت نقصان بہت زیادہ پہنچا۔ اگر انگریزی بہ حیثیت زبان کے پڑھائی جاتی اور ہماری زبان ذریعۂ تعلیم ہوتی تو انگریزی سے جو فوائد ہمیں اس وقت پہنچے ہیں وہ اُس صورت میں بھی ہوتے اور ذریعۂ تعلیم ہونے سے جو جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نقصانات پہنچے ہیں اُن سے محفوظ رہتے۔ بلکہ ایک فائدۂ عظیم یہ ہوتا کہ اگر اُردو ذریعۂ تعلیم بنا دی جاتی اور تمام علوم اور یہاں تک کہ انگریزی زبان بھی اسی کے ذریعے پڑھائی جاتی تو مغربی علوم و ادب کے افکار و خیالات خود بہ خود ہماری زبان میں جذب ہوتے چلے جاتے اور علمی و ادبی اعتبار سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا اور وہ دنیا کی ترقی یافتہ علمی زبانوں کا مقابلہ کر سکتی اور ہماری قوم میں جہالت کا یہ عالم نہ ہوتا جو اب ہے۔ باوجود گوناگوں نقصانات کے انگریزی تعلیم سے جو بعض فوائد ہمیں حاصل ہوے ہیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جدید ادبی تنقید کا شمار بھی انھیں میں ہے ؂

حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا 'مقدمۂ شعر و شاعری' ہمارے ادب میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف اور مقالات میں بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں تنقید کا خاصا چرچا شروع ہو گیا۔ اور گزشتہ تیس سال میں متعدد کتابیں اور بیسیوں مضامین شائع ہوئے اور ہر مہینے رسالوں میں نئے نئے تنقیدی مضامین دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ مغربی نقادوں کی نقل کی گئی ہے بلکہ اکثر مضامین بہت غور و فکر کے بعد لکھے گئے ہیں اور پُر مغز ہیں۔ ہمارے ادیبوں میں بعض نے اس فن میں خاص امتیاز حاصل کیا ہے جس کی تفصیلی کیفیت آپ کو اس کتاب سے معلوم ہوگی ؛

افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسیوں مسلک وجود میں آچکے ہیں۔ مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، ماحولی، تاثراتی، نفسیاتی وغیرہ وغیرہ اور اس زمانے میں فرائڈ اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے اکتشافات کا بھی اثر پڑتا رہے گا۔ افتادِ طبع، ماحول، تعلیم و تربیت و صحبت کی بنا پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ہو جاتا ہے اور جب اس میں غلو ہوتا ہے تو وہی مسلک یا مذہب بن جاتا ہے۔ اسی لیے تنقید کا کوئی مسلک جامع نہیں۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیرِ اثر ایک طرف جھک جاتے ہیں اور دوسرے رخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صحیح تنقید اسی وقت ہوگی جب ادب کے ہر رُخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی، ماورائی، روحانی، جذباتی کہتا اور اسے ماضی پرستی یا روایت پرستی

کا ملزم قرار دیتا ہے اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ جو فرائڈ اور مارکس پرستی میں مادیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی تنقید بھی ادبی تنقید نہیں رہتی کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ بے شک ادب کا کام صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں لیکن اس کا کام محض مادیت کا پرچار بھی نہیں۔ یہ دونوں کا خادم ہے۔ کیا تنقید کے لیے لازم ہے کہ نقاد کسی خاص مسلک کا مقلد ہو؟

شے ایک ہی ہوتی ہے، لیکن اس کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک باطن، دوسرا ظاہر۔ ادب کا بھی ظاہر اور باطن ہے۔ ظاہر اسلوب بیان اور الفاظ کا صحیح استعمال وغیرہ ہے۔ باطن خیال یا موضوع جو اصل مقصد ہے۔ خیال کیسا ہی اہم اور وقیع کیوں نہ ہو اس کے اظہار کا ذریعہ لامحالہ الفاظ یا زبان ہے اور یہی ایک ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ادب کے بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ حُسنِ بیان ہی خیال میں دل کشی پیدا کر کے لوگوں کے دلوں میں اسے جاگزیں کرتا اور تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اصل غایت خیال ہے اور حُسنِ بیان ذریعہ لیکن طرزِ بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و رُوح کا سا ہے۔ جسم کو رُوح سے اور رُوح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تنقید میں نقاد اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا سال ہا سال سے چلا آ رہا ہے۔ یہ بحث عبث ہے۔ عینیت ہو یا حقیقت نگاری زندگی سے بچنا محال ہے۔ یہ ہمارے پیچھے ایسی بُری طرح پڑی ہے کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اس سے

چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ پیدائش کے وقت ہی سے دنیا کے حالات انسان پر اثرانداز ہونا شروع ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔ ان سے کیوں کر اور کہاں تک نجات پا سکتا ہے۔ روسی نقاد بلنسکی نے خوب بات کہی ہے

"عوام بغیر غور و فکر کے زندگی بسر کرتے ہیں اور بُری طرح رہتے ہیں لیکن زندگی میں پڑے بغیر غور و فکر کرنا کیا اس سے بہتر ہے؟"[1] حقیقت یہ ہے کہ زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض و غایت ہے جس کی تکمیل تنقید ہی کی بدولت ہو سکتی ہے۔

تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے۔ اُسے ذاتی اظہار کے قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے۔ ایک طرف وہ سنتِ قدیم پر غیر ضروری شیفتگی سے بچاتی اور دوسری طرف جدّت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے۔ یعنی بریک کا کام دیتی ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی اور محرک بن کر ان کی رہ نمائی کرتی ہے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لیے تنقید لازم ہے۔

مشرق کا لفظ کسی زمانے میں بہت معزز خیال کیا جاتا تھا کیوں کہ علم و حکمت کی روشنی مغرب میں یہیں سے پہنچی۔ لیکن اقوامِ مشرق میں انحطاط

---

[1] "Masses live without thinking ——— but to think without living ——— is that any better?"

پیدا ہوا تو اہلِ یورپ کی نظروں میں یہ لفظ معیوب اور مردود ہوگیا) اہلِ یورپ کی تقلید میں مشرق والے بھی حقارت سے دیکھنے لگے ہیں۔ حال کے نئے نقاد تنقید کے وقت بار بار ان الفاظ کا اعادہ کرتے ہیں: "وہ پورے مشرقی ہیں" "مشرقی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں"، "تنقیدی خیالات و نظریات اور اندازِ تنقید مشرقی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ (" مشرقیت نمایاں ہے"، "مشرقیت کا غلبہ ہے"، "مشرقی نظریات کا گہرا غلبہ ہے"، "مشرقی اصطلاحات تنقید (معنی آفرینی، فصاحت، بلاغت، نازک خیالی، تشبیہ و استعارات) سے کام لیتے ہیں"، "مشرقی تنقید سے متاثر ہیں"، "معانئ بیان کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں"۔ ان تمام فقروں میں ہلکی سی تحقیر پنہاں ہے۔) مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی و بیان کے الفاظ سے کام لیں۔ یہ ہمارے ادب میں شروع سے مستعمل ہیں اور ان کا مفہوم معین ہے۔ پڑھنے والے ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم بلا تامّل سمجھ جاتے ہیں۔ کیا تمام مشرقی الفاظ و اصطلاحات استعمال کرنے اور سرتاسر مغربی الفاظ اصطلاحات کے اختیار کرنے ہی سے تنقید قابلِ قبول ہوسکتی ہے؟ ترقّی پسند نقاد بھی بعض اوقات ہمارے شاعروں کی تنقید میں اس قسم کے الفاظ لکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ چناں چہ ترقّی پسندوں کی صفِ اوّل کے ایک نقّاد قریبِ زمانۂ حال کے ایک اُردو شاعر کی نسبت لکھتے ہیں: "بہ یک وقت جوش، تڑپ، گداز، خلوص، قادر الکلامی، بے جان لفظوں میں جان اور بے رُوح محاوروں میں رُوح پیدا کردی۔ گزشتہ تصوّر کا حسین مرقّع اور پُر اثر پیام"، یہ الفاظ اور اصطلاحیں کہاں کی ہیں؟ اور یہ حقیقت سے بعید مبالغہ آمیز بیان کہاں سے آیا؟ اسے ہمارے نقّاد مشرقی اندازِ بیان نہیں کہتے۔ اگر یہ مغربی اندازِ بیان

ہے تو مشرقی اور مغربی انداز میں کیا فرق رہا۔ مشرق اور مشرقیت کے الفاظ اس انداز سے استعمال کرنے میرے خیال میں آدابِ انشا اور آدابِ تنقید کے خلاف ہیں۔

اس زمانے میں جب کہ تنقید کا ذوق پیدا ہو گیا ہے ڈاکٹر عبادت صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ادب کی بروقت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب سے اردو کے نشو و نما کا آغاز ہوا ہے تنقید کا سراغ لگا کر عہد بہ عہد اس کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور جن ادیبوں نے تھوڑا یا بہت تنقید کا کام کیا ہے، ان کے کام کی خصوصیات اور میلانات اور ان کے محاسن اور اسقام کو بہت سوچ سمجھ کر مناسب الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس معاملے میں ان کی رائے نہایت بے لاگ اور منصفانہ ہے۔ بعض نقادوں کی طرح انھوں نے کہیں بھی ذاتی تعلق، تعصب یا جذبات سے مغلوب ہو کر تنقید کی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ جہاں کوئی سقم بھی دکھایا ہے تو اس میں بھی خلوص اور ہمدردی پائی جاتی ہے۔ تلخی نام کو نہیں اور اس انداز سے لکھا ہے کہ جس پر تنقید کی گئی ہے اگر وہ بہ نظرِ انصاف دیکھے تو خود قائل ہو جائے۔ یہیں اس بات کے سیکھنے کی ضرورت ہے اور ڈاکٹر عبادت نے اس کی بڑی اچھی مثال پیش کی ہے۔ قابل مؤلف کی انصاف پسندی قابلِ داد ہے کہ جو ادیب نقاد نہیں اور انھوں نے تنقید پر کوئی مضمون یا کتاب نہیں لکھی، ان کی تحریروں کو بھی بہ غور پڑھا اور جہاں کہیں ایسے جملے اور خیالات نظر آئے کہ جن میں اصولِ تنقید کی جھلک پائی جاتی ہے تو انھیں بھی پیش کر کے لکھنے والے کے کام کی داد دی ہے۔

قابل مؤلف نے اپنے موضوع سے متعلق تمام تحریروں، مقالوں اور کتابوں کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

اور جہاں تک ممکن ہوا کوئی ان کی نظر سے نہیں بچا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ یہ کتاب لکھ کر ڈاکٹر عبادت صاحب نے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں کے حق میں بہت مفید ہوگا۔ اسے پڑھنے کے بعد اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یا اُقلیدس کا خیالی نقطہ یا معشوق کی موہوم کمر"۔

# لِسانیات

# مقدمۂ دریائے لطافت

سید انشاء اللہ خاں کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی خداداد ذہانت، طباعی، شوخی و ظرافت اور جدت کا ایک زمانہ قایل ہے۔ ان کی خاندانی شرافت اور اخلاق و آداب دلّی اور لکھنؤ کے شرفا سب مانتے تھے۔ ان کے بزرگ دلّی میں آکر بس گئے اور وہیں کے ہو گئے اور رفتہ رفتہ شاہی دربار میں رسائی ہوئی اور سلسلۂ امرا میں داخل ہوے۔ سید انشاء اللہ خاں بھی شاہ عالم بادشاہ کے درباریوں میں تھے۔ لیکن شاہ عالم کی بادشاہت نام کی رہ گئی تھی۔ اگرچہ بادشاہ نیک دل تھے اور اپنے خانہ زادوں اور خاندانی متوسلین کی ہر طرح خاطر کرتے تھے لیکن وہ خود مجبور تھے۔ کمپنی بہادر کے پنشن خوار اور نام کے بادشاہ، وہ قدردانیاں اور قدرافزائیاں کہاں کر سکتے تھے جن کی وجہ سے ان کے بزرگوں کے نام اب تک دنیا میں روشن ہیں۔ دلّی اب وہ دلّی نہ رہی تھی۔ ظاہری آداب باقی رہ گئے تھے۔ مگر سلطنت کی جڑ کبھی کی کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی دولت و ثروت اور علم و فضل بھی رخصت ہو رہے تھے۔ وہ اہلِ کمال جن کا دار و مدار بادشاہوں کی قدردانی پر ہی ان کا ٹھکانا اب یہاں نہ رہا تھا۔ دلّی کے زوال پر سلطنت کا ٹھاٹھ لکھنؤ میں جما۔ آصف الدولہ کی سخاوت اور فیاضی نے حاتم کے نام کو بھلادیا

تھا۔ اہلِ کمال جو قدر دانی کے بھوکے تھے ایک ایک کر کے وہاں پہنچے یہاں تک کہ میر تقی جیسے شخص نے بھی جن کی غیرت اور استغنا کی قسم کھانی چاہیے اپنے وطنِ عزیز کو خیرباد کہی۔ غرض سیّد انشاء اللہ کو بھی یہی کشش لکھنؤ لے گئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد دربار تک رسائی ہوئی اور وہاں پہنچتے ہی اپنی لطیفہ گوئی، طبّاعی اور شاعری کی بدولت وہ عروج ہوا کہ نواب سعادت علی کی ناک کے بال ہو گئے۔ نواب سعادت علی خاں اگرچہ بہت بیدار مغز اور منتظم شخص تھے، مگر آخر فرصت کے وقت انھیں بھی دل لگی اور تفنّنِ طبع کے لیے کچھ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے سیّد انشاء اللہ سے بڑھ کر اور کون مِل سکتا تھا۔ انھوں نے نواب کو ایسا رجھایا کہ ان کے بغیر ایک دم چین نہ آتا تھا۔ امرا کی صحبت آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی اور باوجود غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے سیّد صاحب کا بھی یہی حشر ہوا۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب 'آبِ حیات' میں میاں بیتاب کا ایک قول نقل کیا ہے کہ "سیّد انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا" اس قول کے پہلے حصّے سے تو مجھے بالکل اتّفاق نہیں۔ البتّہ دوسرا حصّہ بالکل صحیح ہے۔ شاعری خود ایک بڑا کمال ہے اور ایسا بڑا کمال ہے کہ اگر کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اس کے سامنے دوسرے کسبی و کمال ہیچ ہیں۔ البتّہ افسوس اس بات کا ہے سیّد انشا کی طبعی ظرافت اور شوخی کو درباری مصاحبت اور مذاق نے خراب کیا اور اس نے ان کی شاعری کو بھی بگاڑے بغیر نہ چھوڑا۔ شوخی اور ظرافت بڑی پُر لطف چیز ہے اور کلام کا رتبہ اس سے بعض اوقات بہت بلند ہو جاتا ہے اور دلوں کے شگفتہ کرنے اور بعض خیالات کے ادا کرنے میں یہ ایک سحر کا کام کرتی ہے بہ شرطے کہ ایک حد تک اور مناسبت سے ہو اور کوئی لطافت بھی پائی

جاتی ہو (جیسے مرزا غالب کے کلام میں) لیکن افسوس ہے کہ سیّد انشاء اللہ کے کلام میں بعض اوقات یہ شوخی و ظرافت تمسخر اور پھکڑ کے درجے تک اور پھکڑ سے فحش اور شہدپن تک پہنچ گئی ہے جو کانوں کو ناگوار اور ذوقِ سلیم پر بہت گراں گزرتا ہے ؎

## سیّد انشا کا کلام

ان کا کلیات جو طبع ہو گیا ہے اس میں کلامِ ذیل شامل ہے :- (۱) اردو کا دیوان (۲) دیوان ریختی (۳) قصائد (جس میں ایک قصیدہ منقبت بے نقط و اشعار ترکی وغیرہ بھی شریک ہیں) (۴) دیوان فارسی (۵) مثنوی شیر و برنج فارسی (۶) مثنوی بے نقط (لوح سُرخی بھی بے نقط و موزوں (۷) مثنوی شکار نامہ (۸) مثنوی در ہجو زنبور، کھٹمل، پشہ، مگس (۹) مثنوی شکایتِ زمانہ (۱۰) مثنوی فیل (۱۱) مثنوی در ہجو گیان چند ساہوکار (۱۲) اشعارِ متفرقہ و رباعیات و قطعہ تاریخ ہائے متفرقہ (۱۳) چیستانیں اور پہیلیاں، مخمس وغیرہ (۱۴) دیوان اُردو بے نقط مع رباعیات و نثر بے نقط (۱۵) شرح مائۃ عامل نظم فارسی (۱۶) مثنوی مرغ نامہ ؎

اس کے علاوہ ایک داستان اُردو نثر کی لکھی ہے جس میں یہ اہتمام کیا ہے کہ کوئی لفظ عربی فارسی کا نہ آنے پائے اور باوجود اس کے کلام اُردو کے پایہ سے گرنے نہ پائے۔ یہ درحقیقت بڑے کمال کی بات ہے۔ آج اگر کوئی چاہے ایسا ایک صفحہ بھی اس رعایت کے ساتھ لکھ لے تو ممکن نہیں ؎

لیکن سیّد انشا کی سب سے بڑی یادگار اور قابلِ قدر تصنیف "دریائے لطافت" ہے۔ اس میں اُردو صرف و نحو تو سیّد انشاء اللہ کی تصنیف ہے اور دوسرا حصہ یعنی منطق، عروض و قافیہ و معانی و بیان مرزا محمد حسن قتیل کا تالیف کیا

ہوا ہے۔ کتاب کی جان پہلا ہی حصّہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہلِ یورپ نے متعدد کتابیں اُردو قواعد پر لکھی تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہلِ زبان نے اُردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اُردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرّہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی کتاب اس پایے کی نہیں لکھی گئی جو لوگ اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں ناگزیر ہے۔

سیّد انشاء اللہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے۔ علاوہ اس کے الفاظ و محاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور ان کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفّظ، مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا، ان سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کیے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنھیں زبان کا ذوق ہے۔ صرف و نحو کے قواعد بھی بڑے سلاست اور جامعیّت سے بیان کیے گئے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اس بارے میں جن جن باتوں کا انھوں نے خیال کیا ہے متاخرین کو بھی وہ نہیں سوجھیں۔ حال آں کہ ایسا عمدہ نمونہ موجود نہ تھا۔ اس سے سیّد انشاء اللہ خاں کے دماغ اور ذوقِ زبان کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی فصاحت و غیر فصاحت و صحت و غیر صحت کے متعلق کتنی سچّی رائے دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ”ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔“ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح

ہے اور اگر خلافِ اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اُس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے کیوں کہ جو کچھ خلافِ اردو ہے غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافقِ اردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔" اس اصول کو قائم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح بتاتے ہیں۔ مثلاً سید انشا کی رائے میں برقا صحیح اُردو کا لفظ ہے گو وہ خلافِ اصل ہے یا وہ غدر کو بہ فتح "د" اُردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بہ سکونِ دال ہے۔ یہ سُن کر بعض اصحاب جنھیں صحتِ لغت کا اسی قدر خیال رہتا ہے جیسے ایک مومن متقی کو ادائے ارکانِ صلوٰۃ کا اور خصوصاً ثقاتِ لکھنؤ بہت جز بز ہوں گے لیکن جو لوگ اصولِ لسان سے واقف ہیں وہ سید انشا کی وسعتِ نظر اور اصابتِ رائے کی داد دیں گے۔ فرق یہ ہے کہ سید انشا اُردو کو ایک جدا زبان خیال کرتے ہیں اور غیر زبان کے جن الفاظ نے منجھ منجھا کر یا گھس پس کر یا اختلافِ لہجہ یا دُوسرے اسباب سے ایک خاص صورت اختیار کرلی ہے وہ اب اُردو کے لفظ ہو گئے ہیں۔ انھیں اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں رہا اور جو کچھ صورت ان کی پیدا ہو گئی ہے اور جس طرح وہ زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں وہی ان کی صحیح صورت ہے۔ اصل زبان سے خواہ وہ کیسی ہی متباین اور مختلف کیوں نہ ہوں۔ مگر جو حضرات ابھی تک اُن عربی فارسی الفاظ کو جو اُردو میں مستعمل ہیں اصلی صورت ہیں لکھنا اور بولنا صحیح اور فصیح سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف غلط اور غیر فصیح تو گویا وہ ابھی اُردو زبان کو زبان ہی نہیں سمجھتے۔ اسی اصول کو اگر مدِ نظر رکھا جائے اور ہر اُردو لفظ اس کی اصلی صورت میں (یعنی جس زبان سے وہ آیا ہے) لکھنا اور بولنا شروع کریں تو اُردو زبان کوئی زبان ہی نہ رہے گی اور موجودہ تحریر و تقریر کے سارے الفاظ باستثنائے چند

کے غلط ٹھیریں گے کیوں کہ اس میں جس قدر الفاظ ہیں وہ یا تو دیسی بولی (قدیم پراکرت) سنسکرت اور ہندی زبانوں کے ہیں یا عربی فارسی ترکی یا بعض یورپی السنہ کے۔ اُردُو زبان مستقل زبان اُسی وقت ہوگی جب وہ ان زبانوں کے لفظ لے کر انھیں اپنا کرلے اور جہاں وہ اپنے ہوئے ان کی شکل وصورت وضع وقطع رنگ ڈھنگ میں ضرور فرق آجائے گا۔ مگر ہم میں سے بعض نازک دماغ دقیق نظر حضرات کو ان غیر ملکیوں کی یہ بے تکلفی ہرگز نہیں بھاتی وہ انھیں اپنا بنانا نہیں چاہتے بلکہ انھیں دھکیل دھکیل کر اپنے حدود سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر سیّد انشا کے اصول پر عمل ہوتا رہتا تو اب تک اُردُو میں بہت کچھ وسعت، لطف اور شیرینی پیدا ہو جاتی۔

اس کتاب کے پہلے ہی باب میں سب سے اوّل انھوں نے اردُو کے حروفِ ابجد سے بحث کی ہے اور ان کی تعداد کے تعین میں بڑی بڑی جدّت طرازیاں کی ہیں۔ سیّد انشا کے بعد سے اُردُو صرف ونحو اور لغت پر بیسیوں ہی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جس جس پہلو سے انھوں نے ان حروفِ تہجّی کو دیکھا ہے اور ان کے اقسام قایم کیے ہیں بہت کم لوگوں کی نظر وہاں تک پہنچی ہے حال آں کہ دیکھنے میں یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ معمولی تقسیم حروف کے جو ہر معمولی کتاب میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً عربی کے اتنے فارسی کے اتنے اور ہندی کے اتنے، سیّد صاحب ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں۔ اس تقسیم کے بعد انھوں نے اُن حروف کو لیا ہے جو کسی خاص حرف سے مِل کر ایک آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً سترہ حروف ایسے ہیں جو ہ کے ساتھ مِل کر ایک آواز دیتے ہیں جیسے بھاگنا، پہننا وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ہاں اب کہیں اُردُو قاعدوں میں یہ حروف بڑھائے گئے ہیں حال آں کہ سیّد انشا مدّتوں پہلے لکھ چکے ہیں۔

یا سترہ حروف ایسے ہیں جو نون کے ساتھ مِل کر ایک آواز پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً پنڈول، رنگیلا، ہنسنا وغیرہ۔ اُردو قاعدوں میں اب تک ان حروف کا ذکر نہیں۔

اسی طرح بعض حروف ایسے ہیں جو ی کے ساتھ مِل کر ایک ہو جاتے ہیں مثلاً کیا (حرفِ استفہام) دھیان، پیارا وغیرہ۔ غرض اسی طرح سید انشا نے اُردو حروفِ تہجی کی کُل تعداد پچاسی بتائی ہی۔

دُوسرے باب میں دہلی کے محلوں کی تمیز کے متعلق بڑی دل چسپ بحث کی ہی اور یہ تفصیل بتایا ہی کہ کس کس محلے کی زبان فصیح ہی اور کہاں کہاں کی غیر فصیح۔ مغلوں (اہلِ مغل پورہ) ساداتِ بارہ، پنجابیوں، پُربیوں کی زبان کیسی ہی اور ان کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ اور لہجہ اور زبان میں کیا فرق پیدا ہوا ہی اور یہ سب امور تفصیل اور مثالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور ایسے لطف کے ساتھ کہ جی خوش ہو جائے۔ اسی میں سید انشا اور حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں کا مشہور مکالمہ ہی۔ ہیں تو گنتی کے دو تین ہی جملے مگر آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہی۔

تیسرے باب میں بعض فصحا وغیرہ کا ذکر ہی اور بعض ایسے الفاظ کا بیان کیا گیا ہی جو اُردو نہیں یا متروک ہیں اور میر تقی یا مرزا سودا نے ان کا استعمال کیا ہی۔ اسی باب میں نواب عماد الملک، بھاڑا مل، مرزا صدرالدین صفاہانی اور مُلّا عبدالفرقان کی دل چسپ تقریریں ہیں۔ خاص کر بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں نہایت پُر لطف ہیں۔ بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں ایسی پاک صاف شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سید انشا کی زبان دانی اور فصاحتِ کلام کا اندازہ ہو سکتا ہی کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے اور زبان

کے سمجھنے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں۔ بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اُردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا۔ اور اس میں شعرائے عصر کے کلام و حال پر جو تنقید کی ہے وہ بہت ہی ظریفانہ ہے یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا ۔

اسی باب کے آخر میں دہلی و لکھنؤ کی فصاحت و فوقیت کا پُر لطف موازنہ ہے اور دونوں طرف کے دلائل کو بیان کیا ہے۔ اس میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ چوں کہ سید انشا نواب سعادت علی خاں کے ملازم اور مصاحب تھے اس لیے کس کس طرح پہلو بچا بچا کر اس بحث کو نبھایا ہے ۔

بابِ چہارم میں مصطلحاتِ دہلی اور باب پنجم میں گفتگو و مصطلحاتِ زنانِ دہلی کا ذکر ہے۔ یہ دونوں باب محققینِ زبان و مؤلفین لغت کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ہیں ۔

اس کے بعد اُردو صرف و نحو ہے۔ نہ صرف اُردو صرف و نحو کی یہ پہلی کتاب ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی اسے تقدم اور فضیلت ہے کہ یہ اوّل کتاب ہے جس میں اُردو کی صرف و نحو بہ لحاظ زبان بیان کی گئی ہے اور عربی فارسی کی اندھوں کی طرح تقلید نہیں کی گئی۔ اگر مابعد کے مؤلفین اس اصول کو پیشِ نظر رکھتے تو اس وقت تک اُردو صرف و نحو مکمّل ہو جاتی ۔

اس میں مطلق شبہ نہیں کہ سید انشاء اللہ خاں کا اُردو زبان پر بہت بڑا احسان ہے اور خصوصاً یہ کتاب انھوں نے ایسی لکھی ہے کہ جب تک اُردو زبان زندہ ہے اس کے مطالعے اور اس سے استفادہ اور سند لینے کی ضرورت باقی رہے گی۔

اس کتاب کا دُوسرا حصّہ منطق و عروض و قوافی اور معانی و بیان میں ہے۔ یہ حصّہ مرزا قتیل کا ہے اور زیادہ قابلِ لحاظ نہیں۔ بہ لحاظ فن کے بھی زیادہ

مستند خیال نہیں کیا جاتا۔ البتہ منطق و عروض میں ایک جدت انھوں نے ضرور کی ہے یعنی اصطلاحاتِ فن کا ترجمہ اُردو میں ہے مثلاً

| | | | |
|---|---|---|---|
| تصوّر | دھیان | بدیہی | پرگمٹ |
| تصدیق | جوں کا توں | نظری | گپت |
| موضوع | بول | تسلسل | اُلجھا سوت |
| محمول | بھرپور | دَور | ہیر پھیر |
| رابطہ | جوڑ | مطابقت | ٹھیک ٹھیک |
| نسبت | ملاپ | التزامی | اُوپری لگاؤ |
| قضیہ | بات | تثلیث | تکڑا |
| | مربّع | چوکڑا وغیرہ | |

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اصطلاحاتِ علمی اس طور پر تراشی جائیں یا ترجمہ کی جائیں تو اس سے علوم کے ترجمہ کرنے یا عام طور پر علوم کے مقبول کرنے میں کہاں تک آسانی ہوتی۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ہمیں اصطلاحات کے وضع کرتے وقت جہاں تک ممکن ہو (بہ شرطے کہ رکاکت پیدا نہ ہو) ہندی سے ضرور مدد لینی چاہیے مثلاً اگر تصفیۃ الاجنحہ کی بجائے ادھ پرایا ادھ پنکھ یا عدیمۃ الاجنحہ کی بجائے بے پرایا بے پنکھ یا عدیمۃ الذنب کی جگہ بے دُما وغیرہ کہا جائے تو کیا ہرج ہے بلکہ سراسر فائدہ ہے۔ بعض الفاظ جو بہ وجہ سخت اور کرخت ہونے کے ہماری زبان پر نہیں چڑھتے ان کا ترک کرنا اولیٰ اور ان کی بجائے ہندی یا فارسی اصطلاحات کا استعمال کرنا مناسب ہے:

مرزا قتیل نے بھی اس حصّے میں سید انشاء اللہ کی پیروی کی ہے اور مزاح و تمسخر میں کوئی کمی نہیں کی مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوا ہنس کی چال چل رہا ہے۔ مرزا صاحب کا

مزاح اکثر بے نمک ہے۔ انھوں نے عروض میں بجائے مروّجہ الفاظ اوزان کے نئے الفاظ تراشے ہیں۔ مثلاً بجائے مفعول مفاعلین مفعول مفاعلین کے بی جان پری خانم بی جان پری خانم اور بجائے فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کے چٹ لگن پری خانم چٹ لگن پری خانم وغیرہ فرماتے ہیں "میں نے منطق اور عروض قوافی کا بیان کتاب سے ترک کر دیا ہے۔ کہ وہ کچھ مفید نہ تھا۔ البتہ بیان و معانی کا بیان بہ طور نمونے کے رہنے دیا ہے وہ کسی قدر ٹھیک ہے۔

اس کتاب کے طبع کرنے میں بڑی دقّت تھی اوّل تو یہ کہ جا بہ جا فحش کلمات بے تکلف استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کے خارج کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی کیوں کہ بعض اوقات مطلب خبط ہو جاتا تھا۔ دوسرے سیّد انشا کی طبیعت میں اُپچ تو تھی ہی انھوں نے حروف کے نام بھی نئے ایجاد کیے ہیں۔ غالباً اس میں انھوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت رکھی ہے۔ مثلاً الف کو اقبال ب کو بخشش پ کو پاکی طینت ت کو ترحم خ کو خدا ترسی ڑ کو ژرف نگاہی ک کو کم دماغی ہ کو ہمّتِ بلند کہا ہے اور اسی طرح دوسرے تمام حروف کو الگ الگ نام دیے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کو بڑی اُلجھن ہوتی ہے مثلاً کھن ایک چھوٹا سا لفظ ہے اس کا تلفّظ وہ اس طرح بتاتے ہیں "کم دماغی مفتوح یا ہمّتِ بلند کی گشتہ و نفاست ساکن ہیئی گاہے" اور چوں کہ کتاب میں مختلف تقریریں اور مختلف بولیاں درج ہیں۔ وہ ایک ایک لفظ کا تلفّظ اس طریقے سے بتاتے ہیں تو پڑھنے والے کو سخت پریشانی ہوتی ہے اس لیے میں نے اس طریقے کو بھی ترک کر دیا ہے اور مروّجہ اور معمولی طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ ناظرین کو سہولت ہو۔

اس کتاب کی تصنیف میں چوں کہ سیّد انشا اور مرزا قتیل دونوں شریک تھے

اس لیے نام بھی دونوں نے دو دو تجویز کیے ہیں۔ سیّد انشا نے اپنے آقائے ولی نعمت نواب ناظم الملک سعادت علی خان بہادر کے نام کی رعایت سے 'ارشادِ ناظمی' اور 'بحرِ سعادت' تجویز کیے اور مرزا قتیل نے 'دریائے لطافت' اور 'حقیقتِ اُردو'۔ مگر ان میں 'دریائے لطافت' ہی مقبول ہوا اور وہی آج تک مشہور رہا۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۲۲ھ مطابق سنہ ۱۸۰۲ء میں تصنیف ہوئی۔ اس کے چھیالیس برس بعد مولوی مسیح الدّین خاں بہادر کاکوروی نے اپنے مطبع آفتاب عالم تاب مرشدآباد میں بہ تصحیح و اہتمام مولوی احمد علی گوپاموی طبع کرایا۔ مولوی مسیح الدّین خاں مرحوم میر منشی گورنر جنرل و سفیر شاہ اودھ تھے اور بعد ازاں واجد علی شاہ مرحوم کی والدہ کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد انھوں نے مرشدآباد میں ایک فارسی ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور اس میں اچھی اچھی کتابیں طبع کرائیں۔ مولوی صاحب کی خوش مذاقی کی بدولت یہ کتاب دستبردِ زمانہ سے بچ گئی۔ مگر اب یہ نسخہ بھی کم یاب ہے۔ اسی نسخے سے انجمن نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اہلِ ملک کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

---

# مقدمہ قواعدِ اردو

اُردو زبان دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اور ابھی ابھی اس نے اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا سیکھا ہے۔ زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے۔ اردو اس زمانے کی یادگار ہے۔ جب مسلمان فاتح ہندستان میں داخل ہوئے اور اہلِ ہند سے ان کا میل جول روز بہ روز بڑھتا گیا۔ اُس وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہو چلا، جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی، جس کا ان میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانے تک ان کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں بھی اسی کا سکّہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسے شوق سے سیکھا۔ اس زمانے میں فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ فضیلت کا ملنا عربی زبان کی تحصیل کے بغیر ناممکن تھا کیوں کہ مسلمانوں کے علوم و فنون کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ ادھر مُلک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی اسے بھی مسلمانوں نے سیکھا، عوام وہی زبان بولتے تھے۔ چناں چہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر

ہوے۔ مسلمان شاہی درباریوں اور علما اور شعرا نے بھی یہ زبان سیکھی اور اس میں تالیف و تصنیف بھی (جو زیادہ تر نظم تھی) کی۔ غرض ہندو مسلمانوں کے اس میل جول اور خلا ملا سے ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہی ظاہر ہی یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اس لیے اوّل اوّل ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے اور اس کے لکھنے کو عار سمجھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمتے گئے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دَور میں شعرا نے اس بچّے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور پال پوس بڑا کیا، بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندُستان پر مسلّط ہوئی، جو ہندو مسلمانوں سے بالکل غیر تھی۔ اُس قوم نے اس کی اُنگلی پکڑی۔ اُس نے اُنگلی پکڑتے ان کا پہنچا پکڑا اور دربار سرکار میں اس کی رسائی ہوگئی اور رفتہ رفتہ دفاتر سے فارسی کو نکال باہر کیا اور خود اس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی۔ آخر ہندُستان کی قدیم راج دھانی اس کا جنم بھوم اور دوابہ اس کا وطن ہوا۔ اب دُور دُور پھیل چکی ہی اور ہندُستان کے اس سرے سے اُس سرے تک چلے جائیے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہی، بلکہ ہندُستان کے باہر تک جا پہنچی ہی۔ اب سب سے بڑھی چڑھی بات یہ ہی کہ یہ تین مختلف جلیل القدر قوموں کی یعنی ہندو، مسلمانوں اور انگریزوں کی چہیتی ہی اور ان تینوں کی متفقہ کوششوں کی عظیم الشّان یادگار ہی۔ تینوں نے اسے سیکھا، پڑھا، لکھا۔ تینوں نے اس کی ترقّی میں مقدور بھر کوشش کی، اور اب تینوں کی بدولت اس رتبے کو پہنچی کہ دنیا کی جدید زبانوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہوئی ؛؛

اُردو ہندی نژاد ہی اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہی۔ برج بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہی۔ اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں وہ زمانۂ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدّا پن اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقّت تھی بالکل جاتی رہی اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف سیدھے سادے ہو گئے' جس سے زبان میں لوچ، گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی۔ اُردو کے ہندی نژاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں، کیوں کہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء و صفات میں ہوا ہی ورنہ زبان کی بنیاد ہندی پر ہی، تمام حروفِ فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔ افعال سب ہندی ہیں۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہی۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہی اور عربی فارسی الفاظ میں شان و شوکت اور زبان کے لیے ان دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہی۔ عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات میں بھی وسعت پیدا کر دی ہی جس سے اس کا حُسن دوبالا ہو گیا اور وہ زیادہ وسیع اور کار آمد بن گئی مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم ہی ہندی ہی ہی، محض غیر زبانوں کے اسماء و صفات کے اضافے سے اس کے ہندی ہونے میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً آج کل بہت سے انگریزی لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے زبان کی اصلیت و ماہیت پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔

ایک دوسری بات اُردو زبان میں یہ ہی کہ وہ اس اصول پر قائم ہی جو تمام جدید زبانوں میں اس وقت پایا جاتا ہی۔ یعنی صورتِ ترکیبی سے حالتِ تفصیلی کی طرف اس کا رجحان ہی۔ قدیم زبانوں میں یہ بڑی دقت

تھی کہ ایک ہی لفظ کو ذرا ذرا سے فرق اور پھیر سے مختلف صورتوں میں لے آتے تھے - اب دُوسرے الفاظ کی مدد سے مرکّب صورتیں پیدا ہوگئی ہیں - اور وہ دقّتیں جاتی رہی ہیں - اُردُو کو بھی اس قید سے آزادی مل گئی ہی۔ غرض یہ زبان مختلف حیثیتوں سے ایسی قبول صورت ہوگئی ہی کہ اس کی ترقی میں شبہہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی صفائی، فصاحت اور صلاحیت اور ہندی، فارسی عربی اور انگریزی کے مختلف اثرات اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ دنیا کی ہونہار زبانوں میں سے ہی اور ایشیا میں ایک روز اس کا ستارہ چمکے گا۔

مجھے خوب یاد ہی کہ کئی سال کا عرصہ ہوا کہ میرے ایک دوست نے ایک جلسے میں تذکرۃً میری کتاب 'صرف و نحو اردُو' کے متعلق کہا کہ انجمن اردُو (حیدرآباد دکن) اسے چھپوادے تو بہت اچھا ہو۔ اس پر ہمارے ایک عالم دوست نے فرمایا کہ صرف و نحو کی کتابیں بچّوں کے لیے ہوتی ہیں۔ انجمن کی طرف سے ایسی کتابوں کا طبع ہونا ٹھیک نہیں۔ مجھے اس میں کلام ہی کہ صرف و نحو کی کتابیں بچّوں کے لیے مخصوص ہیں بلکہ میری رائے میں انھیں اپنی زبان کی صرف و نحو پڑھانا مضر ہی۔ البتہ یہ مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ ایک زندہ اور جدید زبان کے لیے گریمر (صرف و نحو) کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن سوال یہ ہی کہ آخر گریمر کی ضرورت پڑی کیوں؟ جب ہم دنیا کی مختلف زبانوں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے ادب کی تاریخ بہ غور پڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہی کہ ابتداءً گریمر کی ضرورت اُس وقت واقع ہوئی جب کہ ایک زبان والوں نے دُوسری زبان کے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اوّل اوّل اہلِ زبان کو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مثل دُوسرے علوم و فنون کی ضرورت نے اسے بھی ایجاد کیا۔ اور زبان کے سب سے پہلے عالم نحوی وہ لوگ تھے جنھوں نے

سب سے اوّل علمی طور پر زبانوں کی تعلیم دی۔ صرف و نحو کے قواعد کی تدوین انھیں معلّمینِ السنہ کا کام تھا؎

زبانوں کا سیکھنا سکھانا جدید زمانے کی ایجاد ہی جو آج کل خاصا پیشہ ہوگیا ہی۔ قدیم زمانے میں لوگ غیر زبانوں کے سیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے مثلاً کسی قدیم یونانی یا عرب کو کسی غیر زبان کے سیکھنے کا کبھی خیال نہیں آتا تھا۔ اور وہ کیوں سیکھتا؟ اس لیے کہ یونانی سوائے یونانیوں کے اور عرب سوائے عربوں کے سب کو وحشی خیال کرتا تھا۔ غیروں کی زبان سیکھنا، ان کے آداب اطوار کا اختیار کرنا اس کے لیے عار اور موجبِ ذلّت تھا۔ یہی وجہ ہی کہ یونانی غیر اقوام کو ایک لوسائی یعنی بے زبان اور عرب دوسروں کو عجم یعنی گونگے اور پول اپنے پڑوسی اہلِ جرمن کو نیمیا یعنی گونگے بہرے اور اپنے سوا دوسروں کو ملیکھ (ملیچھ) کہتے تھے۔ ملیکھ یعنی ملیچھ کے اصل معنی ایسے شخص کے ہیں جسے صاف طور سے بولنا نہیں آتا؎

جب یونانیوں کو دوسری اقوام سے سابقہ پڑا اور ان سے بات چیت کی ضرورت ہوئی تو بڑی دقت پیش آئی۔ اگر ہر شخص اپنی ہی زبان بولنے پر اصرار کرے تو دوسرے کی کیوں کر سمجھے۔ ان کے لیے غالباً غیر زبانوں کے سیکھنے کی پہلی محرک تجارت ہوئی اور دوسری محرک اسکندر کی فتوحات ــ اس چیز نے یونانیوں پر ثابت کر دیا کہ دوسری قومیں بھی زبان رکھتی ہیں۔ لیکن طرّہ یہ ہی کہ بہ نسبت یونانیوں کے دوسری اقوام میں جنھیں یونانی وحشی کہتے تھے زبانیں سیکھنے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ اسکندر کی فتوحات نے باہمی میل جول کا رشتہ کھول دیا تھا اور اسکندریہ مختلف اقوام، مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف مذاہب کے لوگوں کا سنگھم ہو گیا۔ گو ابتدائی تعلق تجارتی تھا۔

لیکن فرصت کے اوقات میں دوسرے معاملات اور مباحث بھی خود بخود زیر بحث آگئے۔ علاوہ اس کے خود یونانی بھی اسکندریہ میں موجود تھے جو قدیم حالات کی تحقیق میں مصروف تھے اور اسی طرح مصریوں، ایرانیوں اور یہودیوں کے علم، آداب، معتقدات بحث میں آئے۔ اگرچہ اسکندریہ میں دوسری اقوام کے علم و ادب کے متعلق ایک دل چسپی پیدا ہوگئی تھی لیکن زبان کی تحقیق و تنقید دوسری زبانوں کے مطالعے سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ خود یونانی زبان کی مختلف شاخوں پر غور کرنے سے اس کا آغاز ہوا۔ اور سب سے بڑی وجہ اس کی ہومر کی کتاب ہوئی۔ سب سے اوّل ان علمانے زبان کی تنظیم کی طرف توجہ کی جو قدیم اساتذہ اور خاص کر ہومر کی تصانیف کو صحت اور تنقید کے ساتھ شایع کرنے کا کام کر رہے تھے۔ مختلف نسخے اسکندریہ اور پرگامس میں یونان کے مختلف حصّوں سے وصول ہوئے جن میں آپس میں بہت کچھ اختلاف تھا اور اس لیے ان علما کو مجبوراً یونانی گریمر کی صحیح صورت قائم کرنے پر متوجہ ہونا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اوّل یونانی زبان کو تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا اور اس کی تنظیم کی اور مختلف اجزاے کلام کا امتیاز قائم کیا اور الفاظ کے مختلف عمل کے لیے اصطلاحی الفاظ گھڑے۔ تاہم حقیقی اور ابتدائی گریمر ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی پہلا حقیقی نحوی ڈاگونی سی آس تھریکس تھا۔

یہ شخص جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تھریس کا باشندہ تھا لیکن وہ اسکندریہ میں رہتا تھا۔ بعد ازاں وہ رومہ گیا جہاں اس نے یونانی زبان کی تعلیم دینی شروع کی اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور اپنے رومن شاگردوں کے لیے زبان کی پہلی گریمر لکھی۔ اگرچہ گریمر کا ڈھانچہ پہلے سے موجود تھا لیکن اس نے پہلے کے فلسفیوں اور نقادوں کے نتائج سے فائدہ اٹھاکر یہ کتاب مرتب

کی، یونانیوں کے لیے نہیں کیوں کہ انھیں ضرورت نہ تھی، وہ اپنی زبان سے خود واقف تھے بلکہ اہلِ روما کی تعلیم کے لیے اس شخص کے بعد اور لوگ پہنچے اور معلمی یا مترجمی کا پیشہ کرنے لگے۔ یہ پیشہ وہاں اچھا خاصا اور معزز سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ رومن نوجوانوں کو یونانی پڑھنے لکھنے اور بولنے کا ایسا ہی شوق اور خبط تھا۔ جیسا آج کل ہندی نوجوانوں کو انگریزی بولنے کا ہی۔ یہاں تک کہ بچّوں کو اوّل یونانی پڑھائی جاتی تھی اور بعد میں لاطینی۔ اور یونانی آدابِ تہذیب کا اختیار کرنا اور یونانی جاننا علامتِ شرافت سمجھی جاتی تھی۔ بہ عینہٖ جیسے ہمارے ہاں آج کل انگریزی پہناوا، انگریزی بات چیت، انگریزی طرزِ معاشرت باعثِ فخر خیال کی جاتی ہی۔ گو رومہ نے یونان کو فتح کیا تھا لیکن علمی لحاظ سے وہ خود اس کا مفتوح ہوگیا۔ غرض یونانی زبان کے سیکھنے اور یونانی کتابوں کے ترجمے کا عام رواج ہوگیا۔ اور اسی وجہ سے یونانی گریمروں کی ضرورت ہوئی اور جب لاطینی گریمر لکھی گئی تو یونانی اصطلاحات لاطینی لباس میں ترجمہ ہوکر داخل ہوگئیں۔ اور اس جدید لباس میں یہ گریمر دو ہزار سال سے یورپ پر چھائی ہوئی ہی بلکہ آج اس کا اثر ہندستانی مدارس اور ہندستانی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہی:

اسی طرح جب ہم عربی زبان کی صرف و نحو کی ابتدا پر نظر ڈالتے ہیں تو بہ عینہٖ یہی صورت وہاں بھی پیش آئی۔ جس طرح ہومر کی کتاب کی درستی اور صحت کے لیے اوّل اوّل نرے ابتدائی اصول پر نظر گئی اسی طرح قرآن پاک کے الفاظ کی صحت قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے نحو زبان کی طرف توجّہ کرنی پڑی۔ سب سے پہلا شخص ابوالاسود دولی تھا جسے ایک قاری کو قرآن کی آیت غلط پڑھتے ہوئے سن کر یہ خیال ہوا کہ اگر خدانہ خواستہ یہ حالت رہی تو اندیشہ ہی کہ

قرآن پاک کے معانی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔ ابتداءً رسم خط عربی ایسی تھی کہ اس میں نقطے اور اعراب نہ تھے اس لیے اعراب اور نقطے ایجاد کرنے پڑے صرف و نحو کا خیال بھی اسی قسم کے واقعات سے پیدا ہوا۔ خصوصاً جب اہلِ عجم مذہبِ اسلام میں داخل ہوئے اور عربی زبان کا اثر وسیع ہونے لگا تو عجمی زبان کے بولنے میں طرح طرح کی غلطیاں کرنے لگے۔ زبان کے خراب اور مسخ ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اسپر سے ابوالاسود کی تحریک پر حضرت علیؓ نے نحو کا پہلا قاعدہ بتایا کہ "سارا کلام اس سے خالی نہیں کہ یا تو اسم ہوگا یا فعل یا حرف" چناں چہ اسپر سے ابوالاسود نے اوّل اوّل فنِ لسان کے قواعد کی تدوین کی۔ جب عربوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور عربی زبان کی روشنی بھی ساتھ ساتھ پھیلنی شروع ہوئی تو قواعدِ زبان کی ضرورت روز بہ روز بڑھنے لگی۔ کوفہ و بصرہ میں نحویوں کے دو الگ مذہب قائم ہو گئے جن کے مباحث پر اس وقت نظر ڈالنا ہمارے مقصد سے خارج ہے۔ غرض ہوتے ہوتے نوبت یہ پہنچی کہ نحو یا تو زبان سیکھنے کا آلہ تھی یا خود ایک مستقل فن ہو گئی اور ایک نحوی کی ایسی ہی عزت ہونے لگی جیسے کسی عالم فاضل کی۔ عربی صرف و نحو کی تدوین میں عجمیوں نے بہت بڑا حصّہ لیا (کیوں کہ ضرورت زیادہ انھیں کو تھی) اور بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں اور اس میں وہ بحثیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ یہ فن خاصا فلسفہ ہو گیا۔ اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مبالغے کے ساتھ بڑے بڑے اہتمام ہونے لگے، جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ عربی زبان اور صرف و نحو کا اثر فارسی ترکی اُردو زبانوں پر بہت کچھ ہوا ہے۔ اور اب تک صرف و نحو کی عربی اصطلاحات ان زبانوں کی قواعد میں برابر جاری ہیں۔ بلکہ فارسی اُردو کی صرف و نحو اسی کی نقل ہے اور نقل کیا کی ہے منھ چڑایا ہے۔ غرض کہنے کی یہ ہے

کہ عربی صرف و نحو کو زیادہ رونق اور عروج عجمی علما کی بدولت ہوا ہے۔

موجودہ زبان فارسی کو دیکھا جائے تو اس کی صرف و نحو بہت صاف اور سیدھی اور مختصر ہے۔ اور اس میں مطلق وہ پیچیدگیاں نہیں جو قدیم زبانوں یا اُردو زبان میں ہیں۔ لیکن یار لوگوں نے عربی کی تتبّع میں اس کی بھی خوب مٹی خراب کی۔ زبان کچھ کہتی ہے اور گرامر کچھ اور بہ عینہٖ یہ مثل صادق آتی ہے ؎

من چہ سرایم و طنبورۂ من چہ سراید

لیکن تاہم بُری بھلی جو کتابیں فارسی صرف و نحو تنقید زبان صنائع بدائع اور لغت پر لکھی گئی ہیں وہ سب زیادہ تر تو اہلِ ہند یا بعض اور بیرونی لوگوں کی تصنیف سے ہیں۔ اہلِ زبان نے کبھی اس پر قلم اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ انھیں اپنی زبان کی صرف و نحو لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ کبھی انھیں اس کا خیال آیا۔ وہ ان کی مادری زبان تھی۔ پیدا ہوتے ہی وہی آوازیں ان کے کانوں میں پڑی تھیں اور ہوش سنبھالتے ہی وہی زبان جو سنتے تھے بولتے تھے۔ صرف و نحو تو وہ پڑھے جس کی مادری زبان نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ فارسی کی صرف و نحو غیروں نے لکھی۔

اس کے بعد جب ہم اُردو زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی حالت سب سے عجیب و غریب ہے۔ اس کی صرف و نحو کی طرف ابتدا میں نہ صرف کسی اہلِ ہند بلکہ ایشیا بھر میں کسی شخص کا خیال نہ گیا اور خیال کیا تو غیروں نے اور غیر بھی کیسے بات چیت اور زبان ہی میں غیر نہیں بلکہ صورت شکل، عادات و اطوار، طریق ماند و بود، طرزِ خیال، غرض گفتار و رفتار و کردار میں بھی غیر ہیں اور ایسے غیر کہ باوجودے کہ دو سو ڈیڑھ سو برس ایک سرزمین میں ایک ساتھ رہتے گزر گئے مگر اب تک غیریت نہیں گئی۔ میرا مطلب ان اہلِ فرنگ سے ہے جو آگ لینے

آئے تھے اور گھر کے مالک بن بیٹھے۔ اہلِ یورپ کے آنے سے اس ملک کو اگر کچھ فوائد پہنچے ہیں تو ان میں سے بلاشبہ ایک یہ بھی ہی کہ انھوں نے ایک ایسی زبان کی سرپرستی اور تقویت میں ہاتھ بٹایا جو ملک کی مختلف اقوام کی متحدہ اور مشترکہ زبان تھی۔ اگرچہ اس میں ان کی ذاتی غرض پنہاں تھی۔ کیوں کہ بغیر ایک ایسی زبان سیکھے ان کو اپنی اغراض میں کام یابی نہیں ہو سکتی۔ مگر ذاتی اغراض کے ساتھ ملکی اغراض بھی خود بہ خود انجام پا گئے۔ ان لوگوں کے اس زبان پر توجّہ کرنے اور سیکھنے سے بھی صاف عیاں ہی کہ یہ زبان ملک کی عام زبان تھی۔ ان حضرات کو ملک کی کسی زبان سے نہ الفت تھی نہ نفرت، وہ ایسی زبان سیکھنی چاہتے تھے جو ہر جگہ کار آمد ہو اور ان کے کاروبار اور معاملات میں سہولت پیدا کرے اور وہ سوائے اُردو کے کوئی دوسری زبان نہ تھی۔ لہٰذا اس کی تحصیل میں انھوں نے کوشش کی اور بے شک یہ اُن کے اغراض کے لیے مفید بھی ثابت ہوئی۔

جہاں تک تحقیق کی گئی ہی اُس سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ پہلا یوروپین جس نے ہندُستانی زبان کے قواعد لکھے وہ جان جوشوا کٹلر تھا جو پرشیا کے شہر ایل بنجن میں پیدا ہُوا۔ مذہب میں یہ لوتھر کا پیرو تھا، یہ شخص شاہ عالم بادشاہ (سنہ ۱۷۰۸-۱۷۱۲ء) اور جہاں دار شاہ بادشاہ (سنہ ۱۷۱۲ء) کے دربار میں بہ طور ڈچ سفیر کے حاضر ہُوا۔ سنہ ۱۷۱۱ء میں وہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظمِ تجارت بہ مقام سورت مقرّر ہوا۔ وہ لاہور سے آتے اور جاتے وقت بہ راہِ دہلی آگرہ سے گزرا۔ لیکن یہ بالیقین نہیں کہا جاسکتا کہ وہ وہاں ٹھیرا بھی یا نہیں۔ اگرچہ وہاں اہلِ ڈچ کا ایک کارخانہ سورت کے تحت میں موجود تھا۔ اس کا مشن لاہور کے قریب ۱۰- دسمبر سنہ ۱۷۱۱ء

کو پہنچا اور جہاں دار شاہ کے ہم راہ دہلی واپس ہوا اور آخر کار اس مقام سے ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۷۱۲ء کو روانہ ہو کر ۲۰ اکتوبر کو آگرہ پہنچا اور پھر آگرہ سے سورت واپس چلا گیا۔ سنہ ۱۷۱۶ء تک وہ تین سال سورت میں ڈچ کمپنی کا ناظم (ڈائرکٹر) رہا۔ اس کے بعد وہ ایران کا سفیر مقرر ہوا اور بٹاویا سے جولائی سنہ ۱۷۱۶ء میں روانہ ہوا۔ اس وقت اسے ایسٹ انڈیا میں ڈچ کی ملازمت کرتے ہوئے تیس سال ہو گئے تھے اور اصفہان سے واپس ہوتے وقت خلیج فارس کے مقام گمبرون میں بہ علالت بخار انتقال کیا۔

اس نے ہندستانی زبان کے قواعد اور لغت پر کتاب لکھی جو ڈیوڈ مل نے سنہ ۱۷۴۳ء میں چھاپ کر شایع کی۔ قیاس یہ ہوتا ہی کہ یہ کتاب اس نے سنہ ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ تالیف کی ہوگی۔ یہ کتاب لیٹن زبان میں ہی لیکن ہندستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں۔ البتہ حروف کے پیٹوں میں ہندستانی الفاظ بہ عینہٖ لکھے ہیں اور ان الفاظ کا املا ڈچ زبان کے طریقے پر ہی۔ ایک بات اس قواعد میں قابلِ لحاظ یہ ہی کہ حرف فاعلی "نے" کا کہیں ذکر نہیں ہی اور علاوہ "ہم" کے وہ "آپ" کو بھی (جو گجراتی زبان میں استعمال ہوتا ہی) جمع متکلم کی ضمیر بتاتا ہی۔

کیٹلر کی گریمر کے طبع ہونے کے دوسرے سال مشہور مشنری شلز کی کتاب ہندستانی زبان (اردو) قواعد پر شایع ہوئی (سنہ طبع ۱۷۴۴ء) یہ صاحب کیٹلر کی گریمر سے واقف تھے۔ اور اپنی کتاب کے دیباچے میں اس کا ذکر بھی کیا ہی۔ شلز کی گریمر بھی لیٹن میں ہی مگر ہندستانی الفاظ فارسی عربی خط میں ہیں اور ان کا تلفظ بھی ساتھ ساتھ لاطینی میں دیا ہی۔ ناگری حروف کی بھی تصریح کی ہی مگر بعض حروف بالکل ترک کر دیے ہیں۔ وہ ضمائر شخصی کے

واحد و جمع سے واقف ہی لیکن افعالِ متعدی کے زمانۂ ماضی کے ساتھ "نے" کے استعمال سے واقف نہیں اور یہ اسی پر موقوف نہیں بلکہ اکثر قدیم کتبِ قواعد میں "نے" نظر انداز کر دیا گیا ہی جس کی وجہ یہ ہی کہ پرانی اردو میں "نے" کا استعمال بالالتزام نہیں ہوتا تھا۔

ہیڈلے کی گریمر سنہ ۱۷۷۲ء میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد متعدد کتابیں ہندستانی زبان کے قواعد کے متعلق لکھی گئیں جن میں سے زیادہ مشہور پرتگیزی گرمیٹیکا اندوستان ہی جو لزبن میں سنہ ۱۷۷۸ء میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد کا وہ زمانہ ہی جب کہ جان گل کرسٹ نے ہندستانی زبان کی خدمت شروع کی۔ لیکن جان گل کرسٹ کی خدمات کا ذکر کرنے سے قبل ہم ایک شخص لے بی ڈف کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اپنے حالات خود اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ مختصر یہ ہی کہ یہ شخص مدراس میں سنہ ۱۷۸۵ء میں آیا اور غالباً بینڈ ماسٹری کی خدمت پر مامور ہوا۔ وہاں دو سال قیام کرنے کے بعد کلکتہ چلا آیا، وہاں اس کی ملاقات ایک پنڈت سے ہوئی، جس سے اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندستانی (جسے وہ ہندستان کی مخلوط زبان کہتا ہی) پڑھنی شروع کی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس نے دو ناٹکوں کا ترجمہ بنگالی میں کیا اور اس کے اپنے بیان کے بہ موجب ان میں سے ایک ناٹک عام طور پر پبلک میں پسند کیا گیا اور اس کی بہت تعریف ہوئی۔ آیڈلنگ لکھتا ہی کہ اس کے بعد وہ مغل بادشاہ کے ہاں تھیٹر کا منتظم ہو گیا اور آخر مشرق میں بیس سال کے قیام کے بعد انگلستان واپس چلا گیا۔ لندن میں اس نے اپنی گریمر شایع کی اور روسی سفیر ڈرن زو سے ملاقات پیدا کی اُس نے اسے روس میں بھیج دیا جہاں وہ فارن آفس میں ملازم ہو گیا اور

سرکار کی طرف سے سنسکرت کا مطبع قائم کرنے کے لیے اسے بہت کچھ رقم دی گئی۔ لیکن اس کی ہندستانی گریمر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بہ نسبت ہندستانی زبان کے اس کا علم بنگالی اور سنسکرت میں زیادہ ہو۔ کیوں کہ اس نے ہندستانی گریمر میں نہ صرف الفاظ کا تلفظ غلط لکھا ہے بلکہ قواعد کے بیان کرنے میں بھی بہت سی صریح غلطیاں کی ہیں۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا نام اُردو کے محسنوں میں نہایت ممتاز ہے اور اُردو زبان کا مورّخ ان کا ذِکر بغیر شکر گزاری کے نہیں کر سکتا۔ انھوں نے نہ صرف زبان اور قواعدِ زبان اور لغت پر اعلا درجے کی کتابیں لکھیں، بلکہ چند خاص اہلِ زبان حضرات کو جمع کر کے ان سے ایسی کتابیں لکھوائیں جن میں سے بعض ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو کی خدمت کا کام ۱۷۸۷ء میں شروع کیا اور فورٹ ولیم کالج اردو زبان کی تالیف و تصنیف کا مرکز انیسویں صدی کے ابتدائی دس سال تک رہا۔ اگرچہ اصل مقصد اس کا یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں جو انگریز ملازم ہو کر آتے تھے ان کو اُردو سکھانے کے لیے مناسب کتابیں لکھوائی جائیں تاکہ وہ آسانی سے مُلک کی اس زبان کو جو ہر جگہ بولی یا سمجھی جاتی ہو سیکھ سکیں۔ لیکن اس پردے میں بعض بے مثل کتابیں لکھی گئیں اور آیندہ اس ڈھنگ کی تالیف کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ خود گل کرسٹ صاحب نے متعدد کتابیں اُردو زبان میں اور اس کی لغت اور قواعد پر لکھی ہیں۔ ان کی کتاب 'قواعدِ اردو' سنہ ۱۸۰۹ء میں چھپ کر شایع ہوئی۔ اگرچہ ان کی دو ایک کتابیں جو اس سے چند سال قبل طبع ہوئی تھیں اُن میں بھی اُردو زبان کے قواعد کا کچھ کچھ حصہ شریک تھا۔

مسٹر جان شیکسپیر کی اُردو گریمر لندن میں اوّل اوّل سنہ ۱۸۱۳ء میں

شایع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۸۱۸ء میں، تیسرا سنہ ۱۸۰۶ء میں، چوتھا ایڈیشن جس میں دکھنی زبان کی مختصر سی گریمر بھی اضافہ کی ہے سنہ ۱۸۴۳ء میں اور اس کے بعد ایک ایڈیشن سنہ ۱۸۵۸ء میں شایع ہوا ؛

سنہ ۱۸۲۰ء میں 'اردو رسالہ گل کرسٹ' کے نام سے ایک کتاب کلکتہ میں شایع ہوئی۔ اور اس کے کئی ایڈیشن سنہ ۱۸۳۱ء و سنہ ۱۸۴۶ء میں کلکتہ میں اور سنہ ۱۸۴۵ء میں آگرہ میں چھپے یہ رسالہ دراصل گل کرسٹ کی گریمر کا ملخص ہے ؛

ولیم ٹیٹ نے ایک کتاب 'مقدمۂ زبانِ ہندستانی' کے نام سے تالیف کی جو تین حصوں پر منقسم تھی، یعنی گریمر، لغت اور اسباقِ زبان دانی۔ اوّل بار کلکتہ میں سنہ ۱۸۲۷ء میں طبع ہوئی، دوسری بار سنہ ۱۸۲۴ء میں اور تیسری بار سنہ ۱۸۳۳ء میں چھپی ؛

گل کرسٹ صاحب کے بعد اردو کا دوسرا یورپین محسن فرانسیسی عالم موسیو گارساں دتاسی تھا۔ اُس نے اصولِ زبانِ ہندستان پر ایک کتاب لکھی جو پیرس میں سنہ ۱۸۲۹ء میں طبع ہوئی اور صَرفِ اردو و قواعدِ اردو پر ایک بڑا مضمون 'جنرل ایشیاٹک سوسائٹی' بابت سنہ ۱۸۳۸ء میں لکھا۔ (اس کے علاوہ موصوف نے 'تاریخ شعرائے اردو' لکھی جو ایک بے مثل کتاب ہے)

مسٹر ایس ڈبلیو بری ٹن نے ہندستانی زبان کے قواعد پر ایک کتاب تالیف کی جو لندن میں سنہ ۱۸۳۰ء میں طبع ہوئی ؛

اس کے ایک سال بعد یعنی سنہ ۱۸۳۱ء میں مسٹر سٹیم فورڈ آرنات کی کتاب بہ نام 'جدید خود آموز قواعدِ زبانِ ہندستانی'، جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے" یہ کتاب فارسی اور رومن حروف میں ہے اور اس کے ساتھ بطور ضمیمہ کے لغت اور مشقی اسباقِ زبان دانی بھی اضافہ کیے گئے ہیں لندن میں اول بار سنہ ۱۸۳۱ء میں

اور دوسری بار سنہ ۱۸۴۴ء میں طبع ہوئی ÷

سنہ ۱۸۴۲ء میں ایک کتاب انگریزی اور ہندُستانی افعالِ بے قاعدہ پر اور مقدمۂ قواعدِ ہندُستانی برائے افادۂ طلبہ مدراس میں طبع ہوئی ۔ مؤلف کا نام تحریر نہیں ہو÷

ہندُستانی زبان کے قواعد مشرقی اور رومن حروف میں مع آسان انتخابات بہ غرضِ تحصیلِ زبان دانی فارسی عربی اور دیوناگری حروف میں مؤلفہ ایلس ارنات بہ اضافۂ لغت وحواشی از مسٹر ڈنکن فاربس مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۴۴ء ÷

اسی سال مسٹر جیمس آر بالن ٹائن کی گریمر لندن میں طبع ہوئی اور غالباً یہی کتاب بعد ترمیم واضافہ سنہ ۱۸۶۸ء میں شایع ہوئی ÷

سنہ ۱۸۴۷ء میں ہندُستانی زبان کی ایک گریمر لندن میں طبع ہوئی اس کے مؤلف ریورنڈ جی اسمال تھے ۔ اس میں کچھ انتخابات اردؤ ادب کے بھی شریک ہیں ۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۸۵۸ء میں شایع ہوا ÷

جرمنی کے ایک عالم جی دت لوپیا خونے بھی ہندُستانی زبان کے قواعد پر ایک کتاب لکھی تھی جو برلن میں سنہ ۱۸۵۲ء میں طبع ہوئی ÷

سر جونر ولیمس نے سنسکرت اور ہندی زبان کی جو خدمت کی ہو وہ محتاجِ تعریف نہیں ۔ ایک زمانہ اس سے واقف ہو ۔ صاحب موصوف نے ہندُستانی زبان کی ایک ابتدائی کتاب لکھی اور اس میں علاوہ روزمرہ کے استعمال کے الفاظ ومحاورات وقصص مبتدیوں کے لیے صرف و نحو کے قواعد بھی درج کیے ۔ ماسوائے اس کے ہندُستانی گریمر مؤلفہ کاٹن ماتھر مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۶۲ء کو مرتب کیا جو سنہ ۱۸۷۶ء میں شایع ہوئی ÷

سنہ ۱۸۷۲ء میں مسٹر جان ڈوسن نے اُردؤ زبان کی ایک گریمر تالیف کی ÷

مسٹر جان پلیٹ کی 'قواعدِ اردؤ' لندن میں سنہ ۱۸۷۴ء میں طبع ہوئی ۔ یہ کتاب درحقیقت اچھی لکھی گئی ہو ÷

کسی یورپین صاحب نے دکنی گریمر پر ایک رسالہ لکھا تھا لیکن اس پر مؤلف کا نام

نہیں۔ یہ رسالہ سنہ ۱۸۷۸ء میں ستارہ میں طبع ہوا ؛

پامر صاحب کی ہندستانی فارسی و عربی گرامر سنہ ۱۸۸۲ء میں بہ مقام لندن طبع ہوئی ؛

سنہ ۱۸۸۲ء و سنہ ۱۸۸۳ء میں مسٹر ڈبلیو گیگر نے زبانِ ہندستان کی گرامر لکھی۔ ان صاحب کا تعلق سرد هنہ سے معلوم ہوتا ہے ؛

سنہ ۱۸۸۳ء میں پروفیسر فان کیو نے ہندستانی زبان کے قواعد مرتب کیے۔ یہ کتاب نیپولی میں طبع ہوئی ؛

اسی سال مسٹر جے ون سن نے بھی اُردو گرامر تالیف کی ؛

جرمن عالم اے سی ڈل نے ایک کتاب اُردو زبان کے قواعد پر تالیف کی جس کا نام اس نے 'ہندستانی گرامر قیاسی و علمی' رکھا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۹۳ء میں بہ مقام لپ زک طبع ہوئی۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں شلز کی گرامر پھر لپ زک میں طبع ہوئی ؛

یہ فہرست مَیں نے صرف اردو صرف و نحو کی ایسی کتابوں کی دی ہے جو اہلِ یورپ نے تالیف کی ہیں۔ لغت و ادب وغیرہ پر جو کتابیں ان لوگوں نے لکھی ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ یہاں ان کا ذکر خارج از بحث ہے۔ اس سے میرے اس بیان کی تصدیق ہوگی کہ اردو زبان کی صرف و نحو پر پہلے پہل غیروں نے توجّہ کی ؛

اہلِ ہند میں سب سے اوّل اس مضمون پر اردو کے مشہور شاعر میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی نے قلم اٹھایا۔ ان کی کتاب 'دریائے لطافت' سنہ ۱۲۲۲ھ (سنہ ۱۸۰۲ء) میں بہ عہدِ نواب سعادت علی خاں بہادر لکھی گئی۔ اس میں علاوہ قواعدِ صرف و نحو کے عورتوں کے محاورات، مختلف قوموں کی بولیاں اور گفتگوئیں اور طرح طرح کی نظم و نثر بھی شریک ہے۔ بعض محاورات و الفاظ کی تحقیق بھی خوب کی ہے۔ باوجودے کہ اس کتاب کو تالیف ہوئے مدّت گزر چکی ہے لیکن اس وقت بھی وہ بے مثل اور قابلِ قدر کتاب[1] ہے

---

[1] انجمن ترقی اردو اس کتاب کو عنقریب طبع کرنے والی ہے ؛

ہے اور اردو زبان کے ادب میں ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ یہ کتاب اوّل اوّل مرشد آباد میں سنہ ۱۸۴۸ء میں طبع ہوئی ؛

غالباً ناظرینِ کتاب کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے بھی اردو صرف و نحو پر ایک رسالہ تالیف کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی حالی لائبریری میں موجود ہے۔ کاتب نے کتاب کے آخر میں سنہ ۱۲۵۶ھ مطابق سنہ ۱۸۴۰ء تحریر کیا ہے۔ اگرچہ یہ سنہ کتابت ہے لیکن سنہ تالیف بھی اسی کے لگ بھگ ہوگا۔ اس میں صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ زیادہ تر بحثِ مصادر ہے۔ اگرچہ یہ کتاب کچھ ایسی قابلِ لحاظ نہیں۔ لیکن اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مرحوم کو اردو زبان سے کس قدر دلچسپی تھی ؛

اس کے بعد مولوی احمد علی دہلوی نے ایک ابتدائی رسالہ صرف و نحو اردو پر لکھا جو دہلی میں سنہ ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا اس کتاب کا نام 'فیض کا چشمہ' ہے غالباً یہ تاریخی نام ہے اور اس سے سنہ تالیف ۱۲۵۹ھ نکلتا ہے ؛

مولوی امام بخش صاحب صہبائی دہلوی فارسی کے مشہور منشی اور ادیب گزرے ہیں اور دہلی کالج میں پروفیسر بھی تھے، انھوں نے بھی اردو صرف و نحو پر ایک کتاب تالیف کی تھی جو دہلی میں سنہ ۱۸۴۹ء میں طبع ہوئی۔ یہ کتاب بھی اچھی ہے۔ اس کے آخر میں بہ ترتیبِ حروفِ ابجد اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں ؛

ان کے علاوہ بھی اُسی زمانے میں دو ایک کتابیں اور لکھی گئیں۔ مثلاً ایک صاحب مرزا محمد صالح نے ایک گریمر ہندُستانی، فارسی اور عربی زبان کی لکھی اور اس میں فارسی گفتگو کا بھی ایک حصّہ اضافہ کیا۔ اور ایک یورپین صاحب نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جو اصل کے ساتھ تھا یہ کتاب بہ مقام لندن سنہ ۱۸۲۳ء میں طبع ہوئی۔ یا ایک

دوسری کتاب بمبئی کے محمد ابراہیم صاحب مقبہ نے 'تحفۂ الفنسٹن' کے نام سے تالیف کی جو بمبئی میں سنہ ۱۸۲۳ عیسوی میں طبع ہو کر شایع ہوئی۔ یہ کتاب الفنسٹن صاحب گورنر بمبئی کے نام سے موسوم کی گئی تھی لیکن یہ کتابیں کچھ زیادہ قابلِ لحاظ و قابلِ ذکر نہیں ہیں :۔

زمانۂ حال میں متعدد کتابیں اس مبحث پر طلبۂ مدارس وغیرہ کے لیے پنجاب و ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں تالیف ہوئی ہیں، جن میں کم و بیش عربی صَرف و نحو کا تتبع کیا گیا ہے۔ البتّہ مولوی محمّد اسمٰعیل صاحب نے جو دو مختصر رسالے طلبۂ مدارس کے لیے لکھے ہیں ان میں انھوں نے تقلید سے الگ ہو کر جدّت سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ رسالے بہت مختصر ہیں اور صرف ابتدائی مدارس کے طالب علموں کے لیے کار آمد ہو سکتے ہیں :۔

مَیں اس سے قبل اس امر کا اعتراف کر چکا ہوں کہ ایک زندہ زبان کے لیے قواعد کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور مَیں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ عموماً اور اکثر کسی زبان کی صَرف و نحو اُس وقت لکھی گئی جب کہ کسی غیر قوم کو اس زبان کی تحقیق یا اس کے سیکھنے کی ضرورت واقع ہوئی۔ اور صرف و نحو کی تحریر ابتداءً یا اس کے متعلق جدّ و جہد ہمیشہ غیر قوم والوں کی طرف سے ہوئی۔ کیوں کہ اہلِ زبان اس سے مستغنی ہوتے ہیں۔ یہی حال اُردُو زبان کا ہوا۔ اس کے صَرف و نحو اور لغت کی طرف اوّل اوّل اہلِ یورپ، نے بہ ضرورت توجّہ کی۔ اس کے بعد جب اہلِ ملک نے یہ دیکھا کہ ان لوگوں کو اُردو پڑھنے کا شوق ہے تو ان کی دیکھا دیکھی یا ان کے فائدے کی غرض سے خود بھی کتابیں لکھنی شروع کیں۔ بعد ازاں جب یہ زبان مدارس میں بھی پڑھائی جانے لگی تو صرف طلبہ کے لیے کتابیں لکھی جانے لگیں۔ چناں چہ آج کل جس قدر کتابیں لکھی گئیں ان کی اصل غرض یہی تھی۔ لیکن ماسوائے اس کے اب ایک ضرورت داعی ہوئی ہے وہ یہ کہ زبانِ اُردو

اب ملک کی عام اور مقبول زبان ہوگئی ہے اور ملک میں اکثر جگہ بولی جاتی ہے اور ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ حال آں کہ ملک کی دوسری زبانیں خاص خاص خطوں میں محدود اور مخصوص ہیں۔ نیز اس زبان کو کچھ ایسے مقامات کے لوگ بھی پڑھتے اور سیکھتے ہیں جن کی یہ مادری زبان نہیں۔ اس لیے یہ ضرورت واقع ہوئی کہ اس زبان کے قواعد منضبط کیے جائیں اور مستند کتابیں لغت پر لکھی جائیں تاکہ زبان بگڑنے سے محفوظ رہے۔ مَیں نے اس کتاب کے لکھنے میں اس خیال کو مدِ نظر رکھا ہے اور صرف طلبۂ مدارس کی ضروریات کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ بلکہ زیادہ تر یہ کتاب اُن حضرات کے لیے ہے جو زبان کو نظرِ تحقیق سے دیکھنا چاہتے ہیں ؎

ہمارے ہاں اب تک جو کتابیں قواعد کی رائج ہیں ان میں عربی صرف و نحو کا تتبع کیا گیا ہے۔ اُردو خالص ہندی زبان ہے اور اس کا شمول آریائی السنہ میں ہے۔ بہ خلاف اس کے عربی زبان کا تعلق سامی السنہ سے ہے۔ لہٰذا اردو زبان کی صرف نحو لکھنے میں عربی زبان کا تتبع کسی طرح جائز نہیں۔ دونوں زبانوں کی خصوصیات بالکل الگ ہیں جو غور کرنے سے صاف معلوم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگرچہ اردو ہندی نژاد ہے اور اس کی بنیاد قدیم ہندی پر ہے۔ افعال جو زبان کا بہت بڑا جز ہے، نیز ضمائر اور اکثر حروف سب کے سب ہندی ہیں۔ صرف اسما و صفات عربی فارسی کے داخل ہو گئے ہیں۔ اور چند گنتی کے مصادر جو عربی فارسی الفاظ سے بن گئے ہیں مثلاً بخشنا، بدلنا، قبولنا، تجویزنا وغیرہ کسی شمار میں نہیں بلکہ بعض ثقات بہ زعمِ خود انھیں فصیح بھی نہیں خیال کرتے! تاہم اُردو زبان کی صرف و نحو میں سنسکرت کے قواعد کا تتبع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں یہاں لکھی جاتی ہیں :-

۱۔ ہر اسم کے سنسکرت میں تین حصے کیے گئے ہیں۔ مادہ، حرف بعد مادہ اور حرفِ آخر، موجودہ ہندی یا اردو میں حرفِ آخر اُڑ گیا ہے ؎

۲ - سنسکرت میں اسم کی مختلف حالتیں (فاعلی، مفعولی، اضافی وغیرہ) صرف حرفِ آخر کے تغیر سے بنتی ہیں جو اکثر قدیم زبانوں میں پایا جاتا ہے اور ہندی اردو میں الگ حروف بڑھانے سے بنتی ہیں اور تمام جدید زبانوں کا میلان اسی طرف ہے:

۳ - سنسکرت اور پراکرت میں جنس تین ہیں یعنی نر، مادہ اور بے جان - موجودہ ہندی یا اردو میں صرف دو ہیں:

۴ - سنسکرت کا فعل بہت دقیق اور پیچیدہ ہے اور ایک زمانے سے اس میں اصلاح ہوتے ہوتے موجودہ ہندی میں آکر صاف اور سادہ ہوا ہے - تثنیہ کا صیغہ سنسکرت میں ہے ہندی میں نہیں:

سنسکرت میں ہر فعل کی چھ صورتیں، تیرہ قسمیں اور نو جنسی حالتیں ہیں - یعنی صیغے سات سو دو ہوتے ہیں اور یہ سب ایک ہی لفظ کے ہیر پھیر سے بنتے ہیں - موجودہ زبان میں یہ بڑی آسانی ہے کہ اکثر افعال امدادی افعال کی اعانت سے بنائے جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ مصادر فارسی وعربی اسمائے صفات کے آگے ہندی مصادر مثلاً دینا کرنا وغیرہ بڑھا کر بنائے جاتے ہیں:

ایسی صورت میں اُردو زبان کی صرف ونحو میں عربی یا سنسکرت کا تتبع کرنا اُلٹی گنگا بہانا ہے - البتہ اصطلاحات عربی سے لی گئی ہیں کیوں کہ اس سے گریز نہیں۔ اُردو زبان میں تقریباً کُل علمی اصطلاحات عربی ہی سے لینی پڑتی ہیں جیسے انگریزی زبان میں لاطینی اور یونانی سے:

"میں اس موقع پر اُردو ہندی کے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا کیوں کہ یہ بحث میرے خیال میں بالکل بے سود ہے - اوّل تو اس لیے کہ صرف ونحو میں اس بحث کا کوئی موقع نہیں خصوصاً اس خیال سے کہ اس امر میں تقریباً دونوں ایک ہیں اور

ماسوائے بعض جزوی اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں۔ دوسرے جو شخص اس مُلک کی مختلف زبانوں کی تاریخ کو نظرِ غور سے دیکھے گا اُسے معلوم ہو جائے گا کہ فریقین نے محض سخن پروری اور ہٹ دھرمی سے کام لیا ہی۔ دراصل جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ قدرتی اثرات اور رجحانات کا روکنا اپنے ہاتھوں سے اپنی ترقّی کو روکنا ہی ؂

بات یہ ہی کہ جب آریا لوگ اس مُلک میں داخل ہوے تو انھوں نے یہاں ایک دوسری قوم کو آباد دیکھا جن کی زبان ان کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ ملک کی اصل قوم ان قوی آریاؤں کے حملوں کی تاب نہ لاسکی اس لیے کچھ تو ان میں سے شمالی پہاڑوں میں پناہ گزین ہوے اور بہت سے جنوبی اور وسطی ہند کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جا بسے۔ لیکن پھر بھی بہت سے ایسے تھے جنھیں اپنے وطنِ عزیز کی جدائی گوارا نہ تھی، اگرچہ وطن دوسروں کے ہاتھوں میں تھا اور اس لیے نئے حملہ آوروں کی غلامی میں بسر کرنے لگے۔ اگرچہ ایسی ضرورت میں ظاہر ہی کہ مغلوب و پائمال کی زبان کیا باقی رہ سکتی ہی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی زبان نے آریاؤں کی زبان یعنی سنسکرت پر اثر ضرور کیا اور یہ کہنا غلطی نہ ہوگا کہ قدیم ہندی بولیاں جو پراکرت (یعنی عوام کی بولی) کے نام سے مشہور ہیں اس اثر کا نتیجہ تھیں جو صدیوں تک سنسکرت کے دوش بہ دوش ملک میں قائم رہیں۔ اور انھیں پراکرت بولیوں سے ہندُستان کی موجودہ آریائی زبانیں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق سنسکرت سے ایسا ہی ہی جیسے یورپ کی موجودہ رومائی السنہ کو لاطینی سے۔ ان زبانوں کی تعداد عموماً سات شمار کی جاتی ہی۔ یعنی پنجابی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، ہندی، اڑیا اور بنگالی ؂

ان سب میں ہندی بہ لحاظ قدامت و اہمیت کے سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہی لیکن ابتدا ہی سے اس پر غیروں کی نظریں پڑنی شروع ہوئیں۔ مسلمان جو شمال کی

طرف سے اس ملک میں آنے شروع ہوئے اس کو اپنی زبان سے متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور جو اثر بارھویں صدی سے پڑنا شروع ہوا تھا وہ آخر ایک نئی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور یہی اردو (لشکری زبان) کی اصل ہی۔ یہ دراصل کسی پراکرت یا ہندی کی بگڑی ہوئی صورت نہیں بلکہ ہندی کی آخری اور شایستہ صورت ہی۔ اور اس وقت ہندستان کی عام ملکی زبان مانی جاتی ہی۔ یہ نہ کسی خاص شخص یا فریق کی ایجاد ہی اور نہ کسی خاص پالیسی (مصلحت) اور منشا سے بنائی گئی ہی بلکہ جس طرح اس ملک کی معاشرت وسیاست میں وقتاً فوقتاً مختلف قدرتی اسباب سے تغیّرات پیدا ہوئے اور آج انھیں اثرات کی وجہ سے ایک جدید حالت نظر آتی ہی۔ اسی طرح زبان میں بھی قدرتی اثرات درجحانات اور مختلف واقعات سے تغیّرات ظہور میں آئے۔ اور اس وقت جو ہم خاص پالیسی کی وجہ سے پُرانی شی کو نئی سمجھ کے چونکتے ہوتے ہیں وہ صرف ایک دھوکا ہی۔ اب اتنی مدت کے بعد ان باتوں پر جھگڑا کرنا گویا صدیوں کے واقعات کو جھٹلانا اور قدرتی اثرات اور رجحانات کو اُلٹ دینا ہی۔ دنیا میں کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی، اور جب ہم ہی ایک حالت پر نہ رہے تو ہماری زبان کیوں رہنے لگی۔ اور کچھ نہیں تو اگر صرف اس زبان کے الفاظ ہی کو سرسری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی کتنی قوموں نے (بغیر کسی خاص ارادہ کے محض قدرتی اثرات کی وجہ سے) اس کے بنانے میں حصّہ لیا ہی تو کیا ایک ایسی یادگار کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ایک نہایت دردناک فعل ہوگا؟ خصوصاً ایسے عہد میں جب کہ زمانۂ قدیم کے ایک ایک پتھر اور اینٹ کو سینت سینت کے رکھا جاتا ہی۔

اس نہایت مختصر ذکر سے میرا مقصد یہ تھا کہ اُردو کی صرف ونحو کو سنسکرت زبان کے قواعد سے اسی قدر مغائرت ہی جتنی عربی زبان کی صرف ونحو سے۔ میرا خیال یہ ہی کہ کسی زبان کے قواعد لکھتے وقت اس کی خصوصیات کو کبھی نظرانداز نہ کیا جائے اور محض کسی زبان کی تقلید میں اس پر زبردستی قواعد اور اصول کے نام سے ایسا بوجھ نہ ڈال دیا

جائے جس کی وہ متحمل نہ ہو سکے۔ میں نے حتی الامکان اسی اصول کو مدِ نظر رکھا ہے اور اس امر کی کوشش کی ہے کہ جدھر زبان کا رجحان ہو اُدھر ہی اس کا ساتھ دیا جائے۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ بہرحال مجھے کوئی دعویٰ نہیں اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ کتاب اسقام سے خالی نہیں۔ اور اس لیے میں ہر ایک مشورے اور اختلاف کو نہایت شکر و احسان کے ساتھ سُننے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنے کے لیے تیار ہوں ؀

---

# مقدمۂ فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ

جو ملک ترقی یافتہ ہیں یا جہاں علم کا شوق ہو، لوگ اپنے اپنے پیشوں اور فنوں میں نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، علمی تحقیقاتیں کرتے ہیں، اپنے شوق اور محنت سے یا ضرورت سے ایسی ایسی جدّتیں کرتے ہیں جن سے ایک دنیا میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں علمی تحقیقاتوں کے ضمن میں خود بہ خود نئے نئے لفظ اور اصطلاحیں بنتی اور رواج پاتی ہیں اور کتابوں سے زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں۔ ہمیں جب ہوش آیا تو بعض پرجوش اور ہمدرد اہلِ علم نے اپنے ملک میں اشاعتِ علم اور اپنی زبان کو ترقّی دینے کا بیڑا اٹھایا اور ترجمانی یا تالیف کے ذریعے سے اس خدمت کو انجام دینا شروع کیا۔ لیکن قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا۔ ہر فن اور ہر علم میں اس کثرت سے نئے نئے لفظ اور نئی اصطلاحیں نظر آئیں کہ ہماری بے بضاعت زبان ان کی متحمل نہ ہو سکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر باہمّت اصحاب کا جنھوں نے اپنے شوق سے کام شروع کیا تھا، جی چھوٹ گیا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے زبان ہوتی ہے اور اس کے بعد لغت، اوّل علوم کی تدوین ہوتی ہے اور اس کے بعد اصطلاحات کی ترتیب۔ لیکن ہمیں اپنی بدنصیبی سے اس کا برعکس اور غیر فطری طریقہ اختیار کرنا پڑا یعنی پہلے اصطلاحات کی لغت ترتیب دینی پڑی تاکہ مترجمین اور مؤلفین کو سہولت ہو

اوران کے کام میں یکسانی پائی جائے ۔لیکن اس کے لیے وافر سرمایے اور ایک مستعار اور ذی علم جماعت کی ضرورت تھی جو خاطر جمعی سے اس کام کو انجام دے اس لیے اس کام میں خاطر خواہ کام یابی نہ ہوئی اور جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوا بھی تو وہ ناقص اور نامکمل ۔ آخر انجمنِ ترقئ اردو نے اس کے بین بین تجویز کی یعنی مختلف علوم پر کتابیں لکھوائی جائیں اور ساتھ ہی ساتھ اصطلاحات مدوّن کی جائیں۔ یہ طریقہ بہت معقول تھا مگر کافی سامان نہ ہونے کی وجہ سے کام کی رفتار بہت سست رہی ۔ خوش نصیبی سے اسی زمانے میں حیدرآباد دکن میں یونی ورسٹی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور دکن کے بیدار مغز فرماں روا نے قیامِ یونی ورسٹی کی منظوری عطا فرمائی ۔ چوں کہ اس یونی ورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان قرار پایا تھا لہٰذا یونی ورسٹی سے پہلے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا تاکہ وہ نصابِ تعلیم کے لیے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ شروع کر دے ۔ حسنِ اتّفاق سے دارالترجمہ کی نظامت بھی انجمنِ ترقئ اردو کے سکرٹری کے تفویض کی گئی اور اس دیرینہ تمنّا کے پورے ہونے کا سامان غیب سے ہوگیا ۔ چناں چہ اصطلاحات کا یہ مجموعہ اس وقت پیش کیا جا رہا ہے ۔ انجمنِ ترقئ اردو اور سررشتۂ تالیف وترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہے۔

یہاں اس امر کا بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاحات کے وضع کرتے وقت کون سے اصول ہمارے پیشِ نظر تھے ۔

سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ماہرانِ زبان اور ماہرانِ فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے کیوں کہ ایسے اصحاب کا ملنا جو ماہرِ فن بھی ہوں اور ماہرِ زبان بھی، نہایت مشکل ہے ۔ اصطلاحات کے بنانے میں دونوں پہلوؤں کا خیال رکھنا لازم ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے سانچے

میں بھی ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے بھی ناموزوں نہ ہو۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے یہ بڑی مشکل خود بہ خود رفع ہو گئی اور اس دشوار کام کی تکمیل کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ اس کے بعد ہم نے یہ اصول قرار دیے :۔

۱ - چوں کہ اردو زبان کئی زبانوں سے مرکب ہے اس لیے اصطلاحاتِ علمیہ کے لیے ان سب زبانوں سے الفاظ وضع کر سکتے ہیں جن سے اردو زبان مرکب ہے یعنی عربی، فارسی، ہندی، ترکی سے بلا تکلف مدد لی جا سکتی ہے ؛

۲ - الفاظ کے اشتقاق و ترکیب میں کسی خاص زبان کے قاعدے کی پابندی نہ کی جائے اور جو الفاظ مستعمل ہیں، ان کی مثال کا لحاظ رکھا جائے اور جو لفظ زیادہ موزوں معلوم ہو اسے اختیار کیا جائے ؛

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس غرض کے لیے ان میں سے کسی زبان کا بھی کوئی مادہ یا لفظ جو سہل اور موزوں ہو، لے سکتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ سے اشتقاق یا ترکیب کے ذریعے سے جو دوسرے الفاظ بنائے جائیں گے وہ اردو نحو کے قاعدے کے بہ موجب ہوں گے یعنی لفظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن اس کے نحوی قاعدے نہیں لے سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار نہ لیے گئے ہوں مگر جب ان سے افعال یا صفات یا مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں تو عموماً اپنے ہی نحوی قاعدے استعمال کرتے ہیں ؛

۳ - حتی الامکان مختصر الفاظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کر سکیں ؛

۴ - اسی ضمن میں یہ امر بھی عملی طور پر طے ہو گیا کہ جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیر زبانوں کے اسما سے مصادر بنائے جاتے تھے (مثلاً بدلنا، قبولنا، بخشنا وغیرہ) اسی طرح اب بھی ضرورت کے وقت اسماء سے افعال بنا لینا

جائز ہے چناں چہ اسی اصول پر برق سے برقانا اور دوسرے مصادر بنالیے گئے؛ یہ بہت بڑی اصلاح ہے اور اس سے آیندہ نہایت کار آمد الفاظ وضع ہو سکتے ہیں ۔ اس میں بڑی بات یہ ہے کہ مصادر بنانے سے الفاظ مختصر بن جاتے ہیں اور اشتقاق و ترکیب میں آسانی ہوتی ہے ؛

۵ ۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ جو اصطلاحات قدیم سے ہمارے ہاں رائج ہیں اور اب بھی اسی طرح کار آمد ہیں انھیں ہم نے برقرار رکھا ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ہے ؛

۶ ۔ ایسے انگریزی اصطلاحی الفاظ جو عام طور پر رائج ہو گئے ہیں یا ایسے لفظ جن کے اشتقاق مشکوک ہیں یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں، انھیں بہ دستور رہنے دیا ہے کیوں کہ نہ ان کا ترجمہ ہو سکتا ہے اور نہ ترجمے کی ضرورت ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں تھیں اور رائج ہو گئی تھیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کے رو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے تھے انھیں ترک کر دیا ہے اور ان کی بجائے دوسرے الفاظ وضع کر لیے گئے ہیں ؛

۷ ۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض انگریزی اصطلاحات اس قسم کی آگئی ہیں جو حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں وہ الفاظ اس وقت کی معلومات کے لحاظ سے تجویز کیے گئے تھے ۔ چوں کہ زبان میں ایک زمانۂ دراز سے رائج ہیں اب ان کا بدلنا ناممکن ہے ۔ لیکن ہم نے اپنی اصطلاحات میں انگریزی کی تقلید نہیں کی ہے اور ایسے الفاظ تجویز کیے ہیں جو جدید تحقیقات کی رو سے صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں گویا ایک طرح ہماری اصطلاحات زیادہ ترقی یافتہ ہیں؛

اصطلاحات کے متعلق قدیم سے یہ ایک خیال چلا آرہا ہے وہ مشکل اور غاص

وضع کی ہونی چاہییں اور جہاں تک عام بول چال سے بعید ہوں اسی قدر زیادہ مناسب اور موزوں ہوں گی تاکہ عام الفاظ میں اور ان میں امتیاز رہے اور التباس نہ ہونے پائے اور علمی شان قائم رہے۔ علمی شان اکثر دقیق، ثقیل اور مرعوب کن الفاظ میں سمجھی جاتی ہے اور اکثر اوقات صرف مشکل اصطلاحات کا لینا ہی علم و فضل کا قائم مقام خیال کر لیا جاتا ہے۔ ہمیں اکثر ایسے لوگ ملیں گے جو محض اصطلاحات کی بدولت عالم و فاضل اور صوفی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ خیال اس وقت کی یادگار ہے کہ مذہبی پیشوا علوم کے بھی حامل تھے۔ قدیم ہندستان میں ویدوں کے پڑھنے اور پڑھانے والے برہمن تھے۔ چند اونچی ذاتوں کے سوا عام لوگ جو نیچ ذات کے سمجھے جاتے ہیں، وید پڑھنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ تمام عبادات اور رسوم ویدہی کے الفاظ میں ادا ہوتی تھیں اور اب تک ایسا ہوتا ہے۔ یہی حال زمانۂ وسطیٰ میں یورپ میں پادریوں کا تھا۔ انجیل غیر زبان میں تھی، عبادت غیر زبان میں ہوتی تھی، انجیل زنجیر میں بندھی ہوئی میز پر رکھی رہتی تھی اور لوگ بہ طورِ تبرک کے زیارت کر لیتے تھے۔ اپنی زبان میں ترجمہ کرنا حرام تھا۔ شروع شروع میں ترجمے کرنے والوں پر بڑی بڑی سختیاں کی گئیں اور انھیں مردود و مرتد سمجھا گیا۔ علم و فضل بھی انھیں کے ہاتھ میں تھا گویا مذہبی پیشوا ہی علم کے بھی پیشوا تھے اور وہ عام لوگوں کو اس قابل نہیں خیال کرتے تھے کہ مقدس کتاب کی تعلیم حاصل کریں یا علم و فضل سیکھیں۔ وہ عام لوگوں کو علم پڑھانا گویا انجیل کی اس آیت کی عدول حکمی سمجھتے تھے کہ " اپنے موتیوں کو سوروں کے سامنے نہ ڈالو۔" عوام کالانعام میں نہ اس کی صلاحیت تھی اور نہ اس کا حق رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں علوم کو اور بھی مشکل بنایا جاتا تھا تاکہ عام لوگ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں گویا یہ خاص اسرار تھے جو سینہ بہ سینہ انھیں کو پہنچتے تھے جو اس کے اہل تھے۔ اس زمانے میں یہ دقیق اور ثقیل اصطلاحات ہی ان کی شانِ علم اور رعب

فضل وکمال کو قائم رکھنے والی تھیں۔ مسلمانوں میں اگرچہ پادریوں اور پروہتوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے تاہم ان پر بھی اس کا اثر پڑا جن لوگوں نے شروع شروع قرآن کا ترجمہ کیا وہ کچھ کم مردود و ملعون نہیں سمجھے گئے تھے اور اگرچہ ان میں علم کے سکھانے کے معاملے میں بہت رواداری تھی لیکن علوم کی تدوین کا جو ڈھنگ پڑ گیا تھا وہ ویسا ہی رہا۔ خصوصاً جب علم غیر زبانوں اور غیر قوموں سے حاصل کیا جاتا ہے تو اس قسم کی دقتیں اور بڑھ جاتی ہیں اور ان زنجیروں کا توڑنا آسان کام نہیں ہوتا۔

حال آں کہ علم ہی ایک ایسی چیز ہے جو نہ کسی کی وراثت ہو سکتی ہے اور نہ کسی خاص فرقے کا حق ہو سکتا ہے اور افسوس یہی بعض خاص فرقوں کے قبضے میں آکر روحانی اور دماغی حکومت کا موجب ہو گئی۔ اب ظاہر ہے کہ وہ زمانہ نہیں رہا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس قدیم روایت کو جو دنیا میں دوسرے بہت سے طلسم وستم کے آلات کی طرح دماغی اور اخلاقی ظلم کا ہتھیار تھی، قائم رکھا جائے۔ اس لیے ہم نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ اصطلاحیں آسان اور عام فہم بنائی جائیں اور ایسے مادّوں سے وضع کی جائیں جو زبان میں عام طور سے رائج ہیں۔ جگہ جگہ ہم نے ہندی ترکیبوں کو استعمال کیا ہے تاکہ پڑھنے والے آسانی سے سمجھ جائیں۔ اشتقاق و ترکیب میں کہیں اپنی زبان کے قواعد کو ترک نہیں کیا خواہ لفظ عربی ہو یا فارسی یا کسی اور زبان کا۔ ان اصول پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے البتہ چند لفظ بہ طور مثال کے لکھے جاتے ہیں مثلاً

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | OSTRACISM | (دیس نکالا) |
| AUTONOMY | (سوراج) | ANARCHY | (نراج) |
| CHEMICAL COMBINATION | (کیمیائی ملاپ) | TRIQUETROUS | (تدھارا) |
| TABESCENT | (جھری دار) | STUPOSEUS | (سنیلا) |
| UNICOSTATE | اِکرگا (اِک + رگا) | LARVA | (پہل روپ) |

GAMOSEPALOUS (زاجاتی) ASEXUAL (منجھ روپ) PUPA (دل پیتا) لیکن باوجود اس کے بعض علوم ہیں کہ ان میں ہم اس قدر آسانی پیدا نہیں کر سکے، اس لیے کہ ان کی بہت سی اصطلاحات پہلے سے مروّج ہیں اور ان کا بدلنا ممکن نہیں۔ مثلاً علمِ ہیئت کی کثرت سے ایسی اصطلاحیں ہیں جو عربی ہیں اور وہ بہ جنسہٖ (کسی قدر تلفظ کے فرق سے) یوروپ کی تمام زبانوں میں رائج ہیں، اس لیے ہمیں ان کے مقابل وہی اصلی عربی لفظ لکھنے پڑے ہیں اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ تاہم ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس مشکل کو آسان کر دیں۔ اس زمانے میں جب کہ الٰہی حکومتیں تک عوام کی ہو گئی ہیں، تو کیوں علوم و فنون خاص فرقوں کے ہاتھ میں رہیں اور عام نہ ہو جائیں۔

غیر زبانوں سے بعض الفاظ کا مستعار لینا ناگزیر ہے لیکن بلا وجہ اور خواہ مخواہ الفاظ مستعار لیتے چلے جانا تخیّل کی کمی اور قوّتِ نطق کا ضعف ہے۔ بعض لوگ محض فیشن کے خیال سے اور بعض لوگ سُستی کی وجہ سے اور بعض علمی شان دکھانے کو غیر زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور یہ سب اخلاقی اور دماغی ضعف کی دلیل ہیں۔ اپنے الفاظ استعمال کرنے میں (خواہ مرکّب ہوں یا مفرد) ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک غیر تعلیم یافتہ بھی آسانی سے انھیں سمجھ سکتا ہے۔ جن جن ممالک میں لوگ بیدار ہوتے جاتے ہیں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے۔

اہلِ جرمنی میں یہ تحریک سترھویں صدی سے شروع ہوئی اور اس وقت سے انھوں نے اپنی زبان کو ناگوار غیر الفاظ سے پاک کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے کئی انجمنیں قائم ہوئیں جن کا یہی کام تھا کہ وہ اس مسئلے پر غور کریں اور اپنی اصلی زبان کو ترقّی دیں۔ قومی اتّحاد کے ساتھ ساتھ اس تحریک کو بھی قوّت ہوتی گئی۔ اس زمانے کے جرمنوں کو اپنی زبان کی صفائی پر بڑا فخر ہے۔ اسی طرح انھوں نے

علمی اصطلاحات بھی بہت سادہ بنائی ہیں جسے ان کے ملک کا ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

مثلاً انگریزی NITROGEN جرمن STICKSTOFF (STICK STUFF)

" ALBUMEN " EIWEISS (WHITE OF AN EGG)

اسی طرح اہلِ جاپان نے بھی علمی اصطلاحات بہت عام فہم بنالی ہیں۔ نواب مسعود جنگ بہادر ناظمِ تعلیمات ریاست حیدر آباد دکن دو سال ہوے جب جاپان کے تعلیمی نظام کے معائنے کے لیے اس ملک میں گئے تو انھوں نے وہاں علمی اصطلاحات کے متعلق تحقیق کی اور بہت سی جدید اصطلاحات جو جاپانیوں نے وضع کی ہیں لکھ کر لے آئے تھے۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خاص طور پر ان اصطلاحات کو بہت سہل بنایا ہے۔ مثال کے طور پر چند اصطلاحات یہاں درج کی جاتی ہیں:-

| جاپانی | انگریزی |
|---|---|
| پانی واٹر<br>عنصر SUI SO { SUI— SO—ELEMENT } | HYDROGEN |
| کوئلہ<br>عنصر TANSO { TAN—CHARCOAL SO—ELEMENT } | CARBON |
| TANSUIKWABUTSU. | CARBOHYDRATE |

TAN—CHARCOAL (CARBON)

SUI—WATER (HYDROGEN)

KWA—COMBINATION

BUTSU—THING.

HYDRODYNAMICS SUIRYOKOGAKA

پانی SUI—WATER

قوت RYOKO—POWER

مطالعہ GAKU—STUDY

یعنی پانی کی قوت کا مطالعہ یا علم

METAPHYSIC KEIJIJO—GAKU

شکل KEI—SHAPE

اور JI—AND

بالا JO—ABOVE

مطالعہ GAKU—STUDY.

یعنی مادی اشیا سے بالا علم

TALEOLOGY KOBUTSUGAKU

قدیم KO—OLD

شی BUTSU—THING

مطالعہ GAKU—STUDY

یعنی قدیم اشیا کا علم

FOSSIL KWASEKI

منقلب KWA—TRANSFORMED

پتھر SEKI—STONE

پتھر میں بدلا ہوا

گیس کو ہم نے بھی گیس ہی رکھا ہے ان کے ہاں بھی یہی ہے۔ ذرا تلفظ بدلا ہوا ہے وہ گیسو کہتے ہیں:

یہی اہلِ روس کر رہے ہیں اور یہی اہلِ بوہیمیا کو کرنا پڑا کہ انھوں نے غیر ضروری

جرمن الفاظ کو نکال باہر کیا۔ یونانیوں نے ترکی لفظ خارج کر دیے۔ ایرانی بھی کچھ عرصے سے اپنی زبان کو پاک صاف کرنے کی طرف متوجّہ ہیں اور اب ترکوں نے بھی اس طرف توجّہ کی ہی ورنہ سب یہی قومیں تھیں جو ہماری طرح غیر زبانوں کو بولنا اور غیر زبانوں کے الفاظ استعمال کرنا فخر سمجھتی تھیں ؛

بہت ممکن ہی کہ ہماری بعض ترکیبیں کانوں کو نامانوس اور اجنبی اور ذوقِ سلیم کو ناگوار گزریں اور بعض الفاظ اور اصطلاحیں اوپری اور مصنوعی نظر آئیں۔ لیکن ہماری نیت ہمارا اصول مستحکم ہی، ہم اپنے ملک سے محبت رکھتے ہیں اور علم کو عام کرنا چاہتے ہیں اور حکیم سقراط کی طرح معاوضہ لے کر نہیں بلکہ کچھ دے کر بھی عامی سے عامی کو بھی سب کچھ جو ہمیں آتا ہی بتا دینا چاہتے ہیں۔ ایک جرمن صرف و نحو کے مؤلف نے اپنی کتاب میں اہلِ جرمنی کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کیا ہی جو کم و بیش ہم پر صادق آتا ہی :۔

"آج کل (سنہ ۱۹۰۸ء کا ذکر ہی) یہ عام خواہش ہی اور کسی قدر نامعقول حد تک پہنچ گئی ہی کہ کوئی ایسا لفظ نہ استعمال کیا جائے جسے کوئی جرمن جو غیر زبانیں نہیں جانتا، نہ سمجھ سکے۔ نتیجہ یہ ہی کہ غیر زبانوں کے لفظ کے بجائے جو لفظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اکثر ناگوار اور ثقیل ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کا کوئی جز غیر زبان کا ہوتا ہی۔ ایک بیرونی شخص کو یہ تحریک مصنوعی معلوم ہوتی ہی، اگرچہ اس کی محرک خالص حبِّ وطن اور مادری زبان کا فخر ہی جو دوسری قوموں کے لوگوں میں نہیں پایا جاتا"؛

اس کتاب کے پڑھنے والے کو کہیں کہیں یہ بھی نظر آئے گا کہ جو اصول ہم نے قائم کیے ہیں ان پر ہم بعض اوقات عمل نہیں کر سکے۔ ہمیں اس کا اعتراف ہی۔ یہ پہلا مرحلہ اور ابتدائی کوشش ہی لیکن ہمیں قوی امید ہی کہ جو داغ بیل ہم نے

ڈالی ہے آیندہ اس پر چلنے والے اسے زیادہ ہم وار اور صاف بنالیں گے ٭

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے باقی علوم کی اصطلاحات بھی تیار ہو رہی ہیں وہ بعد ازاں شایع ہوں گی۔ اس جلد میں بھی بعض علوم کی اصطلاحات مکمل نہیں ہیں۔ اس کی تکمیل پھر کسی وقت جب کتاب دُوسری بار طبع ہوگی تو کر دی جائے گی۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کا طبع کر دینا بہت ضروری تھا کیوں کہ اکثر صاحبوں کا تقاضا تھا اور ضرورت کے وقت مؤلفین و مترجمین الفاظ لکھ لکھ کر پُوچھتے رہتے ہیں اور ہمیں نقل کر کر کے بھیجنے میں بہت زحمت ہوتی تھی۔ ذی علم نقّادوں سے توقّع ہے کہ اسے غور سے ملاحظہ فرمائیں اور جہاں کوئی سقم نظر آئے یا کوئی بہتر لفظ ملے تو اس سے اطلاع فرمادیں تاکہ طبعِ ثانی کے وقت اس کی اصلاح ہو سکے ٭

ہمیں اس کا بہت افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے چھپنے میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں اور آخر میں ایک غلط نامہ لگانا پڑا۔ ایک تو الفاظ اجنبی تھے دُوسرے ان کی صحت بہت مشکل تھی اور بعض اوقات اصل میں غلطیاں تھیں جن کی تحقیق کے بعد اصلاح کی گئی ٭

ہیئت اور نباتیات کی تمام اصطلاحیں انجمن نے بہ طورِ خود مرتّب کرائی تھیں۔ نباتیات کی اصطلاحیں ہمارے مکرّم دوست حاجی عبدالرحمٰن خاں صاحب فسٹ اسسٹنٹ امپیریل ایکونامک بوٹےنسٹ، پوسا نے میری درخواست پر اپنی خاص عنایت سے بڑی محنت کے ساتھ مرتّب کیں۔ خاں صاحب موصوف ماہرِ فن بھی ہیں اور ادیب بھی اور اس لیے جو اصطلاحیں انھوں نے وضع کی ہیں وہ زبان اور فن دونوں لحاظ سے موزوں ہیں۔ میں خاں صاحب کا اس موقع پر تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں بعد میں دارالترجمہ نے بھی اس فن میں نیز ہیئت میں کچھ اصطلاحیں وضع کیں جن میں کچھ اختلاف تھا وہ ہم نے ضمیمے میں درج کر دی ہیں تاکہ ناظرین ضرورت کے وقت دونوں

کو نظر میں رکھیں:۔

مَیں مولوی عنایت اللہ صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ جب کبھی مَیں نے ان سے درخواست کی انھوں نے دار الترجمہ سے بہت مستعدی اور خوشی کے ساتھ اصطلاحات روانہ فرمائیں۔ لیکن وہ اس قدر بے ترتیب ہوتی تھیں کہ ان کی ترتیب اور تصحیح میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ مَیں اپنے کالج کے پروفیسر محمّد ابراہیم صاحب ایم اے، پروفیسر وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی، پروفیسر کریم احمد صاحب بی اے ایم ٹی اور پروفیسر عزیز الرحمٰن صاحب ایم. ایس. سی نیز سیّد غلام ربّانی صاحب کا بہت خلوص سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان صاحبوں نے وقت بے وقت دِلی شوق سے ان اصطلاحات کی ترتیب و تصحیح اور پروفوں کے درست کرنے میں بہت بڑی مدد دی:۔

---

# مقدمہ 'فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں'

تقریباً پچیس سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے پیشہ وروں کی اصطلاحات جمع کرنے کا خیال ہوا۔ تھوڑا بہت کام شروع کیا بھی، لیکن جب کام کا آدمی نہ ملا تو ناچار ترک کرنا پڑا۔ اس کے لیے موزوں آدمی کا ملنا بہت مشکل تھا کیوں کہ اس راہ میں قسم قسم کی دشواریاں ہیں۔ اگر لغات اور کتابوں سے کام چل جاتا تو کوئی دشواری نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کتابوں کی چھان بین سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملتی ہے لیکن ٹھیٹ اصطلاحوں سے وہ بھی خالی ہیں پھر ان کا سمجھنا اور سمجھانا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کاری گروں کو کام کرتے نہ دیکھا جائے اور ان کے آلات اور طریقۂ کار سے پوری واقفیت حاصل نہ کی جائے۔ پیشے ایک دو تو ہیں نہیں کہ آدمی ایک آدھ جگہ بیٹھ کر سب کچھ تحقیق کر لے، سیکڑوں ہیں اور وہ بھی مختلف مقامات پر۔ اس لیے اس کام میں بڑی دردسری اور سرگردانی کی ضرورت ہے۔ جب میں نے اردو لغت کی ترتیب اپنے ذمے لی تو پرانا سودا پھر تازہ ہوا۔ پہلے صرف شوق تھا اب شوق کے ساتھ ضرورت بھی آملی۔ میری نظر ظفرالرحمٰن صاحب دہلوی پر پڑی جو خود بھی بڑے ہنرمند ہیں اور ان چیزوں سے انھیں طبعی مناسبت ہے؛ اور ایک خوبی ان میں یہ ہے کہ جس کام کو لیتے ہیں بڑی

تن دہی اور جاں کاہی سے انجام دیتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے دن رات کام کر کے اسے پُورا کیا، ہر قسم کی کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ جن سے کچھ بھی مدد مِل سکتی تھی اُن کے لیے مہیّا کیں۔ خود انھوں نے مختلف مقامات کا دَورہ کیا۔ کاری گروں سے ملے اُن کے کام دیکھے، طریقِ کار کو سمجھا، اُن کے آلات و اشیا کا معائنہ کیا اور تصویریں لیں۔ کاری گر اس معاملے میں بہت بخل کرتے ہیں اور کچھ بدگمان بھی ہیں (اور اُن کی بدگمانی درست بھی ہی) اس لیے طرح طرح سے پھسلا کر کام نکالا؛

یہ زمانہ مشین اور سائنس کا ہی، آج کل تعلیم میں بھی حرفت و صنعت کو داخل کر لیا گیا ہی اس کے لیے لامحالہ اصطلاحی لفظوں کی ضرورت پڑے گی، یہ کتاب اس غرض کے لیے بہت کار آمد ہوگی؛

جب سے ہم نے اپنی صنعت و حرفت کی طرف سے بے رُخی کی ہم اپنے لفظ بھی بھوُل گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جگہ بھدّے اور ثقیل الفاظ نے لے لی۔ یہ سب ہماری غفلت اور موجودہ طرزِ تعلیم کے باعث ہوا۔ مثلاً فنِ معماری کو لیجیے۔ ہمارے انجنیر یا تو انگریزی کالجوں کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں یا ولایت سے تعلیم پا کر آتے ہیں۔ ان کی زبان پر انگریزی اصطلاحیں چڑھی ہوتی ہیں، جو کتابوں میں پڑھا وہی ان کی زبان پر ہوتا ہی۔ ٹھیکہ داروں، معماروں اور مزدوروں سے جب وہ بات چیت کرتے یا کام کی ہدایت کرتے ہیں تو وہی انگریزی اصطلاحات جو انھوں نے پڑھی ہیں استعمال کرتے ہیں۔ راج مزدور بھی اُن سے سُن سُن کر اُنھیں انگریزی لفظوں کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے لگتے ہیں اس طرح ہمارے سبک اور موزوُں لفظ خارج ہوتے گئے اور اُن کی جگہ انگریزی کے مسخ شدہ بھدّے لفظ رائج ہو گئے؛

اس معاملے میں تھوڑا بہت قصور مترجمین کا بھی ہی، جو لوگ انگریزی

یا دُوسری یورپین زبانوں سے ترجمہ کرتے ہیں تو وہ بعض اوقات ناواقفیت کی وجہ سے مکھی پر مکھی مار دیتے ہیں اور ایسے لفظی ترجمے کر دیتے ہیں جو ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی نے لیبان کی فرانسیسی کتاب "تمدنِ عرب"، کا ترجمہ کیا، ترجمہ بہت اچھا ہی اس میں ایک جگہ HORSE SHOE ARCH کا لفظ آیا ہی۔ انھوں نے اس کا ترجمہ "نعل اسپ محراب" کر دیا بالکل لفظی ترجمہ ہی، اصطلاح نہیں۔ اسی کو مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔ جب دلّی کے ایک پُرانے معمار سے ایسی محراب کی تصویر کھینچ کر پوچھا کہ اسے کیا کہتے ہیں تو اُس نے جھٹ کہہ دیا "گھُرنعل" یہ ہی اصطلاح ——! محراب کی ہمارے ہاں بیسیوں قسمیں ہیں اور اُن کے نام بھی الگ الگ ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں کیسا کچھ خزانہ بھرا پڑا ہی جو ہماری غفلت کی وجہ سے ناکارہ اور زنگ آلودہ ہوگیا ہی۔

پیشہ وروں کی اصطلاحوں نے ادبی زبان پر بھی اپنا اثر ڈالا ہی۔ مثلاً پخ کا لفظ ہی سنگ تراشوں کی اصطلاح میں ستون کے پتھر کے پہلو کو کہتے ہیں، جس کے کناروں کو طرح طرح سے تراش کر خوش نما بنا لیا جاتا ہی۔ ادب میں آ کر اس کے معنی کسی قدر بدل گئے ہیں اور اس سے پخ لگانا، پخ نکالنا، پخ لگنا محاورے بن گئے ہیں۔ مرزا داغ کہتے ہیں ؎

خالی نہیں ہیچ سے کوئی بات ہر بات میں پخ نکالتے ہو

خراد (یا خراط) نجاری کا لفظ ہی بڑھئی لکڑی وغیرہ کے لیے خراد پر چڑھنا یا چڑھانا بولتے ہیں۔ اسی سے ادب میں استعارۃً خراد پر چڑھنا یا خراد پر اُترنا اچھے خاصے محاورے بن گئے ہیں۔ بدھ دُکان داروں اور حساب دانوں کی اصطلاح ہی اب یہ بدھ کا ملنا کا محاورہ دکانوں سے نکل کر ادب میں آپہنچا ہی اور اس کے کئی

معنے ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے بہت سے لفظ اور محاورے ہیں جو پیشہ وروں کی بدولت ہمارے ادب میں پہنچے ہیں:

یہ 'اصطلاحاتِ پیشہ وراں' کا پہلا حصّہ ہے باقی حصّے بھی تیار ہیں اور عنقریب شایع کیے جائیں گے۔ یہ کتاب کئی سال کی محنت مشقّت کے بعد تیار ہوئی ہے اور ہماری زبان میں اپنی وضع کی پہلی اور نہایت قابلِ قدر تالیف ہے:

---

# مقدّمہ

## مطبوعاتِ سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سرکارِ عالی

دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادّہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے، تخیّل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے، علم کا دارومدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اس وقت قوم یا تو بےکار اور مردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ دوسری ترقّی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔ تاریخِ عالم کے ہر دور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ خود ہمارے دیکھتے دیکھتے جاپان پر یہی گزری اور یہی حالت اب ہندستان کی ہے۔

جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطعِ تعلّق کر کے تنہا اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ نہیں سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوامِ عالم سے بےنیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقّی پائے۔ جس طرح ہوا کے جھونکوں اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھرے رہتے ہیں جہاں انسان کی دست رس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اُڑ کر پہنچتے ہیں۔ جس طرح یونان کا اثر روما اور

دیگر اقوامِ یورپ پر پڑا جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا۔ جس طرح اسلام نے یورپ میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانونِ عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہے گا:

دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب قوم میں جدّت اور اُپج نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری، کم مایہ اور ادنیٰ ہوں گی۔ اُس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمے کے ذریعے سے دنیا کی اعلیٰ درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیّر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابلِ قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔

اسی اصول کی بنا پر جب عثمانیہ یونی ورسٹی کی تجویز پیش ہوئی تو ہز اکزالٹڈ ہائی نس رستمِ دوراں ارسطوے زماں سپہ سالار آصف جاہ مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ نواب میر عثمان علی خاں بہادر فتح جنگ جی۔سی۔ایس۔آئی۔جی۔بی۔ای والیٔ حیدرآباد دکن خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ نے جن کی علمی قدردانی اور علمی سرپرستی اس زمانے میں احیائے علوم کے حق میں آبِ حیات کا کام کر رہی ہے، بہ تقاضائے مصلحت و دُور بینی سب سے اوّل سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری عطا فرمائی، جو نہ صرف یونی ورسٹی کے لیے نصابِ تعلیم کی کتابیں تیار کرے گا بلکہ ملک میں نشر و اشاعت

علوم و فنون کا کام بھی انجام دے گا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی یہ کام ہندستان کے مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا انجام پایا مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیرِ نگرانی ڈاکٹر گل کرسٹ، دہلی سوسائٹی میں، انجمنِ پنجاب میں زیرِ نگرانی ڈاکٹر لائٹنر و کرنل ہال رائڈ، علی گڑھ سائنٹفک انسٹی ٹیوٹ میں جس کی بنا سر سید احمد خاں مرحوم نے ڈالی۔ مگر یہ کوششیں سب وقتی اور عارضی تھیں۔ نہ ان کے پاس کافی سرمایہ اور سامان تھا نہ انھیں یہ موقع حاصل تھا اور نہ انھیں اعلیٰ حضرت و اقدس جیسے علم پرور فرماں روا کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ یہ پہلا وقت ہے کہ اُردو زبان کو علوم و فنون سے مالامال کرنے کے لیے باقاعدہ اور مستقل کوشش کی گئی ہے اور یہ پہلا وقت ہے کہ اردو زبان کو یہ رتبہ مِلا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار پائی ہے۔ احیائے علوم کے لیے جو کام آگسٹس نے روما میں، خلافتِ عباسیہ میں ہارون الرشید و مامون الرشید نے، ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث نے، بکرماجیت و اکبر نے ہندستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم و کیتھرائن نے روس میں اور مت سُشی ہٹو نے جاپان میں کیا وہی فرماں روائے دولتِ آصفیہ نے اس ملک کے لیے کیا۔ اعلیٰ حضرت و اقدس کا یہ کارنامہ ہندستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

من جملہ اُن اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں ایک بڑا سبب زبان کی تکمیل ہے جس قدر جو قوم زیادہ ترقی یافتہ ہے اسی قدر اس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات اور علمی مطالب کے ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اور جس قدر جس قوم کی زبان محدود ہوتی ہے اسی قدر تہذیب و شائستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے۔ چناں چہ وحشی اقوام میں الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی کم پایا گیا ہے۔ علمائے فلسفہ و علم اللسان نے یہ ثابت کیا ہے کہ زبان، خیال اور خیال

زبان ہی اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقا کا علم، زبان کی تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہو سکتا ہی۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں ویسی ہی مدد دیتے ہیں جیسی آنکھیں دیکھنے میں۔ اس لیے زبان کی ترقّی درحقیقت عقل کی ترقّی ہی۔

علمِ ادب اسی قدر وسیع ہی جس قدر حیاتِ انسانی۔ اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہی۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقّی میں مدد دیتا اور نظر میں وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیّر پیدا کرتا ہی بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہی۔ قومیت کے لیے ہم خیالی شرط ہی اور ہم خیالی کے لیے ہم زبانی لازم۔ گویا یک زبانی قومیت کا شیرازہ ہی جو اسے منتشر ہونے سے بچائے رکھتا ہی۔ ایک زمانہ تھا جب کہ مسلمان اقطاعِ عالم میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے علمِ ادب اور زبان نے انھیں ہر جگہ ایک کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریز ایک دنیا پر چھائے ہوئے ہیں لیکن باوجود بُعدِ مسافت و اختلافِ حالات یک زبانی کی بدولت قومیت کے ایک سلسلے میں منسلک ہیں۔ زبان میں جادو کا سا اثر ہی اور صرف افراد ہی پر نہیں بلکہ اقوام پر بھی اُس کا وہی تسلط ہی۔

یہی وجہ ہی کہ تعلیم کا صحیح اور فطرتی ذریعہ اپنی ہی زبان ہو سکتی ہی۔ اس امر کو اعلیٰ حضرت واقدس نے پہچانا اور جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد ڈالی۔ جامعۂ عثمانیہ ہندستان میں پہلی یونی ورسٹی ہی جس میں ابتدا سے انتہا تک ذریعۂ تعلیم ایک دیسی زبان ہوگا۔ اور یہ زبان ،اردو، ہوگی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں، جہاں ہر صوبہ ایک نیا عالم ہی، صرف اردو ہی ایک عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہی۔ یہ اہلِ ہند کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اب بھی یہی اس فرض کو انجام دے گی۔ یہ اس کے خمیر اور وضع و ترکیب میں ہی اس لیے یہی تعلیم اور تبادلۂ خیالات

کا واسطہ بن سکتی اور قومی زبان کا دعویٰ کر سکتی ہی ⁂

جب تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا گیا تو یہ کھُلا اعتراض تھا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کتابوں کا ذخیرہ کہاں ہی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اُردو میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اس میں علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم ہو سکے - یہ صحیح ہی کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کافی ذخیرہ نہیں - اور اردو ہی پر کیا منحصر ہی ہندُستان کی کسی زبان میں بھی نہیں - یہ طلب و رسد کا عام مسئلہ ہی - جب مانگ ہی نہ تھی تو رسد کہاں سے آتی - جب ضرورت ہی نہ تھی تو کتابیں کیوں کر مہیا ہوتیں - ہماری اعلیٰ تعلیم غیر زبان میں ہوتی تھی، تو علوم و فنون کا ذخیرہ ہماری زبان میں کہاں سے آتا - ضرورت ایجاد کی ماں ہی - اب ضرورت محسوس ہوئی ہی تو کتابیں بھی مہیا ہو جائیں گی - اسی کمی کو پُورا کرنے اور اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے سرشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا - یہ صحیح نہیں ہی کہ اُردو زبان میں اس کی صلاحیت نہیں - اس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں - سرشتۂ تالیف و ترجمہ کا وجود اس کا شافی جواب ہی - یہ سرشتہ یہی کام کر رہا ہی - کتابیں تالیف و ترجمہ ہو رہی ہیں اور چند روز میں عثمانیہ یونی ورسٹی کالج کے طالب علموں کے ہاتھوں میں ہوں گی اور رفتہ رفتہ عام شائقینِ علم تک پہنچ جائیں گی ⁂

لیکن اس میں سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضعِ اصطلاحات کا تھا - اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجایش ہی - اس بارے میں ایک مدت کے تجربے اور کامل غور و فکر اور مشورے کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہی کہ تنہا نہ تو ماہرِ علم صحیح طور سے اصطلاحات وضع کر سکتا ہی اور نہ ماہرِ لسان - ایک کو دوسرے کی ضرورت ہی - اور ایک کی کمی دوسرا پُورا کرتا ہی - اس لیے اس اہم کام کو صحیح طور سے انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہی کہ دونوں ایک جا جمع کیے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے

کے مشورے اور مدد سے ایسی اصطلاحیں بنائیں جو نہ اہلِ علم کو ناگوار ہوں نہ اہلِ زبان کو۔ چناں چہ اسی اصول پر ہم نے وضعِ اصطلاحات کے لیے ایک ایسی مجلس بنائی جس میں دونوں جماعتوں کے نمایندے شریک ہیں۔ علاوہ ان کے ہم نے اُن اہلِ علم سے بھی مشورہ کیا جو اس کی خاص اہلیت رکھتے ہیں اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے ہماری مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ غیر مانوس معلوم ہوں گے اور اہلِ زبان انھیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس سے گریز نہیں۔ ہمیں بعض ایسے علوم سے واسطہ ہے جن کی ہوا تک ہماری زبان کو نہیں لگی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ نہیں کہ جب ہماری زبان کے موجودہ الفاظ خاص خاص مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ہم جدید الفاظ وضع کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے محض ٹالنے کے لیے زبردستی الفاظ گھڑ کر رکھ دیے ہیں، بلکہ جس نہج پر اب تک الفاظ بنتے چلے آئے ہیں اور جن اصولِ ترکیب و اشتقاق پر اب تک ہماری زبان کاربند رہی ہے، اس کی پوری پابندی ہم نے کی ہے۔ ہم نے اُس وقت تک کسی لفظ کے بنانے کی جرأت نہیں کی جب تک اسی قسم کی متعدد مثالیں ہمارے پیشِ نظر نہ رہی ہوں۔ ہماری رائے میں جدید الفاظ کے وضع کرنے کی اس سے بہتر اور صحیح کوئی صورت نہیں۔ اب اگر کوئی لفظ غیر مانوس یا اجنبی معلوم ہو تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ جو زبان زیادہ تر شعر و شاعری اور قصص تک محدود رہی ہو، وہاں ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ جس ملک سے ایجاد و اختراع کا مادّہ سلب ہو گیا ہو جہاں لوگ نئی چیزوں کے بنانے اور دیکھنے کے عادی نہ ہوں، وہاں جدید الفاظ کا غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہونا موجبِ حیرت نہیں۔ الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اوّل اوّل الفاظ کا یہی حال ہوتا ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کر دیتا ہے اور صحت و غیر صحت کا فیصلہ زمانے

کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کرلیں، آیندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانے کی کسوٹی پر پُورا اترا تو خود ٹکسالی ہو جائے گا اور اپنی جگہ آپ پیدا کرلے گا۔ علاوہ اس کے جو الفاظ پیش کیے گئے ہیں وہ الہامی نہیں کہ جن میں ردّ و بدل نہ ہو سکے، بلکہ فرہنگ اصطلاحاتِ عثمانیہ جو زیرِ ترتیب ہے پہلے اس کا مسودہ اہلِ علم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا اس کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ہماری مشکلات صرف اصطلاحاتِ علمیہ تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ہمیں ایک ایسی زبان سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے جو ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے، اس میں اور ہماری زبان میں کسی قسم کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں۔ اس کا طرزِ بیان، ادائے مطلب کے اسلوب، محاورات وغیرہ بالکل جدا ہیں۔ جو الفاظ اور جملے انگریزی زبان میں بالکل معمولی اور روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں، ان کا ترجمہ جب ہم اپنی زبان میں کرنے بیٹھتے ہیں تو سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ان تمام دشواریوں پر غالب آنے کے لیے مترجم کو کیا کچھ خونِ جگر کھانا نہیں پڑتا۔ ترجمے کا کام، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بہت خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔

اس سررشتے کا کام صرف یہی نہ ہوگا (اگرچہ یہ اس کا فرضِ اوّلیں ہے) کہ وہ نصابِ تعلیم کی کتابیں تیار کرے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہر علم پر مستند اور کثرت سے کتابیں تالیف و ترجمہ کرائے گا، تاکہ لوگوں میں علم کا شوق بڑھے، مُلک میں روشنی پھیلے، خیالات و قلوب پر اثر پیدا ہو، جہالت کا استیصال ہو۔ جہالت کے معنی اب لاعلمی ہی کے نہیں بلکہ اس میں افلاس، کم ہمتی، تنگ دلی، کوتہ نظری، بے غیرتی، بداخلاقی سب کچھ آجاتا ہے۔ جہالت کا مقابلہ کرکے اسے پسپا کرنا سب سے بڑا کام ہے۔ انسانی دماغ

کی ترقی علم کی ترقی ہے، انسانی ترقی کی تاریخ علم کی اشاعت و ترقی کی تاریخ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک انسان نے جو کچھ کیا ہے، اگر اس پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا گیا، پچھلی غلطیوں کی صحت ہوتی گئی، تاریکی گھٹتی گئی، روشنی بڑھتی گئی، انسان میدانِ ترقی میں قدم آگے بڑھاتا گیا۔ اسی مقدس فرض کے ادا کرنے کے لیے یہ سررشتہ قائم کیا گیا ہے اور وہ اپنی بساط کے موافق اس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرے گا۔

لیکن غلطی، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ادب کا کامل ذوقِ سلیم ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا۔ غلطی ترقی کی مانع نہیں ہے، بلکہ وہ صحت کی طرف رہ نمائی کرتی ہے۔ پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے۔ ایک جاپانی ماہرِ تعلیم (بیرن کی کوچی) نے اپنے ملک کا تعلیمی حال لکھتے ہوئے اس صحیح کیفیت کا ذکر کیا ہے جو ہونہار اور ترقی کرنے والے افراد اور اقوام پر گزرتی ہے:-

"ہم نے بہت سے تجربے کیے اور بہت سی ناکامیاں اور غلطیاں ہوئیں۔ لیکن ہم نے ان سے نئے سبق سیکھے اور فائدہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے ملک کی تعلیمی ضروریات اور امکانات کا صحیح اور بہتر علم ہوتا گیا اور ایسے تعلیمی طریقے معلوم ہوتے گئے جو ہمارے اہلِ وطن کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ ابھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جو ہمیں حل کرنے ہیں، بہت سی ایسی اصلاحیں ہیں جو ہمیں عمل میں لانی ہیں۔ ہم نے اب تک کوشش کی اور ابھی کوشش کر رہے ہیں اور مختلف طریقوں کی برائیاں اور بھلائیاں دریافت کرنے کے درپے ہیں، تاکہ اپنے ملک کے فائدے کے لیے اچھی باتوں کو اختیار کریں اور رواج دیں اور برائیوں سے بچیں"۔

اس لیے جو حضرات ہمارے کام پر تنقیدی نظر ڈالیں انھیں وقت کی تنگی، کام کا ہجوم اور اس کی اہمیت اور ہماری مشکلات پیشِ نظر رکھنی چاہییں۔ یہ پہلی سعی ہے اور پہلی سعی میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور رہ جاتی ہیں، لیکن آگے چل کر یہی خامیاں ہماری رہ نما بنیں گی اور پختگی اور اصلاح تک پہنچائیں گی۔ یہ نقشِ اول ہے، نقشِ ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ ضرورت کا احساس، علم کا شوق، حقیقت کی لگن، صحت کی ٹوہ، جدّ و جہد کی رسائی خود بہ خود ترقّی کے مدارج طے کر لے گی۔

جاپانی بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تیس چالیس سال کے عرصے میں وہ کچھ کر دکھایا جس کے انجام دینے میں یورپ کو اتنی ہی صدیاں صرف کرنی پڑیں۔ کیا کوئی دن ایسا آئے گا کہ ہم بھی یہ کہنے کے قابل ہوں گے؟ ہم نے پہلی شرط پوری کر دی ہے یعنی بے جا قیود سے آزاد ہو کر اپنی زبان کو اعلا تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لوگ ابھی ہمارے کام کو تذبذب کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ہماری زبان کی قابلیت کی طرف مشتبہ نظریں ڈال رہے ہیں۔ لیکن وہ دن آنے والا ہے کہ اس ذرّے کا بھی ستارہ چمکے گا، یہ زبان علم و حکمت سے مالا مال ہوگی اور اعلیٰ حضرت کی نظرِ کیمیا اثر کی بدولت یہ دنیا کی مہذب و شایستہ زبانوں کی ہم سری کا دعویٰ کرے گی۔ اگرچہ اس وقت ہماری سعی اور محنت حقیر معلوم ہوگی، مگر یہی شامِ غربت صبحِ وطن کی آمد کی خبر دے رہی ہے، یہی شب بیداریاں روزِ روشن کا جلوہ دکھائیں گی، اور یہی مشقت اُس قصرِ رفیع الشّان کی بنیاد ہوگی جو آیندہ تعمیر ہونے والا ہے۔ اس وقت ہمارا کام صبر و استقلال سے میدان صاف کرنا، داغ بیل ڈالنا اور نیو کھودنا ہے، اور فرہاد وار شیریں حکمت کی خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم لانے کی سعی کرنا ہے۔ اور گو ہم نہ ہوں گے مگر ایک زمانہ آئے گا جب کہ اس میں علم و حکمت کے دریا بہیں گے اور ادبیات کی افتادہ زمین سرسبز و شاداب نظر آئے گی۔

آخر میں مَیں سر شتے کے مترجمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنے فرض کو بڑی مستعدی اور شوق سے انجام دیا۔ نیز مَیں ارکانِ مجلس وضعِ اصطلاحات کا شکرگزار ہوں کہ ان کے مفید مشورے اور تحقیق کی مدد سے یہ مشکل کام بہ خوبی انجام پا رہا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ سر شتہ جناب مسٹر محمد اکبر حیدری بی۔ اے معتمد عدالت و تعلیمات و کوتوالی و امورِ عامہ سرکارِ عالی کا ممنون ہے جنھیں ابتدا سے قیام و انتظام جامعۂ عثمانیہ میں خاص انہماک رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجہ اور امداد ہمارے شریکِ حال نہ ہوتی تو یہ عظیم الشان کام صورت پذیر نہ ہوتا۔ مَیں سیّد راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) آئی۔ ای۔ ایس ناظمِ تعلیمات سرکارِ عالی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ اور عنایت ہمارے حال پر مبذول رہی اور ضرورت کے وقت ہمیشہ بلا تکلف خوشی خوشی ہمیں مدد دی۔

# متفرّقات

# مقدّمۂ مبادیٔ سائنس

'مبادیٔ سائنس' انجمنِ اردوٗ کی پہلی کتاب ہو جو پبلک کے سامنے پیش کی جاتی ہو۔ یہ کتاب دراصل فرانسیسی میں لکھی گئی تھی۔ فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کی گئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی بِکری ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ترجمے میں آسانی کی غرض سے اس کتاب کے دو حصّے کرلیے گئے ہیں۔ پہلے حصّے میں حیوانات، نباتات اور حجریات و معدنیات کا ذِکر ہو جس کا یہ ترجمہ ہو۔ اور دوٗسرے حصّے میں طبیعیات، کیمسٹری (کیمیا)، فزیالوجی (علمِ کاسہ سر) کا بیان ہو۔ اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہو کہ ان علوم کے تمام اصول اور مسائل بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ نہایت سہل زبان میں ادا کیے گئے ہیں اور یہی اس کتاب کے مقبول ہونے کی وجہ ہو:۔

انجمنِ اردوٗ نے سب سے اوّل اس کتاب کو کیوں انتخاب کیا اس کی دوٗ وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ زبانِ اردوٗ کی توسیع و ترقّی کا بہت بڑا ذریعہ یہی ہو کہ اُسے علمی زبان بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر زبان سے صِرف یہ مقصود ہو کہ روزمرّہ کی بات چیت، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے منھ دھونے کی کرلی جائے تو اتنا تو شاید جانور بھی آپس میں کہہ سُن لیتے ہیں۔ ایک ایسی زبان جسے ہندوستان

سے عظیم الشان ملک کی عام زبان ہونے کا دعویٰ ہو اسے اسی قدر وسیع ہونا چاہیے جتنا وسیع اس کا ملک ہو۔ اور اس کی اسی قدر مختلف حیثیتیں ہونی چاہییں جتنی اس میں مختلف اقوام و ملل ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں مختلف علوم و فنون نہ آ جائیں۔ علاوہ اس کے ملک میں بھی تعلیم اُسی وقت پھیل سکتی ہو جب علوم و فنون کی کتابیں ملکی زبان میں ہوں۔ ہر شخص انگریزی یا یورپین زبانیں نہیں جان سکتا۔ فی صدی چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جو یہ زبانیں جانتے ہیں۔ باقی سارے ملک کی تعلیم کا دار و مدار دیسی زبان پر ہو۔ لیکن جب دیسی زبان میں سوائے دیوانوں، عشقیہ مثنویوں، ناولوں، تاریخی قصوں کے کچھ نہ ہو تو علم کی روشنی کیسے پھیلے۔ اور جب علم حاصل کرنے کے لیے ایک غیر زبان سیکھنی پڑے تو ہماری زبان کس مرض کی دوا ہو۔ آخر دوسروں کی زبان سے کب تک کام نکلے گا اور ہم گونگے بنے کب تک دوسروں کا منھ تکتے رہیں گے؟ یہی وجہ ہو کہ انجمن نے ایک ایسی کتاب کا انتخاب کیا اور ان علوم کی اشاعت کی کوشش کی جن کی ضرورت ہو۔ کسی انتہائی کتاب کا ترجمہ کرنا اس وقت بے موقع ہوگا۔ شروع ابتدائی کتابوں سے ہونی چاہیے تاکہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور اُن میں ایسے علوم کے پڑھنے کا ذوق پیدا ہو۔ یہ کتاب اگرچہ ابتدائی ہو مگر جامع ہو اور ہر علم کے مسائل اصولی طور پر مکمل بیان کیے گئے ہیں۔

دوسری وجہ اس کتاب کے انتخاب کی یہ ہو کہ ہم ہندو اور مسلمان صدہا سال سے علومِ نظری میں اس قدر منہمک ہیں کہ گویا ہمارے دماغ کی ساخت ایک دوسری قسم کی ہوگئی ہو۔ ہمارا قدیم لٹریچر مابعد الطبیعیات و الٰہیات سے بھرا پڑا ہو اور یہ مادی دنیا ہماری نظروں میں ایسی حقیر ہوگئی تھی کہ ہماری اکثر بحثیں اس خاک دان سے ہمیشہ

ارفع اور بالا بالا رہیں اور اگر کسی نے بدقسمتی سے ان بحثوں میں طبیعیات کے مسائل کو دخل دیا تو ہم نے اپنی منطقی بنوٹ کا ایسا پیچ مارا کہ طبیعی دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ قانون و منطق و فلسفہ میں بہت تیز ہوتے ہیں مگر میدانِ طبیعیات میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے دماغوں کا علاج علوم طبیعیات ہی کی اشاعت سے ہو سکتا ہے۔

اب مجھے مترجم کی نسبت بھی کچھ کہنا ضرور ہے۔ یہ کتاب علمی ہے اور علمی اصطلاحات سے بھری پڑی ہے۔ قابل مترجم نے نہایت تحقیق اور جاں کاہی سے تمام اصطلاحات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان قدیم اور مروّجہ عربی اصطلاحات لکھی جائیں۔ جہاں کہیں کوئی عربی اصطلاح نہیں ملی وہاں موزوں اور مناسب اصطلاح عربی زبان میں بنالی گئی ہے۔ عربی زبان میں جدید الفاظ بنانے کی بہت کچھ گنجایش ہے اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس وسیع اور بے نظیر زبان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مولوی معشوق حسین خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) نے اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ کر کے ملک پر بڑا احسان کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ ترجمہ بلا معاوضہ انجمن کو دے دیا ہے۔ ان کی یہ مثال نہایت قابلِ قدر اور قابلِ تقلید ہے اور انجمن بہ درجۂ غایت ان کی شکر گزار ہے۔

آخر میں مَیں افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ کتابت میں اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں۔ سنگی چھاپے میں کتابت کی غلطیوں کا ہونا ایک ایسی معمولی بات ہو گئی ہے کہ مَیں نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا عذر پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ کامل طور پر صحیح لکھنے والا ایسا ہی کم یاب بلکہ نایاب ہے جیسے یورپ میں ہاتھی۔ لیکن اس کتاب میں صرف کاتب ہی قصور وار نہیں بلکہ ایک وجہ اور بھی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ لائق مترجم نے کتاب کا بہت سا حصہ ترجمہ کر کے خوش نویس سے صاف کرا لیا تھا اور کتاب

چھپنے ہی کو تھی کہ اتنے میں معلوم ہوا کہ انگریزی کتاب کا ایک جدید اڈیشن شایع ہوا ہے جس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے اور کتاب کی حیثیت بالکل دوسری ہوگئی ہے۔ اس لیے انھیں سرے سے پھر ترجمہ کرنا پڑا۔ اتفاق سے اسی اثنا میں انھیں یہاں سے جانا پڑا۔ یہاں چوں کہ طبع کا کل انتظام ہو چکا تھا۔ لہذا جلد جلد ترجمہ کر کے بھیجنا پڑا۔ خوش نویس سے صاف کرانے کی مہلت نہ ملی۔ مسودے ہی پر سے کاپی لکھی گئی۔ ایک تو علمی کتاب جس میں سیکڑوں غیر مانوس الفاظ، دوسرے جلدی میں لکھے ہوے مسودے سے کاپی لکھنا، تیسرے طبع کی جلدی، ان تمام وجوہات سے کتابت میں غلطیاں ہو گئیں ؛

کتاب کے آخر میں ایک مکمل فہرست انگریزی اصطلاحات کی معہ ترجمہ و تلفظ کے دے دی گئی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو اور نیز اُن لوگوں کو جنھیں اصطلاحات کے ترجمے کی تلاش رہتی ہے بہت سہولت ہوگی۔ علاوہ اس کے آیندہ جب اصطلاحات علمیہ کی اُردو لغت لکھی جائے گی تو اس سے بہت بڑی مدد ملے گی ؛

# مقدمۂ 'معرکۂ مذہب و سائنس'

(۱)

جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب 'شاہ نامہ' کو پڑھا ہے انھیں جنگِ سہراب و رستم کی دل کش داستان یاد ہو گی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آمادۂ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہول ناک سانحہ اور یہ پُر الم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی۔

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے۔ مصنف کا زورِ قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے[۱]۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔

---

[۱] میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث، دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو سی کم بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا مگر مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو درحقیقت قابلِ مبارک باد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے۔ لیکن یہ اسی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی فاضل مترجم کو حاصل ہے۔

پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہیں ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکڑ پکڑ اور دگدا میں رہے گا؟ کیا وہ یونہیں اندھیرے میں ٹاپک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اور نورِ ہدایت کبھی نہ پہنچے گا؟ رستم و سہراب کے حال سے تین شخص واقف تھے ایک سہراب کا ماموں ژندہ رزم جسے اس کی ماں نے اسی غرض سے اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ دُوسرا ہجیر، تیسرا کیکاؤس۔ لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ پہلا درحقیقت نیک نیّت ہے اور اسی کام کے لیے آیا ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کہے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دُوسرا طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو گیا اور اس نے جان بوجھ کر اس راز کو چھپایا۔ تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا۔ اسی طرح کی تین قوتیں مذہب و علم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جہالت، مخالفتِ حق اور نفسانیت۔ لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن مٹ کر رہے گی۔ حق کا بول بالا ہوگا۔ دونوں مخالف ایک دُوسرے کو جانیں اور پہچانیں گے۔ ظلمت کا پردہ درمیان سے اُٹھ جائے گا۔ دوستی دشمنی سے، رنج راحت سے اور ٹریجیڈی کامڈی سے مبدّل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کش مکش اور الجھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیوں کر؟ اسے ہم آگے بیان کریں گے۔

(۲)

بچّے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں۔ اُس کا ہاتھ پاؤں مارنا، غوں غاں کرنا، ڈر سے سہم جانا، پیار کرنے سے ہمک کر آنا، ماں کی محبت، غیروں سے وحشت غرض یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قویٰ کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قویٰ ادنا حالت میں ہوتے ہیں۔ جب بڑا ہو کر سیانا ہو جاتا ہے تو احساس اور خواہش کا زور شروع ہوتا ہے اور اعلا دماغی قویٰ کے نشو و نما سے نظامِ جسمانی کی قوّت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ احساس کی قوّت بڑھ جاتی ہے اور حسّی غدودِ اعصابی کی ساخت اور توسیع میں ترقّی ہونے لگتی ہے۔ یہ حالت جوانی دیوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تمیز حیوانی، احساس اور

خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قویٰ اپنا رنگ دکھاتے ہیں:۔

لہٰذا انسان کی نشو و نما کی تین صورتیں ہوئیں۔ حیوانی، احساسی اور عقلی:۔

قوّتِ حیوانیہ کے ذریعے سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر اسے اپنے افعال، جذبات و خیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے۔ مثلاً جسمانی ورزش (یعنی اعصابی حرکت) سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج والم یا غصہ یا دیگر جذبات کی وجہ سے آدمی نڈھال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لیے ہمیں غذا کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے انجن کو ایندھن کی، یہی ایندھن یا غذا عضلات یا اعصابی ریشے میں بدل جاتی ہے۔ جب ہماری قوت صرف ہو جاتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا کرنے کے لیے ایندھن طلب کرتا ہے اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آجائے گا اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتۂ حیات ٹوٹ جائے گا:۔

قوّتِ حیوانیہ قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی، حسّی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی ہے۔ تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشو و نما اور اس کے انتقال سے اپنی نسل کے نمو میں صرف کرتے ہیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا کی تلاش اور گھر کی ساخت اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل میں صرف کر سکتا ہے اور چاہے تو دماغی تکمیل میں۔ ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بہت بڑی مقدار کو حاصل کرتا ہے اور اسے وہ عضلات، گوشت اور خون کے بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی نسل کو بڑھائے۔ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اُس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور وہ خون کی لہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے۔ جس سے خاکستری رنگ کے عروقی مادّے میں اُکساؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی

ہی رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلطیف[1] گہری ہو جاتی ہے اور اکساوٗ کے لیے زیادہ گنجایش نکل آتی ہے۔ جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بہ طور فضلے کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب پسینہ وغیرہ کے ذریعے سے نکل جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر قوت جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راہ سے خارج نہیں ہو جاتی بلکہ دماغی ورزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دماغ میں رہتے ہیں اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لیے بہت سا حصہ قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح مستتر رہتی ہے۔

صرف غذا کے ذریعے سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر حس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ، سامعہ، ذائقہ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں، جس طرح برف آس پاس کی اشیا سے ایک مقدار حرارت کی جذب کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے اور جب برف پانی کی شکل میں مبدل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ اور زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح انجماد، سیلان اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے جو روشن جسم کے اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں۔ اور پیچھے کی طرف ریٹنا (تشبکہ) پر جا کر لگتی ہیں۔ اور اپنی حرکت دماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔ آواز بھی ہوا کی حرکت ہی ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو وہاں سے ڈرم (جوف طبل) میں تموج پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا گونجتی ہیں۔ اور وہاں وہ موسیقی کے خیال

---

[1] تلطیف، ترقی نمودن، مہربانی کردن

سے مبدّل ہوجاتی ہیں۔

غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ہم اس صدمے کی قوت کو جو سرخی کی شعاعوں سے مشبکہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے، بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر رہتی ہے جس طرح کہ سورج کی قوت کوئلے کی تہوں میں مستتر ہوتی ہے اور اس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے۔ اسی طرح سرخ روشنی کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں جاکر خیال میں مبدل ہوجاتی ہے اور حالتِ منفعلہ میں رہتی ہے۔

جہاں ادراک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ مادر زاد اندھے کے دماغ میں سُرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے، نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عالمِ خیال اور عالمِ مادّی دونوں میں یہ حالت یکساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا، سنا، سونگھا یا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کرسکتے۔

عالمِ خیال یادداشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے۔ یہ یادداشتیں ادراکات کے آثارِ باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے گا تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے۔ جب ایک مصوّر کوئی تصویر بنا رہا ہے اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے تو یہ مستتر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل اضطراری ہوتا ہے جسے تمیزِ حیوانی کہتے ہیں وہ احساسِ ظاہری کے تابع ہوتی ہے۔ تعقّل سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصابِ دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شاملِ مسل رہتا ہے۔ ادراک عقل کا

دروازہ ہے، احساس علم ہے بیرونی اشیا کا جو جسمانی اثر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادراک میں یہ اعصابی اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بہ وجہ اس توافق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی منظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات آوازیں ہمارے کان تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن جونہیں رکاوٹ رفع ہوجاتی ہے احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اکساڈ واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچے تھے خیال کی صورت قائم ہوجاتی ہے ؎

وہ اعصابِ دماغی جو احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذباتِ لطیف کی صورت میں تبدیل کرسکتا ہے مثلاً میں نے ایک شے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبے کو تحریک ہوئی دل سکڑنا اور دم گھٹنا شروع ہوا ؎

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دارالخلافہ ہے اور اسی کی وجہ سے انسان وحیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے بھیل یا گونڈ کی زندگی کا انحصار اُس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لیے اُس کی قوتِ حیوانیہ بہ نسبت دماغ کے جسم پر زیادہ تر صرف ہوتی ہے۔ بہ خلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصارِ زندگی عقل پر ہے اور اس لیے اس کی قوتِ حیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کم زور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوتِ حیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ ہم

یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہوجاتا ہے۔ یعنی قوّتِ حیوانیہ دماغی مادّے کی پرورش میں لگ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسی قدر عقلی فعل کم زور ہوجاتا ہے اور جس قدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہوجاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں۔ لیکن جذباتِ انسانی کچھ ایسے قابلِ وقعت نہیں سمجھے جاتے حال آں کہ یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ لہٰذا اب ہم ان کی طرف توجّہ کرتے ہیں۔ جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے رنج و راحت کا حساب انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو اُبھارتے ہیں کہ ایسا ڈھنگ نکال لیں کہ اُن خوش گوار اثرات کا پھر اعادہ ہوسکے لیکن یہ خلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذباتِ عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعے میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقّی کا خاتمہ ہوجائے۔ بال بچوّں عزیزوں اور دوستوں سے محبّت نہ ہو تو نہ کوئی خاندان ہو نہ لطفِ محبّت ہو۔ شکل، رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو فنونِ لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔

جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشوونما انسان کی بہبودی اور ترقّی کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقلی کی نشوونما۔ خیالات اور جذبات کا تعلّق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں اَن بَن ہوجاتی ہے۔ مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف

ہے، مگر عقل کہتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں اور یہی بنائے مخاصمت ہوئی ہے ؛

جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آجاتا ہے۔ ایک خبیث بدباطن کے چہرے کو دیکھیے کیسی پھٹکار برستی ہے بہ خلاف اس کے ایک نیک نفس زندہ دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجیے جیسے پھول کھلا ہو ؛

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعے سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی چڑچڑے اور غصہ ور ہو جاتے ہیں۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف۔ جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کم زور ہو جاتی ہیں ؛

غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنانہ ہے اور دوسری مردانہ۔ اگر صرف عقل ہی کی نشو ونما اور ترقی زیادہ ہو گی تو جذبات محدود اور کم زور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان ذکی الحس اور ہر دل عزیز اور کم عقل ہو جاتا ہے ؛

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لیے ؛

عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذبات مدنیت اور اُنس بہ حیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے اور بہ حیثیت جذبات کے وہ من جملہ اوروں کے ایک ہے۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پُرزور جذبات والے آدمی کے لیے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھُل مِل جاتا ہے کہ اس میں سے رفتہ رفتہ

رنگِ تشخّص غائب ہو جاتا ہے۔ اور خیالات کو باقاعدہ ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد سا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا، جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال رہتا ہے جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات ہمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی مائل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں اور اشیائے قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے ذریعے سے دماغی قویٰ اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا، ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا، ایک دوسرے کو حدِ اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیرِ حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علومِ نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن، پالٹیکس اور اتحاد مقاصدِ انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے، باہم اعتدال قائم رکھے اور قوتِ حیوانی کو دماغی اور احساسی حصّۂ جسم کی پرورش اور نشو و نما میں یکساں صرف کرے۔

(۳)

حیات کے دو مقصد ہیں۔ ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائشِ نسل۔

قوت کے انجذاب کے لیے ضرور ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے اور اس غرض سے کہ وہ مادہ اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے۔ حیات کے لیے ضرور ہے کہ اس میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساختِ اعضا ادنا درجے کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے اور جہاں ساخت پیچیدہ ہوتی ہے وہاں زیادہ ہوتی ہے۔

بہ قول لب مُنز کے حیات حجریات میں سوتی ہے، پھولوں میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں جاگتی ہے؛

اس معرفت طبعی میں ارادہ ہونا چاہیے زندہ رہنے، بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ہونی چاہیے جس کے ذریعے سے وہ سمجھے کہ کیوں کر زندہ رہنا، بڑھنا اور نسل بڑھانی چاہیے۔ بغیر اس تمیز کے ترقّیٔ حیات کے لیے مناسب اور غیر مناسب اشیا کا انتخاب کرنا ناممکن ہے اور بغیر اس ارادے کے کہ زندہ رہنا چاہیے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا؛

تمیزِ طبعی افزائش اور نشو و نما کا پیمانہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجود کی ضروریات سے اس طور پر ہے کہ حیات کے اُن دو مقاصد کے لیے کافی ہو۔ کیوں کہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کی قوت ایسی شے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضایع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشو و نما کے لیے روشنی کی ضرورت ہے اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اُس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مِل سکتی۔ جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھانا شروع ہوگا اور مر جائے گا؛

پودے کی نشو و نما کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اُسے کچھ تو اُس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے؛

حیوانی زندگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک جگہ نہیں بلکہ دُور دُور پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے کے لیے اُسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اُسے دی گئی ہے؛

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوئی ہے جو پودوں میں نہیں یعنی خوشی کا احساس۔

یہ اس وقت ہوتا ہی جب وہ ایسا فعل کرتا ہی جو اس کی کامل نشو و نما کا باعث ہوتا ہی۔ اور ایک احساس تکلیف کا ہی جو اس وقت ہوتا ہی جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے اگر اسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا ؛

حواس ارادے کو اُکسانے اور تمیز طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنے والا ہی۔ چھوٹا پرندہ انڈے کے اندر نہ صرف خیال کرتا ہی بلکہ اس سے فعل بھی صادر ہوتا ہی۔ کیوں کہ وہ نکلنے کے لیے خول توڑتا ہی۔ اور باہر نکلتے ہی دانہ چُننے کے لیے چونچ کھولتا ہی۔ قید کی حس نے اس کے ارادے کو اُبھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئے اور خول ٹوٹ گیا لیکن یہ تمیز طبعی کا کام تھا تجربے سے کچھ علاقہ نہیں۔ کیوں کہ اس سے بیش تر وہ کون سے ایسے محبس کو توڑ کر باہر نکلا تھا۔ اسی تمیز نے اس کی چونچ کھلوائی۔ یہ ننھا سا جانور زندہ ہی اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہی۔ اسے زندگی دی گئی ہی اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہی۔ چھوٹا بچہّ دنیا میں ارادے تمیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہی۔ زندہ رہنا اس کے لیے لطف ہی۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہی۔ اس خواہش کا پُورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہی۔ خواہش کا پُورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہی اور اس کی طلب اس کی پہلی کوشش ہی۔ کس تجربے نے اُسے یہ بتایا ہی کہ منھ اور گلے کے ذریعے سے دودھ کا پینا اس کی زندگی کے لیے ضروری ہی۔ یہ تمیز طبعی ہی جس نے اُسے اس فعل پر آمادہ کیا جس سے اُس کی بھوک کا احساس رفع ہوا ؛

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو ان کے حیوانی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے اِرد گِرد پائی جاتی ہی جہاں تک کہ اُس کی ذاتی نشو و نما یا اس کی نسل کی افزایش کا تعلق ہی یا تو اسے خوشی دیتی ہی یا تکلیف؛

نظامِ اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تمام جسم پر حسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے ہیں جس میں باریک باریک اعصابی ریشے ہوتے ہیں اور آپس میں خوب ملے ہوئے ہیں۔ سب سے بیرونی عصبیہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے حیوانات خیالات پر سے کام نہیں کرتے۔ سوائے اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کیلئے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائشِ نسل ؞

انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے۔ دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کر سکتے ہیں فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً ان کے بال یا پَر یا خول ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں، جہاں گرمی سردی کا گزر نہیں۔ لیکن جسمِ انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے احساس کرنے میں بہت تیز ہے تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے ننگا منگا آتا ہے لہذا اُسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوئی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لیے اُسے ایسی قوت عطا کی گئی ہے جو دیگر حیوانات کی تمیزِ طبعی سے اعلا ہے ؞

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لیے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے اور یہ قوت اس ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے ؞

بھیڑ مادہ اور قوت کو غذا کے ذریعے سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اُن کی شکل میں مادّے کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں بھی مادّہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے جو اسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے ؞

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی وسعت محض شہوانی

زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت سے اقوامِ انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعے سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصے کو منوّر کرتی ہے جسے حیوانی یا مادّی زندگی سے کچھ تعلق نہیں، ہمیں رنگوں کے تناسب، حسنِ صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے۔ حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں، احساسات اور قوّتِ ارادی کا محض بے کار جاتا ہے۔ انسان ایسی اشیا سے بے حد مسرّت اور لطف حاصل کرتا ہے جنھیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوش نما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھ کر کتّے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حال آں کہ انسان اس سے لطف اُٹھاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے دیکھنے سے اُس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے جو اس کی نشوونما کے لیے ضروری ہے یہاں تک کہ بچّے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں۔ لوری یا گانا سُننے سے انھیں بھی مزہ ملتا ہے۔ خوب صورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں؛

انسان کی ساخت میں حصۂ اسفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصۂ اعلا میں روحانی آلات۔ حصۂ اسفل کو ہاضمے اور توالد سے تعلق ہے اور حصۂ اعلیٰ قوّت حاصل کرنے کا آلہ ہے جسے حصۂ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے۔ حصۂ اعلا میں دماغ یعنی مقامِ عقل ہے۔ قوّتِ حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے فطرتِ حیوانی یا فطرتِ روحانی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں؛

وحشی اقوام میں قوّتِ حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہی اور دماغ بے کار ہوتا ہی۔ لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوّتِ حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہی اور شہوانی زندگی کم زور ہو جاتی ہی۔ کیوں کہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بے کار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لیے دُوسرا اعصابی مادّہ صرف ہوتا ہی۔ اور وہ ذرّات جو توالد و تناسل کے لیے ضروری ہیں بننے بند ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہوگی۔ کیوں کہ دماغی محنت میں وہ تمام قوّت صرف ہو جاتی ہی جو بہ صورتِ دیگر اُن ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی ہی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب توجّہ فطرتِ حیوانی کی طرف ہوتی ہی اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہی تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہی جیسے دُوسرے حیوانات میں تمیزِ طبعی۔ اس وقت وہ مسرّت جو حصولِ علم، ورزشِ عقل، احساسِ حُسن وغیرہ سے ہو سکتی ہی زائل ہو جاتی ہی۔ بہ خلاف اس کے جب عقل پر بے حد زور دیا جاتا ہی تو رنج و راحت کا وہ احساس جو اُن چیزوں سے حاصل ہوتا ہی جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہی اور فطرتِ حیوانی کم زور ہو جاتی ہی۔

رنج و راحت کا ادراک کیا ہی؟ یہ درحقیقت قوّت کی تحلیل کا نام ہی۔ چناں چہ دُوسرے حیوانات کی زندگی کو دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہی انھیں نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوش خط کتاب دکھاؤ اسے کچھ لطف نہ آئے گا۔ کیوں کہ اُس کے دماغ میں کوئی شی اُسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہی۔ اُس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہی جس میں شعاعیں آئیں اور نکل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ جس طرح مادّی قوّت ہی ایک روحانی قوّت بھی ہی اور روحانی توالد و تناسل کا سلسلہ عالمِ خیال میں جاری ہی مگر اس طرح نہیں جیسے

ہم عالمِ مادّی میں پاتے ہیں ؛

پان سو برس ہوئے ایک بڑے دانش مند نے ایک کتاب لکھی تھی اس کے خیالات میٹھے ننھے بیج تھے جو ڈال دیے گئے۔ میں نے اس کتاب کو کھولا اور پڑھا۔ اُن بیجوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعے سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی تخیل نسلاً بعد نسلٍ پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانے کی مناسبت سے ان میں تغیّر و تبدّل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب اُن اصلی خیالات کی زندہ اولاد ہیں جو اُس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی نہ تھا؛

قطعِ نظر اس قیاس کے ہم مادّی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوّت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوت ہی کے تغیّر و تبدّل سے روشنی، حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی تغیّر و تبدّل سے قوتِ افعال ارادہ، ادراک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے؛

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوّت کی تحلیل کا پتا لگتا ہے اور ہم اُس قوّت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہے اُس قوّت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی۔ رُوحانی زندگی میں بھی رنج و راحت قوّت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوّت کہ جذب ہوتی ہے وہ خیالات کے سلسلے سے نشو و نما پاتی ہے؛

مقصدِ حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشو و نما اور اس کی نسل کی افزائش ہے؛

رُوحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشو و نما ہے۔ جسم میں قوّت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفاع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشو و نما ہوتی ہے

حیات کے ذریعے سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشو ونما پا سکتی ہے۔ ہر درخت اور حیوان کی نشو ونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنھیں مادّی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت میں لیے جا رہی ہے۔ وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدّنی اور سیاسی ترقّی ہے اور اسی پر اُسے ساری ہمّت اور قوّت صرف کر دینی چاہیے۔ اس خیال کی بنا پر بنی نوعِ انسان کُل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آیندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربے اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقّی یافتہ ہے اور آیندہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقّی یافتہ ہوگا۔ غرض تمام توجّہ اور خیال انسان کی آیندہ ترقّی پر ہونا چاہیے۔ اور نیکی اور بُرائی اسی میں ہے جس سے عام بنی نوعِ انسان کی بہبودی یا مضرّت متصوّر ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقّی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقّی کرتی جاتی ہے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں جو وحشی اقوام میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے بدقوارہ ضعیف اور مریض افراد بچپن ہی میں مر جاتے ہیں۔ مہذّب ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھنے اور نشو ونما پاتے ہیں۔ کیوں کہ سائنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انھیں پھیلاتا اور آیندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں از روئے انتخابِ فطری ضعیف اور مریض خود بہ خود مر جاتے ہیں۔ مہذّب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا اور اس لیے قوم میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

سب سے ادنا جان داروں میں سب سے زیادہ افزایشِ نسل ہوتی ہے بعض

چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچّے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لیے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچّے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے غریب لوگ جنھیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام لینا پڑتا ہے، ان کے کثرت سے بال بچّے ہوتے ہیں۔ اعلا تعلیم یافتہ لوگ جنھیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے تمدّنی ترقّی تقسیمِ کار میں ہے۔ غیر متمدّن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا وہ اب بیس شخص کرتے ہیں پہلے ایک ہی شخص لوہار، بڑھئی، درزی، موچی، معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقّی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا، بڑھئی کا دُوسرا، درزی کا تیسرا، موچی کا چوتھا، معمار کا پانچواں۔ اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مِل گیا۔ اب جو اور ترقّی ہوئی تو ایک ہی پیشے کی کئی کئی شاخیں ہوئیں اور ہر شاخ کا کام علاحدہ علاحدہ شخص کرنے لگے اور روز بہ روز کام کی تقسیم کو ترقّی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے، دُوسرا لکھتا ہے، تیسرا صاف کرتا ہے، چوتھا اسے صحیح کرتا ہے۔ حال آں کہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیمِ کار ترقّی کی علامت ہے؟

انسان یہاں کچھ ایسے بکھیڑوں اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کی خوشی کا دار و مدار زیادہ تر اُس کی ذات پر ہے۔ اُسے یہ خیال ہرگز تسلّی نہیں دے سکتا کہ آیندہ دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اُس کی تکلیف یا درد میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دُوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلا درجے کی مہذّب نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقّی یافتہ اور مہذّب ہے۔ ایک گنوار یا کھیت کے مزدُور

کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہی۔ برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ۔ مثلاً لندن، پیرس، شکاگو، نیویارک میں جو چشم و چراغِ عالم کہلاتے ہیں، وہاں امرا خوشی کی جُستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں، دولت صَرف کرتے ہیں، لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قعرِ مذلّت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہٰذا محض تمدّنی و سیاسی ترقّی اور محض یہ خیال کہ آیندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلّی نہیں دے سکتا۔

اب دُوسرا جواب مذہبی عقیدے میں ہی۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور اُبھارتا ہی بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلّق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہی اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دے گا اور تمدّنی اور سیاسی ترقّی کی طرف لے جائے گا انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقّی کا باعث ہوگا۔ اُن قوی اور امتیازات کا وجود جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممیّز کرتے ہیں قطعی ہی۔ دُوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنی خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ اُن کی ذاتی نشو و نما یا ترقّی کا باعث نہ ہو۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیوں کہ وہ اس کی نشو و نما کے لیے ضروری نہیں ہی۔ بس وہ چیزیں جن کے لیے انسان کی حیوانی فطرت خواہش مند ہی ضرور حقیقی وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت دوڑتی ہی ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہی۔ تمیزِ طبعی ایک قسم کی خواہش ہی جو ہمارے وجود کے قانون کا اتّباع کرتی ہی اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہی۔

انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگاتا، اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگاتا ہے۔ جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی فطرت کی آواز ہے جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اس کی حیات و تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً ہر طریقہ گورمنٹ صحیح اصول پر قائم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصول کو پامال کر دیتا ہے تو اس طریقہ گورمنٹ میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعۂ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ کسی ایک صداقت میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور اُسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے روگردانی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے۔

(۴)

انسان میں دو طبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک تو ہر واقعے کے سبب دریافت کرنے کی چونپ ہے، دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

انسان کے دماغ پر دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی اشیا کا اثر حواس کے ذریعے سے۔ یعنی حس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیا اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مادر زاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت

قائم ہے، حاصل کرتا ہے۔ یہ مسرت، غصہ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آسکتے۔ گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالمات ہیں جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدا میں انھیں حاصل کرتا ہے۔

علّت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیزِ طبعی انسان کو علّت و معلول کی تلاش پر اُبھارتی ہے۔ کیوں کہ اس کی صداقت کا اُسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علمِ اخلاق کا مطالعہ بے کار ہوگا۔

علّت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علّتِ اولیٰ کہلاتی ہے اور بعد ازاں جو اس میں تغیّر و تبدّل کرتی ہے اُسے علّتِ ثانیہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اسے حرکت دے تو اس کی علّتِ ثانیہ پہلے جسم کی قوّتِ متحرّکہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علّت ہے۔ عللِ ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علّتِ اولیٰ پر جا کر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً عللِ ثانیہ کے سلسلے میں اس مصدرِ حرکت کو ٹٹولتا ہے جو خود بہ خود پیدا ہوئی اور جسے وہ علّتِ اولیٰ کہتا ہے۔

علّت کا خیال مفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اس کا تعلق جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علّت کے خیال کے لیے کافی نہیں۔ کیوں کہ اس کے متعلق یہ تصوّر کرنا ممکن ہے کہ وہ سلسلۂ علّت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ ہم اسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں

اب اگر ہم ان تمام اشیا کو جو نہیں ہیں الگ کردیں۔ نیز ہم یہ فرض کرلیں کہ کوئی اور ایسی شی نہیں ہی جو ان کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اُس نے حصّہ لیا ہو تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لیے بالکل ناقابلِ تصور ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہی ؛

جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہی تو اُسے اس حالت کے پیدا کرنے کے لیے ایک ایسی شی کی ضرورت ہی جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہی جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلۂ علّت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں ؛

کیا یہ عقیدہ قابلِ اعتماد ہی یا محض دھوکا ہی ؟

اگر یہ دھوکا ہی تو کیا وجہ ہی کہ انسان علّت کا خیال اُس واقعے سے متعلق کرتا ہی جو دُوسرے واقعے سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہی۔ چاند کی تبدیلی اور موج کی مد ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو موج کی مد کا باعث قرار دیا۔ لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی بیشی موج کی مد و جزر کی تابع ہی ؛

ایک کے بعد دُوسرے واقعے کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہی۔ اس میں کبھی تغیّر و تبدّل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہی کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علّت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا۔ دن رات کے بعد آتا ہی مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علّت یا سبب ہی ؛

علّت و معلول کا نتیجہ تجربے سے اور پختہ ہوجاتا ہی۔ تجربہ یقین کا معلّم ہی جس طرح احساس تمیزِ طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علّت کا ہونا ممکن ہی۔ کیوں کہ وجود کے خیال میں یہ ضرور نہیں ہی کہ قوت کا خیال بھی ہو۔ قوت

کا تصوّر ہو سکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہی ہے۔ اس طرح قوّت کا خیال تو ہم میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

علّت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشو و نما بلکہ ہماری اعلا ہستی کی ترقّی کے لیے بھی ضروری ہے۔ حیوان کو علّت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف عللِ ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کوّا تجربے سے بندوق دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلی تو مجھے چوٹ لگے گی یا مر جاؤں گا لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس لیے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجّب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربے نے اُسے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا۔ جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کرے گا اسی قدر اُسے ترقّی ہوگی۔ حیوان جو عللِ ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے، اسی حالت میں ہے۔

ادنا سے ادنا دماغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں قوّت ہے اور اُس قوّت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گو انسان ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رُکا ہم چلنے سے رُک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اس کے تمام افعال اس مختار قوّت پر مبنی ہیں۔ اُس کا یہ خیال کہ اُس کے افعالِ ارادی بعید اسباب کا نتیجہ ہیں وہ سخت منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدّت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

عالمِ مادّی میں انسان ایسی اشیا میں تغیّرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔

وہ ایسی حرکات دیکھتا ہی جس کا باعث وہ نہیں ہی اور ایسے نتائج دیکھتا ہی جن میں اس کا دخل نہیں ہی۔ اس لیے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہی جس پر اُسے کوئی قدرت نہیں، جو اس سے پیدا نہیں ہوتی، اور جو اس سے زیادہ قوی ہی؛

انسان میں قوائے دماغی مادّے پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسطِ انسان حرکت میں آتا ہی انسان اس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہی اور اُسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھتا ہی جو اس سے باہر ہی، اور اسی قسم کی ہی جیسی اس میں ہی۔ ایک ادنا عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب و علل میں پھنس کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی ہی مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہی۔ سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلۂ اسباب سے ہوتے ہوئے خود ذرا سرچشمۂ حرکت تک پہنچ جاتی ہی؛

باصرہ ایسی حس ہی جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہی لیکن سب میں ایک سی قوتِ بصارت نہیں ہوتی۔ صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا خوبی پر منحصر نہیں ہی، بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہی۔ یہی حالت چشمِ بصیرت کی ہی۔ بعض معلومات کے ذریعے سے علل کو زیادہ تیزی اور خوبی سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ادنا اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوتِ اولیٰ کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہی؛

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہی۔ اس لیے اس نے اس قوت کو جو نیچر میں پائی جاتی ہی اپنی قوتِ ارادہ کے مثل سمجھا تو اُس کا ایسا سمجھنا جائز ہی۔ جب اس نے ایسے معلومات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انھیں ایک ایسی قوتِ مختار سے منسوب کرنا جو مادّے کے اندر اور باہر ہی بالکل جائز ہی۔ یہی خدا کے خیال کی اصل ہی۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں اور درختوں، دریاؤں، پہاڑوں،

بادلوں اور ہواؤں میں ہوں خواہ ایک علّتِ اعلا ہو جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے:

اس مسئلے میں بنی نوع انسان کے عام اتّفاق کو گزشتہ زمانے کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغریٰ کبریٰ سے ایک ہی نتیجے پر پہنچی ہیں۔ الہام انسان کی ذات اور اصولِ علّت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر ذی عقل پر ہوتا ہے:

اب ہم انسان کی دوسری تمیزِ طبعی پر توجّہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے:

حجریات و نباتات سب میں قوّتِ انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شے دوسری اشیا میں سے اسی سے ملتی یا اُسے جذب کرتی ہے جو اس کے لیے مفید ہے۔ حجریات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے اِردگرد کی اشیا میں سے وہی چیزیں اور اسی قدر لے لیتی ہیں جو ان میں مِل سکتی اور ان کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔ ادویہ کی کیمیاوی ترکیب کو دیکھیے۔ ہر دوا دوسری سے گھُل مِل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیا سے وہی اجزا اور اسی قدر حصّہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے لیکن انسان میں دو حصّے ہیں مادّی اور غیر مادّی۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادّی خوشی اور مادّی نشو و نما کے لیے مفید ہیں۔ اور کبھی وہ اشیا جو قوائے حصّہ غیر مادّی کی نشو و نما اور مسرّت کے لیے ضروری ہیں۔ اور چوں کہ اس میں یہ دو حصّے پلئے جاتے ہیں اس لیے اس کی قوّتِ انتخاب ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کی طرف جاتا ہے جو مادّی خوشی کو بڑھاتی ہیں اور کبھی اُن اشیا کی طرف جو اس کی غیر مادّی مسرّت میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض انسان ان دو کششوں کے درمیان واقع

ہے جدھر زیادہ زور ہوتا ہے اُدھر ہی کھچ جاتا ہے۔ ایک طمعہ مچھلیاں دو کش مکش آپس میں ہے:

انسان میں یہ تخالف عجیب و غریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے۔ لہذا تمام تمیزاتِ حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں۔ لیکن اس میں جو دُوسری قوت ہے وہ اُسے بعض اوقات اس دائرے سے نکال کر ایک دُوسرے عالم میں لے جاتی ہے۔ جہاں اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے:

جس طرح تمیزاتِ طبعی مادّی زندگی کی فلاح کے لیے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح ادراک غیر مادّی حصّے کی فلاح میں بہ ذریعۂ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تمیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے:

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشمِ بصیرت کے سامنے بہت سی اشیا یا احساسات آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیا انتخاب کی جاتی ہیں جنھیں تجربہ اور تمیزِ طبعی اعلیٰ خیال کرتی ہے۔ تخیّل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعثِ مسرت ہیں اور اس مجموعے سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اور پھر انھیں اس طرف متوجہ کرکے ارادے کو اس کے حصول کے لیے چھوڑ دیتا ہے:

دیگر حیوانات میں تخیّل بہت ادنا درجے میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرے کو پیش کرتا ہے اور انھیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیّر کرکے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ بھی شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات کو پیش کرتا ہے۔ لیکن تخیّل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک حواس کی قائم مقام ہوسکتی ہے اور

چاہے تو سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے اور اس کی مدد سے غیر مادّی حصّہ اپنی سماعت اور اجازت کو بلا قیدِ مکان و زمان ان غیر مادّی صوَر تک پہنچا سکتا ہے جنھیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس پُر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے مشعل ہوتی ہے جس سے رستے پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے۔ تخیّل امید پیدا کرتا ہے لیکن اُسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تحقیق پر اُبھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے۔ لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا۔ دُوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے لیکن چوں کہ وہ کسی منتہا کا خیال نہیں کر سکتے لہذا اپنی حالت پر قائم ہیں :

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پُورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے منتہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے کوشش کرتا چلا جاتا ہے :

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منتہا وہی نہ ہو جو دُوسرے انسان یا دُوسری قوم کا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے، دُوسرا نیلے کو، تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزو کی طرف مائل ہے۔ اور اس کمال کا ایک رُخ دیکھتا ہے جو ان تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوب صورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوسِ قزح کے حُسن سے کم نہ ہو :

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دست رس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیال علّت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علّتِ انتہائی کی راہ سجھائی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علّتِ انتہائی میں وہ اپنے تمام ادراکات

کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادر، علیم و بصیر اور کمالِ عدل و خیر و حُسن سمجھتا ہے؛

کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بُری ہوتی۔ اُسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربے سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلے پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منتہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصوّر ہوتے نہ مغنّی؛

انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی دوسری محبّت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبّت کا جذبات سے۔ عقل چاہتی ہے کہ سب میرے تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلّق ان دونوں سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے؛

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے۔ انسان ایک علّتِ اعلا کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوّتِ انتخاب کی مدد سے وہ ایک منتہائے خیال کا تصوّر کرتا ہے۔ اور یہ منتہائے خیال اس کی محبّت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے؛

جہاں عقل اور جذبات میں اتّحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے؛

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں، وہ فلسفہ ہے۔ اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر توہّمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی

جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناواجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہیے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے۔ علّت العلل کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش، دوسرے کئی خداؤں کی پرستش سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام معلومات کی علت ہے۔ اور آریہ اقوام نے اُن قوتوں کو اُلوہیت کا درجہ دیا جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اس جھگڑے کو ہار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی بکھیڑوں میں پڑ گئے۔

(۵)

مذہب انسان کی گھٹّی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدّوجہد قائم رہے گی۔ اس کے محدود حالات اُس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔ یہ یقین ہے کہ علم بدلتا رہے گا۔ ایک قیاس ترک اور دوسرا اختیار کیا جائے گا۔ تحقیق میں تغیر و تبدّل ہوتا رہے گا۔ لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پرانے خیال کو بدل دے۔ لیکن وہ عقیدہ جو امٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کرے گا کیوں کہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت ققنس کی سی ہے۔ پیرِ فرتوت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انھیں شعلوں میں سے پھر زندگی پاتا ہے۔

جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا نئی نسلوں کے سپرد کیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کرے گا اسے اور اعلا کرے گا اور آیندہ نسلوں کے حوالے کر جائے گا۔ قرن در قرن اور صدی در صدی یہ کام یونہیں جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تخالف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم خدا کی معرفت پر منتہی ہو جائے گا:-

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدائے آفرینش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں:-

ایک انگریز لڑکے، ایک جاہل مسلمان، ایک معمولی ہندو، یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھیے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے وجوہات کو غور سے دیکھیے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب 'افریکینیا' میں لکھتے ہیں کہ "ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں اور موت کے بعد وہ روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے"۔ اس میں کچھ شک نہیں (جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے) کہ انسان بھوت پریت یا سایے سے خدا تک پہنچا ہے اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اُسے اپنے سایے یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں، درختوں، جانوروں اور دیگر مظاہرِ قدرت کے سامنے سر جھکایا

ہی۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پر زور بہتے دریاؤں یا سربہ فلک پہاڑوں کے سامنے جھکایا؟ کہا جاتا ہی کہ اس کی وجہ ڈر ہی۔ ڈر تھا تو بھاگ جاتے چھپ جاتے۔ لیکن بجائے اس کے انھوں نے ایک ایسی قوّت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازلی ہی۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے۔ لیکن کیوں انھیں رُوح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال اُن بچوں تک میں پایا گیا ہی جو الگ رکھے گئے جنھیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی بلا امداد غیرے صرف اپنے خیال اور اپنے تجربے سے یہاں تک رسائی کی ہی اور اُن میں خدا کا خیال اور رُوح وجسم کا امتیاز پایا گیا ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہی اور ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہی۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہرِ قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہی صحیح نہیں ہی کیوں کہ مختلف مرحلے طی کر کے کسی شی تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شئ بے اصل ہی۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال، فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول تمام ایجادات واختراعات کو اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انھیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سُراغ لگایا ہی۔ یہ چیزیں انسان کو اتنا ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک دُوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

(۶)

علمائے طبیعیات د بعض دیگر فلاسفۂ حال وقدیم کا دعویٰ ہی کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہی۔ مگر استقرا کیا ہی؟ تجربے کے ذریعے سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن

ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چوں کہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آیندہ بھی انھیں حالات میں وہی واقع ہوگا۔ یہ مانا کہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالم گیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیوں کر معلوم ہوا؟ تجربے سے! تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہوگا:۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بہ وجہ تجربے کے!

تجربے پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لیے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقشِ قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی پائی جاتی ہے!

یہ ہم کس لیے مانتے ہیں کہ اصولِ نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے؟

بہ وجہ تجربے کے!

تجربے پر ہمیں کیوں یقین ہے؟

اس لیے کہ نیچر میں اصولِ یکسانی پایا جاتا ہے!

اسی طرح استدلال کرتے جائیے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور شے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دار و مدار ہے۔ وہ شے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیزِ فطری ہے۔ بین کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شے کی مشابہت جو ہمارے تجربے میں آچکی ہے اس شے سے جو تجربے میں نہیں آئی ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جب کہ تجربے نے ابھی اُسے ثابت نہیں کیا تھا:

لہٰذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ کیوں کہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیزِ فطری پر ہے جو تجربے سے مقدم ہے۔

صرف ایک قوت ہے جو بلا واسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ قوتِ ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں۔

میری قوتِ ارادی دوسری قوتوں کی دریافت کرنے والی ہے۔ ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دار و مدار ہے وہ یہ ہے کہ میں عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں۔

مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفتِ طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں اور کر رہا ہوں۔ یہ تمام امور معرفتِ طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ "میں خیال کرتا ہوں لہٰذا میں ہوں" اس منطق سے باہر ہے۔ کیوں کہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں اور میرے ہونے کا علم مجھے اس وقت بھی ہے۔ میں ہوں اس لیے کہ میں ہوں۔ یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں یا ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفتِ طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے شکوک کرنے سے

عقل کو بے دست و پا کرنا ہی اور یہی شکوک ہیں جو رُوح کے متعلق کیے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہی کہ ہم میں کوئی شے غیر مادّی نہیں۔ ہمارا اوّلین اور یقینی علم وہ ہی جو حواس کی رپوٹ سے قبل ہی اور حواس کے تابع نہیں۔ لیکن جب حواس کی رپوٹ وصول ہوتی ہی تو عقل اس کی خبر دیتی ہی۔ حواس اور عقل مل کر ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں ؁

ممکن ہی کہ مادّئین کہیں کہ یہ عقل مادہ ہی۔ سوال یہ ہی کہ یہ کیوں کر معلوم ہوا جب کہ یہی نہیں معلوم کہ مادّہ کیا ہی ؟

یہ یقینی امر ہی کہ مَیں ہوں اور جب مَیں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر مَیں کیسے یہاں آیا؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور اور ان سے پہلے اور۔ اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو مَیں بے سبب ہوں۔ مگر تمام نوعِ انسان ایسی ہی ہی۔ یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ماسبق اسباب کے بعد ظہور میں آئی جن میں قوتِ تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہی۔ مَیں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ مَیں ہوں، مَیں خیال کرتا ہوں، مَیں ارادہ کرتا ہوں۔ مَیں اپنے گرد اوروں میں بھی انھیں تین چیزوں کو پاتا ہوں۔ لیکن ان میں سے کوئی یا سب مل کر بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ مَیں یقیناً غیر فانی ہوں۔ مَیں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہٰذا میرا سبب کوئی اور ہی جو ان سب سے بالا ہی۔ سوا اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا ؁

ہم جو کارگاہِ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہی کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے۔ آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیوں کر ہو سکتا ہی ؟ صرف ایک طریقہ ہی۔ اپنی قوتِ ارادی سے ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے، اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں اور یہ تمام قوتیں ظہور میں اس قوتِ ارادی کا

جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے ؛

(۷)

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شے بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے اور ایک ذرّہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے اور سمجھتا ہے کہ مَیں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادّے کے کون سے سالمے (جزو دیمقراطیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے۔ اُس میں جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اس میں جو آتا ہے؟ کیا آکسیجن ہائیڈروجن کا سالمہ (جزو دیمقراطیسی) معرفت طبعی (کان شس نس) حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے اور کیا آنے والا جزو دیمقراطیسی آتے ہی معرفتِ طبعی حاصل کر لیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہیے جس میں یہ معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے اور جس کا ان سالمات کی مسلسل آمد و رفت پر عمل ہے۔ اور ادراک جس کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادّی ہے اور جو روح کہلاتی ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیلِ ہیئت ہے لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرّات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر مادّی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں مگر ان اعصاب اور ریشوں سے معرفتِ طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصّوں کے مختلف کام ہیں جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں۔ لہٰذا اس معرفتِ طبعی کا یکساں حالت پر رہنا اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اعصاب اور دماغی اعضا ادراک کے

تابع اور کارکن ہوں جو سب کا صدر نشین ہے اور سب پر حاوی ہے۔ علمِ فزیالوجی (علم کاسۂ سر) جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دہریت کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس پر اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا ؎

مشہور سائنس دان مسٹر پراکٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر کے لیے بہ وجہ ضرب کے بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس میں معرفتِ طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے وہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے مرگیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ زور سے لگے تو وہ مرجاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اس میں معرفتِ طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفتِ طبعی (کان شس نس) حاصل کرتا ہے تھوڑی سی ضرب سے وہ بے ہوش ہو کر پھر ہوش میں آجاتا ہے زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا کیوں کہ فی الحال یہ اس کی دست رس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے سرتاجِ علمائے سائنس کہنا چاہیے اور جو عین اسی زمانے میں جب کہ ڈاروِن اپنی مشہور آفاق کتاب "اوری جن آف سپی شیز" لکھ رہا تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات سے انھیں نتائج پر پہنچا جو ڈاروِن نے قائم کیے تھے اور جب اُس نے اپنا رسالہ ڈاروِن کے پاس رایل سوسائٹی میں پڑھنے کے لیے بھیجا تو ڈاروِن دنگ رہ گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصاً وہ علم جسے ہم روحانی کہتے ہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ جب کبھی اہلِ سائنس یا کسی زمانے کے عام معلمین

نے ایسے واقعات سے جو بہت سے اوسط درجے کے ایمان دار اور ذہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کیے ہیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانونِ قدرت کے خلاف ہیں تو یہ منکرین ہمیشہ غلطی پر ثابت ہوئے ہیں۔ چناں چہ اس فاضلِ عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں اور بعد کامل غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بے شک روحانی قوت موجود ہے اور جو مظاہرِ روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اور نہ صرف اس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر نوبل، سر جان فوربس اور ڈاکٹر کارپنٹر اور دیگر علمانے بعد تحقیق کے اس کی اصلیت کو تسلیم کیا۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنھوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے اور اگرچہ اکثر علمائے سائنس ان شہادتوں کی پروا نہیں کرتے اور ہنسی اُڑاتے ہیں لیکن اس امر کا پُورا پُورا یقین ہے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اس کمیشن کا بھی مفصّل حال لکھا ہے جو اس امر کی تحقیق کے لیے بیٹھا تھا اور جسے بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوّت بے شک ایک ایسی قوّت ہے جو مادّے سے الگ اور بالا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس داں تھے۔

(۸)

انسان جو اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لیے ہے جس نے اپنی بساط سے زیادہ قدم مارا ہے اور اسرارِ عالم کے دریافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنی آس پاس کی اشیا پر غور سے نظر ڈالے گا تو ہر چیز نئی اور پُراسرار معلوم ہوگی اور ایک ذرّے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی بے خبر پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت سے۔ جب ہم اس کرّے پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع

نظر آتا ہی اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس ترقّی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حاوی نہیں ہوے۔ لیکن نظامِ شمسی کے مقابلے میں یہ بہت ہی چھوٹا ہی اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اور نظام موجود ہیں اور یہ عالمِ سیارگاں کے مقابلے میں ایک نقطے کے برابر ہی تو معلوم ہوتا ہی کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشو و نما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہی اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے اور بننے میں صرف ہوا لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظامِ شمسی کے زمانۂ نشو و نما سے کیا جائے تو بہت ہی کم ہی اور بہ مقابلہ عالمِ سیّارگان ایک لحظے کے برابر ہی اور ابدالآباد کے مقابلے میں ہیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھ کر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے اُس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہو سکتی ہی۔ یہ ظاہر ہی کہ ایک زمانے میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرد ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہی اُس سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ اس آتشیں مزاج کُرّے کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہوں گے۔ جب نظامِ شمسی کے ایک بہت چھوٹے سے کُرّے کی حالت درست ہونے میں اس قدر عرصۂ دراز لگا تو خیال کرنا چاہیے کہ اُن کرّوں کے لیے جو اس سے سیکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ جب انسان یہ سوچتا ہی کہ سورج سے بھی بڑے بڑے سیّارے موجود ہیں اور نظامِ شمسی جیسے دُوسرے نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اَور اور ان کے بعد اَور اور یہ سلسلۂ نامتناہی یوں ہی چلا جاتا ہی تو خلائے بسیط کا خیال حدِ وہم سے گزر جاتا ہی۔ اسی طرح جب زمانے کا خیال کرتا ہی کہ ایک ادنیٰ اور حقیر کُرے کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس لگ گئے ہیں تو اس کُل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت

صرف ہوا ہوگا تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ کس ترتیب و قاعدے سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اس حکیمِ مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و وہم میں نہیں سما سکتی جو اس کارخانے کا چلانے والا ہے؂

ممکن ہے کہ ایک سائنس داں یہ کہے کہ یہ سب وہم ہے کائنات میں سوائے مادّہ اور سالمات کی حرکت اور کشش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسمانی خلا میں مادہ ہی مادّہ منتشر ہے جس کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرّات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں سے گاس نکلتی ہے جو "نیبولا" (ضبابہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہ ضبابہ نظامِ شمسی کے احاطۂ کشش کے اندر آکر سورج کی مدوّر راہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر بعض ان میں سے ہمارے کرّے کے پاس سے گزرتے اور اس میں آ داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں۔ یہی اجسام بے انتہا اصلی سیارے اور شموس ہیں۔ ان کی ترکیب انھیں عناصر سے ہوئی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ثوابت کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں ہمیں اس مادّے کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے عالمِ سیارگان میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی وسعت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالتِ ماسبق کیا تھی؟ یہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزائے لایتجزّے کی حالت میں تھا، اُس صورت میں کب سے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی اجزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیوں کہ پھر ہمیں اُن قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہوگا جن کے زور سے یہ اجزائے لایتجزّیٰ

مادے اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوے۔ اس سادہ سے سادہ قوّت میں کہاں سے اتصال پیدا ہوا؟ یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر پُر اسرار قوّتِ ثقل کہاں سے آئی جو غیر محدود، غیر متبدّل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہی؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لاینحل مسائل ایتھر ہیں۔ ایتھر کیا ہی اور مادّے سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ وہ قوتیں کہاں سے آئیں جو ایتھر سے کپکپاہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت، روشنی، الکٹرسٹی کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیلِ ہیئت، حرکات سالمات اور مادے کی اُن بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشو و نما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً کبھی نہ ہوگا۔

قدیم سے قدیم نظریۂ مادّہ سے لے کر جدید سے جدید نظریے پر غور کرو۔ ہر ایک میں یہی لاینحل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی اس کائنات کی علّت العلل کے قریب نہیں پہنچاتا۔ اور زیادہ سے زیادہ بہ قول ہربرٹ سپنسر "تمام مظاہر میں ایک نامعلوم اور ناقابلِ دریافت قوّت کے ظہور کا ادراک" ہوتا ہی یا جیسا کہ اسی علامۂ دہر نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا "ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہی اور پھر اس سے پرے جہاں وہم و خیال کے پَر جلتے ہیں۔ جب اس معلوم کا اُس نامعلوم اور غیر محقق وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہی تو خیال کی یہ ساری تحقیق ہیچ و بے حقیقت ہو جاتی ہی۔ یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلے میں ہمارے بے انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں، ایسا ہی کہ اس کے ذِکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کچھ عرصے سے یہ طبعی ادراک کہ یہ غیر محدود خلا بغیر کسی اصل اور سبب کے موجود رہے گا، میرے دل میں ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہی کہ اس کے سامنے مَیں سہما جاتا ہوں"۔

(۹)

مادّیین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہرِ عالم کی گتھی سلجھانے کے لیے کافی ہے۔ رُوحانی یا الٰہی اثر سب فسانہ ہے۔ ویماقریطس سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ ہر زمانے میں تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ فلاسفہ اور علمائے علومِ طبیعیات کو اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قائم کریں کہ جس سے تمام اشیا اور مظاہر کی کنہ دریافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیاوی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کیسی ہی تبدیلی اس میں کیوں نہ واقع ہو جائے نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علمِ طبیعیات کی رُو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوت خواہ کسی شکل وصورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ تو فنا ہو سکتی ہے اور نہ پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر علمِ کیمیا کی رُو سے ایسے مرکبات ترتیب دیے گئے جو اب تک بغیر قوتِ حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور آخر بڑھتے بڑھتے اوّل مادے کے متعلق نظریۂ اجزائے دیمقراطیسی قائم ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لاتیجزّے۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان دہریت اور مادیت کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہرِ عالم کا باعث ہے۔ اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے؟

اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادے کا اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے۔ اور اُن کا باہمی کیا تعلق ہے۔ دُوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے سے بالکل آزاد ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر ہم مظہر کو بغیر مادے کے نہیں

پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور وافی باعث ہو؟ فرض کرو کوئی مظہر معلوم ہو۔ اُس کے چند اسباب قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے کافی باعث ہیں یا نہیں۔ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شی کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہو اور جو اب تک سبب نامعلوم تھا۔ مثلاً جب سیارہ یورینس دریافت ہوا تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سورج کے گرد گردش کرتا ہو اور جو دائرہ وہ بناتا ہو اس کے لیے صرف سورج کی اور بعض چھوٹے سیاروں کی کشش جو یورینس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سورج کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرے کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہی کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔ ان مہندسوں نے محض ریاضی اور ہندسے کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہو نہ ہو فلاں مقام پر کوئی اور ستارہ یورینس سے پرے واقع ہو جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہو۔ چناں چہ بعد میں اس مقام پر دوربین کے ذریعے سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب نیپچون کہتے ہیں۔ اسی طور پر ہم اس عالم کو لیتے ہیں اور مادے کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پوری پوری آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس کا کافی باعث ہو یا کوئی اور شی بھی ہو جو اس کا تکملہ کرتی ہو اور مادے سے خارج ہو؟ پس اگر کوئی ایسی شی ہو تو یہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہو اور اس کے بعد ہم مادے کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذاتِ خود قائم اور کافی ہو ؛

مظاہرِ کائنات جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور سے یہ ہوگی:۔

۱ ۔ قوت۔ جو حرکتِ اتصالِ اجزائے لایتجزّا اور کششِ کیمیاوی سے ظاہر

ہوتی ہے ؂

۲ - حیات - حیوانی یا نباتی

۳ - قوّت - مدرکہ

۴ - ادراکِ طبعی (کانشس نس)

۵ - جذبات اخلاقی مثلاً محبت، رحم وغیرہ۔

ہماری سب سے اوّل تحقیق یہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مظہر یا مظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادّے سے اس قدر الگ ہوں کہ مادّہ ان کا باعث نہ ہو یا باعثِ جزوی ہو؟ قوّت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انھیں سوائے مادّے کے تعلّق کے کسی اور طرح نہیں جانتے۔ اب رہی قوّتِ مدرکہ اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادّے سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظامِ اعصابی قوّتِ مدرکہ کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر کہ تمام افعالِ ادراکی کا تعلّق اس نظام کی ساخت اجزائے لاینجزٰے کی حرکت سے ہے اور یہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہ ہر حال اس میں شبہ نہیں کہ قوّت بلا شرکتِ مادّہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتی ؂

مگر اس میں شک نہیں کہ ادراکِ طبعی (کانشس نس) یعنی خالص قوّتِ مدرکہ پر غور کرنے کا فعل مادّے سے بالکل بے تعلّق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً محبّت یا رحم بھی مادّی تعلّقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادّے سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادراکِ طبعی (کانشس نس) کو اُن دیگر ادراکی افعال سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلّق دماغ کے تغیّراتِ اجزائے لاینجزیٰ

سے ہی اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور دماغ پر کس قدر اثر پڑتا ہی مثلاً دفعتاً سر میں درد ہونا، چہرے کا سرخ ہو جانا، نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہی کہ ہم مادّے کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف سے مادّیین کی بن آتی ہی۔ کیوں کہ مظاہرِ عالم کہیں بلا تعلقِ مادہ نہیں پائے جاتے۔ اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ہوتا ہی لیکن اس سے یہ ضرور نہیں کہ صرف مادّہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و وافی ہی۔ اب دیکھنا یہ ہی کہ اگر ایسا نہیں ہی تو کون سی شے ہی جو اس کا تکملہ کرتی ہی؟

شاید یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہ ہر حال یہ یاد کرنا چاہیے کہ مادّے کے وجود کی شہادت سوائے قوتِ مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہی۔ یعنی مادّے کا وجود خود قوتِ مدرکہ کا نتیجہ ہی جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا یقین کرنا چاہیے اور قوتِ مدرکہ کے نتائج کا اعتبار نہ کرنا چاہیے انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ مادّہ حس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق قوتِ مدرکہ سے ہی جو حواس کے واقعات سے نتیجہ نکالتی ہی۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی نے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہی۔ میں یہاں اس کے فلسفے کو بالتفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسی قدر اشارے پر کفایت کرتا ہوں؀

مادّے کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے اب تک تسلیم کی گئی ہیں۔ ٹھوس جیسے برف، سیال جیسے پانی اور دخانی جیسے آکسیجن یا ہیڈروجن۔ بعض اہلِ سائنس نے ایک اور حالت بھی اضافہ کی ہی جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہی اور وہ شعاعی کہلاتی ہی؀

مادّے کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہی کہ وہ اجزائے لایتجزّے سے بنا ہی۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جن میں مادّے کے تمام خواص موجود ہیں اور ان کے باہمی

تعلق کو قوتِ اجزائے لاتیجزّٰے کہتے ہیں۔ اور ہر جزوِ دیمقراطیسی کسی نہ کسی کیمیاوی عنصر کے ایک یا ایک سے زاید اجزائے لاتیجزّٰے سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے اجزائے دیمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیاوی اتّصال کے قوانین کی رُو سے عمل میں آتا ہے ؛

یہ اجزائے لاتیجزّٰے اور اجزائے دیمقراطیسی کیا ہیں ؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طرح استدلال اور قیاس سے حاصل ہوا ہے جیسے رُوح کا ہے۔ جزوِ لاتیجزّٰے میں چند خواص و صفات مانی گئی ہیں ؛

اوّل قوتِ اتّصال یا کششِ اجزائے لاتیجزّٰے۔ یہ قوت ہے جو ہر شے کو جو جزوِ لاتیجزّٰے سے بڑی ہے مجتمع رکھتی ہے۔ یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ، حالتِ سیّال میں کم اور حالتِ دخانی میں بالکل نہیں ہوتی ؛

دوم۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزوِ لاتیجزّٰے ایک ارتعاشی حرکت سے بے چین رہتا ہے اور اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادّے کی ٹھوس، سیّال، دخانی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں ؛

سوم۔ ہر جزوِ لاتیجزّٰے میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکتِ اندرُونی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی حرکت کُل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصّہ جزوِ لاتیجزّٰے کی دُوسرے حصّے پر۔ مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصّہ الگ ہو جائے اس حرکت میں کپکپاہٹ پائی جاتی ہے۔

چہارم ہر شے کے اجزائے لاتیجزّٰے ایک ہی جسامت کے خیال کیے گئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصّہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو

قسمیں پیدا کرنا جو مختلف جسامت کے اجزاے لاتیجزاے سے بنی ہوں ناممکن ہی؛
اس سے مفصلہ ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

۱ - ایک شی کے اجزائے لاتیجزاے بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں مگر دوسری اشیا کے اجزا سے مختلف ہوتے ہیں ؛

۲ - مختلف اشیا کے اجزائے لاتیجزاے جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور اُن میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی ؛

۳ - ایک شی کے اجزائے لاتیجزاے اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور اسی لیے اس روشنی میں بھی جو اُن سے نکلتی ہی ؛

۴ - کسی جزوِ لاتیجزاے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی ؛

مادے کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہی اور نہ طبیعیات کی کسی کتاب سے اس تعریف کا پتا لگتا ہی۔ لیکن نظریۂ اجزائے لاتیجزاے کا (جو مادے کے متعلق جدید نظریہ ہی) صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہی۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں سے ایک جزوِ لاتیجزاے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو مادے کا ہی جس میں تمام صفات و خواص مادے کے موجود ہیں۔ یا تو یہ سادہ یعنی مفرد ہی جیسے آکسیجن کا جزوِ لاتیجزاے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے دیمقراطیسی ہائیڈروجن کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں جزو دیمقراطیسی ایک مرکب شی ہی کیوں کہ از روئے علمِ کیمیا اس زمین پر تخمیناً ستر اشیا ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی (بہ شرطے کہ وہ ترکیب پا سکے) مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہی۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملاتی ہی اور بعض کو رد کر دیتی ہی۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بہ وجہ کیمیادی کشش و اندفاع الگ اور مختلف ہی۔ ہم نے اجزائے لاتیجزاے اور اجزائے

دیمقراطیسی دونوں کو دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالا نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ستر اشیا ایسی ہیں جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بے شمار ایسا مواد تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لایتجزٰی کے گدام کے لایق ہے۔ جزوِ لایتجزٰی کیمیاوی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبیعیات کی رُو سے بھی مرکب ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنی اس کے ایک حصّے کی حرکت دُوسرے حصّے پر جس سے کہ آس پاس کے ایثر میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لایتجزٰی میں مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا اجزائے لایتجزٰی اصل مسالا نہیں ہیں بلکہ بہ ذاتِ خود ایک کامل اور عجیب شے بنائی گئی ہے جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے:

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لایتجزٰی دیکھتے ہیں اور دُوسری طرف سادہ اور مفرد عناصر جن سے اجزائے لایتجزٰی بنے ہیں۔ لیکن کہیں اصل مسالا جو تمام اشیا کی اصل ہے نہیں ملا۔ مگر باوجود اس کے ہر طرف ہم انتظام و ترتیب میں عقل و حکمت کی بیّن شہادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں:

یہ ہے وہ مادّہ جسے عالمِ علومِ طبیعیات و کیمیا تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبیعی اجزائے لایتجزٰی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا وجود ہوتا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لایتجزٰی میں نہیں کیوں کہ اس نے اُسے کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادّی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لیے اُس کا خیال ہے کہ یہ صفات اجزائے لایتجزٰی ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک عالمِ علمِ کیمیا اجزائے دیمقراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اُسے معلوم ہے لیکن اجزائے دیمقراطیسی میں نہیں۔ کیوں کہ اس نے کبھی ایک جزوِ دیمقراطیسی کا تجربہ نہیں کیا بلکہ انھیں بڑے بڑے مادّی مجموعوں میں پایا۔ وہ ہائیڈروجن کے جزوِ دیمقراطیسی

میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہو جسے وہ درحقیقت ہائیڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہو۔ طبیعیات وکیمیا کے واقعات اجزائے لاتیجزّٰے اور اجزائے ذیمقراطیسی میں ادا ہوتے ہیں۔ اور اجزائے لاتیجزّٰے اور اجزائے ذیمقراطیسی از روئے تعریف کافی سبب ہیں اُن نتائج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کیے گئے تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں لیکن وہ اصطلاحات اجزائے لاتیجزیٰ اور اجزائے ذیمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لیے وہ اس نظریے پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن دیکھنا یہ ہو کہ یہ نظریہ بھی اُن واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہو کچھ روشنی ڈالتا ہو یا نہیں۔

کیا نظریہ اجزائے لاتیجزّٰے اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہو؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہو کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتلۃ الاولیٰ (پروٹوپلیزم) سے ایسا گہرا تعلق ہو کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ اور اگرچہ کتلۃ الاولیٰ کے کیمیاوی اجزا بہ خوبی معلوم ہیں اور انسان انھیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہو لیکن نہ تو کتلۃ الاولےٰ پیدا کر سکتا ہو اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم اُن صفات کو لیں جو از روے جدید سائنس اجزائے لاتیجزیٰ میں پائی جاتی ہیں اور اُن کو ہزار ملائیں ہزار اُلٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کششِ اجزائے لاتیجزّیٰ کی حرکتِ مدامی اور اُن اجزا کی کپکپاتی ہوئی حرکت، یہ سب مل کر بھی اُس نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اصل بنا اور ساختِ کائنات

کی جزوِ اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی ؛

جب حیات صرف اجزائے لاتیجزیٰ یا مردہ مادے سے پیدا نہیں ہو سکتی تو پھر قوتِ مدرکہ کہاں ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہلِ سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوتِ مدرکہ مادے کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے جب قوتِ مدرکہ کا یہ حال ہے تو کانشس نس (معرفتِ طبعی) تو اس سے بھی کہیں پرے ہے۔ کیوں کہ معرفتِ طبعی کے معنے ہیں قوتِ مدرکہ کا اپنے باطن پر غور کرنا اور یہ اجزائے دیمقراطیسی کے ترتیب دینے، ملانے اور اُلٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہم دردی کے جذبات ہیں ؛

ممکن ہے کہ مادیئین میں سے کوئی یہ کہے کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پذیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہوگی مادے کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کر سکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر مادے کی تعریف میں وسعت ہو جائے گی تو اس کے ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوتِ مدرکہ اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہو جائے گی۔ جس قدر اجزائے لاتیجزیٰ کی تحقیق میں زیادہ تہ کے اندر جاؤ گے اسی قدر اجزائے لاتیجزائے کے پیدا کرنے کے لیے قوتِ مدرکہ کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی۔ اگر نباتات اجزائے لاتیجزیٰ کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لاتیجزیٰ کے وجود کے لیے بے شک قوتِ مدرکہ کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ غرض اس مشکل کو جس طرح چاہو حل کرنے کی کوشش کرو ایک ایسی چیز ماننی پڑے گی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادے سے الگ نہیں پاتے۔ کیوں جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ،

تجربہ محض یک طرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوتِ مدرکہ سے تعلق رکھتی ہے اور اُسے اپنے ساتھی مادّے پر فضیلت ہے۔

یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ رُوح جسم کی قید سے الگ ہو کر بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مادّے کا نظریہ اجزائے لاینجزیٰ اور اجزاے دیگر ایسی کے ذریعے سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسی خالق اور منتظم قوتِ مدرکہ کی شہادت دیتا ہے جس کی ہستی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے۔

(۱۰)

نظامِ کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے کہ مادّے سے بالا ہے جسے ہم رُوح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت ابھی اور ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اصل یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بے خبر ہے اور اس بے خبری میں اس پر حملے کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے۔ پچھلی صدی میں جب کہ سائنس کی ترقی معراجِ کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملے کرنا، اس کی ہنسی اُڑانا اور اُس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہلِ سائنس و فلاسفہ و حکما اور اکثر بڑے بڑے مصنّفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا اور یہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بوڑھیوں کی کہانی اور بچّوں کا کھیل ہے۔ یا ایک ہیچا ہے جس کا ڈر زمانۂ طفلی سے بیٹھا ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پُرزور اور بے جا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہو گی وہ اُن پیچیدہ مسائل

اور گتھیوں کو سلجھائے گا جو اب تک لاینحل سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن خود اس کے زور نے اسے کم زور کر دیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہلِ سائنس مخمور تھے اُترنے لگا اور باوجود حیرت انگیز ترقّی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا۔ انگرسال اور بریڈلا جیسے اعدائے مذہب بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایگ ناسٹک (لاادریہ) کے بانی پروفیسر ہکسلے کے پُرزور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی اب دھیمے پڑ چکے ہیں۔ وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہی چلا ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس نے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشّان انقلابات پیدا کیے اور اس کی ترقّی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدّن کے ہر پہلو اور ہر روش میں نظر آتا ہے۔ اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی اور آیندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہلِ سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس مہتم بالشّان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دُوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انھوں نے سائنس کے بھرّے میں اس سے منھ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھ کر سمجھ لیا کہ دُوسری طرف کچھ نہیں۔ حال آں کہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقّی پر نظر ڈالی جائے تو منظر زیادہ وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہلِ سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انھوں نے انسانی ترقّی اور تہذیب و تمدّن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتّفاق سے نہیں آتی تو کیا مذاہب جنھیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل و تصرّف اور قوت

ہی مہمل اور لغو ہیں؟ کیا انھیں انسانی ترقّی وتہذیب وتمدّن میں کچھ بھی دخل نہیں ہے؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہلِ سائنس اور فلاسفہ کو غور کرنا چاہیے تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انھیں کبھی اس طرف متوجّہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رہی اور ابتدا سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ کیا کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے بلکہ بجائے تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے اس جلتی آگ میں اور تیل ڈالا۔

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک زینے سے دوسرے زینے پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ترقّی پر بہ حیثیتِ مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب وغریب اور عظیم الشّان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھجک کے رہ جاتا ہے۔ سب سے اوّل اسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا۔ اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقّی کرتا رہا۔ مگر اس رستے میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں، بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہوا۔ اور اب تک ترقّی کے میدان میں اسے وہی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں اور اسے اپنے بنی نوع کے ساتھ ہر دفعہ اور ہر لحظہ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے۔ یہی لڑائی مقابلہ، مناقشہ اور جدّ وجہدِ ترقّی اور تہذیب وتمدّن کی جان ہے۔ ہر شے جس میں حیات ہے اور تمام امور وخیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جدّ وجہد پائی جاتی ہے۔ تمام افعال وحرکات میں، تمام ارادوں اور نیتوں میں، اندرونی اور بیرونی زندگی میں ہماری زندگی کے اعلا اور نازک موقعوں میں ہمارا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں۔ ہماری ساری طاقت اور

دانش مندی اسی میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لیے اس کا ارتقا دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس کی ترقی میں اس کا بڑا حصّہ ہے لیکن عقل انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدّم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے۔ ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہیے۔ دوسری خصوصیت انسان میں مدنیّت کی ہے یعنی وہ قابلیت جس کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ عقل کا کام تفرقہ، انفعال اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقّی کے لیے ایثار اور سوسائٹی کے فائدے کو اپنے فوائد پر مقدّم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لیے اور خصوصاً ان نسلوں کے لیے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں قربانی کرتا ہے۔ یہ ایثار اور قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالا ہے اور یہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوئی ہے اور اس لیے انسانی تمدّن و ترقّی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقا کا مقصد جد و جہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے۔ عقل اس کی مخالف ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جدّ و جہد کرے۔ ورنہ اگر وہ غالب آجائے گی تو شیرازۂ نظامِ تمدّن بکھر جائے گا ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لیے قربان کر دیے جاتے ہیں۔ عقل افراد کو اپنے فوائد کے لیے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقّی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے۔ نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ اُن لوگوں

کے لیے بھی جو آیندہ زمانے میں آئیں گے اور ابھی وجود میں نہیں آئے، حال آں کہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہی۔ غرض انسانی تمدّن میں دو مخالف رجحانات کی نشوو نما ہوتی ہی۔ ایک وہ جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہی اور دوسرا رجحان عقلی ہی جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہی جو ابھی وجود میں نہیں آئے تامّل اور عذر ہی۔ لیکن ترقی وہی قوم کرسکتی ہی جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہی۔ مگر اس اتباع کے لیے عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر ناپائے دار اور کس قدر بے بنیاد ہی تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہی جس کے سامنے باقی تمام خیالات ہیچ ہیں۔ اس کی ہدایت یہی ہی کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتّی الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ انسان تکلیف سے بچے راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہی اور شہرت اور قوت حاصل کرتا ہی اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہی جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی ترقی رک جائے۔ اس لیے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہی جس کا ذکر ہم ابھی کرچکے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اُس کے تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہ بر و رہ نما ہی لیکن اس کا احاطہ محدود اور اُس کی نظر تنگ ہی۔ اور اس لیے ضرورت ہی ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہی۔ اکثر کہا جاتا ہی کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیّت اور مخیّر اور نیک چلن ہوتے ہیں لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہی۔ انسانی تمدّن یا

انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدھ نسل کا کام نہیں ہے قرنوں اور نسلوں کی جد وجہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصولِ اخلاق و مذہب کا قائل نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلۂ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست، بات چیت، طرزِ خیال، غرض کل حرکات و افعال اُسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اُسی سوسائٹی سے ارثاً تعلیماً صحبتہً ملے۔ وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رجحانِ طبیعت اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زایل نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ مجبور ہے اور بات بات میں اسی نظامِ اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا اور جس کی وہ تضحیک کرتا ہے ؛

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے اور بڑے بڑے اہلِ آرا کی رائے ہے کہ باوجود زمانۂ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجے کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط، افلاطون و ارسطو و فیڈاس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہ تھا۔ یہ اس لیے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابعِ عقل کر دیے گئے تھے۔ اسی بد اخلاقی و بد مذہبی نے روما کو تباہ کیا۔ لیکن یہودی اور ہندو باوجودے کہ وہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں اور ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے اُن اقوام کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں ؛

انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حالت پر قانع نہیں رہتا ایک چیز کے حاصل ہونے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف لپکتا ہے۔ جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوئی رفتہ رفتہ جب روٹی پیٹ بھر ملنے لگی تو بھوک تو

ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقے پر آٹھیرا۔ اور اس چاٹ میں اس نے وہ ترکیبیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لیے تھا اُسے اس نے وجہ زیبائش اور آرائش بنالیا۔ وہ حقیر جھونپڑا جو سر چھپانے کے لیے بنایا تھا اب ایک شان دار محل بن گیا ہے جس میں تمام سامانِ آرائش و حُسن جمع ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت، حکومت، قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس اور بڑھتی گئی اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی۔ اور ہر شے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوتی گئیں اور وہ ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں وہ اسی کو اصلِ ترقی سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ درجۂ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجۂ اعلا کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی ہے جسم کے چھوڑنے کے بعد رُوح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی نفسانیت اور خود غرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح نہیں دی۔ جس نے اس ہدایت کے نُور سے جو مذہب کے ذریعے سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منوّر نہیں کیا اور اپنے باطن اور روح کی صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی رُوح عالمِ ارواح میں بھی ادنیٰ حالت میں رہے گی۔ ڈارون کا اصولِ ارتقا صرف جسم اور اس کے علائق تک ہے۔ جب جسم کا خاتمہ ہوگیا تو اس اصول کے ماننے والوں کو اور ذرا دُوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہیے جو اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ ابدالآباد تک رہنے والا ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد رُوح جس حالت میں یہاں تھی اُسی

حالت میں عالمِ ارواح میں پہنچتی ہے۔ اگر وہ یہاں ادنا حالت میں تھی تو وہ وہاں ادنا حالت میں رہ کر پھر ترقّی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات غالباً اس کی تکلیف کا باعث ہوں گی۔ اگر اس نے یہاں ترقّی کی ہے تو ترقّی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور وہاں سے ترقّی کر کے اپنے سے اعلا دُوسرے عالمِ ارواح میں جائے گی اور اسی طرح ترقّی کر کر کے اس سے بھی اعلا عوالم میں پہنچے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیوں کہ جس طرح سیّاروں کے نظام لاتعدّد لاتحصیٰ ہیں اسی طرح نظاماتِ رُوح بھی بے حد و بے شمار ہیں۔ یہ ہے اصل اور صحیح اصولِ ارتقا جس کا سلسلہ نامتناہی ہے اور لازوال ہے۔ اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ ادنا خیالات کو چھوڑ کر درجۂ اسفل سے اعلا کی طرف ترقّی کرے جس کی ہدایت ہمیں مذہب کرتا ہے۔

(۱۱)

غرض سائنس انسان کا کامل تعلّق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے۔ کیوں کہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادّی اشیا تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے۔ اور وہ مادّی اور غیر مادّی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دُور دُور تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں۔ مذہب نہ صرف اُن فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلّق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دُوسروں سے متعلّق ہیں۔ بلکہ وہ اُن فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو اُن لوگوں سے متعلّق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلّق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے۔ سائنس انسان کی رُوح اور رُوحانی عالم اور عقبیٰ کا انکار کرے تو وہ کوتہ نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شَے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی۔ اہلِ سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور

چند قانونِ قدرت جو انھیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے، یہ خلافِ قانونِ قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانینِ قدرت پر حاوی ہیں۔ جو ذرا ہوشیار ہیں انھوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں۔ لیکن یہ جواب خود "ان سائنٹی فک" ہے۔ سائنس جستجو، تلاش اور تحقیق سکھاتا ہے۔ تحقیق سے اعراض کرنا سائنس کی ذات کے خلاف ہے۔ لیکن اہلِ سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے جو امور ان کی تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن سائنٹی فک تحقیقات کو بھی ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب میں اہلِ مذاہب پر تو جا بجا طعن و تشنیع کی ہے کہ انھوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انھیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ خود اہلِ سائنس نے تمام سائنٹی فک تحقیقات کی ابتدا ابتدا میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اوّل اس کی مخالفت میں اہلِ سائنس آستینیں چڑھا کر آئے۔ کوپرنیکس، گلی لیو اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے سائنس میں ایسے ایسے انکشافات کیے ہیں جو تا قیامت یادگار رہیں گے۔ لیکن ان کی مخالفت سب سے اوّل نہایت شدّ و مد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہلِ سائنس نے کی۔ جب بنجمن فرینکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برانقی کی بحث کی تو تمام اہلِ سائنس نے اسے بے وقعت بتایا اور رسالہ "فلاسوفیکل ٹرینزاکیشن" نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا حال آں کہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ جب ینگ نے روشنی کے نظریہ انتعاشیہ کے عجیب و غریب ثبوت پیش کیے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی۔ سر ہمفری ڈیوی نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہو سکتی

ہی تو اہلِ سائنس نے اس کا مضحکہ اُڑایا۔ اسٹیون نے جب یہ تجویز کی کہ لورپول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس وقت کے بڑے بڑے اہلِ سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہو سکے جب نام ور اور مشہور منجّم ارے گو نے برقی ٹیلی گراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فرنچ اکاڈیمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اُڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظیریں پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اوّل اہلِ سائنس نے اس کی مخالفت کی۔ جب سائنس کے متعلق اہلِ سائنس کا یہ حال ہے تو روحانیت کے متعلق وہ جس قدر شدّ و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے۔ لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلّم ہو جائیں گے اور انھیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا کیوں کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محدود رکھا۔ اہلِ سائنس اہلِ مذاہب کو تعصب کا الزام دیتے ہیں۔ لیکن ان کی ضد اور ان کا تعصّب ان سے کچھ کم نہیں۔ ان کے ذرا سے علم نے انھیں اندھا کر دیا ہے۔ تحقیق و تجسّس جس پر انھیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرے تک محدود رکھتے ہیں اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت آتا ہے جب انھیں مجبوراً اس خول کو توڑ کر باہر نکلنا پڑے گا۔

غرض اگر ہم رُوح کی ہستی اور اس کی قوّت سے جس کے متعلق بے انتہا واقعات اور بہت قوی دلائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذہب کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدّن سے خارج کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سُود و بے کار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی ہے۔ اگر انسان صرف اسی مادّی دنیا کو اور اس چندروزہ

زندگی کو اپنا منتہا سمجھ لے تو کیا ان انسانی تمنّاؤں کے لیے جو اس کے دل میں موجیں مار رہی ہیں یہ دنیا کافی ہو سکتی ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بری بھلی کسی طرح کاٹ کر چل دے؟ کیا علومِ طبیعیات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبیعیات و ریاضیات کے قانون اس کے فرماں روا ہیں تو انسان محض ایک چلتی پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوّت ہے تو ایک وحشیانہ قوّت ہے جو سب پر غالب آجائے گی۔ خیر و شر یا بُرائی بھلائی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدّنی ذلیل و حقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور الٰہی قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مٹا دو۔ اور خدا، حیاتِ جاوید، انصاف و عصمت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مادّہ سب زائل ہو جائے گا۔ افسوس اُن بے چاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت و مشقّت میں جُت جاتے، جفائیں سہتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں کس لیے؟ اس لیے کہ چند غافل ناکسوں کی عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس ان پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردّد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملے جو اصل مسرّت ہے۔ دولت ملی، اس وقت جب کہ آفتیں سہتے سہتے اور بلائیں جھیلتے جھیلتے کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ نہ پہلی سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش، قویٰ میں اضمحلال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرّت کا باعث نہیں۔ یا اس وقت بے مانگے بلا محنت مشقّت کے ملی جب کہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا اور بجائے مسرّت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ کاش ضبطِ نفس ہوتا، تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی۔ دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرّت کا

ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حصولِ دولت و عیش کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور آفتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل خوشی اعتدال، قناعت اور ضبطِ نفس میں ہے۔ بہ شرطے کہ انسان کسی مقصدِ اعلا کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادّی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور بامسرّت بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ ہے۔ بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ اپنے ارادے میں قوتِ نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشاتِ نفسانی کو اس کے تابع بنانا چاہیے تاکہ قلب کا اثر مادّی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرّت کا باعث ہوں۔ اسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ مسرّت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیاتِ انسانی کی تہ میں رنج و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہوا ہے اور زیادہ تر وہ جو کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو بھلائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلامِ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہ عام مصروفیت ادنا درجے کی ہے اعلا درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرّت اور خوشی پہنچانے کے لیے اپنے تئیں بھلا دیتا ہے۔ مذہب کی زبان میں اسے ثواب کا کام کہتے ہیں۔ وہ ایک تنگ دائرے سے نکل کر انسانی ہم دردی اور اخلاق کے اعلا طبقے میں

جا پہنچتا ہی اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہی سچّے مذہب کی تعلیم یہی ہی اور یہی وجہ ہی کہ ایک سچّے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائے دار اور مستقل اور بے غل وغش ہوتی ہی اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہی وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آیندہ کی توقع رکھتا ہی بہ خلاف اُس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر پچھتاتا اور حال میں مذبذب اور بے اطمینان رہتا ہی اور آیندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہی ؃

(۱۲)

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہی تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بے کار یا گم راہ کرنے والے ہیں بلکہ اس رخ پر زیادہ زور اس لیے دیا گیا ہی کہ آج کل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی نگاہ اس قدر خیرہ ہوگئی ہی کہ وہ دوسرے رُخ پر نظر نہیں ڈالتے ۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کار آمد ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہی ۔ اور مادّی ترقّی سے اس نے انسانی تمدّن کو جو مدد دی ہی وہ ظاہر ہی ۔ لیکن یہ ضرور ہی کہ محض سائنسی ترقّی انسانی ترقّی نہیں ہو سکتی ۔ اور نہ اُسے اُس رُتبے پر پہنچا سکتی ہی جو اس کا اصل منشا و منتہا ہی ؃

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہی ؟ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہی ؃

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہی اور سائنس کی بنیاد عقل پر ۔ اہلِ مذہب سائنس سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ سائنس کے اصول اور اُس کے انکشافات مذہب کو کم زور اور زائل کر دیں گے ۔ حال آں کہ یہ خیال محض باطل ہی ۔ سائنس صدہا سال سے برابر ترقّی کرتا چلا آتا ہی لیکن وہ مذہب کی بنیاد کبھی نہ ہلا سکا ۔ مذہب کی قوّت ابھی تک ویسی ہی قائم ہی اور قائم رہے گی اس لیے کہ جس شی پر مذہب کی بنیاد ہی وہ

سائنس کی دست رس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے اس لیے کہ اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدانِ قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے حال آں کہ عقل بہ ذاتہا محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے۔ عقلی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ادلّہ و براہین اسی کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لیے تمام دلائل بے کار ہیں۔ لہٰذا اہلِ مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر زمین گردش کرتی ہے اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی نیا ستارہ دریافت ہو تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے آثار تحجّرہ نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کششِ ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائلِ عالم کو حل کیا تو بہت مبارک، مذہب اس سے کیوں خائف ہو؟ اور نظریۂ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا ہے تو بتائے مذہب کیوں اس سے گھبرائے۔

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قوی ہے تو پھر اہلِ مذاہب کیوں اہلِ سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چوں کہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش سنبھالا اور جب کہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لیے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور سائنٹی فک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا۔ اور مذہب کا ہادی معلّم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب میں داخل کر لیے گئے

تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے نئے انکشافات شروع ہوے۔ اہلِ مذاہب نے جب یہ دیکھا تو یہ امر ناگوار گزرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے۔ جو امور ابدان و حفظانِ صحت کے متعلق تھے وہ علمِ طب نے سنبھال لیے جو مُلکی تھے وہ علمِ سیاست نے لے لیے اور جو نجوم و شموس و اقمار کے متعلق تھے وہ فلکیات کے تحت میں آ گئے۔ مگر اہلِ مذاہب ایک مدت تک اُنھیں باتوں پر جمے رہے جو ابتدا میں ضمناً ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آ گئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس کی ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے۔ لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اُسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں کیوں کہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کر سکتا اور نہ اُسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے جس پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دست رس اور رسائی سے باہر ہے:

اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے۔ سو یہ بالکل بے جا اور محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیوں کہ سائنس مذہب کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس استدلالِ عقلی پر مبنی ہے اور سب چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری نہیں اُترتیں ان کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دُوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاقِ حق میں صرف عقل ہی پر دار و مدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان کی اخلاقی رُوحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حُسن کی دریافت کے لیے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاقِ حق میں عقل وہیں تک کام دیتی ہے جہاں تک سلسلۂ علت و معلول کا تعلق ہے۔ لیکن جہاں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی

عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس کی کیا پیش جا سکتی ہے جس کا زیادہ تر تعلق تمیزِ وجدانی پر ہے۔ چوں کہ مذہب کی بنیاد فوق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس لیے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نافہمی سے اس پر حملہ کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اسے اور ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہ اٹھتا ہے کہ یہ خلافِ قانونِ فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانینِ فطرت اس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اوّل تو اس کرّے کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے دوسرے جو چند قانونِ فطرت ہمیں معلوم ہیں بالکل محدود ہیں اور وہ صرف مادّی حالت سے متعلق ہیں۔ عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اس پر ہے اور بھی محدود ہے۔ اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسی ہو سکتی ہے۔ وہ مادّی حالت سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس محدود علم اور یک طرفہ علم پر اس کے یہ دعوے ہیچ ہیں اور بغیر اس کوچے میں قدم رکھے جو مادّے سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرے میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار ناقابلِ سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافہمی ہے۔ اہلِ سائنس کو زیادہ عالی ظرفی، زیادہ وسیع النظری، زیادہ حوصلہ وتحمّل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہیے۔ اپنی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر یہ کہ دینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انھیں جھٹلانا سائنس اور فلسفے کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرتِ واقعات و دلائل وہ اپنے انکار پر مصر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعصب اور ان کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور ضد سے کہیں بڑھی ہوئی ہے ::

جس طرح علمائے طبیعیات و مریدانِ ارتقا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہلِ مذاہب کو بھی چاہیے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہی جہاں مذہب کو رُک جانا چاہیے۔ اور ایک حد ہی جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہیے۔ اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے پُرانے قصّے قضیے اور عداوتوں کو بھلا دیں بلکہ دور وٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح من جائیں۔ عالمِ طبیعیات کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہی، قبل اس کے کہ وہ کائنات کے مسئلے حل کرے۔ اور اسی طرح اہلِ مذاہب کو بھی۔ ان کا منشا ایک ہی۔ یعنی انسان کی ترقّی اور بہبودی۔ لیکن ایک کا مقصد مادّی اور ظاہری ترقّی ہی اور دوسرے کا مقصود باطنی اور روحانی ترقّی۔ ایک استدلالِ عقلی اور استقرا کے رستے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچتا ہی اور دوسرا جذبات اور تخیّل کی راہ سے۔ لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بُری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہی بہت اچھا کرتا ہی۔ اگر خدا کا خیال ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہی تو نیچر اسے نکال نہیں سکتی۔ رُوح اسے ضرور یہیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہی کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہی۔

جھگڑے، تنازع اور جدّوجہد سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہی۔ اہلِ مذاہب کا ضعف اس میں ہی کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حال آں کہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اُس سے مدد لینا اور اُسے معاون بنا کے رکھنا چاہیے۔ اگر اس کے کہیں دشمن ہیں تو ان سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہی۔ کیوں کہ ممکن ہی کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گم نامی کا

احتمال ہے۔ گُم نامی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اسے توہماتِ باطلہ اور تمام غیر ضروری کثافتوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔ اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کر کے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصولِ مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حال آں کہ اگر وہ انسان کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالے جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اس کی قسمت میں ہار ہے۔ یہ وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا۔ تحقیق و تجسّس اس کے اصل اصول ہیں۔ اُسے چاہیے کہ وہ انھیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرتِ حق کا تماشہ دیکھے۔ اُسے اب صداقت کے ماننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور زیادہ عالی ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہیے اور ضد اور نفسانیت سے دست بردار ہونا چاہیے۔

بہ قول پروفیسر ٹیٹ و بال فور اسٹی وارٹ جو اس زمانے میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں اس کائنات میں ایک قانون توال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ ہستی محض بے کار اور مہمل ہو جائے گی۔ یہ مادّی عالم صرف مادّے ہی سے نہیں بنا بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دار و مدار ہے۔ اور وہ توانائی ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ توانائی اسی وقت کارآمد ہے جب کہ یہ تبدیلِ ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربے سے یہ ثابت ہے کہ توانائی کی تبدیلی اُسے کم زور کر دیتی ہے۔ یہ بے شک ممکن ہے کہ توانائی کو ہم حرارت میں تبدیل کر لیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوتِ حرارت کو کم زور کر دے گی اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سورج ہمارے نظام کا منبع حرارتِ اعلا ہے

اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دار و مدار ہے اس حرارت سے اخذ کی جاتی ہے جو سورج سے نکلتی ہے۔ جب کہ سورج ہمارے لیے توانائی مہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر کار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں سے وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہو جائے گی جو اس وقت اس میں موجود ہے۔ علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ایتھری رگڑ کی وجہ سے ہماری زمین اور ہمارے نظام کے دُوسرے کُرّے بالتفاوت سورج کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت پیدا ہو گی۔ اور عارضی طور پر سورج کی بُجھی ہوئی قوت پھر بحال ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا اور وہ بجھ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمنۂ بے شمار کے بعد اس کے پھر کسی پڑوسی کُرّے سے مُڈبھیڑ ہو اور اس کی جان میں جان آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کا خاتمہ کر دے گا۔ تو پھر کیا اس سے وہ قانونِ عالم جسے قانون توال یا عدمِ انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا؟ ایسی حالت میں وہ تسلسل جو برابر جاری رہنا چاہیے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہر ہی سب کچھ ہوتا تو بے شک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے کھُردرے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اُن قوانین کی تکمیل کے لیے جو اس نے دریافت کیے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانونِ توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرئی عالم سے قبل ہو گا کیوں کہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہیے۔ اب یہاں مذہب یا الہام اور سائنس کی سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے

ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہو کہ دنیا اور اس کی کائنات سب مل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس ان قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہو یہ استدلال کرتا ہو کہ موجودہ نظام کا انجام یہی ہونے والا ہو۔ مذہب کہتا ہو کہ ایک روحانی دنیا بھی ہو جس کا اِس دنیا سے گہرا تعلق ہو اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہو۔ سائنس بھی اب دبی زبان سے کہنے لگا ہو کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون ملیامیٹ ہو جائیں گے۔ اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے۔ کیوں کہ قانونِ توال یا عدمِ انقطاع کا مقتضی یہ ہو کہ اگر یہ موجودہ کائنات برباد و تباہ ہو گی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدا سلسلۂ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانونِ نشو و نما میں پھولے پھلے۔ اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہو اور اس لیے بلا کسی مذہبی خیال کے رُوح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہو کیوں کہ ظاہر ہو کہ اگر یہ اصول صحیح ہو تو موت انسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی اور یہی آخرت یا عقبےٰ ہو۔

یہاں سائنس و مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہو اور جس پر ڈاکٹر ڈریپر نے فصاحت کے دریا بہا دیے ہیں، کافور ہو جاتی ہو۔ سائنس اب تک ایک گنبدِ بے در میں چکر لگا رہا تھا۔ اب اُدھر کی تھوڑی سی جھلک پہنچنی شروع ہوئی ہو۔ وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہو کہ یہ نئی شئے کیا ہو۔ وہ زمانہ قریب ہو کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منوّر ہو جائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہو اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہو کہ بجائے سلجھانے کے اور اُلجھن پیدا کر دی ہو۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور انوکھے قیاسات اور نظریات سے جن پر اہلِ سائنس کو بڑا فخر ہو اہلِ مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہو۔

وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے اور ان جدید انکشافات سے اُس حالت میں تزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چوں کہ اسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے۔ لہٰذا مذہب اور الہام کو بھی اسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے ٹھیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا۔ اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حال آں کہ اسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہلِ مذہب کی بڑی کم زوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہامِ ربّانی کو ہمیشہ گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اُسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے۔

لیکن صرف اہلِ مذاہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہلِ سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اہلِ سائنس اہلِ مذاہب کے اجتہادات اور رایوں کو الہامِ ربّانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لیے ان رایوں کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہامِ ربّانی کو غلط ثابت کر دیا۔ زیادہ تر خطرہ "نیم حکیم" اہلِ سائنس سے ہے جنھوں نے کبھی آنکھ اُٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقینیات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا اور ان میں ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگرچہ بعض اہلِ سائنس جنھیں خدا نے اعلا دماغ عطا کیا ہے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب "کان فلکٹ بٹوین سائنس اینڈ ریلجن" (معرکۂ مذہب و سائنس) در حقیقت سائنس کی پر زور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے وہ مذہب کہتے ہیں وہ در حقیقت مذہب نہیں بلکہ

رومن ازم ہے اور جتنے حملے انھوں نے مذہب پر کیے ہیں وہ بلاشبہ رومن ازم پر ہیں، مذہب پر نہیں ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حملوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شان دار عمارت جو انھوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بدگمانی ابھی مدت تک رہے گی۔ اور اسے سہنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے۔ اہلِ مذاہب کو سائنس کی صداقت اور اہلِ سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہیے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنی نادانی پر پچھتائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائیں گے۔ پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہوگا۔ اور یہ توام بھائی ایک جان دو قالب ہو جائیں گے۔

(۱۳)

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے سوائے اُن امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیوں کہ وہ مشاہدے، تجربے اور استقرا پر مبنی ہیں۔ حال آں کہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بے حد اور بے شمار اختلافات میں یہ مشکل آ پڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے۔ اور صداقت کا پتا کہاں ملے۔

پروفیسر میکس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے آتے ہیں۔ انھیں میں کچھ ہیر پھیر اور ردّ و بدل کر لیا جاتا ہے۔ بہ عینہٖ یہی حال مذاہب کا ہے۔ ہمیشہ نئے نئے بنتے

رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے البتہ کچھ ردّ و بدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف اُن ممالک اور ان اقوام کی وجہ سے ہیں جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اُس زمانے کی وجہ سے جب کہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ اگر ابتدا سے لے کر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جمایا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا۔ ملک اور قوم اور زمانے کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر مشکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے۔ اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقّی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس لیے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منتظم سلسلے میں آنے کے قابل ہیں؛

اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لیے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے؛

مذہب کے لیے سب سے بڑی آفت مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے کسی ایک خوبی کو لیا اور اسے آسمان پر چڑھا دیا اور دُوسری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ دُوسرے نے کسی دُوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پسِ پشت جا پڑی۔ اس کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب ہیچ رہ جاتے ہیں غرض مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر سے دیکھا اور باقی پہلو یوں ہی رہ گئے۔ اس مبالغے سے مذاہب میں انحطاط اور تنزّل پیدا ہوا۔

حال آں کہ وہ بات جو باعثِ انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی۔ لیکن اس میں مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی اور دوسری خوبیاں اس مبالغے کی وجہ سے کم زور ہو گئیں۔ جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضا کم زور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے کہ ایک پر زور دینے سے دوسری کم زور ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی کامل صداقت اور اصل کام یابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب قوتوں میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہیں ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس میں اختلاف اور عناد ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں، دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جد و جہد رکھتی ہیں۔ کیوں کہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بہ حیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عائد ہیں۔ بہ حیثیت انسان ناطق کے وہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے۔ شخصی ترقی کے لیے کامل آزادی کی ضرورت ہے لیکن تمدنی ترقی کے لیے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے اس لیے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے۔ اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا

باعث ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مختلف زمانوں میں مختلف نبی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انھوں نے اصلاح کی کوشش کی لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانے کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لیے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانے میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابل میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو گیا۔ لہٰذا اس کی کامل اصلاح کے لیے ایک انسانِ کامل کی ضرورت تھی جو ملکِ عرب میں مبعوث ہوا۔ اس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک چلے آ رہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہو گیا جو انسان کی دنیوی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبرِ خدا صلعم ان اختلافات کی لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لیے انھوں نے مبالغے سے احتراز کیا اور اعتدال کو مدِ نظر رکھا اور ان اختلافات میں ہمیشہ کے لیے مصالحت پیدا کر دی۔ یہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ پیغمبرِ خدا نے اس معمّے کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کش مکش میں ہے کہ وہ مبالغے سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لیے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور دنیا کے امور کی اصلاح کے لیے ضروری ہے بلکہ تمام

اخلاق و نیکی اور کل کائنات کا دار و مدار اسی پر ہے۔ یہ زمین، یہ سیارے، یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنے اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مِل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالم گیر اور پُر معنی اصول پر پیغمبرِ اسلام کی تعلیم مبنی ہے۔ اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کمی کو پُورا کیا۔ اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لیے ایسی بنیاد قائم کر دی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت[۱] کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسنِ معاشرت کے متعلق احکام دیے ہیں۔ لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہو جاؤ۔ کیوں کہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی ہے[۲]۔ نماز روزے، حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نیکی کے یہ معنی نہیں کہ نماز کے لیے پورب پچھم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب، یتیموں، محتاجوں، مسافروں کو اپنا مال دینا، غلاموں کو آزاد کرنا، زکوٰۃ دینا، نماز پڑھنا، اپنے عہد کو پُورا کرنا، سختی اور تکلیف میں ثابت قدم رہنا[۳]۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ اس کا مدار محض

---

[۱] لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ [۲] وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ.
[۳] لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت مادّی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لیے وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ آگے قدم رکھتا ہے اور اس کا رُوحانی احساس قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آں حضرت صلعم کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔ خبابؓ صحابی آں حضرت صلعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے کعبے کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپؐ نے مشرکوں سے بہت ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ مَیں نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپؐ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سُن کر آپؐ اُٹھ بیٹھے اور آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے کہ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اُس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اُسے دین سے نہ پھیرتی تھی۔" سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدِ نظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق میں۔ مثلاً یہ فرمایا ہے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے۔ بدلہ لو تو اس کے بدلے میں اسی قدر تکلیف دو جتنی تمھیں پہنچی تھی، لیکن اگر صبر کرو درگزر کرو معاف کرو اور بخش دو تو اللہ تمھیں دوہرا اجر دے گا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے[1]۔ اور اس کو بار بار

---

[1] وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ۳۰)

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (شوریٰ ۳۸)

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہی اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا درجہ بہت بڑا بتایا ہی۔ آخر یہاں تک کہہ دیا ہی کہ تم گنہ گاروں، خطاکاروں اور دشمنوں اور مخالفوں سے شیوۂ عفو و غفران اختیار کروگے تو خدا بھی تمھاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔[1] یعنی بدلہ لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہی اور مقتضائے عدالت ہی لیکن اخلاقِ کریمانہ کا یہی مقتضا ہی کہ بُرائی کے عوض بھلائی کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور بُرائیوں کو معاف کرو اور عموماً درگزر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہی کہ بُری بات کا جواب ایسا دو جو سب سے بہتر ہو۔[2] ایک دوسری جگہ ارشاد ہی کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی. برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کروگے تو تم دیکھوگے کہ تم میں اور کسی شخص میں عداوت تھی تو اب ایک دم سے گویا وہ تمھارا دل سوز دوست ہی اور حُسنِ مدارات کی توفیق انھیں لوگوں کو دی جاتی ہی جو صبر کرتے ہیں اور یہ انھیں کو دی جاتی ہی جن کے بڑے نصیب ہیں۔[3] پھر یہ بھی سمجھایا ہی کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ رُکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب سے عدل و احسان و انصاف کا برتاؤ کرو۔ چناں چہ فرمایا ہی ای ایمان والو کھڑے ہوجایا کرو اللہ کے لیے گواہی دینے کو انصاف کی، اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقویٰ کی بات یہی ہی کہ تم عدل کرو۔[4] اس سے

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (نحل) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ)

[1] وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (نور۔۶۳) [2] اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (مومنون ۴۸) [3] وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (حم سجدہ)
[4] يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ

بڑھ کر حسنِ معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہو ؛

اسی طور پر رُپے پیسے کے کمانے اور اس کے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہو۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو[1] اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا[2] خرچ کرنے والے فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگ دستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو[3] رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بے جا نہ اُڑاؤ۔ دولت کے بے جا اُڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہو۔ اگر تم کو پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہو اُن سے منھ پھیرنا پڑے تو نرمی سے ان کو سمجھا دو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ دکہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو کہ تم تہی دست ہو کر لوگوں کی ملامت سننے بیٹھو؛

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلا تعلیم دی ہو جو تمدن کی جان اور ترقیٔ عالم کی رُوحِ رواں ہو فرمایا ہو کہ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ'' یعنی مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہو کہ ایک ادنیٰ غلام اور شہنشاہ برابر ہی۔ اور صرف یہ قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے اب تک اس پر عمل جاری ہو اور یہی وجہ ہو کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے شہنشاہ ہو گزرے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا ہو اور اس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی ہو اور اس نے اشاعتِ اسلام میں بہت مدد دی ہو۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں ان کی تقسیم محض حدودِ جغرافیہ کی رُو سے ہی۔ لیکن مسلمانوں کی قوم اس تنگ اور ادنیٰ امتیاز سے بالا ہی۔ مسلمانوں کی راہ میں مُلکی حدود، آب وہوا، رنگ اور نسل حائل نہیں، سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی، عرب کا

---

[1] کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا [2] اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (انعام۔۱۷)

[3] وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (فرقان۔۶)

بدّو، ہندستان کا برہمن، یورپ کا فرنگی، مصر کا فلاح غرض دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی یہ سب کم زور اور عارضی امتیازات اُٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کہیں ہو اور کوئی ہو مسلمان ہے۔ اس کا وطن سارا عالم اور اس کی برادری سب مسلمان ہیں۔ چناں چہ خدا فرماتا ہے کہ سب مل کر مضبوطی سے اللہ کا ذریعہ پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے[1]۔

اس سے بھی بڑھ کر اعلا اور افضل ایک اور تعلیم اسلام کی ہے جو درحقیقت تمام عالم کے لیے صلائے عام ہے۔ یعنی پیغمبرؐ نے فرمایا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ " اس سے بڑھ کر کامل وسیع اور عالم گیر اصول کسی دین و مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا۔ اور دنیا پر اس کی حکومت ہوگی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر، اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور انسان کی ترقّی کی ممد ہے کہ دنیا کی مادّی اور روحانی ترقّی کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبرؐ اور پاک باطن خلفاؓ اور تابعینؒ نے اپنے عمل سے اخوتِ اسلامی اور مسالمت اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

---

[1] وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا

خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیٹیکل حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسی طرح انھوں نے میدانِ علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالامال کر دیا۔ اور صلح جوئی، آزادی، بے تعصبی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگ مگ کر رہا ہے۔ غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی، دنیاوی تمدن اور اُخروی راحت، عقل اور جذبات مذہب و سائنس میں توافق اور توازن قائم رکھنے والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر ہی زور دیا تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔

---

# مقدمۂ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

## حصہ اوّل

## مشتمل بر حالاتِ مصنّف

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت اور لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہی۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہی وہ خود کبھی نہیں بڑھتا۔ اور جو بڑھتا ہی تو جتنا پاتا ہی اُس سے زیادہ کھوتا ہی۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے ابتدا میں ایک معمولی منشی کی طرح دفتر میں ملازمت کی اور محض اپنی لیاقت اور محنت سے اعلا رتبے پر پہنچ گئے۔ اُن کی تعلیم بہت معمولی درجے کی ہوئی تھی۔ لیکن لگاتار مطالعہ اور محنت کی بدولت انھوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور صاحبانِ دستارِ فضیلت کو میسّر نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی ایک سبق ہی اُن لوگوں کے لیے جو دنیا میں

پڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے کارنامے نوجوانانِ ملک کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیں گے۔ ان کے آباواجداد[1] دراصل سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر وہیں آباد ہوگئے مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوے۔ بعدازاں ان کا تبادلہ سہارن پور ہوگیا۔ جہاں وہ کلکٹر کے دفتر کے ہیڈ کلارک تھے۔ سہارن پور میں یہ محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریزی کلارکوں کے لیے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا۔ چناں چہ کرانی خانہ منشی خانے کو کہتے تھے جہاں کلارک کام کرتے تھے۔ چوں کہ مولوی محمد بخش انگریزی دان تھے اور کسی قدر انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لہٰذا لوگ انھیں کرانی کہنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے معزز ترین عہدہ گورنری جنرلی پر لارڈ ڈلہوزی نئے نئے تشریف لائے تھے۔ یہ صاحب تھے تو کم عمر مگر بلا کے ذہین، جفاکش، مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکّے تھے۔ انھوں نے ملک کی آبادی اور آسایش خلائقِ عامہ کے لیے بہت سے نیک کام کیے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک کام اُن کے ہاتھ سے ایسا ہوا کہ ان کی ساری نیکیوں پر پانی پھر جاتا

---

[1] مولوی چراغ علی مرحوم کے ابتدائی حالات ہمیں زیادہ تر مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پوری (حال وظیفہ یاب حسنِ خدمت سرکارِ نظام) سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پُرانے دوست اور رفیق ہیں اور مرحوم اور اُن کے خاندان کو اس وقت سے جانتے ہیں جب کہ مرحوم کے والد سہارن پور میں ملازم تھے۔ مرحوم مولوی صاحب موصوف کا بہت اعزاز و احترام کرتے تھے اور مولوی صاحب کے تعلقات اب تک مرحوم کے خاندان سے ویسے ہی چلے جاتے ہیں اور زمانۂ حیدرآباد کے اکثر حالات ہمیں مولوی صاحب موصوف کے بھتیجے مولوی انوارالحق صاحب سے معلوم ہوے ہیں جو مرحوم کے پاس بحیثیت پیشکار تھے اور مرحوم ان پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ نیز دیگر حضرات سے جو جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ ان کے نام کے ساتھ بعد تحقیق کے لکھ دیے گئے ہیں۔

ہے۔ ابتدا اسے یہ بات اُن کے ذہن نشین ہوگئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اور جس طرح بن سکے دیسی ریاستوں کو نیست ونابود کر دیا جائے اور ان کے ملک کمپنی کے علاقے میں ضم کر دیے جائیں۔ وہ اپنے بھادیں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے۔ وہ اس خیال پر اخیر تک جمے رہے اور بڑے تشدّد اور استقلال سے اسے عمل میں لائے۔ لیکن اس سے جو بُرے نتائج پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں اور اُس کا بُرا اثر اب تک رعایا کے دل سے پُورے طور پر زائل نہیں ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی سے قبل کمپنی بہادر کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ تھے۔ وہ جیسے لڑائی میں سخت تھے ویسے ہی فتح کے بعد معتدل مزاج بھی تھے۔ سکھوں سے پہلی لڑائی فتح کرنے کے بعد بیرونی اضلاع کو الگ کر کے پنجاب اُنھیں لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا کہ وہ انتظام خود کر لیں۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج الگ اپنے زور میں آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ رانی میں اتنی قوت اور دُور اندیشی نہ تھی کہ وہ ان سب کو سنبھالے بلکہ اس نے کج رائے اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھ میں پڑ کر ملک کی حالت اور بگاڑ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ ایک ایسی اچھی اور سرسبز سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے اندرونی انتظامات میں دخل دینے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور مہاراجا کے دربار کو پُورا اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی اور دستور و آئین کے مطابق اپنا انتظام کر لیں لیکن جب روز بہ روز خرابیاں بڑھتی گئیں تو بہ مجبوری ایک کونسل مقرر کی گئی کہ اُس کے صلاح و مشورے سے انتظامِ ریاست چلایا جائے اور کونسل کا میرِ مجلس انگریز ہو۔ پنجاب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ہنری لارنس جیسا پاک نفس، نیک دل اور ہوش مند ریزیڈنٹ ملا۔ وہ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے اور اس خوبی اور نیک نیتی سے کام چلایا کہ رعایا ان کی عاشق ہو گئی۔ اتنے میں لارڈ ہارڈنگ

ولایت کو سدھارے اور اُن کی جگہ لارڈ ڈلہوزی آئے۔ اور لارڈ ہارڈنگ کے جاتے ہی سر ہنری لارنس رخصت پر ولایت تشریف لے گئے۔ سر ہنری لارنس کے جانے کے بعد ناتجربہ کار انگریزی افسروں نے رعایا کی دل داری کا مطلق خیال نہ کیا اور انتظام کے جوش میں ایسی ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں میں انگریزوں کی طرف سے بددلی اور نفرت پیدا ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور سکھوں میں بڑی خوں ریز اور خوں خوار جنگ ہوئی جس سے ہندستان اور انگلستان میں تہلکہ مچ گیا اور ایک دفعہ انگریزی حکومت جڑ بنیاد سے ہل گئی۔ آخر انگریزوں کی فتح ہوئی اور مہاراجا رنجیت سنگھ نے جو ہندستان کے نقشے میں انگریزی کمپنی کی عمل داری کا سُرخ رنگ دیکھ کر یہ پیشین گوئی کی تھی کہ نقشے کا سارا رنگ سُرخ ہوتا نظر آتا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد پوری ہو کے رہی اور اب پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہوگیا۔ اس جدید صوبے کے انتظام کے لیے ہندستان سے جہاں اور تجربہ کار اور لایق عہدہ داران منتخب کیے گئے وہاں مولوی محمد بخش کا بھی انتخاب ہوا۔

سنہ ۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمۂ بندوبست میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ عہدۂ مہتممی بندوبست پر سرفراز ہوئے۔ اور کچھ عرصے تک صوبۂ پنجاب کے اضلاعِ ملتان، ڈیرہ غازی خاں، بنوں وغیرہ میں مامور رہے۔ سرحدی اضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیال کوٹ میں متعین کیے گئے۔ اس کے بعد ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور رہے یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہتممی بندوبست جیسا وقیع اور اعلا عہدہ جب کہ آج کل بھی دیسی لوگوں کو شاذ و نادر ہی ملتا ہے تو اس زمانے میں جب کہ نہ ہندیوں کے حقوق تسلیم کیے گئے تھے اور نہ اُن حقوق پر زور دینے والے ابھی میدان میں آئے تھے کیسا کچھ وقیع اور معزز نہ سمجھا جاتا ہوگا۔

افسوس ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ مولوی محمد بخش کے حالات اور اُس وقت کے واقعات معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن صرف ایک یہی واقعہ مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کی کافی شہادت ہے کہ حکومتِ وقت نے انھیں ایک ایسے عہدے پر جو کسی طرح ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں سرفراز فرمایا۔

سُنا گیا ہے کہ مولوی محمد بخش کو اپنی اولاد کی تعلیم کے متعلق بڑے بڑے خیال تھے لیکن اجل نے مہلت نہ دی اور عین عالمِ جوانی میں (جب کہ اُن کی عمر غالباً پینتیس ۳۵ سال سے زائد نہ تھی) سَن ستاون کی مشہور فوجی شورش سے ایک سال قبل یعنی سنہ ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا اور سارے منصوبے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مرحوم نے چار بیٹے چھوڑے جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی تھے اور اُس وقت ان کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ اب تک میرٹھ میں موجود ہے۔

مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد ان کے سب اہل و عیال یعنی ان کی والدہ بیوی اور چاروں بچے (چراغ علی، ولایت علی، عنایت علی اور منصب علی) میرٹھ واپس آ گئے۔

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرِ سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی۔ اور سوائے معمولی اُردو، فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے۔ اسی زمانے میں کمشنری گورکھ پور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا وہاں کے خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس رُپے تھی مرحوم کا تقرر ہوا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں ابتدا سے تھا، سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ چناں چہ پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخِ محمدی' کے جواب میں آپ کا رسالہ 'تعلیقات' اسی زمانے کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے 'منشورِ محمدی'، 'مخبرِ صادق' وغیرہ میں بھی ان کے

اکثر مضامین شایع ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پور سے بستی میں محکمۂ انجنیری میں مقرر ہو کر آئے اور چوں کہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور اُن کے خاندان سے قدیم تھے لہذا دونوں صاحب ایک ہی جگہ رہنے سہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مولوی محمد زکریا صاحب بستی کی خدمت سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں اُن کا ایک اچھی خدمت پر تقرر ہو گیا وہاں سے انھوں نے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد کے محسن مسٹر گوراوسلی یہاں جوڈیشل کمشنر ہیں۔ اگر آپ یہاں آئیں اور ان سے ملیں تو اغلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے چناں چہ اس اطلاع پر غالباً سنہ ۱۸۷۲ء یا سنہ ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنؤ گئے اور مسٹر گوراوسلی سے ملے۔ اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصرمی کی جگہ خالی تھی۔ لہذا اس وقت ان کا تقرر اسی خدمت پر بہ مشاہرہ لے ہو گیا۔ کچھ دنوں بہ طورِ قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہو گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد سیتاپور میں تبادلہ ہو گیا:۔

مولوی چراغ علی کا میلانِ طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا انھوں نے ہمیشہ یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہبِ اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ چوں کہ اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لیے مولوی چراغ علی بھی خود بہ خود امامِ وقت کی طرف جھکے۔ اور وحدتِ ذوق سر سیدؒ سے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ اب تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط وکتابت شروع ہو گئی تھی۔ اور 'تہذیب الاخلاق' میں بھی اُن کے بعض مضامین شایع ہوئے تھے۔ چناں چہ جب سر سیدؒ لکھنؤ تشریف لائے تو مولوی صاحب مرحوم اُن سے ملنے کے لیے سیتاپور سے لکھنؤ گئے۔ کچھ عرصے بعد جب ریاست حیدرآباد سے کچھ کام ترجمہ وغیرہ کا سر سیدؒ کے پاس آیا تو انھوں نے مولوی چراغ علی کو اُس کام کے سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ اس بنا پر سنہ ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لے کر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے

سرسیدؒ کے پاس رہ کر اس کام کو بہ کمالِ خوبی انجام دیا۔ جس کا معاوضہ بھی ریاست سے اُن کو مِلا۔ اس کے ایک سال بعد (سنہ ۱۸۷۷ء میں) نواب سرسالار جنگ اعظم نے بہ توسط مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک) مرحوم سرسیدؒ سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسیدؒ نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدر آباد چلے آئے۔ جہاں وہ عہدۂ اسسٹنٹ ریونیو سیکرٹری (مددگارِ معتمد مال گزاری) پر بہ مشاہرہ چار سو رُپے مامور ہوئے۔ معتمد مال گزاری اس وقت نواب محسن الملک مولوی مہدی علی مرحوم تھے۔ اس وقت سے مولوی چراغ علی کی زندگی کا نیا دَور شروع ہوا۔

کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلا قابلیت کا ہونا بالکل ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے گی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو اُس کی ترقی شاہ راہِ تمدّن پر بہت سست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں اعلا ترقی کی ہو۔ ابتدا ابتدا میں مسلمانوں کی فتوحات اپنی ذاتی قوت سے دنیا میں آناً فاناً میں پھیل گئی لیکن ان فتوحات کو قائم رکھنے یا وسیع کرنے کے لیے یہی کافی نہ تھا۔ پھر جب انھوں نے عجم میں قدم رکھا اور امن و جنگ، تجارت و سفارت کے ذریعے سے انھیں روزانہ دُوسری اقوام سے سابقہ پڑا تو اُس وقت سے ان کی ترقی کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ آخر انھی لوگوں نے یونان کی علم و حکمت کو زندہ کیا اور تمدّن میں ایسی ترقی کی کہ جس سے ایک عالم میں اُجالا ہوگیا۔ یہی حال یونان و روما اور یورپ و دیگر اقوام کی ترقی کا ہے۔ تازہ مثال جاپان کی ہے۔ وہی جاپان جو اپنے آپ کو غیر ملک والوں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا تھا اور غیر صورت کو دیکھ کر چونک اُٹھتا تھا آج انھیں سے اُن کے گُر سیکھ کر اُن کا استاد بنا چاہتا ہے۔ اہلِ جاپان کی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو کام وہ خود نہیں کر سکتے تھے

وہ اُنھوں نے غیر ملک والوں سے ملازم رکھ رکھ کر لیا اور پھر خود سیکھ کر ان کی معلمی سے مستغنی ہو گئے۔ چناں چہ ابتدا میں انھوں نے ریلوے، ٹیلی گراف، لائٹ ہوس اور بحری فوج کا انتظام انگریزوں کے سپرد کیا۔ قانونی اصلاح اور فوجی تربیت اہلِ فرانس کے ہاتھوں ہوئی۔ تعلیمی معاملات، ڈاک خانہ کے انتظام اور زراعت میں اہلِ امریکہ سے سبق لیا۔ طبّی تعلیم، تجارتی قواعد، لوکل گورمنٹ کا دستور اور فوجی افسروں کی تعلیم جرمن والوں کے حوالے کی اور سنگ تراشی (مصوّری) میں اٹلی والوں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ غرض ابتدا میں ان سب سے کام لیا اور پھر خود سیکھ کر ان میں ایسا کمال پیدا کیا کہ آج دنیا کی اعلا دول میں ان کا شمار ہے۔ یہ زمانہ تجربات کا زمانہ ہے اور جاپان نے جو تمدّن کی مختلف اور بے شمار شاخوں میں اس قدر جلد اور قابلِ تعریف ترقی کی ہے اسے اگر اُنیسویں صدی کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سر سالار جنگ اوّل کے تدبّر اور چارہ سازی اور جاپان کی بیداری کا بالکل ایک زمانہ تھا۔ جاپان نے اپنے ملک کو ہشیار کرنے اور اپنے تمدّن کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تدبیر اختیار کی تھی بہ عینہٖ وہی تدبیر اُس دَور میں اور عالی دماغ وزیر نے اس ملک میں اختیار کی اور باہر سے قابل، تجربہ کار اور شایستہ لوگوں کو بُلا کر کام لیا۔ ان لوگوں نے ملک کے انتظامات کو درست کیا۔ پرانی خرابیوں کی اصلاح کی، نئے نئے دفاتر قائم کیے اور اُن کو صحیح اصول پر چلایا۔ ملک کے ذرائع آمدنی پر غور کیا اور آمدنی کو بڑھایا۔ تعلیم کو رونق دی، تہذیب و شایستگی پھیلائی، اور ملک اور گورمنٹ کو خاصا مہذّب اور شایستہ بنا دیا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ جاپان اس عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور یہ مُلک وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے بہ شرطے کہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمّت ہو۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لیے سب کچھ ہوتا چلا جائے تو

یہ محض خیال بلکہ جنون ہے۔ اہلِ جاپان میں حبِّ وطنی کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور ہر جاپانی اس شدّ و مد اور جوش سے کام کرتا تھا کہ گویا ساری سلطنت کا بار اسی کے سر پڑنے والا ہے، اور ہر شخص کی دلی آرزو یہ تھی اور اسی خیال سے محنت کرتا تھا کہ وہ سارے عالم میں جاپان کی دھاک بٹھادے اور طرفۃ العین میں اُسے عروس الممالک بنادے۔ بخلاف اس کے یہاں یہ باتیں ابھی خواب و خیال سے بھی کوسوں دُور ہیں۔ دفاتر اور ہر قسم کے سر رشتے جو ایک مہذّب ملک میں ہونے چاہییں یہاں بھی موجود ہیں۔ کونسلیں ہیں، کمیٹیاں ہیں، قابل سے قابل ڈگری یافتہ افسر بھی ہیں۔ کمیٹیاں ہوتی ہیں، تجویزیں پیش ہوتی ہیں، رزولیوشن پاس ہوتے ہیں، نئی نئی اسکیمیں جاری ہوتی ہیں، رُپیہ وصول ہوتا ہے، ذرائع آمدنی بھی سوچے جاتے ہیں، رپورٹیں بھی لکھی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن حیات کا نام نہیں۔

سر سالار جنگ نے اس تدبّر کے ساتھ بڑی دانش مندی یہ کی تھی کہ ابتدا میں انھوں نے قابل لوگوں کو سر سیّد سے طلب کیا۔ یہ دو عالی دماغ شخص سرزمینِ ہندستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے مسلمان اُن پر جس قدر فخر کریں وہ بجا ہے۔ اور ایسے وقت میں ہوئے جب کہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ سر سیّدؒ کے انتخاب اور سر سالار جنگ مرحوم کی قدردانی اور کارفرمائی نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح جو لوگ انتخاب کیے گئے انھوں نے اپنے فرائض کمال وفاداری اور قابلیت سے ادا کیے۔ اور وہ ہمیشہ عزّت و حرمت کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ اُنھیں میں سے ایک مولوی چراغ علی مرحوم بھی تھے:

ابتدا میں مولوی چراغ علی کا تقرر مددگاری معتمدی مال گزاری پر بہ مشاہرہ چار سو رپے ماہانہ ہوا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد سات سو رُپے ہوگئے۔ بعد ازاں عہدِ وزارت نواب عماد السلطنت مرحوم میں جب نواب محسن الملک مرحوم معتمد پولیٹیکل و فینانس مقرر

ہوئے تو مولوی چراغ علی کا تقرر معتمدی مال گزاری پر بہ مشاہرہ پندرہ سو روپے ہوا عہدِ وزارت سر آسمان جاہ بہادر مرحوم میں جب کہ بہ مصالح وقت مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) معتمدِ مال گزاری مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی صوبہ داری ورنگل پر مامور ہوئے اور پھر صوبہ داری گلبرگہ پر تبادلہ ہو گیا۔ دو سال بعد نواب محسن الملک کے جانے پر معتمدِ مال و فینانس مقرر ہوئے۔

غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو اس طرح بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانب داری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیشِ نظر رہتے تھے اور انھیں پر سے وہ بلا رو رعایت فیصلہ کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ حیدر آباد جو اِن باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ وہ روزانہ سوائے اہم امور کے بہت کم کام کرتے تھے۔ جب کام بہت سا جمع ہو جاتا تھا تو دو تین روز جم کر کام کرتے تھے اور سب کو ایک ہی دفعہ ختم کر دیتے تھے۔ وہ کبھی طول طویل فیصلہ نہیں لکھتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم مسلوں اور مدتوں کے پیچیدہ معاملات کو چند سطروں میں سلجھا دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا معاملے کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ ان کی تحریر جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی اور یہی حال اُن کی تمام تصانیف کا ہے۔ لفظ اشد ضروری سے انھیں سخت چڑ تھی، اور اس قسم کے جو مراسلات آتے وہ انھیں اُلٹ کے پھینک دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ سمجھتے سمجھاتے خاک نہیں، خواہ مخواہ مراسلات پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم نے لکڑی کا ایک صندوق بنا رکھا تھا، جو اشد ضروری لفافہ آتا وہ اس میں بے پڑھے ڈال دیتے تھے۔ ایک بار مدار المہام بہادر کے ہاں کمیٹی تھی، اس میں اُن کے بعض ہم عصر و ہم رتبہ معزز عہدہ دار بھی

نے مدار المہام بہادر کے سامنے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے ہیں یا سوتے رہتے ہیں کہ ہمارے ضروری اور اشد ضروری مراسلات کا بھی جواب نہیں دیتے۔ مولوی صاحب نے کہا ذرا تامل فرمائیے میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ آدمی سے کہا وہ صندوق لے آؤ۔ صندوق آیا اور انھوں نے مدار المہام بہادر سے مخاطب ہوکر کہا کہ سرکار دیکھیے ان صاحبوں کے تمام اشد ضروری لفافے اس میں موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک لفافہ بھی نہیں کھولا، سب کے سب بند پڑے ہیں۔ اب میں ان میں سے کوئی سا ایک اٹھالیتا ہوں۔ چناں چہ انھوں نے ان میں سے ایک لفافہ اٹھالیا۔ اُسے کھولا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ فلاں تختہ بھیج دیا جائے۔ مراسلہ پڑھ کر سنانے کے بعد مدار المہام سے عرض کی کہ اس کا اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ یہ کون سا اشد ضروری کام تھا۔ یہ لوگ اشد ضروری کے معنی نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ لفافوں پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ میں جواب نہیں دیتا۔ پھر فرمایا کہ شاید سال بھر میں دو تین ہی واقعے اشد ضروری در پیش آتے ہوں گے۔ اِن حضرات نے ہر ایک بات کو اشد ضروری خیال کر لیا ہے۔

مولوی طالب الحق صاحب مددگار صدر محاسب جو سرکارِ عالی کے ایک نہایت متدین، قابل اور تجربہ کار عہدہ دار ہیں اور سر سالار جنگ مرحوم کے زمانے سے اب تک مختلف عہدوں پر رہے ہیں اور خود بھی مولوی چراغ علی مرحوم کے تحت میں کام کر چکے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے سرکارِ عالی میں ایسے ایسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا سابقہ ہوا ہے جو اپنے اپنے کمال اور خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے، لیکن مرحوم میں بعض ایسی خصوصیات تھیں کہ پھر کسی میں نظر نہ آئیں۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے، بڑی غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے، اور رائے

قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے، گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی مولوی صاحب موصوف نے راقم سے ایک خاص معاملے کے متعلق ذکر کرکے فرمایا (اور اُس کی مِسل کا بھی حوالہ دیا) کہ مرحوم کی زمانۂ مددگاری میں سر سالار جنگ مرحوم نے مولوی صاحب مرحوم کی رائے سے اس میں اختلاف کیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا رجحان معتمد (نواب محسن الملک مرحوم) کی طرف ہے۔ اور مولوی صاحب مرحوم کی رائے پر چند سوالات کیے۔ مرحوم نے نہایت مدلّل جواب دیا۔ اس پر کچھ سر سالار جنگ مرحوم نے اعتراض اور سوال کیے، ادھر سے پھر اس کا جواب ادا کیا گیا۔ کوئی چار پانچ مرتبہ ایسے ہی سوال و جواب ہوئے، اور آخر نواب مدار المہام بہادر مرحوم قائل ہو گئے اور یہ تحریر فرمایا کہ مَیں دیکھنا تھا کہ آپ اپنی رائے کے متعلق کیا دلائل رکھتے ہیں اور بے شک آپ کی رائے صحیح اور درست ہے۔ اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور اُن کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے ایک دو لفظ کہہ دیتے تھے جس سے مافی الضمیر ادا ہوجائے جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ نہایت تیز فہم اور صائب الرّائے تھے۔

جناب مولوی سید علی حسن خاں بہادر سابق معتمد فینانس و حال وزیر جاورہ جو مولوی چراغ علی مرحوم کے بہترین جانشین ہوئے اور بہ وجہ اپنی اعلا قابلیت تدیّن، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ ایک بار نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم فرمانے لگے کہ مولوی چراغ علی بھی عجیب و غریب آدمی تھے۔ اور اس کے بعد انھوں نے ایک پارسی جنٹلمین کا واقعہ بیان کیا جسے وظیفہ رعایتی یا رقم دینے کے متعلق

نواب صاحب مرحوم نے حکم دیا تھا۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے معاملے کو ڈال رکھا تھا اُس نے آکر نواب صاحب سے شکایت کی کہ معتمد صاحب کچھ تصفیہ نہیں کرتے اور معاملے کو ڈال رکھا ہے۔ نواب صاحب نے پھر حکم لکھا۔ مولوی صاحب مرحوم پھر چُپ سادھ گئے۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد پھر شکایت کی۔ نواب صاحب نے پھر لکھا مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بے چارہ سائل کچھ دنوں تک اپنے معاملے میں تگ و دَو کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی تو پریشان ہوکر پھر نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رویا دھویا۔ نواب صاحب مرحوم جو مروّت کے پُتلے تھے فرمانے لگے کہ اچھا جب مولوی چراغ علی یہاں آئیں تو ہمیں یاد دلا دینا۔ غرض وہ تاک میں رہا جس روز مولوی صاحب بارگاہِ وزارت میں حاضر ہوئے تو اس نے یاد دہانی کرائی۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ مَیں نے فلاں معاملے میں آپ کو تین بار حکم دیا، مگر آپ نے اب تک اُس میں کچھ نہ کیا۔ مولوی صاحب نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا اور مِسل صندوق میں سے نکال کر سامنے رکھ دی۔ نواب صاحب نے کسی قدر جھنجھلا کے کہا کہ مَیں مِسل کو کیا کروں آپ کو کئی بار لکھا گیا ہے اور آپ نے اب تک ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مولوی صاحب نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ "آپ اس لیے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لُٹا دیں۔ آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے۔" یہ جواب سُن کر نواب صاحب مرحوم بالکل ساکت رہے، اور پھر کبھی آپ نے مولوی صاحب سے اس معاملے کے متعلق تحریک نہیں کی۔ یہ واقعہ خود نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کی زبانی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سوائے مولوی چراغ علی کے کوئی دوسرا شخص یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے اُن کی اخلاقی جرات اور راست بازی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی سید علی حسن صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اضلاع پر سے جو تخمینہ گوشوارے آتے تھے اور اُن پر جو مولوی صاحب مرحوم تنقیح کرتے تھے اس سے اُن کی دقتِ نظر اور اعلا درجے کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدہ دار کہ بڑے بڑے دورے کرتے، ہر معاملے کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے، اُن سے تعلق دار لوگ اتنا نہیں ڈرتے تھے، جتنا مولوی چراغ علی مرحوم کی گھر بیٹھے تختوں کی تنقیح سے ؛

مطالعے میں بے حد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی، اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے۔ اور انتہا ہو کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں، اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے اتنے میں سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ مسٹر محبوب علی (سپرنٹنڈنٹ مدرسۂ حرفت و صنعت اورنگ آباد فرزندِ مرحوم) اپنی والدہ کی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو اُن کے سینے پر سے کتاب اٹھا کے رکھوں ورنہ کتاب کے جِلد پٹھے سب ٹوٹ کے رہ جاتے۔ تین چار گھنٹے سوتے تھے اور ایک آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں تو البتہ جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعۂ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ اُن کا کتب خانہ قابلِ دید تھا، اور اس میں بہت کم ایسی کتابیں تھیں جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہوں، یا جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔ مطالعے میں انھیں ایسی محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے اُنھیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مولوی سید تصدق حسین صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ کو جو بہت باوضع

اور ہم درد بزرگ ہیں، علاوہ قدیم تعلقات کے ایک مدت تک شب و روز مرحوم کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مرحوم کے ملازم کلّو کی زبانی فرماتے تھے کہ بلدہ میں مرحوم کا جو بنگلہ ہے اُس میں ڈرائنگ روم کے سامنے ایک شہ نشین ہے۔ اُس کے نیچے تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹھ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب مرحوم اس شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کہ اتفاق سے تہ خانے میں آگ لگ گئی اور دھنوا نکلنا شروع ہوا۔ ملازموں نے بہتیرا شور و غل مچایا کہ آگ لگی۔ مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ بھی گئی، مگر آپ جس طرح کتاب پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور یہ بھی تو خبر نہ ہوئی کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ مولوی انوار الحق صاحب نے اپنی چشم دید واقعہ جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کھانا کھا رہے تھے اور اس کے نیچے تہ خانے میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے تکلف بے ہراس کھانا کھاتے رہے۔ یا تو یہ دونوں واقعے ایک ہیں یا کلّو کے بیان کرنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے اور اس سے اُن کی استقلالِ طبع کا بہ خوبی پتا چلتا ہے۔ ایک دُوسرا واقعہ اسی قسم کا ایک صاحب نے اپنی چشم دید بیان کیا ہے۔ کہ ایک مقام پر ٹانگے میں سوار دورہ کر رہے تھے رستے میں ٹانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُسی میں پڑے پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ لوگ گئے اور کسی دُوسری جگہ سے ٹانگے کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اُس کی تہ تک پہنچتے اور اُس کے ما لہ و ما علیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے، اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے، اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر

بہم پہنچاتے۔ چناں چہ اسی غرض سے مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کو بہ غرضِ تلاشِ کتب مصر کو روانہ کیا تھا۔ مولوی عبداللہ صاحب مرحوم نے جو خط مرحوم کو مصر سے لکھا تھا وہ ہم نے خود دیکھا ہی اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہی کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم گنجایش چھوڑی ہی۔ ان کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، اور مواد فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہی؛

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب سابق اسسٹنٹ سکریٹری پولٹیکل فینانس و ناظم مردم شماری (اشوشئٹ رائل اسکول آف مائنز، فیلو آف دی جیولاجیکل سوسائٹی وغیرہ وغیرہ) راقم سے فرماتے تھے کہ جب برٹش گورمنٹ کی طرف سے ریاست میں مسٹر کرالی کے کنٹرولر جنرل مقرر ہونے کی خبر آئی تو چوں کہ مولوی صاحب مرحوم فنانشل سکرٹری تھے، انھیں فکر ہوئی۔ آخر انھوں نے فنانس پر انگریزی میں جس قدر مستند اور اعلیٰ درجے کی کتابیں تھیں سب منگوالیں، اور ان کا خوب مطالعہ کیا اور دو مہینے میں اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی اور فنانشل معاملات پر گفتگو آئی تو وہ مولوی صاحب کے وسیع معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا؛

اسی طرح جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہی تو انھوں نے اسے سیکھنا شروع کیا اور پیانو پر گتیں نکالنی شروع کیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹفک طور پر مدوّن کریں۔ چناں چہ لکھنا بھی شروع کیا تھا اور اس کا ناتمام سا مسودہ اب بھی موجود ہی۔ لیکن اس کام کے لیے بڑی فرصت درکار تھی لہٰذا اُسے انجام نہ دے سکے۔ علمِ ہیئت میں بھی انھیں کافی دخل تھا؛

متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ چناں چہ سرسید اُن کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت دست گاہ رکھتے تھے، عربی و کالڈی زبان میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے، لیٹن اور گریک بہ قدر کار روائی جانتے تھے۔ عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے، فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ اعلا درجے کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انھوں نے تصنیفیں کی ہیں"۔ زیادہ تر ان کی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں جن کا مفصل ذکر ان کی مذہبی تصانیف میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ لیکن یہاں اس قدر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی ابتدائی تعلیم خاص کر انگریزی زبان میں بہت کم ہوئی تھی لیکن انھوں نے صرف اپنے مطالعے کے زور سے انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت اور دست گاہ حاصل کر لی تھی:

ہم ان کی مطبوعہ کتب کو ہی دیکھ کر نہیں کہتے بلکہ ہم نے اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسوّدے بھی دیکھے ہیں۔ اُن کی انگریزی کتابوں پر ہندُستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو زبردست ریویو کیے ہیں اُن میں اُن کی انگریزی تحریر کی بھی تعریف ہے۔ ہم بہ طورِ نمونہ یہاں ایک دو ریویوں سے صرف اُن کی انگریزی دانی کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں :۔

'اے تھی نیم'، نے جو انگلستان کا ایک مشہور پرچہ ہے اور جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے ان کی کتاب زیرِ دیباچہ پر ایک بڑا ریویو لکھا ہے۔ لکھتا ہے کہ "مولوی صاحب کی انگریزی قابلِ قدر ہے"۔ (بابت ۵ر جنوری سنہ ۱۸۸۴ء)

'بمبئی گزٹ'، جو بمبئی پریسی ڈنسی کا بہت قابلِ قدر اخبار ہے لکھتا ہے :۔ "یہ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں لکھی گئی ہے"۔ ('بمبئی گزٹ' بابت ۱۲ر جولائی سنہ ۱۸۸۳ء)

'جنرل آف دی انجمنِ پنجاب'، نے دو نمبروں میں اس کتاب پر بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اُس میں لکھتا ہے کہ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے

اور وہ شرع و مذہب اسلام کا بڑا عالم ہو"۔

مولوی انوار الحق صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے سیّد محمود مرحوم کا خط مولوی چراغ علی کے نام دیکھا جس میں سیّد محمود مرحوم نے مولوی صاحب کے وسیع معلومات اور ان کی انگریزی دانی اور انگریزی کی بڑی تعریف کی تھی۔

علاوہ مذہبی تصانیف کے جن کا ذکر مفصل طور پر الگ کیا جائے گا یہاں اُن کی بعض اُن تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہو جو انھوں نے سرکاری تعلق اور حیثیت سے لکھیں یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔

۱۔ 'بجٹ' (موازنہ) سب سے اوّل مولوی چراغ علی مرحوم نے تیّار کیا۔ اگرچہ موازنہ اب کچھ کا کچھ ہو گیا ہو اور خاصہ ایک دفتر ہو۔ لیکن بعض اہل الرّائے کا یہ قول ہو کہ جو اختصار اور صفائی اُس موازنے میں پائی جاتی ہو وہ موجودہ موازنے میں نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج کل موازنے کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہو لیکن بہ فحوائے اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ فضیلت کی دستار مولوی صاحب مرحوم ہی کے سر رہے گی۔

۲۔ 'اڈمنسٹریشن ریورٹ' (رپوٹ نظم و نسق) بابت سنہ ۸۵ و ۱۸۸۴ء لکھی جو چھ سو سینتیس ۶۳۷ بڑے بڑے صفحوں پر ہو۔ اس قسم کی پہلی رپوٹ ہو اور بعد ازاں جتنی رپوٹیں لکھی گئیں وہ اسی کی پیروی میں لکھی گئیں۔

۳۔ 'حیدرآباد (دکن) انڈر سر سالار جنگ'۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہو اور ریاست کی انتظامی حیثیت سے نہایت قابلِ قدر اور بے مثل کتاب ہو۔ مولوی صاحب مرحوم نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جان کاہی سے کام لیا ہو۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں اُن تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہو جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں۔ لیکن جس انتظام اور

صیغے پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے، اسے ابتدا سے لیا ہے اور اس کی اصل، تغیرات، وجہ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہے اور اس کے متعلق تمام مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیا کر دیا ہے۔ علاوہ اس تاریخی اور انتظامی حیثیت کے ساتھ ساتھ ممالکِ محروسہ سرکاری کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات سے بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے بغیر کوئی شخص حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ حالتِ انتظامی سے پورا واقف نہیں ہو سکتا خصوصاً جن لوگوں کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ہے، انھیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری بلکہ لازمی ولابد ہے۔ اس کتاب کو مولوی صاحب مرحوم نے نواب سرسالار جنگ کے نام سے معنون کیا ہے۔ اگرچہ کتاب نواب صاحب مرحوم کے زمانے میں آپ کی اجازت سے لکھنی اور چھپنی شروع ہو گئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ بعد میں فاضل مؤلف نے اپنی احسان مندی کے اظہار میں نواب مرحوم کے نام سے اُسے منسوب کیا۔ انگریزی اخبارات نے اس پر بہت عمدہ عمدہ ریویو کیے ہیں اور فاضل مؤلف کی محنت و تحقیق کی داد دی ہے۔ چناں چہ 'بمبئی گزٹ' اپنے نمبر مورخہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۸۸۴ء میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب کے تاریخی اور اعدادی حصے میں بڑی محنت اور احتیاط صرف کی ہے۔ لیکن سب سے دل چسپ وہ حصہ ہے جس میں موجودہ نظم و نسق کی کیفیت درج ہے۔ اس میں متجسس ناظرین اُن مختلف محکموں اور سررشتوں کے طرزِ عمل اور حقیقت کو دیکھیں گے جو سرسالار جنگ کی بدولت ایسے وقت میں ظہور میں آئے جب کہ بے عنوانی اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی اور اُنھوں نے نظم و ترتیب کی صورت قائم کی"۔

اسی طرح اُس وقت کے رزیڈنٹ مسٹر کارڈی نے اپنے خط مورخہ ۱۷ ار اکتوبر سنہ ۱۸۸۴ء میں جو مولوی صاحب مرحوم کے نام ہی اس کتاب کی بہت تعریف لکھی ہی ٭

اسی کا ایک ضمیمہ صرفِ خاص انڈر سر سالار جنگ، ہی جن میں اُن اصلاحات و ترقیات کا ذکر ہی جو سر سالار جنگ کی تدبیر و دانش مندی سے علاقہ صرفِ خاص میں عمل میں آئیں ٭

۴۔ "جاگیرات و جاگیر داران"۔ افسوس یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس میں تمام جاگیر دارانِ ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کی اصل اور تاریخ، ان کا رقبہ اور آمدنی، پیداوار، صنعت و حرفت اور دیگر تمام دلچسپ اور مفصل حالات درج کریں۔ لیکن اس کے لیے انھیں مواد بہم پہنچانے میں بہت دقت پیش آئی۔ یہاں کے جاگیردار صاحبان مولوی صاحب کے اس کام کو غالباً شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے، اور مراسلوں کے جواب میں حوصلہ شکن تساہل سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہی کہ مرحوم کی زندگی میں یہ کتاب ختم نہ ہونے پائی۔ اور ان کے بعد جو لوگ عہدۂ فنانشل سکرٹری پر اُن کے جانشین ہوئے ان میں سے نہ کسی کو اس سے دلچسپی تھی اور نہ اتنی فرصت کہ اس کام کو انجام تک پہنچاتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو نہ صرف دلچسپ ہوتی بلکہ بہت سی عمدہ معلومات کا خزانہ ہوتا جو گورنمنٹ اور ملک دونوں کے لیے مفید ہوتا ٭

غرض مولوی چراغ علی مرحوم نہ صرف بہ حیثیت ایک مصنف کے بلکہ بہ حیثیت ایک عام انسان کے بھی ایک عجیب و غریب شخص تھے۔ اور یہی وجہ ہی کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوا ہی۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے

اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے، اور چوں کہ وہ تقریباً ہر شخص سے جدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے دُوسرے اُنھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ وہ ایسی ہنسی بہاشی کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چناں چہ اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوائے دُوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جز بز ہوتے تھے، کبھی اخبار اُٹھا لاتے، کبھی کتاب پڑھنے لگتے۔ عام طور پر بہت کم سخن تھے، بہت اختصار کے ساتھ اپنا مطلب ادا کرتے تھے، اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے، اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح وبسط اور خوبی کے ساتھ دیتے۔ مثلاً اگر کسی بچے نے کسی پودے کی نسبت پوچھا تو آپ پُورا حال اس پودے کا اور پودوں کی نشو و نما اور آب و ہوا اور زمین کے اثر کا بیان کر دیتے اور ان چھوٹی چھوٹی مگر مشکل باتوں کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تو تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے، پھر مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا، خودی و بزرگی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے

زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اُس وقت انھیں بہت کچھ سِکھا سکتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی بہت سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ رُپے پیسے کی بالکل محبّت نہیں تھی۔ بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے، نہ کبھی کسی معاملے میں ان سے باز پُرس کرتے، اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے ان کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی، مگر خفا ہونا تو درکنار انھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں کر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔ مولوی صاحب مرحوم کے بھتیجے مولوی محمد علی صاحب جو نیک سیرتی اور سادگی میں اپنے والد مرحوم اور چچاؤں کی سچّی یادگار ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ رات کا کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ جب ہم نے انھیں کام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر سوئے، پھر اُٹھ کر لکھنے یا پڑھنے بیٹھ گئے، اور پھر سو گئے، اور اس کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ دُوسرے کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ چوں کہ ذیابطیس کی شکایت تھی، پانی زیادہ پیتے تھے، اور یوں بھی رات کے وقت وہ اکثر کام کرتے رہتے تھے لیکن کبھی کسی نوکر کو نہ بُلاتے اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔

غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہ وقار، عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بے کار ضائع جانے نہیں دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اور ایسے وقت میں کسی طرف متوجّہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور بیہودہ باتوں سے انھیں طبعی نفرت تھی۔ یہ حال غیروں ہی سے نہ تھا بلکہ بیوی بچّوں سے بھی یہی کیفیت تھی۔ سب کی سُن لیتے تھے مگر اپنی کچھ نہیں کہتے تھے، کبھی کسی سے مناظرہ اور بحث نہیں کرتے تھے، کوئی کچھ کہا کرے، انھیں جو کچھ کرنا ہوتا تھا

کر گزرتے تھے ؎

سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ
حالی

وقار اور متانت ان پر ختم تھی، استقلال میں پہاڑ تھے، آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کہیں نہ چوکتے تھے، مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اسلام کے سچّے حامی تھے، اور اُن کی عمر اور محنت کا زیادہ حصّہ اسی میں گزرا۔ اُن سے پہلے صرف دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یورپین مصنّفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں، ایک تو سرسیّد جن کی کتاب 'خطباتِ احمدیہ' کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور دُوسرے رائٹ آنریبل مولوی سیّد امیر علی بہ القابہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں اُس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود ان کے حریف ریورنڈ کینن میکال نے اُن کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملت سے انھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی، یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ چناں چہ گزشتہ مردم شماری سے قبل جب مردم شماری ہوئی تو انھوں نے مذہب (فرقہ) کے خانے میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے لفظ شیعہ لکھ دیا، لیکن اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیے۔ اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اُس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے، اور باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔

اس موقع پر یہ واقعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس وقت ہم مولوی صاحب مرحوم کے حالات کی جستجو میں تھے تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں چند خطوط

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کے بھی ملے جو انھوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پُرزور کتاب 'براہینِ احمدیہ' کی تالیف میں مدد طلب کی تھی۔ چناں چہ مرزا صاحب اپنے خط میں کہتے ہیں کہ "آپ کا افتخار نامہ محبت آمود . . . عزِّ ورود لایا۔ اگرچہ پہلے سے مجھ کو بہ نیتِ الزام خصم اجتماع براہینِ قطعیہ اثباتِ نبوت و حقیتِ قرآن شریف میں ایک عرصے سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجبِ گرم جوشی و باعثِ اشتعالِ شعلۂ حمیتِ اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجبِ ازدیادِ تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحبِ فضیلت دینی و دنیوی تہِ دل سے حامی ہو، اور تائیدِ دینِ حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلاشائبۂ ریب اس کو تائیدِ غیبی خیال کرنا چاہیے جزاکم اللہ نعم الجزاء . . . . ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائجِ طبعِ عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں۔" ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں "آپ کے مضمون اثباتِ نبوت کی اب تک میں نے انتظار کی، پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا، اس لیے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہِ عنایتِ بزرگانہ بہت جلد مضمون اثباتِ حقانیتِ فرقانِ مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں، اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا 'براہینِ احمدیہ علیٰ حقانیت کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ' رکھا ہے، اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کردوں اور اپنے مختصر کلام سے اُن کو زیب و زینت بخشوں۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرماویں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرماویں۔" اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوتِ اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "دوسری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے، اور امید کہ عنقریب آجائے گا اور پنڈت

دیانند کی 'وید بھاش'، کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں، اور اُن کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے، لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہوں یا جو وید پر اعتراض ہوتے ہوں، اُن اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتبِ مسلمہ آریہ سماج کی صرف 'وید' اور 'منو اسمرت' ہے، اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں۔ مَیں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثباتِ نبوّت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہنود کے وید اور اُن کے دین پر بھی سخت سخت اعتراض کیے جائیں کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلافِ حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے اُن پر ثابت کیے جائیں، اپنے دین کی طرف داری سے باز نہیں آتے، اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گزارہ کرلیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کر دوں گا۔" ایک اور خط مورخہ ۱۹ فروری سنہ ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں "فرقانِ مجید کے الہامی اور کلامِ الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعثِ ممنونی ہے نہ موجبِ ناگواری۔ مَیں نے بھی اسی بارے میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے۔ اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شایع ہوجائے گا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہاتِ صداقتِ قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں، تا اسی رسالے میں حسبِ موقع اندراج پاجائے یا سفیرِ ہند میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانۂ گزشتہ سے تعلّق رکھتے ہوں اُن کا تحریر کرنا ضروری نہیں، کہ منقولاتِ مخالف پر حجّتِ قویّہ نہیں آسکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے

یا جو عند العقل اُس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیے۔ بہ ہر صورت میں اُس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بہ مقتضا اس کے کہ اُلکریم اذا وعد وفا مضمون تحریر فرما دیں۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے۔ اور آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکرِ کتاب الٰہی کو دندان شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں، ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔" اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ ارمئی سنہ ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں" کتاب 'براہینِ احمدیہ' ڈیڑھ سو جز ہی جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس رُپے ہی۔ اور آپ کی تحریر محققانہ ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی"۔

ان تحریروں سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہی کہ مولوی صاحب مرحوم نے مرزا صاحب مرحوم کو 'براہینِ احمدیہ' کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہی۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ مولوی صاحب مرحوم کو حمایت و حفاظتِ اسلام کا کس قدر خیال تھا۔ یعنی خود تو وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ چناں چہ جب مولوی احمد حسین صاحب امروہی نے اپنی کتاب 'تاویل القرآن' شایع کی تو مولوی صاحب مرحوم نے بہ طور امداد کے سو رُپے مصنّف کی خدمت میں بھیجے اسی طرح جو لوگ حمایتِ اسلام میں کتابیں شایع کرتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں ان کی کتابوں کی خرید فرماتے تھے، چناں چہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب 'پیغامِ محمدی' کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔

وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے، چہرے سے اُن کے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی، چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ اُن کے اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے، جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہی کہ

علاوہ شکل وصورت کے لوگوں پر اُن کے علم وفضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

حیدرآباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے، اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، وہ اس طرح سے رہے، جیسے طوفانِ موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حال آں کہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی جھگڑے کسی سازش، کسی پولیٹیکل سوشل تحریک میں اُن کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے، نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی امور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے، وہ ان سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے، ان کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا ؎

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
(حالی)

جو لوگ یہاں کام یابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اُنھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے، اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمینِ شور میں قلبہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اب تک بار آور ہیں، اور جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ عزت وحرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا: ؎

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
(میر)

# وفات

اگر صد سال مانی ور یکی روز		بہ باید رفت زیں کاخِ دل افروز

مرحوم کو ذیابیطس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، اب اسی کے اثر سے ایک گلٹی دہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرے کے نیچے نمودار ہوئی، ڈاکٹر ہیر اُن کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ اور ڈاکٹر لاری مشہور سرجن و سابق ناظم محکمۂ طبابت سرکارِ عالی کی یہ رائے ہوئی کہ عملِ جراحی کیا جائے۔ اس وقت تک مرحوم بالکل تن درست اور صحیح معلوم ہوتے تھے اور سرکاری کام میں برابر مصروف تھے۔ چناں چہ حسبِ مشورۂ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اس کے بعد صحت میں یک بارگی فرق آگیا اور ضعف طاری ہوگیا بعد ازاں دو تین بار پھر نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردّی ہوتی گئی اور زہر آلود خون پھیلتا گیا۔ حال آں کہ یہ زخم بہت ہی نازک ہوگیا تھا اور پکے پھوڑے سے زیادہ اس میں تکلیف ہوتی تھی، لیکن جب ڈاکٹر زخم صاف کرتا اور اُسے اندر باہر سے صاف کر کے دھوتا تھا، تو مولوی صاحب خاموش اسی طرح بیٹھے رہتے تھے، کیا مجال جو زبان سے اُف نکل جائے، یا تیور سے کسی قسم کی درد یا تکلیف کا اظہار ہو۔ چوں کہ حالت ناقابلِ اطمینان تھی لہٰذا مولوی صاحب اور اُن کے اعزہ و احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ بمبئی جا کر علاج کیا جائے۔ چناں چہ روزِ سہ شنبہ بہ تاریخ ۱۱ر جون سنہ ۱۸۹۵ء مرحوم معہ اہل و عیال کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، حالت بہت ردّی ہو چکی تھی، زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی، اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جان دار بچ نہیں سکتا آخر آ پہنچا۔ پندرھویں جون روزِ شنبہ صبح کے آٹھ بجے سے تنفّس شروع ہوگیا اور گیارہ بجتے بجتے دارِ فنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طے کر کے راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

مرحوم بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انسان نہیں رہتا، لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں، جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اُس کی کمائی ہے۔ اولادِ مرحوم کی یہی ہے یعنی پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں۔ بہ فضلِ خدا سب کے سب صحیح سلامت اور بہ قیدِ حیات ہیں۔ اور اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جان دار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنیٰ اور ذلیل جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چناں چہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں لیکن انسان کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں، بلکہ اُن کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اور ہم کیا یاد کر رہے ہیں، بلکہ ان کا کیریکٹر اور ان کا کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم ان کی کتابیں شوق سے پڑھتے، ان کا ترجمہ کرتے اور انھیں یاد کرتے ہیں اور ان کے نیک نام اور کام کی یاد دُوسروں کو دلاتے ہیں۔ بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔

مرحوم کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس و ملال کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ہم بہ خوفِ طوالت صرف دو تحریروں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم (مدار المہام وقت) کا اظہارِ افسوس جو انھوں نے سرکار کی طرف سے کیا۔ اور جریدۂ اعلامیہ سرکارِ عالی میں طبع اور شایع ہوا۔ دُوسرا سر سید کا نامۂ الم جو اس دردناک خبر کے سنتے ہی اُنھوں نے 'تہذیب الاخلاق' میں لکھا تھا حقیقت میں یہ دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی ہوئی ہیں:۔

"مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ، بے لوث، مستقل مزاج،

تجربہ کار، عہدہ دار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا۔ اُدھر قوم میں سے ایک حامیٔ ملت اور فاضل محقق گم ہو گیا۔ جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم نے قلم اُٹھایا ہے اُس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور زمانۂ آیندہ اس سے بھی بہتر لوگ پیدا کرے گا۔ لیکن ایسے دُھن کے پکّے، دنیا و مافیہا سے بے خبر اور اپنے کام میں ہمہ تن محو، مشکل سے پیدا ہوں گے"۔

(از جریدۂ اعلامیہ احکامِ سرکارِ نظام الملک آصف جاہ، جلد بست و ششم نمبر چہل و یکم مطبوعہ ہفدہم امرداد ماہ الٰہی سنہ ۱۳۰۴ ف مطابق سی ام ذی الحجہ سنہ ۱۳۱۲ھ)

"نواب مدار المہام سرکارِ عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سُنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمدِ مال و فینانس سرکارِ عالی نے بہ تاریخ ہشتم امرداد سنہ ۱۳۰۴ ف بہ روز شنبہ بہ مقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بہ غرضِ علاج و تبدیلِ آب و ہوا گئے تھے، انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگزار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکارِ عالی مکرّر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ طبقۂ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو درحقیقت بہت نقصان پہنچا"۔ (صفحہ ۳۹۵ نشان ۱۶۴)

(از "تہذیب الاخلاق"، علی گڑھ) سلسلہ سوم جلد دوم، مطبوعہ یکم محرم الحرام سنہ ۱۳۱۳ھ)

"افسوس! ہزار افسوس! صد ہزار افسوس! کہ پندرھویں جون سنہ ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بہ مقام بمبئی چار ہفتے کی بیماری میں انتقال کیا۔ اُن کا خط خود اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مورخہ نہم جون مقام حیدرآباد سے ہمارے پاس آیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تین ہفتے سے بیمار ہوں، ڈاڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے، ڈاکٹروں نے اس اندیشے سے کہ مغز میں

ورم نہ ہو جائے کلور فارم کا عمل کر کے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلور فارم کا عمل کیا۔ بہت ہی کمزور ہو گیا ہوں، کھانا پینا نہیں، چلنا پھرنا موقوف، مگر اب زخم بھرتا چلا آتا ہے، اور ارادہ ہے کہ تبدیلِ آب و ہوا کے لیے بمبئی جاؤں۔ اس کے بعد بارھویں جون کا بمبئی سے انھیں کا بھیجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آگیا ہوں۔ افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جب کہ ہم بعض کاغذات ان کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے، اُسی وقت انھوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے، حیدرآباد میں سالارجنگ اعظم نے ان کو بُلایا تھا۔ اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدرآباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

متعدد علوم میں نہایت اعلا درجے کی دست گاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بہ قدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلا درجے کے مصنّف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن) افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب

جو انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا، اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا"۔

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ اُن میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

سیّد محمود مرحوم (خلف سر سیّدؒ) نے بھی جو فارسی صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی: ع

جیف چراغ علی از دنیا نہاں شد

۱۸۹۵ء

مولانا حالی مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے: ؎

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بر دل — کہ از و خاطرِ افگار بہ صد غم شد جفت
از خرد سال وفاتش چو بہ جستم 'محمود' — "شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا" گفت

مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور کیریکٹر کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے: ؎

آہ آہ! از رحلتِ بے گاہِ اعظم یار جنگ — کز میانِ رہ زہم راہاں عناں پیچید و رفت
جیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع — بزمِ ما را بزمِ ماتم باز گردانید و رفت
مستفیداں پُر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز — مشتی از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحابِ فیضِ کلکش ناشدہ سیرابِ خلق — ساعتی برقِ یمانی از اُفق تابید و رفت
عقدہ ہا نہ کشودہ ماند و نکتہ ہا نہ نوشتہ ماند — بہر جوی شیر کوہِ بی ستوں کندید و رفت
کرد بی آزارِ خلق اعمالِ سلطانی ادا — نی ز کس رنجید و نی کس را بہ رنجانید و رفت
یادرانِ قوم را تا زیست یاور بود و یار — ہر چہ بہ توانست در تاییدِ شاں کوشید و رفت
از دلِ پُر درد او گاہی صدای بر نخاست — مدتی چوں بحرِ کاہل در نہاں جوشید و رفت

طبعِ آزادش بہ ہر ملت کہ بینی صلح داشت　　در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجید و رفت
گر زید صد سال کس انجام او مرگست و بس　　چوں شرر بر وضعِ دوراں می تواں خندید و رفت

مولوی محمد اعظم صاحب چریاکوٹی نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک حیدرآباد میں ملازم تھے اور اب وظیفہ یابِ حسنِ خدمت ہیں، ایک اچھا قطعہ تاریخ لکھا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

آں گرامی معتمد کز حسن رایش بے درنگ　　یافت آرے در دکن مال و خزانہ آب و رنگ
محکم اخلاصِ دلی با ملتِ اسلام داشت　　در معیشت بود در رفتارش بر آدابِ فرنگ
علم را جوہر شناسے، قدردانِ اہلِ علم　　طالبِ حکمت نگہ دارندہ آئینِ ہنگ
با علوِ فکر تش مرغِ ہما بر کندہ بال　　عقلِ کل در مرغزارِ جو دتش آہوی لنگ
با سبک روحی متینی بود چوں کوہِ گراں　　کلک او در دشتِ معنی برق رفتاری سرنگ
بہرِ معنی ہا دلش دریائی گوہر خیز بود　　وقت گویائی دہانش بود شکر بادِ تنگ
شد نمایاں ناگہاں از گوشۂ رخسارِ او　　دانۂ ریشِ قضا چیزی کم از قدرِ مشنگ
بارہا از بہرِ اصلاحش برو نشتر زدند　　تا شد از نشتر زنی ہا کار بر بیمار تنگ
رفتہ رفتہ شد بس ابتر حالِ او در چند روز　　بود گویا صورتِ تصویر بر پشتِ پلنگ
عاقبت بے وقت مرگ از گلشنِ گیتی ربود　　آں چناں کز کمیں ساحل نشیناں را نہنگ
الغرض چوں رختِ ہستی بست از دنیای دوں　　ہاتفی گفت از جلالی، وای اعظم یار جنگ
　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۲　۱۳ ھ

سید محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سنہ عیسوی میں دوسری ہجری نبوی میں کہی تھیں۔ جو یہ ہیں :ـــ

۱۔ ہاتفی گفت از سرِ افسوس　　گوہرِ شب چراغ بود نماند
　　　　　　　　　　　　　　۱۸۹۵ ع

۲۔ ہائے اعظم یار جنگ
　　۱۲ ، ۱۳ ھ

# مقدّمۂ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

غدر سنہ ۱۸۵۷ء سے مسلمانانِ ہند کی حالت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا اگرچہ اقبال کبھی کا منھ موڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی برائے نام باریک سا پردہ آنکھوں کے سامنے حایل تھا۔ اس پردے کے اُٹھتے ہی ادبار کی بھیانک اور مہیب تصویر نظروں کے آگے پھر گئی۔ رسّی کے جلنے پر بھی بَل ویسے ہی رہتے ہیں، نشہ اُتر جانے پر بھی خمار کا اثر باقی رہتا ہے سب کچھ چھن جانے پر بھی غفلت وہی رہی۔ فرداً فرداً سب اپنی قسمت کے شاکی اور اپنے حال پر نالاں تھے لیکن بدبخت قوم کے حالِ زار پر کسی کی نظر نہ تھی اور جو کسی کے دل میں درد اُٹھا بھی تو اتنی ہمّت اور سکت کہاں جو اس پُرآشوب اور تاریک زمانے میں جب کہ ہر طرف یار و اغیار منھ کھولے بیٹھے تھے، اور زمین و آسمان دشمن ہو رہے تھے، اپنے اور اپنے بھائیوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ قومیت کا خیال سالہا سال سے مر چکا تھا، اخوت اور محبت کے اثر دلوں سے محو ہو چکے تھے، البتہ مذہب سے محبت ضرور تھی، مگر وہ بھی نادان دوست کی محبت سے زیادہ نہ تھی۔ حکومت جا چکی تھی، اقبال منھ موڑ چکا تھا، دولت سے بہرہ نہ تھا، علم پاس نہ تھا، اغیار تو اغیار خود یار و مددگار جان کے لیوا تھے، آفات کا نزول تھا، ادبار کی چڑھائی تھی۔ ایسے کڑے وقت پر، ایسے نازک زمانے میں، ایسے ہنگامۂ رست و خیز میں جب کہ نفسی نفسی

کا عالم اور عزت و غیرت کا ماتم بپا تھا، اپنے بھائیوں کے کام آنا عین جواں مردی اور اصل انسانیت ہی۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپِ ہمسائیگاں
وز سمومِ نجد در باغِ عدن بریاں شدن

مسلمانوں کی حالت اس وقت اس بے سروسامان اور لُٹے قافلے کی سی تھی جو ایک لق و دق صحرا میں جا نکلا ہی، جہاں راستے کا نشان گم ہو، زادِ راہ مفقود ہو، ہر طرف سے طوفان بپا ہی۔ مگر اس پر بھی ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں اور نفسانیت پر تُلے ہوے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ غافل اور لایعقل اُن کے رہ بر و رہ نما ہیں۔ اس بُرے وقت میں انھیں میں سے ایک بندۂ خدا اُٹھتا ہی، جو انھیں راستہ دکھلانے اور کھوئی دولت کا نشان بتلانے پر آمادہ ہوتا ہی۔ اہلِ قافلہ اس پر ہنستے اور اُسے بے وقوف بناتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ان کے راہ گم کردہ اور گم راہ کن رہ نما اس کے دشمن ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ آپس کے لڑائی جھگڑے چھوڑ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس پر طرح طرح کی بدگمانیاں کی جاتی ہیں۔ اس کی محبت کو عداوت، اس کی ہم دردی کو بدخواہی، اس کی دل سوزی کو خود غرضی پر محمول کیا جاتا ہی۔ وہ جوں جوں ان کی دل دہی کرتا ہی، وہ اس سے اور بد کتے ہیں، وہ جوں جوں اُن کی فلاح و بہبود کی کوشش کرتا ہی وہ اور اس سے بدظن ہوتے ہیں۔ ایک عرصے تک اس کی صدا صدا بہ صحرا اور اس کی بے ریا کوشش سعی لاحاصل رہی۔ لیکن آخر اس کی صداقت نے فتح پائی۔ اس کے خلوص نے سب کو قائل کر دیا۔ اس کی بے ریائی نے خود غرضیوں کے طلسم کو توڑ دیا اور زمانے نے خود کھوٹے کھرے کو پہچان لیا۔ جھوٹ کو زک ہوئی اور میدان سچ کے ہاتھ رہا۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ

وہ کوئی انوکھا شخص نہ تھا۔ وہ ہمیں میں سے تھا۔ ہماری ہی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی تھی۔ وہ کوئی عالم وفاضل نہ تھا، مال دار اور دولت مند نہ تھا، صاحبِ جاہ ذی اثر نہ تھا، وہ ہر لحاظ سے ایک معمولی آدمی تھا۔ لیکن ہاں اسے ایک دل ملا تھا جس میں درد تھا اور واقعات سے متاثر ہونے کی صلاحیت تھی۔ لیکن کیا کسی اور کے دل میں درد نہ تھا؟ ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ اس سے زیادہ ہو۔ لیکن اگر نرا درد ہی درد ہوا تو پھر انسان اس کے جذبے اور زور میں اپنے تئیں نہیں سنبھال سکتا وہ آپے سے باہر ہو جاتا اور کپڑے پھاڑ کر دنیا سے نکل جاتا ہے کہ اس کی نوبت "خبرش باز نیامد" تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس درد کے ساتھ اُسے دماغ بھی ویسا ہی عطا ہوا تھا۔ درد اس میں حرکت اور اشتعال پیدا کرتا تھا اور عقل اس کی تحریک پر اسے سیدھے راستے سے بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ یہی ایک سچے مذہب اور خصوصاً اسلام کی تعلیم کا ماحصل ہے کہ انسان نہ تو جذبات ہی سے ایسا مغلوب ہو جائے کہ دنیا کے کام کا نہ رہے اور نہ درد سے خالی عقل ہی کا بندہ ہو جائے کہ ایک بگولے کی طرح دنیا میں مارا مارا پھرے۔ اس لیے ایسے نازک وقت میں قوم کو سنبھالنا ایک ایسے ہی شخص کا کام تھا جس کے سینے میں درد بھرا دل ہو اور اس کے ساتھ ہی روشن دماغ رکھتا ہو۔ ریفارمر اور مجتہد ہونے کا حق ایسے ہی شخص کو حاصل ہے۔

آج یہ اسی کا طفیل ہے کہ ہم مسلمانوں میں ایک حرکت سی دیکھتے ہیں اسی نے ہمیں قومیت اور ہمدردی کا سبق پڑھایا۔ اسی نے ہمیں علم سیکھنے کا شوق دلایا، اسی نے ہمیں اپنے مذہب کی حقیقت سے واقف کیا اور دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے چلنے کی تعلیم دی۔

باوجود ان تمام بیش بہا اور بے نظیر خدمات اور احسانات کے جو سر سید نے اپنی قوم پر کیے اس نے اپنی مثال سے دنیا میں پھر ایک بار یہ ثابت کر دیا کہ علم وفضل

دستارِ فضیلت میں نہیں، حکمت و دانش یونی ورسٹی کی ڈگریوں میں نہیں، لیاقت و قابلیت امتحان سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر بالفرض یہ سب کچھ ہو بھی تو کیا؟ کیا کتابوں کے تودے اور عمامۂ فضیلت کے وزن سے انسان بنتا ہے؟ نہیں بلکہ ع

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

بعض "حاملانِ اسفار" اب تک اسی خام خیالی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ایسے شخص کو جس نے کبھی باقاعدہ نصابِ نظامیہ پڑھ کر فضیلت کی دستار حاصل نہیں کی، کیا حق حاصل تھا کہ وہ تفسیر لکھے، یا جس نے کبھی علوم کی تحصیل کی نہیں اس کو علوم کی اشاعت اور اس کے متعلق رائے دینے کا کیا منصب تھا۔ لیکن ان کو کولھو کے چکّر سے باہر نکل کر اور آنکھوں پر سے اندھیری اُٹھا کر ذرا دنیا کو دیکھنا چاہیے:

لیکن بڑی مشکل یہ تھی کہ قوم میں ایک خرابی نہ تھی کہ جس کی اصلاح کی جائے کوئی ایک بیماری نہ تھی جس کا علاج ہو۔ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہ تھی اور سر سے پانو تک روگوں بھری تھی۔ یہ اسی کا دل و دماغ تھا کہ ہمت نہ ہارا اور ہر خرابی کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ وہ اس دُھن میں ایسا لگا کہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ یہ جہاد کا وقت تھا۔ اور اس نے جہاد کیا۔ اور جہاد بھی کیسا جہادِ اکبر۔ یہاں اس کے بے مثال احسانات گنوانا ایک قصۂ طویل ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ اگرچہ اس نے ہر قسم کی اصلاحات پر کمر باندھی، لیکن اس کی دُور بین نظر نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جہاں مسلمان عزّت و حکومت، علم و دولت کھو چکے ہیں، وہاں وہ اپنے سچے مذہب کو بھی فراموش کر چکے ہیں۔ اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ اور سارے فساد کی اصل ہے۔ چناں چہ اس نے جان توڑ کر اس خرابی کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی ساری ہمّت و قوت اس میں صرف کر دی:

دنیا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی، اس کی نیرنگیاں کبھی کم نہیں ہوتیں، اور

ہمیشہ کسی نہ کسی نئے دَور کا زور و شور رہتا ہے۔ اس زمانے میں بھی یورپ میں علم و حکمت کا وہ سیلاب آیا کہ اس نے پچھلے دوروں پر پانی پھیر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ جب کسی خاص زمانے میں کسی خاص طرف میلان ہوتا ہے تو اس میں مبالغہ بھی بے حد ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ اور اس لیے انسان کی گزشتہ کوششوں کے مقابلے میں اس خاص لحاظ سے بہت بڑی ترقی ہو جاتی ہے اور اس کے اثر سے بڑے بڑے تغیّر اور انقلاب آتے ہیں۔ فلسفے اور مذہب کا بَیر قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اب اس دَور میں سائنس نے نیا چولا بدلا اور سارے عالم میں کھلبلی مچادی تو اوّل اوّل اہلِ مذاہب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کی عالم گیر اور حیرت انگیز ترقی دیکھ کر ششدر سے رہ گئے۔ مگر پھر وہ سنبھلے اور سنبھل کر اپنے بچاؤ کی فکر کرنے لگے مگر یہ ترقی یافتہ اقوام کی حالت تھی۔ لیکن وائے بر آں قوم جس پر جہالت اور تعصب چھایا ہوا ہو، جس کے مجتہد اور مصلح اپنے مقتدیوں سے زیادہ ناواقف اور جاہل ہوں! ہمارے علما کی حالت اس وقت اصحابِ کہف کی سی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو وہیں سمجھ رہے تھے جہاں وہ تھے۔ زمانے کا تغیّر اور اس دَور کی خصوصیت ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی اور آئے تو کیوں کر، جو یہ سمجھے کہ رات کو سویا اور صبح ہوتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اسے کوئی کیوں کر سمجھا سکتا ہے کہ اس اثنا میں کئی صدیوں کا پھیر پڑ گیا ہے اور زمانے میں ایک نیا دَور شروع ہو گیا ہے؛

یہاں آلاتِ حرب سرے سے بدل گئے ہیں اور ہم ہیں کہ اپنی بوسیدہ تلوار، ڈھال اور تیر و ترکش سنبھالے مقابلے کے لیے چلے جا رہے ہیں۔ اور چوں کہ غنیم کی قوت کا اندازہ نہیں ہے اس لیے اسے بے حقیقت سمجھتے ہیں اور اپنی قوت پر نازاں ہیں؛

سرسیّد نے دیکھا کہ اور تو ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیز

مذہب بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ اور ہم کہیں کے نہ رہیں۔ وہ مذہب کی قوت اور اثر سے خوب واقف تھا اور جانتا تھا کہ ہم مذہب ہی کے بل پر دنیا میں اُٹھے تھے اور اب بھی اگر سنبھلے تو اسی کے سہارے سے سنبھلیں گے۔ اور اس لیے اپنی تمام اصلاحوں کی بنیاد مذہب پر رکھی۔ اور ساتھ ہی ان تمام الزامات کو نہایت تحقیق اور شدومد کے ساتھ رفع کیا جو اس نئے زمانے میں اسلام پر ہر طرف سے وارد ہو رہے تھے۔ اس نے ان الزامات کا جواب ملّانوں کی طرح کج بحثی سے نہیں دیا بلکہ اس نے اس کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ کیوں کہ پُرانے ہتیار بے کار ہو چکے تھے۔ اور اس دم دعوے کے ساتھ اسلام کی حقّانیت ثابت کی جس کی نظیر اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کام میں بعض اور بندگانِ خدا نے بھی جو اسلام سے محبت رکھتے تھے سرسیّد کا ہاتھ بٹایا۔ اور جس عظیم الشّان کام کو سرسیّد نے انجام دیا تھا۔ اسی کی پیروی میں بھی ان لوگوں نے اپنی اپنی بساط کے موافق اسلام کی خدمت کی۔ ان سب میں زیادہ محقّق' وسیع النظر اور زبردست مصنّف' مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ بہادر) مرحوم تھے ان کی تقریباً تمام تصانیف اسلام کی حمایت میں ہیں۔ ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا مطالعہ کس قدر وسیع اس کی نظر کیسی غائر اور اس کی تحقیق کس پایے کی تھی۔ وہ لفاظی اور عبارت آرائی کچھ نہیں جانتے اور نہ ان کو فصاحت و بلاغت سے کچھ سروکار ہے، جیسا کہ اکثر مذہبی تصانیف کے مصنّفین کا قاعدہ ہے مگر ان کی کتابیں معلوماتِ علمی سے لبریز ہیں۔ واقعات کی تنقید و تنقیح، صحیح نتائج کے استخراج میں انھیں کمال حاصل ہے۔ وہ کبھی اپنی بحث سے الگ نہیں ہوتے، کبھی کوئی غیر متعلق بات نہیں کہتے اور نہ کبھی الزامی جواب دیتے ہیں۔ بلکہ امرِ زیرِ بحث کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر ایک وسیع نظر ڈالتے ہیں۔ تمام واقعاتِ متعلقہ کو جمع کر کے اُن کی تنقید کرتے اور حتی الامکان قرآن مجید سے استدلال کرتے اور نہایت صحیح اور عجیب نتائج استنباط

کرتے ہیں اور اسی ضمن میں وہ بڑے بڑے مستند لوگوں کی رایوں کو پیش کرتے ہیں یا ان کی غلطیوں پر نظر ڈالتے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جس بات کو وہ لیتے ہیں اس پر اس خوبی اور جامعیت سے بحث کرتے ہیں کہ پھر اس میں کسی اور اضافے کی گنجایش نہیں رہتی۔ البتہ ایک کسر ان کی مذہبی تصانیف میں ضرور نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تحریر میں گرمی نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرد مہر منطقی ایک ایسے مبحث پر جس سے اُسے دلچسپی ہے بحث کر رہا ہے۔ اور واقعات اور دلائل و براہین پیش کر کے بال کی کھال نکال رہا ہے حال آں کہ مذہب کو منطق و استدلال سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ انسان کے جذباتِ لطیفہ یا وجدانِ قلب سے ہے اور اس لیے مذہب پر بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان رسمی قیود سے باہر نکل کر نظر ڈالے اور اس میں وہ جوش اور حرارت ہو جو ایک سرد مہر منطقی یا ایک کائیاں دنیا دار میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو نہ تو مذہب کے اس حصے سے بحث تھی اور نہ وہ غالباً اس بحث کے اہل تھے۔ بلکہ ان کا مقصد مذہب کے صرف اس حصے سے تھا جس کا تعلق امورِ دنیا سے ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مذہبِ اسلام کسی طرح انسان کی دنیاوی ترقی کا مارج نہیں بلکہ اس کا مُمد و معاون ہے اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اس میں مولوی صاحب مرحوم کو پوری کام یابی ہوئی ہے:

ان کی مذہبی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:-

۱- 'تعلیقات'۔ یہ رسالہ پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخِ محمدی' کے جواب میں ہے۔ مرحوم نے اس رسالے میں اس امر کو ثابت کر کے دکھایا ہے کہ پادری صاحب کے ماخذ سب کے سب غلط اور لچر ہیں۔ اور ایسی کم زور بنیاد پر اعتراضات کی عمارت کرنا خلافِ دانش مندی ہے۔ اسی ضمن میں احادیث کی تنقید اور صحت و غیر صحت پر بحث کی ہے۔ اور بعض منصف مزاج یورپین فاضلوں کی رایوں کا اقتباس بھی درج کیا ہے۔

نیز مسیحؑ و اناجیلِ اربعہ پر تفصیلی ردّ و قدح کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسیحؑ کی سوانح عمری نہایت غیر معتبر ہے۔ اور چاروں انجیلیں تاریخی اعتبار سے گری ہوئی ہیں۔ (مطبوعہ لکھنؤ سنہ ۱۸۷۲ء)

۲۔ 'تحقیق الجہاد'۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور بڑے معرکے کی کتاب ہے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر یہ بہت بڑا اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ مذہب جہاد کے ذریعے یعنی بہ زورِ شمشیر دنیا میں پھیلایا گیا ہے۔ مرحوم نے نہایت خوبی اور بسط کے ساتھ جہاد کی حقیقت اور ماہیت پر بحث کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں جو لڑائیاں ہوئیں، وہ تمام حالتِ مجبوری میں اور اپنے بچاؤ کے لیے تھیں۔ ان سے ہرگز اسلام کا بہ جبر پھیلانا یا کفار کا قتل کرنا مقصود نہ تھا۔ اس ضخیم کتاب میں یہ بحث اس شرح و بسط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ کی گئی ہے کہ آج تک کسی نے اس مسئلے پر اس خوبی کے ساتھ بحث نہیں کی تھی۔ تمام بڑے بڑے یوروپین مصنّفین مثلاً سر ولیم میور، ڈاکٹر اسپرنگر، مارکس ڈاڈ، ہیو، سیسل، ڈاکٹر سیموئل رین، باسورتھ اسمتھ وغیرہ نے جو اس بحث پر تحریریں لکھی ہیں، ان کے اقوال نقل کر کے اُن پر تنقید کی ہے اور ان کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ مرحوم کی یہ کتاب در حقیقت نہایت قابلِ قدر ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب دنیا میں اپنی نوعیت اور طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔

۳۔ 'ریفارمز انڈر مسلم رول'۔ اس کتاب کے متعلق ہم آخر میں مفصل بحث کریں گے۔

۴۔ 'محمد دی ٹرو پرافٹ'۔ (محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں) یہ کتاب بھی انگریزی زبان میں ہے اور مرحوم کی تصانیف میں بڑے پایے کی ہے۔ اس کتاب میں آں حضرتؐ کی لائف اور کیریکٹر کے متعلق تمام شکوک اور اعتراضات کو عالمانہ اور محققانہ تحقیق سے دفع کیا ہے۔ اور نہایت مدلل طور سے اس امر کو ثابت کیا ہے کہ محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب اب تک کامل نہیں ملی، کچھ کچھ مطبوعہ حصّے کہیں کہیں سے دست یاب ہوئے ہیں۔ نہ یہ معلوم ہوا کہ یہ کتاب طبع کہاں ہوئی تھی۔ خود مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی موجود ہیں مگر وہ بھی کسی قدر ناقص ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک بار یہ کتاب کسی وجہ سے چھپتے چھپتے رہ گئی تھی اور مصنف نے دوبارہ بعد ترمیم و اضافہ کے چھپوائی۔ چناں چہ ہمارے پاس ہر دو مطبع کے پروف موجود ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس یہ کتاب کامل موجود ہو تو اس قابل ہے کہ چھپوا دی جائے ورنہ کم سے کم اس کا ترجمہ ضرور طبع کر دیا جائے۔ آج کل کے زمانے میں اور خاص کر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے لیے، ایسی کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے ؎

۵۔ 'اسلام کی دنیوی برکتیں'، اس رسالے میں مرحوم نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام دنیا میں کن کن برکات کے نزول کا باعث ہوا ہے۔ اور اہلِ عالم کو اس سے کیا کیا نعمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ یہ کتاب پنجاب میں کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے ؎

۶۔ 'قدیم قوموں کی مختصر تاریخ'؛ ایام النّاس ایک اُردو کا چھوٹا سا رسالہ ہے۔ قرآن مجید پر ایک یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے جن کا دنیا میں کبھی وجود ہی نہ تھا اور یہ صرف بے بنیاد قصّے اور فسانے ہیں۔ مرحوم نے عجیب و غریب تحقیق و تدقیق اور کاوش سے اِن اقوام کا تاریخی ثبوت بہم پہنچایا ہے اور قدیم یونانی اور عبرانی کتابوں سے مدد لی ہے۔ اور ثبوت میں ان قدیم مؤرخوں کی تاریخوں کو پیش کیا ہے جن میں ثمود و عاد کا ذکر ہے اور وہ سب نزولِ قرآنِ پاک سے کئی صدیوں پیش تر کی تصنیف ہیں۔ یہ رسالہ صرف ایک دفعہ طبع ہوا ہے اب نہیں ملتا ؎

مرحوم نے کئی رسالے مثلاً 'بی بی ہاجرہ'، 'ماریہ قبطیہ'، 'تعلیق نیاز نامہ' وغیرہ نا تمام چھوڑے لیکن ان سب سے زیادہ قابلِ قدر اور بے مثل کتاب

"العلوم الجدیدة والاسلام" ہی جسے وہ اپنی آخری عمر میں لکھ رہے تھے۔ اور جس کا ابتدائی حصہ "تہذیب الاخلاق" سلسلۂ جدیدہ کی جلد دوم کے ابتدائی پرچوں میں چھپ چکا تھا۔ لیکن افسوس ہی کہ ان کی بے وقت موت نے اِس بے نظیر کتاب کو پورا نہ ہونے دیا۔ یہ کتاب درحقیقت مصنف نے سرسید مرحوم کے ایک سوال کے جواب میں لکھنی شروع کی تھی۔ اس کی پوری حقیقت ظاہر کرنے کے لیے ہم یہاں سرسید مرحوم کا وہ خط نقل کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے اس تصنیف کے موضوع پر بحث کی ہی :۔

"نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب کو جو مضمون لکھنا ہی وہ نہایت مفید و بہ کار آمد ہی۔ ابھی تک انھوں نے صرف تمہید ہی تمہید لکھی ہی۔ فلسفے کے طرف داروں اور مخالفوں کا حال لکھا ہی ان کے نام اور ان کا زمانہ بتایا ہی۔ پھر علمائے اسلام میں جو بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں ایک ایک کو گنایا ہی۔ اس کے بعد اب وہ اصل مضمون کی تحریر پر متوجہ ہوں گے جس کو ہمارے ناظرین اخبار پڑھ کر امید ہی کہ تعجب کریں گے۔ نواب اعظم یار جنگ درحقیقت ایک لاحل سوال حل کرنے پر مستعد ہوے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہمارے ناظرین پرچہ کو اس کا کہ وہ کیا سوال ہی خیال ہی یا نہیں اس لیے ہم سوال کو بہ طور یاددہانی کے اس مقام پر چھاپتے ہیں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ کیسا مشکل لاحل سوال ہی۔ اور اس کا جواب جو ہو وہ کیسا قابلِ توجہ اور ہماری قوم کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ مدت سے یہ سوال کیا گیا ہی اور آج تک کسی نے اس کا جواب نہیں دیا خدا کرے کہ نواب صاحب ممدوح پورا اور قابلِ تشفی جواب دیں۔

سوال مذکور یہ ہی :۔

اکثر لوگوں کی راے میں یہ مسلم ہی کہ یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائدِ اسلام سے

برگشتگی پیدا کرتی ہو اور اُن کی رائے میں اس کا علاج اُن علوم کے ساتھ دینی علوم کی اعلا درجے کی تعلیم دینا ہو۔ اگر یہ رائے صحیح ہو تو یورپین علوم و فنون کے ان مسائل اور ان کے دلائل کو جو اس برگشتگی کا باعث ہیں بیان کرنا چاہیے۔ اور اُن کتبِ دینیہ اور ان مقامات کا نشان دینا ضرور ہو جن کے تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے معہ اس بیان کے کہ کس وجہ سے وہ کتابیں اور مقامات روک ہو سکیں گے۔ اگر یہ رائے صحیح نہیں تو جہاں تک مفصّل اور دلیل سے اس کی عدم صحت کا بیان ممکن ہو بیان کیا جائے"۔

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم نمبر ۲ مطبوعہ یکم ذی قعدہ سنہ ۱۳۱۲ھ)

اس کے بعد سر سیّد مرحوم نے اس کتاب کے متعلق تحریر فرمایا ہو کہ:-

جس سوال کا جواب نواب اعظم یار جنگ بہادر کو لکھنا ہو۔ اس جواب کے قبل انھوں نے بہت سی تمہیدات قائم کی ہیں۔ ہم سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اصل سوال کا جواب کب آئے گا۔ واضح ہو کہ نواب صاحب ممدوح کا ایک خط ہمارے پاس آیا ہو اس میں انھوں نے لکھا ہو کہ ان کے جواب کے مضامین کی ترتیب کیوں کر ہو۔ ہم اس خط کو جہاں تک کہ ترتیب مضامین سے متعلق ہو ذیل میں چھاپتے ہیں"۔

## انتخاب خط

وہ لکھتے ہیں کہ "چھٹی صدی تک کے حکمائے اسلام کی فہرست بھیج دی گئی ہو (جو چھپ بھی گئی ہو) اس کے بعد تھوڑا سا ذکر اس انقلابِ عظیم کا ہو جو ایشیائی اسلامی دنیا میں چنگیز خاں کی طرف سے ہوا اور اس کی وجہ سے تصنیف و تعلیم علوم حکمیہ بند ہو گئی۔ اس کے بعد حال کے زمانے تک کے

اہلِ حکمت و منطق کی فہرست مختصر سی ہے۔ اس کے بعد تصنیفات یعنی کتب مصنفۂ علومِ حکمیہ و معقولات کا بیان ہے۔ اس کے بعد اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ اور معتزلہ اور دیگر متکلمین کے اسما مذکور ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کتبِ علم کلام و عقائد کی تفصیل ہے۔ ان سب کے بعد اب اصل بحث آتی ہے کہ علمِ کلام و عقائد کے رو سے کون کون سا مسئلہ حکما و فلاسفہ کے خلاف ہے اور انھیں مسائل کے متعلق علومِ جدیدہ میں ان کی تائید ہوتی ہے یا مخالفت۔ اور بتایا گیا ہے کہ علومِ جدیدہ ان مسائلِ اختلافیہ میں علم کلام کی تائید میں ہیں اور علمِ کلام کے ذکر کے قبل مَیں یہ لکھنا بھول گیا ہوں کہ علومِ دینیہ کیا کیا ہیں اور وہ کہاں تک فلسفہ و حکمت کے اعتراضات کی تردید کر سکتے ہیں۔ فقہ و تفسیر و حدیث حکما کے مقابلے میں کچھ کارآمد نہیں ہیں اور اس غرض سے علمِ کلام ایجاد کیا گیا تھا مگر اب وہ بھی مفید و کارآمد نہیں رہا۔ اخیر پر اس سوال کا جواب ہے جو اس مضمون کی ابتدا میں تھا۔ اس کے بعد میں کچھ اس کا ذکر ہوگا کہ اب تک اس قسم کی کتابیں جن میں تطبیق بین الحکمۃ والاسلام ہوتی ہے کیا کیا تصنیف ہوئیں اور آئندہ کس قسم کی کتابیں تصنیف ہونی چاہییں۔ غرض کہ یہ ایک مختصر سی کیفیت اور فہرستِ مضامینِ رسالہ ہے جو آپ کی اطلاع کے لیے عرض کی گئی۔ والسّلام

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۳ مطبوعہ یکم ذیحجہ سنہ ۱۳۱۲ھ)

افسوس ہے اسی زمانے میں مولوی چراغ علی مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ جب سر سید کو نواب صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر پہنچی تو اُنھوں نے "تہذیب الاخلاق" میں جو آرٹیکل اس حادثۂ جاں گزا پر لکھا ہے اس میں اس مضمون کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:-

"افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو اُنھوں نے "تہذیب الاخلاق"

میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا اور اب امید نہیں ہو کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم نمبر ۴ مطبوعہ یکم محرم سنہ ۱۳۱۳ھ)

اس ناتمام رسالے کے متعلق ہم نے کسی قدر تفصیل سے اس لیے بحث کی ہو کہ ناظرین کو اس مضمون کی اہمیت معلوم ہوجائے نیز یہ بھی ظاہر ہوجائے کہ مرحوم اس پایے کے شخص تھے کہ ان کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس سوال کے جواب پر قلم اٹھائے۔ اس کتاب کے ناتمام رہنے میں مرحوم کا کچھ قصور نہ تھا۔ یہ اللہ کی مرضی تھی کہ انھیں ایسے وقت میں اٹھالیا جب کہ انھیں ابھی بڑے بڑے کام کرنے تھے۔ اور افسوس کہ جن لوگوں کی نظریں اس اہم سوال کے جواب پر لگی ہوئی تھیں انھیں مایوس ہونا پڑا۔ علاوہ مذکورۂ بالا تصانیف کے مرحوم کے متعدد رسالے مثلاً 'غلامی'، 'تسری'، 'تعددِ ازدواج'، 'ناسخ و منسوخ'، 'ردِ شہادتِ قرآنی بر کتبِ ربانی' مصنفہ سر ولیم میور وغیرہ دست یاب ہوے ہیں جو بڑی محنت و تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ چوں کہ اس مقدمے کے لکھنے کے بعد ملے، لہٰذا انشاءاللہ پھر کسی وقت اس پر بحث کی جائے گی۔

اب ہم کتاب زیرِ دیباچہ یعنی "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، کے مجوزہ اصلاحات سیاسی و تمدنی و فقہی زیرِ حکومتِ اسلام" پر کسی قدر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں:

اس کتاب کا باعثِ تصنیف یہ واقعہ ہوا کہ انگلستان کے ایک پادری کیفن ملکم میکال نے 'کن ٹم پوری ری ریویو' بابت ماہِ اگست سنہ ۱۸۸۱ء میں ایک مضمون اس عنوان سے لکھا تھا کہ "کیا زیرِ حکومتِ اسلام اصلاحات کا ہونا ممکن ہی۔" اس مضمون میں پادری صاحب نے اس بات پر زور دیا ہی کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہی جو زمانۂ حال کے بالکل نامناسب ہی۔ اسلامی سلطنت میں کسی اصلاح کی

توقع رکھنی فضول ہے کیوں کہ اسلامی سلطنت درحقیقت الٰہی سلطنت ہے جس کے تمام قواعد خواہ مذہبی ہوں یا تمدنی، دیوانی ہوں یا فوجداری سب خدا کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور اس لیے اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ لہٰذا جب تک مسلمان مذہب اسلام کو ترک نہ کردیں گے اُس وقت تک وہ ترقی نہیں کرسکتے۔ پادری صاحب نے اس مضمون میں (نیز اپنے دیگر مضامین میں بھی) سخت تعصب، بے تمیزی، زبان درازی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔ ایسے روشن زمانے میں جب کہ یورپ میں سر دھر سائنس نے تعصب کے جنون کو بہت کچھ دھیما کردیا ہے ایک ایسے عالم شخص کے قلم سے ایسے مضامین کا نکلنا ایک تعجب خیز امر ہے۔ خاص کر دولتِ عثمانیہ کے خلاف پادری صاحب نے بہت کچھ زہر اگلا ہے اور وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ اس کا وجود یورپ میں باقی رہے۔ اس بارے میں وہ مسٹر گلیڈسٹون آں جہانی اور مسٹر اسٹیڈ اڈیٹر ریویو آف ریویوز، کے ہم خیال ہیں۔ ریورنڈ موصوف کے اس مضمون کے جواب میں مولوی چراغ علی مرحوم نے یہ کتاب لکھی اور درحقیقت نہایت پُرزور، مدلل اور جامع کتاب لکھی ہے۔ جس میں اُن تمام بڑے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو عموماً اور اکثر اسلام پر ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہوتے ہیں۔ اب تک کسی شخص نے ان اعتراضات کا جواب اس طرز سے اور اس جامعیت کے ساتھ نہیں دیا تھا؛

اِس کتاب کو مصنف مرحوم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں پولیٹیکل (سیاسی) اصلاحات کا ذکر ہے اور دوسرے حصے میں سوشل (تمدنی) اصلاحات کا اور کتاب کے شروع میں مصنف نے ۴۰ صفحات کا ایک مقدمہ لکھا ہے جو ایک محققانہ اور عالمانہ تحریر ہے؛

اس سے قبل کہ ہم اس کتاب کے مضامین پر نظر ڈالیں ہم اس دھوکے کو اُٹھا دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ناظرین کو ”اصلاحات“ کے لفظ سے پیدا ہو گا۔

مولوی صاحب مرحوم کا مقصد صرف اِس قدر ہے کہ اسلام ترقی اور اصلاح کا مانع نہیں ہے، اور خلیفۂ وقت بہ لحاظ اقتضائے زمانہ پولٹیکل اور سوشل امور میں جدید اصلاحات کے جاری کرنے کا مجاز ہے، اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں احکامِ مذہب کی رُو سے مسلمان اس زمانے میں ترقی نہیں کر سکتے، اُن کی احکامِ الٰہی و رسولؐ کے حوالے سے تردید کی ہے۔ اُن کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ خدا و رسولؐ نے ہرگز اس قسم کی اصلاحات کی مخالفت نہیں کی اور اُن کا ہونا ہر زمانے میں ممکن ہے اور بس۔ اب رہی یہ بحث کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا کن اسباب سے انحطاط ہوا، اور وہ کون سے ذرائع ہیں جو ان کی ترقی کا باعث ہو سکتے ہیں، اس کتاب کے موضوع اور مولوی صاحب کے مقصد سے خارج ہے۔ اس زمانے میں یہ سر سید احمد خاں، مولوی جمال الدین افغانی اور مصطفیٰ کامل پاشا کا حصہ تھا، اور جن لوگوں کو اس بحث سے دل چسپی ہو وہ ان تینوں بزرگوں کے حالات اور اعمال کو مطالعہ فرمائیں:۔

کتاب کے مقدمے میں مصنف نے فقہ کے مذاہبِ اربعہ و اصولِ فقہ پر بھی بحث کی ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ علمِ فقہ محض ایک ظنّی علم ہے اور اس میں آب و ہوا، رسوم و عادات، انسانی خواہشات و ضروریات سیاسی و تمدّنی حالات و معاملات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور ایک حد تک انھیں امور کے اختلاف کی وجہ سے مذاہبِ فقہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ علاوہ اس کے بانیانِ مذاہبِ فقہ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ کر سکتے تھے کہ ان کا اجتہاد قطعی ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اُن کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ آیندہ آنے والی نسلوں کو اپنے اجتہادات کا ایسا ہی پابند کر دیں جیسا کہ اپنے زمانے کے لوگوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ایک ہی مسئلے پر مختلف فتوے دیے گئے ہیں اور اس اختلاف کی وجہ زیادہ تر اقتضائے ضروریاتِ زمانہ تھیں۔ مقلدین کا یہ کہنا کہ چار ائمہ فقہ

کے بعد کسی کو حق اجتہاد کا نہیں ہے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ اکثر یورپین مصنفوں نے جو متقدمین کے اقوال کے مطابق ان چار ائمہ کے اجتہادات کو قطعی اور ناقابلِ تبدیل خیال کر کے اسلام کے متعلق استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا بحرالعلوم نے بہت بڑی اور سچی بات کہی ہے کہ "متقدمین کا یہ خیال سراسر حماقت ہے اور یہ لوگ ان میں ہیں جن کی نسبت حدیثِ پیغمبر صلعم میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بغیر علم کے فتوے دیتے ہیں، خود گم راہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گم راہ کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایسا کہنا گویا علمِ غیب کا دعویٰ کرنا ہے جو سوائے خدا کے کسی کو نہیں"۔

اب فقہ کی بنیاد صرف چار چیزوں پر ہے۔ (۱) قرآن، (۲) حدیث، (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ کوئی پولیٹیکل (سیاسی) اور سوشل (تمدنی) قانون یا ضابطہ ہے بلکہ اس کی اصل غایت قومِ عرب میں نئی روح پھونکنی، قومیت کی شان پیدا کرنی اور دنیا کو اخلاقی و مذہبی تعلیم دینی تھی۔ لیکن چوں کہ اس وقت عرب اور دنیا میں بعض ایسے قبیح اور مذموم رواج جاری تھے جن کا تعلق سیاست و تمدن سے تھا لہٰذا ان کا استیصال کرنا یا ان کی اصلاح کرنا اس کا فرض تھا اور اس لیے اس کے متعلق چند معقول، معتدل اور منصفانہ ہدایات کی گئی ہیں۔ آیاتِ احکام کو جو کلہم دو سو بیان کی جاتی ہیں یہ سمجھ لینا کہ وہ باضابطہ پولیٹیکل اور سول قواعد ہیں صحیح نہیں ہے اکثر یہ کیا گیا ہے کہ آیات کے واحد الفاظ ناقص جملوں اور الگ الگ فقروں کی تعبیر کر کے قانون بنا لیا گیا ہے اور قرآن کی اصل تعلیم اور منشا کو نظر انداز کر دیا ہے۔

رہی حدیث سو ایک دریائے ناپید اکنار ہے اور رطب و یابس، جھوٹ سچ کا ایک ایسا طومار ہے کہ اس میں کھرے کھوٹے کا پرکھنا محال ہو گیا ہے۔ صحاح ستہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ ان نیک نیت بزرگوں نے احادیث کی صحت کا معیار راوی کی صداقت اور اس کے اعلا اخلاق اور اتقا اور سلسلۂ روایت کو پیغمبر صلعم یا صحابہؓ تک پہنچنے کو قرار دیا

ہی مضمون حدیث سے بحث نہیں کی عقلی اصول سے پرکھنا دُوسروں کا کام ہے۔ اور اس لیے تمام حدیثیں ایسی نہیں ہیں جن کا ماننا لازم ہو۔ آں حضرتؐ نے کبھی اپنے متبعین کو احادیث کے جمع کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی اور نہ کبھی صحابہؓ نے ایسا کرنے کا خیال کیا۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کا کبھی یہ منشا نہ تھا کہ وہ ملک کے پولٹیکل و سوشل قوانین میں مداخلت کریں۔ ہاں البتہ اُن امور میں جو آپؐ کی روحانی اور اخلاقی تعلیم کے مخالف تھے آپؐ نے ضرور مداخلت کی اور اس کی اصلاح فرمائی۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ ایسا نظام جو غیر متیقن اور ناقص احادیث پر قائم ہے قطعی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔

اجماع کے متعلق بڑے بڑے فقہا کو اختلاف ہے یا بعض مجتہدین یا فقہا نے جو شرائط قائم کی ہیں اُنھیں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اجماع ایک ناقابلِ عمل اور ناممکن اصول ہے۔ اس پر مصنف نے اپنے مقدمے میں مفصل بحث کی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ فقہے کا یہ اصول کہاں تک کارآمد اور قابلِ عمل ہو سکتا ہے۔

قیاس، اُس استدلال کو کہتے ہیں جو قرآن یا حدیث یا اجماع سے کیا جائے۔ علّتِ قیاس کے لیے اُن میں سے کسی ایک کا ہونا ضرور ہے لیکن یہ تمام استدلال شبہے سے خالی نہیں اور سند نہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے قیاس کو فقہے میں بہت بڑا دخل ہے۔ فقہا کو اجماع سے زیادہ قیاس میں اختلاف ہے اور بڑے بڑے جیّد فقہا اور علما نے اس کے ماننے سے انکار کیا ہے۔

غرض یہ کہ اگرچہ اسلامی فقہے کے بعض ضابطے اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت مناسب اور معقول تھے۔ لیکن موجودہ ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ کوئی شے سوائے قرآنِ پاک کے قطعی اور ناقابلِ تبدیل نہیں۔ لہٰذا اس زمانے میں بھی اجتہاد کا وہی حق حاصل ہے جو پہلے زمانے میں تھا، بہ شرطے کہ وہ احکامِ قرآن سے مطابق ہوں۔ اور مصنف کی رائے میں یہ حقِ اجتہاد سلطانِ روم کو بہ حیثیتِ خلیفہ حاصل ہے۔ بہ حیثیت

خلیفہ کے سلطانِ روم کسی مذہبِ فقہ کے مقلّد نہیں ہیں۔ خلفائے راشدینؓ ان مذاہبِ فقہ سے پہلے گزرے ہیں اور بعد کے خلفا کے زمانے میں مختلف ممالکِ اسلامیہ میں مختلف فقہی تغیّر و تبدّل ہوتے رہے ہیں اور اس لیے سلطانِ روم بہ حیثیت خلیفہ کے موجودہ ضروریات و حالات کے مطابق ضروری تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ اور غالباً اسی خیال کی بنا پر مصنف نے اپنی کتاب کو سلطان عبدالحمید خاں کے نام سے معنون کیا تھا:۔

مصنف نے اپنی کتاب میں تمام سیاسی، تمدّنی اور فقہی اصلاحات کی بنا قرآن پر رکھی ہی اور تمام اُن اعتراضات کو جو مخالفین کی طرف سے اسلام پر وارد کیے گئے ہیں نیز اُن غلطیوں کو جو مسلمانوں میں رائج ہوگئی ہیں قرآن سے رد کیا ہی۔ قرآن روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے ہی، وہ قانونی ضابطہ نہیں ہی اور اس لیے آزادیٔ رائے اور علمی و اخلاقی و قانونی تغیّرات کا مانع نہیں ہی:۔

مصنف نے دو واقعے ایسے بیان کیے ہیں جس سے صاف ظاہر ہی کہ آں حضرت صلعم دنیاوی معاملات میں اپنی رائے کو کبھی قطعی اور ہر حالت میں قابلِ پابندی نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے آپؐ نے صاف طور سے آزادیٔ رائے کی اجازت دی ہی:۔

پہلا واقعہ امام مسلم سے مروی ہی کہ جب آں حضرت صلعم مدینے کو آرہے تھے تو آپؐ نے دیکھا کہ بعض لوگ کھجوروں میں نر و مادہ کا جوڑ لگا رہے ہیں۔ آپؐ نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ لوگ آپؐ کے ارشاد کے مطابق اس سے باز رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں کی فصل خراب رہی۔ جب اس کی خبر آپؐ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں محض بشر ہوں۔ جب میں مذہبی معاملے میں کچھ ہدایت کروں تو اس پر عمل کرو لیکن جب میں دوسرے معاملات میں کچھ کہوں تو مجھے محض بشر سمجھو۔" (مقدمہ حصہ اوّل صفحہ ۳۴)

یہ واقعہ بیّن ثبوت اس بات کا ہی کہ آں حضرتؐ نے سول اور پولیٹیکل معاملات میں اپنی رائے کو کبھی ناقابلِ تبدیلی اور قطعی قرار نہیں دیا بلکہ اس میں کامل آزادی عطا فرمائی ہی۔ دوسرا واقعہ ترمذی، ابو داؤدؔ اور دارمی سے مروی ہی کہ آں حضرت نے جب معاذ بن جبل کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو اس سے سوال کیا کہ "تم لوگوں کے معاملات کو کیوں کر چُکاؤ گے"۔ اس نے جواب دیا "کلام اللہ کے مطابق"۔ پھر فرمایا "اگر تمھیں کلام اللہ میں کوئی بات نہ ملے تو"۔ جواب دیا کہ "میں پیغمبرؐ کی نظیر سے کام لوں گا" کہا کہ "اگر کوئی ایسی نظیر نہ ملے تو"۔ اس کے جواب میں معاذ نے کہا کہ "میں اپنی رائے پر عمل کروں گا (اجتہادِ رائی)" آں حضرت صلعم نے معاذؓ کے اس معقول جواب پر خدا کا شکر ادا کیا۔ (مقدمہ حصّہ اوّل صفحہ ۳۵)

معاذؓ کے جواب پر خدا کا شکر ادا کرنا بتاتا ہی کہ آنحضرت صلعم دنیاوی معاملات میں آزادیٔ رائے کو کس قدر دل سے پسند فرماتے تھے۔

مصنّف نے کتاب کے دو حصّے کیے ہیں، ایک پولیٹیکل یعنی سیاسی اصلاحات دوسرا سوشل یعنی تمدّنی حالات۔

پہلے حصّے میں اِن امور پر بحث کی گئی ہی :-

۱۔ پادری میکال صاحب کے خیال میں اسلامی سلطنتیں الٰہی سلطنتیں ہیں جن کے قوانین و ضوابط میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ مصنّف نے اس قول کی تردید کی ہی۔ اور اس امر کو ثابت کیا ہی کہ پہلے چار، یا پانچ خلفائے اسلام کی حکومت جمہوری قسم کی تھی اسی لیے پہلے چار یا پانچ خلفا خلفائے راشدین کہلاتے ہیں اور اُن کے بعد کے خلفائے جور، یا "ملکِ عضوض" تھے چوں کہ ابتدائی زمانے میں سیاست اور حکومت کے چلانے کے لیے کوئی قانونی ضابطہ نہ تھا، بنوامیہ کے زوال کے بعد خلفائے عباسیہ کے عہد میں کچھ تو جان و مال کی حفاظت کچھ کاروبارِ سلطنت کے

چلانے کے لیے اور کچھ بادشاہوں اور خلیفوں کی خواہشات پورا کرنے کے لیے قرآن پاک کی آیتوں کی طرح طرح کی تعبیریں اور تاویلیں کی گئیں اور اپنے مطلب کے موافق استدلال کیے گئے اور جھوٹی سچی حدیثیں پیش کر کے دنیا پرست فرماں رواؤں کے اعمال کو جائز قرار دیا گیا:

شریعتِ اسلام نہ تو پیغمبرِ اسلام نے لکھی ہے نہ آپؐ نے لکھوائی ہے نہ آپؐ کے زمانے میں لکھی گئی ہے اور نہ پہلی صدی ہجری میں مرتب ہوئی۔ اور جس قدر اصول اور رواج اور کاروبارِ سلطنت اور جان و مال کی حفاظت کے لیے قواعد اس میں درج ہیں وہ قرآن کے احکام پر مبنی نہیں ہیں۔ لوگوں نے عموماً اور یورپین نے خصوصاً قرآن اور شریعت کو گڈمڈ کر دیا ہے اور اس لیے ساری خرابی اس عدمِ امتیاز سے پیدا ہوئی ہے اگر اس فرق کو سمجھ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جو انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہو۔ بلکہ ٹھیٹ اسلام میں بہ ذاتہٖ ایک ترقی ہے اور اس کے اصول ایسے جاندار ہیں کہ اُن میں جدید حالات اور عقل و حکمت کی مطابقت کی کامل صلاحیت موجود ہے:

۲۔ دوسرا اعتراض پادری صاحب کا یہ ہے کہ اسلام کا حکم غیر مسلموں کے حق میں یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا غلامی یا موت۔ اور یہی سلطانِ روم کی حکومت میں ہوتا ہے:

مصنف نے اس کی تردید بڑے زور و شور سے کی کہ نہ آں حضرت صلعم کی ایسی تعلیم ہے اور نہ قرآن میں ایسا کوئی حکم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام میں غیر مسلموں سے کبھی رواداری یا مسالمت کا برتاؤ نہ کیا جاتا۔ اس کے بعد مصنف نے قرآن کی مدنی اور مکی سورتوں میں سے کوئی (۳۴) آیتیں پیش کی ہیں جن میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب میں کامل آزادی عطا کی گئی ہے۔ باوجود اس کے فقہ کو الٰہی کلام ہونے کا حق نہیں جو وہ ایسا حکم جاری کرے۔ یہاں تک کہ کتبِ فقہا کی کتب میں بھی ایسا چنگیزی حکم نہیں پایا جاتا۔ 'ہدایہ' اور دیگر کتبِ فقہ سے اپنے اس دعوے کو ثابت کیا ہے اور جہاں جہاں

اِن فقہا نے قرآن کی آیات سے تجاوز کیا ہے اور استدلال میں غلطی کی ہے اُسے صاف طور پر دکھایا ہے۔

۳۔ اس کے بعد اس امر پر بحث کی ہے کہ آں حضرت صلعم کے زمانے میں جس قدر جنگیں ہوئیں وہ سب اپنی حفاظت کے لیے تھیں۔ اس بحث پر مصنف نے ایک الگ کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عنقریب طبع ہونے والا ہے۔ لہٰذا اس کی بحث زیادہ تر تفصیل کے ساتھ اُس کتاب میں آئے گی۔

۴۔ پادری میکال کا ایک اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ "شرع اسلام نے غیر مسلموں کے حق میں مساوی حقوق عطا کرنے کی ممانعت کر دی ہے" علاوہ دیگر براہین کے مصنف نے اس کی تردید میں آں حضرت صلعم کے دو فرمان پیش کیے ہیں جو آں حضرت صلعم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں صادر فرمائے ہیں جن میں آں حضرت صلعم نے تمام مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ ان کی مدد کریں اور کسی قسم کی تکلیف نہ دیں۔ اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے تو انھیں بچائیں اور وہ دونوں اپنے اپنے مذہب پر رہیں۔ عیسائیوں کے گرجاؤں کی حفاظت کریں۔ کسی زائر کو زیارت سے نہ روکیں۔ گرجا گرا کر مسجد یا مکان نہ بنائیں۔ اگر کوئی دشمن مسلمانوں پر حملہ کرے تو عیسائیوں کے لیے ضرور نہیں کہ وہ مسلمانوں کی حمایت میں لڑیں۔ اگر کوئی عیسائی عورت مسلمان سے شادی کرلے تو اپنے مذہب پر قائم رہ سکتی ہے اور اس اختلافِ مذہب کی وجہ سے اسے تکلیف و ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور پھر یہ حکم دیا ہے کہ جو اس کی پابندی نہ کرے گا وہ پیغمبر اور خدا کی نظروں میں ناانصاف اور نافرمان ٹھیرے گا۔ ایسی بے نظیر رعایتوں پر بھی اگر مسلمان جابر اور متعصب کہلائیں تو صریح ناانصافی اور تاریخ کا خون کرنا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے دار الحرب اور دار الاسلام، جزیہ، حقوقِ ذمیاں،

"رفیق و مملوک"، "شہادتِ غیر مسلم"، "تعمیرِ گرجا" پر بڑی لطیف اور دل چسپ بحثیں کی ہیں اور نہایت مدلّل طور پر ثابت کیا ہو کہ اسلام نے مسلم و غیر مسلم دونوں کو قانونی حقوق مساوی طور پر دیے ہیں۔ چوں کہ پادری میکال کا حملہ اسلام پر عموماً اور ترکی پر تخصیص کے ساتھ تھا لہذا مصنّف نے معاملاتِ ترکی پر بحث کر کے فرمایا ہو کہ سلطنتِ عثمانیہ عیسائیوں کے حق میں نہایت نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرتی ہو اور بعض حالتوں میں مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ مراعات مرعی رکھی جاتی ہیں۔ اور اس بارے میں بڑے بڑے یورپین مصنّفین اور مدبّرین کی رائیں پیش کی ہیں جو معاملاتِ سلطنتِ عثمانیہ سے خاص واقفیت رکھتے ہیں یا جنھیں بہ حیثیت مشیر ہونے کے ایک مدّت دراز تک وہاں رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اور اس کے ساتھ ایک فہرست ان بڑے بڑے عیسائی عہدہ داروں کی دی ہو جو ترکی سلطنت میں مامور ہیں۔ خصوصاً اس ضمن میں مصنّف نے جو محاصرۂ وارنا کا ایک واقعہ بیان کیا ہو اس سے معلوم ہوتا ہو کہ ترکوں سے بڑھ کر کوئی قوم دنیا میں عیسائیوں سے ایسا شریفانہ برتاؤ نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ خود عیسائی بھی اپنے ہم قوموں سے ایسی رعایت کی توقع نہیں کر سکتے۔ لکھا ہو کہ ہینساڈیس نے جو رومن کیتھلک مذہب پر تھا برین کووچ سے جو گریک چرچ کا متبع تھا دریافت کیا کہ اگر فتح تمھاری ہوئی تو کیا کرو گے۔ اس نے جواب دیا کہ میں ہر شخص کو مجبور کروں گا کہ وہ رومن کیتھلک ہو جائے۔ اس کے بعد اس نے سلطان سے یہی سوال کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے قریب گرجا بنواؤں گا اور انھیں اجازت دوں گا کہ خواہ وہ مسجد میں عبادت کریں یا صلیب کے سامنے سر جھکائیں۔ جب اہلِ سرویہ نے یہ جواب سُنا تو انھوں نے بہ نسبت لیٹن چرچ کے ترکوں کی اطاعت کو بہت غنیمت سمجھا (حصّہ اوّل صفحہ ۸۱)۔ اسی طرح سلطان سلیم نے اوّل بار ہا چاہا کہ عیسائیوں کے مذہبی رسوم کو بند کر دے یا انھیں

تہ تیغ کر ڈالے۔ لیکن مفتی نے ہمیشہ منع کیا کہ ایسا کرنا احکامِ قرآن کے خلاف ہے۔ غرض مصنف نے مختلف تاریخی شہادتوں اور بڑے بڑے اہل الرائے کی رایوں سے اس امر کو بہ خوبی ثابت کر دیا ہے کہ ترکی کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا ہے اور اب پہلے سے بھی اچھا ہے ؛

اسی ضمن میں مصنف نے جزیے کا ذکر کیا ہے جس پر پادری میکال نے بہت کچھ زہر اُگلا ہے اور لکھا ہے کہ عیسائی جزیہ دے کر ایک سال کے لیے اپنی جان بچاتا ہے اور ایک سال اور اپنی گردن پر سر قائم رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔ ذمیوں کے حقوق کا مصنف نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور قرآن اور اقوال و اعمال آں حضرت صلعم سے بڑے شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے جو حقوق غیر مسلم رعایا کو عطا کیے ہیں وہ کسی قوم نے اپنی غیر قوم رعایا کو نہیں دیے۔ اور یہ ٹیکس جسے پادری صاحب "حقِ زندگی" سے تعبیر کرتے ہیں درحقیقت از روئے شرع اسلام ان لوگوں کی حفاظتِ جان و مال کے لیے ہے جو مسلمانوں پر فرض ہے اور امام ابو حنیفہ رح اور امام شافعی رح کا بھی یہی مذہب ہے۔ شرع میں یہاں تک رعایت ہے کہ اگر دو سال کا ٹیکس جمع ہو جائے تو صرف ایک سال کا لیا جائے اور گزشتہ سال کا معاف کیا جائے۔ مسلمانوں کو ذمیوں سے زیادہ مصیبت بھگتنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ملک کی حفاظت کے لیے لڑائیاں لڑتے اور اپنا خون بہاتے ہیں۔ پادری صاحب نے یہ اعتراض خاص کر ترکی پر کیا ہے۔ حال آں کہ وہاں کی حالت یہ ہے کہ ہر مسلمان جوان پر فرض ہے کہ وہ پانچ سال تک فوج میں کام کرے اور سات سال بحری فوج میں اور اس کے بعد سات سال ریزرو میں رہتا ہے۔ عیسائی ان تمام تکلیفوں سے بری ہے۔ ترک اگر ان مشقوں سے بچنا چاہے تو اسے دس ہزار پیاسٹر یعنی ۹۵ پونڈ ادا کرنے ہوں گے حال آں کہ عیسائی صرف ۲۵ پیاسٹر یعنی

چار شلنگ ۶ پنس ادا کر کے تمام تکلیفوں سے محفوظ اور تمام رعایتوں کا مستحق ہو جاتا ہے مصنف نے اس پر بڑی طول طویل اور عالمانہ بحث کی ہے۔

۵- پادری میکال نے ایک بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ شرع اسلام کا یہ قانون ہے اور بے شمار علما کا اس پر فتوا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ وعدے یا معاہدے کا توڑ دینا روا ہے۔ پادری صاحب کا یہ اعتراض جس قدر بے بنیاد اور لغو ہے وہ ظاہر ہے قرآن میں معاہدے کی کامل پابندی کی سخت تاکید ہے اور پیغمبرِ خدا صلعم نے اس کی ہدایت کی ہے۔ چناں چہ عیسائیوں کو آپؐ نے بہ ذریعۂ تحریر جو حقوق دیے اس کا ذکر ہو چکا ہے اور یہی حال خلفائے راشدینؓ کا تھا چناں چہ حضرت ابوبکرؓ نے فوج کو نصیحت فرمائی تو اس میں یہ بھی فرمایا کہ "جب تم کسی سے معاہدہ کرو تو اس پر قائم رہو اور اسے پورا کرو" اسی طرح حضرت عمرؓ نے جو ایک ذمّی کے ہاتھ سے شہید ہوئے تھے وفات کے وقت یہ وصیّت کی کہ ذمّیوں کے ساتھ اپنے معاہدوں اور اقراروں کی پابندی کرو۔ ان کی حمایت میں ان کے دشمنوں سے لڑو اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ان پر نہ ڈالو" اس کے علاوہ اسلامی تاریخ موجود ہے اُسے اُٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے کیسے کیسے سلوک کیے کہ آج تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۶- ایک بڑا اعتراض پادری میکال کا یہ ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ مصنف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اوّل تو یہ قرآن کا حکم نہیں ہے دوسرے خود فقہا میں اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہے۔ بلکہ بہ خلاف اس کے قرآن میں معافی کا حکم ہے۔ البتّہ ایسے مرتد کو جو بغاوت کرتا ہے اور جنگ پر آمادہ ہے، قتل کر دینے کا حکم ہے۔ یہ امر ارتداد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بغاوت کی وجہ سے ہے۔ جن فقہا نے قتل کا فتوا دیا ہے مصنف نے ان کے وجوہ پر بحث کی ہے اور ان کے استدلال کو ضعیف اور خلافِ حکمِ خدا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد عیسائیوں کے قانون کو جو مرتد اور کافر کے متعلق ہے دکھا کر بتایا ہے

کہ اسلام میں بہ مقابلہ مذہبِ عیسائی کے کس قدر نرمی اور رعایت کا برتاؤ روا رکھا گیا ہے۔
اسی ضمن میں مصنّف نے پادری میکال اور دیگر معترضین کے اعتراضات دربارۂ غیر مساوات غیر مسلمین کو بیان کر کے سب کے جواب کمال خوبی سے ادا کیے ہیں اور کامل طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے نہایت منصفانہ برتاؤ کی اجازت دی ہے۔ اور عموماً مسلم اور غیر مسلم کو یکساں حقوق دیے ہیں اور یہ بات کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اسی کے ساتھ سلطنتِ ترکی پر جو متعصبانہ حملے کیے گئے ہیں ان سب کی اصل حقیقت دکھا کر اور بڑے بڑے مدبّرینِ یورپ کے آرا پیش کر کے معترضین کی غلط بیانیاں ثابت کی ہیں۔ ہم نے عمداً اس مقدمے میں سلطنتِ ترکی سے بحث نہیں کی۔ اس لیے کہ اب ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے اور ابھی دیکھنا ہے کہ یورپین دول اب ینگ ٹرکش کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہیں، اور ایک اسلامی دولت کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں جیسا کہ اب تک ہوا یا اس میں سہولتیں پیدا کرتی ہیں۔ یورپ میں ترکی سلطنت مسیحی دول کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور اگر آپس کی رقابت ان کی سدِّ راہ نہ ہوتی تو کبھی کی اُن کا شکار ہو چکی تھی۔ اس نئے دَور کا خیر مقدم اگرچہ بڑی خوشی سے کیا گیا ہے لیکن اُن کا دِل جانتا ہے کہ اب اُن کا وہ زور نہیں چل سکتا جو سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں انھیں حاصل تھا کہ جو چاہا دباؤ ڈال کر لکھوا لیا اور جس طرح چاہا سلطنت کو نقصان پہنچا کر اپنے لیے رعایتیں حاصل کر لیں۔

دوسرا حصہ اس کتاب کا سوشل یعنی تمدّنی اصلاحات کے متعلق ہے۔ اس حصے میں مفصلۂ ذیل اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے:-

۱۔ اسلام میں عورتوں کی حالت

۲۔ تعدّدِ زوجات

۳۔ طلاق

۴ - غلامی -

۵ - تسرّی -

اگرچہ یہ مسائل اس قسم کے ہیں کہ ان پر سال ہا سال سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے اور مخالفین کو بار بار معقول اور مدلّل جواب دیے جا چکے ہیں، لیکن فاضل مصنّف سے پہلے کسی عالم نے اِن مسائل پر عالمانہ اور محقّقانہ بحث نہیں کی تھی۔ مصنّف کا استدلال صرف قرآنِ پاک سے ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے پڑھ لینے کے بعد پھر کسی بڑی سے بڑی کتاب پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ساری کتاب علمی معلومات سے لبریز ہے اور ایک سطر بے کار نہیں۔ اس کتاب پر ریویو کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ مصنّف کے حق میں ظلم کرنا ہے۔ غلامی پر اس سے پیش تر سرسیّد احمد خاں مرحوم ایک بیش بہا اور بے مثل کتاب لکھ چکے تھے، لیکن جس انداز سے مصنّف نے اس مضمون پر بحث کی ہے ناظرین اُسے دیکھ کر بے اختیار مصنّف کی قابلیت اور محنت کی داد دیں گے۔ غرض کہ فاضل مصنّف نے ایسا بڑا کام کیا ہے کہ اس کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اس کتاب کے متعلق (جو انگریزی میں ۱۸۳ صفحے پر ہے) یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ؎

لیکن میکال نے جو اعتراضات مختلف مضامین کے ذریعے سے اسلام اور ترکی سلطنت پر کیے ہیں اُن سے بہت کچھ بوئے تعصّب آتی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ رائٹ آنریبل مسٹر جسٹس امیر علی کے ایک جوابی آرٹیکل کے جواب میں جو مضمون میکال نے انگلستان کے مشہور رسالہ 'نائن ٹینتھ سنچری' میں بھیجا تو اڈیٹر نے صرف اس وجہ سے اُسے نہیں چھاپا کہ پادری صاحب موصوف اپنے مضامین میں اس قدر بدزبانی اور بدلگامی سے کام لیتے ہیں کہ جس سے مسلمانوں کے دِلوں کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اور پادری صاحب کے جواب طلب کرنے پر اڈیٹر رسالہ مذکور

نے ان کی تحریرات سے اس کا کافی ثبوت بہم پہنچایا ہے جس سے غالباً انھیں کچھ ندامت نہ ہوئی ہوگی۔

لیکن میکال اور ان کے بعض ہم نوا یورپین مصنفین کا یہ کہنا کہ اسلام اپنے پیرووں کو چھٹی صدی کے بدؤں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا اور مسلمان کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک وہ مذہب اسلام کو ترک نہ کر دیں ایک حیرت انگیز اور سخت حیرت انگیز امر ہے یہ کس قدر جراءت اور دلیری کی بات ہے۔ گویا دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنا اور تاریخی واقعات کا خون کرنا ہے۔

کیا مسٹر میکال اور اُن کے دوست بھول گئے ہیں کہ موجودہ ترقی اور تمدّن کی بنیاد اہلِ اسلام کی ڈالی ہوئی ہے۔ مذہب عیسوی ہمیشہ عقل و آزادی کا دشمن رہا حال آں کہ برخلاف اس کے اسلام نے مردہ علوم و فنون کو جگایا، آزادی کو بڑھایا، غلامی کو مٹایا، نئی تحقیقات کی بنیاد ڈالی، جدید اکتشافات سے خزانۂ علم کو معمور کیا، اوہامِ باطلہ اور بطلان پرستی کی بیخ کنی کی، مذہب و سائنس میں تطبیق دی اور یورپ کے گھپ اندھیرے میں مشعلِ علم سے نور پھیلایا، علم و حکمت و آزادی کا عَلم دنیا میں بلند کیا۔ اسی کے طفیل سے رفتہ رفتہ وہ ترقی ہوئی کہ جس کے چکاچوند میں مسٹر میکال اور اُن کے دوستوں کی آنکھیں اس قدر خیرہ ہوگئیں کہ اب وہ اپنے محسنوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مذہبِ عیسوی نے علوم و فنون اور آزادی اور علما پر جیسے جیسے ہول ناک ظلم و ستم کیے ہیں اُسی قدر اور اس سے زیادہ اہلِ اسلام نے ان پر احسان کیے ہیں اور اس پر بھی اس روشنی کے زمانے میں وہ موردِ الزام ہیں۔ کیا ریورنڈ میکال اور ان کے دوستوں کو یاد نہیں کہ عیسائی علما ہر فلسفی اور طبیعی کو "کافر" "دہریہ" اور "مرتد" کا خطاب دیتے تھے۔ اور اس کے بعد ایک اور نہایت نفرت انگیز اور سخت لفظ ان لوگوں کے لیے ایجاد کیا گیا تھا وہ لفظ "محمدن"

تھا۔ چناں چہ راجر بیکن پر جس کے احسانات سے انگلستان اور یورپ کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتا محض طبیعی اور فلسفی ہونے کی وجہ سے "مسلمان" ہونے کا اتہام لگایا گیا تھا اور مسیحی علما نے اسے مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ تحریریں اب تک موجود ہیں۔ گویا لفظ "مسلمان طبیعی اور فلسفی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اور آج انھیں کے سپوت ہیں جو علی الاعلان یہ دعوا کرتے ہیں کہ مسلمان اسلام پر قائم رہ کر دنیا میں ترقی نہیں کرسکتا اور یہ کہ اسلام دشمنِ علم و آزادی ہے: ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

نوٹ:۔ اس کتاب کے ترجمہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ مصنف نے خود بھی اس کتاب کا اُردو ترجمہ کرنا شروع کیا تھا لیکن انجام کو نہ پہنچا سکے صرف ابتدائی چند اوراق کا ترجمہ کرکے رہ گئے۔ اتفاق سے وہ چند اوراقِ ترجمہ ہمارے ہاتھ آگئے۔ لہٰذا ہم نے تبرکاً اس قدر حصہ اپنے ترجمے کا خارج کرکے مصنف کا اصل ترجمہ داخل کردیا ہے۔ چناں چہ صفحہ (۱) سے صفحہ (۱۴) تک خود مصنف کا ترجمہ ہے۔ مصنف مرحوم کا ترجمہ 'پنجاب ریویو' کے ضمیمے میں چھپا تھا (ملاحظہ ہو پادری رجب علی کا مشہور رسالہ 'پنجاب ریویو' کا ضمیمہ جلد ۴ نمبر ۴ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۸۸۷ء) اس اُردو ترجمے میں علامۂ مصنف نے چند حاشیے بھی اضافہ کیے ہیں جو اصل انگریزی کتاب میں نہیں ہیں۔ چناں چہ مقدمہ حصہ اول نقرہ (۱۴) صفحہ ۸ میں جو تفصیلی نوٹ فقۂ حنفیہ پر لکھا گیا ہے وہ اصل انگریزی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے اُردو میں نقل کردیا ہے۔

# مقدمۂ "تحقیق الجہاد"

واشنگٹن ارونگ، امریکہ کے ایک مشہور مصنف اور ادیب نے آں حضرت صلعم کی بھی لائف لکھی ہے اس کے پہلے ہی صفحے پر آں حضرتؐ کی ایک تصویر دی ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ یہ تصویر مصنف کے اصلی خیال کا فوٹو ہے جس کی پہلے سے یہ رائے ہو وہ ایک ایسے بڑے مصلح اور نبی اور بنی نوع انسان کے محسن کی لایف کیا خاک لکھے گا۔ اور یہ کچھ ارونگ ہی پر موقوف نہیں۔ یورپ میں یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے اور پولیٹیکل مصلحتوں نے وہی کام کیا ہے جو بھس میں چنگاری کرتی ہے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں صدیوں سے جنگ و جدل چلی آرہی ہے اور اگرچہ یہ جنگ و جدل ملکی ہے لیکن اس نے اپنے ساتھ مذہب کو بھی سان لیا ہے۔ تلوار والے تو تلوار سے کام لیتے ہیں اور اہلِ قلم اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالتے ہیں۔ غرض یہ منحوس جنگ ایسی ٹھنی کہ ختم ہونے کو نہیں آتی۔ کم زور کا قاعدہ ہے کہ جب ہاتھ سے کام نہیں نکلتا تو زبان سے کام لیتا ہے۔ عیسائیوں کو شکستیں کیا ہوئیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنا شروع کیا اور بدنام بھی کیسا کچھ تسمہ لگا نہ رکھا۔ جس زمانے میں آں حضرت صلعم کی شہرت ہوئی تو روما کے ایک پوپ نے آں حضرت صلعم کے حالات دریافت کرنے

کے لیے ایک مشن عرب کو بھیجا۔ معلوم نہیں وہ مشن پہنچا یا نہیں پہنچا مگر جو رپوٹ اس نے لکھ کر بھیجی وہ کذب و افترا کی ایک پوٹ ہو۔ سچ نام کو نہیں اور ایسی ایسی باتیں اور واقعات تصنیف کیے ہیں کہ الف لیلہ بھی اس کے سامنے مات ہو۔ اور افسوس کہ یہ رسم اب تک جاری ہو۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی کتاب یا اخبار یا رسالے ہیں کوئی ایسا مضمون شایع نہ ہوتا ہو جس سے مسلمانوں کی دل آزاری نہ ہوتی ہو اگر وہ تمام کتب و تحریرات جمع کی جائیں جو عیسائیوں اور خاص کر اہلِ یورپ نے اسلام، بانیٔ اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف لکھی ہیں تو وہ ایک ایسا بڑا انبار کذب و افترا اور دروغ و بہتان کا ہوگا کہ 'رڈر' اور 'ٹائمز' اس کے ایک صفحے کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ بات یہ ہو کہ مسلمانوں کو جو کامیابی ہوئی آناً فاناً اور کام یابی پیدا کرتی ہو حسد اور خصوصاً جب عیسائی ان کے آگے ہر جگہ ناکام یاب اور پسپا ہوتے گئے تو حسد کی آگ اور بھڑک اُٹھی اور بغض و کینہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ سارا فساد اسی کا ہو۔ گو اس وقت یورپ کی تہذیب و شائستگی اور سائنس کا آفتاب عین نصف النہار پر ہو مگر تعصب کے جراثیم رگ رگ اور ریشے ریشے میں کچھ ایسے سرایت کر گئے ہیں اور گوشت پوست میں کچھ ایسے پیوست ہو گئے ہیں کہ تیز سے تیز شعاعیں بھی انھیں ہلاک نہیں کر سکتیں۔ آج کل اسے مذہبی تعصّب نہیں کہتے بلکہ یہ تعصّب ایک دوسری ہول ناک اور مکروہ صورت میں ظاہر ہوا ہو جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اسے پالٹیکس یا ڈپلومیسی کہتے ہیں۔ اس کے لیے ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں اور ہو کہاں سے ہمارے یہاں یہ سیاسی چال بازیاں اور عیاریاں تھیں کہاں جو لفظ ہوتا۔ اگرچہ صدہا انقلاب ہو گئے، حالات بدل گئے اور جو آگے تھے وہ پیچھے اور جو پیچھے تھے وہ آگے ہو گئے مگر افسوس ابھی تک دلوں میں کدورت وہی چلی آتی ہو۔ درد جاتا رہا مگر کسک باقی ہو۔ سانپ کبھی کا نکل گیا مگر یہ کم بخت ابھی تک لکیر پیٹے جاتے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ کچھ کے پر کچھو کا نہ دیتے ہوں ؛

اسلام کی ترقّی اشاعت کو جو بجلی کی رَو کی طرح تمام عالم میں دوڑ گئی عیسائی دیکھ کر حیران و ششدر تھے اور جب وہ اپنے نبی علیہ السّلام کے حالات عہدِ جدید میں پڑھتے تھے تو ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ وعظ کرتے کرتے اس دنیا سے اُٹھ گئے مگر اپنی قوم پر کچھ اثر ڈال نہ سکے یہاں تک کہ ان کے حواریوں کی یہ حالت تھی کہ پتا کھڑکا اور بندہ بھڑکا، خطرے کے نام سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ جو لوگ اسلام لائے انھوں نے ہر طرح کی صعوبتیں، اذیتیں اور ظلم سہے، گھر بار چھوڑا، بال بچّے چھوڑے مگر مذہب نہ چھوڑا یہاں تک کہ اپنے مذہب کے لیے جانیں تک قربان کر دیں۔ وہ بُت جو گھروں میں خدا بنے بیٹھے تھے اور جو یہودیوں کی کوشش سے نکلے نہ عیسائیوں کی سعی سے، انھیں وہ خود بہ خود پھینک پھینک کر اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اس غیر معمولی ترقّی اور اثر کو دیکھ دیکھ کر عیسائی حیران ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے جو کوئی نبی نہ کر سکا وہ پیغمبرِ اسلام سے کیوں کر ہو گیا۔ بس اس پر یہ قیاس کر لیا کہ رسول اللہ صلعم نے اسلام بہ جبر پھیلایا اور اپنے ذہنوں میں وہ تصویر کھینچ لی جو واشنگٹن اِرونگ نے اپنی کتاب کے پہلے صفحے پر دی ہے۔ حال آں کہ یہ واقعہ ہے اور ایسا کھُلا واقعہ ہے جس کے لیے مزید تحقیقات یا پُرانے کھنڈروں یا قدیم کتبوں یا بھوج پتروں کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کبھی آں حضرت صلعم کے زمانے میں یا اس کے بعد بہ جبر یا بہ زورِ شمشیر نہیں پھیلایا گیا بلکہ جس رواداری، مسالمت اور اعتدال کے ساتھ مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی اور جو فیّاضانہ برتاؤ انھوں نے غیر اقوام کے ساتھ روا رکھا دنیا میں اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ مجھے اس کے متعلق اس مختصر مقدمے میں کسی شہادت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں اور ان واقعات سے ہماری اور غیروں کی تاریخیں بھری پڑی ہیں اور جسے مذہبی پہلو سے اس مسئلے کو دیکھنا ہو تو

اس کتاب کا مطالعہ کرے :

معترضین کو "جہاد" کا حربہ ایسا مل گیا ہو کہ اُسے جا و بے جا ہر موقع پر پیش کر دیتے ہیں گویا اُسے مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کے لیے ایک ہیچا بنا رکھا ہو اور یہ ایک ایسا ڈراؤنا اور خوف ناک لفظ ہو گیا ہو کہ اہلِ یورپ اسے سُن کر اس طرح چونک اُٹھتے ہیں جیسے کبھی نپولین کے نام سے وہاں کے تاج دار سہم جایا کرتے تھے۔ لیکن کیا درحقیقت یہ لفظ ایسا خوف ناک ہو؟ جہاد کیا ہو؟ اپنی حفاظت کے لیے ہاتھ پیر ہلانا اور حتی المقدور کوشش کرنا۔ کب؟ جب جان و مال ننگ و ناموس اور مذہب پر آبنے۔ کون سا قانون ہو جو اس کی اجازت نہیں دیتا اور کون سا انسان ہو جو ایسے وقت اپنی حفاظت نہیں کرتا۔ مدافعت اور اپنی حفاظت ایک قدرتی فعل ہو اور بڑے سے بڑے انسان سے لے کر ادنا سے ادنا کیڑے مکوڑے تک وقت پڑے پر اپنی حفاظت اور مدافعت میں سعی کرتے ہیں۔ اسلام نے کہیں بہ جبر یا بہ زورِ شمشیر کسی کو مسلمان بنانے کی اجازت نہیں دی اور نہ آں حضرت صلعم نے کبھی ایسا کیا نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ جن لوگوں نے آں حضرتؐ کے حالات کا مطالعہ کیا ہو انھیں معلوم ہو کہ ابتدائی تیرہ سال آپؐ پر کیسے مصیبت کے گزرے ہیں۔ قریش نے آپؐ کے ساتھ کیا کیا نہ کیا۔ طرح طرح سے آپؐ کی توہین و تحقیر کی، جسمانی، مالی اور روحانی صدمے پہنچائے، ادائے نماز سے روکا، یہاں تک کہ تھوکا، کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالی، آپؐ کی گردن میں آپ ہی کے عمامے کا پھندا ڈال کر کعبہ سے باہر نکال دیا، تلقین و تعلیم سے باز رکھا اور ہر قسم کی اذیتیں اور صعوبتیں پہنچائیں۔ آپؐ کے پیرووں پر بڑے بڑے ظلم توڑے اور کوئی دقیقہ ان کے ستانے اور ان کی زندگی تلخ کرنے کا اُٹھا نہ رکھا۔ آپؐ کے اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، ایک جتھا قائم کیا اور آمد و رفت میل جول اور تمام تعلقاتِ باہمی قطع کر دیے۔ آخر انھیں مایوس و مجبور ہو کر

اپنے وطن مالوفہ کو خیر باد کہنا پڑا اور آوارہ وطن ہو کر مکّہ سے دور جا کر پناہ لی۔ مگر ظالموں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پہلے سے زیادہ ظلم و تعدّی پر آمادہ ہو گئے اور فوجیں لے کر حملہ آور ہوے۔ اس پر بھی اگر آں حضرت صلعم خاموش صبر و تحمّل کیے بیٹھے رہتے تو وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے۔ اس وقت آپ کا فرضِ عین تھا کہ اپنے تئیں اور اپنے رفقا کو ہلاکت سے بچاتے اور یہی کیا اور یہی کرنا چاہیے تھا اور ایسا کرنا بہ درجۂ مجبوری تھا کیوں کہ سوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لیے آں حضرت صلعم کے تمام غزوات دفاعی تھے۔

اس مسئلے پر جس شرح و بسط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس کتاب میں بحث کی ہو آج تک کسی نے اس پر ایسی غائر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اس زمانے میں جب کہ جدید خیالات اور جدید فلسفہ ہمارے ملک میں گھر کرتا جاتا ہو اور اسلام اور اہلِ اسلام پر نئے نئے اور دل آویز طریقوں سے حملے کیے جا رہے ہیں اور مسلمان انھیں پڑھ پڑھ کر اپنے اعتقادات و خیالات میں ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں ایک ایسی محققانہ کتاب کی بے حد ضرورت تھی۔ نئے تعلیم یافتہ تو خیر نشانۂ ملامت ہیں ہی مگر ان پرانے علما کا کیا کیا جائے جو اپنے کلام سے (خواہ وہ کسی نیت سے ہو) معترضین کی تائید کرتے ہیں۔ چناں چہ ایک عالم محدّث کو جنھوں نے علومِ دینی کو اردو میں شایع کر کے اسلام کی بڑی خدمت ادا کی ہو اور خاص کر کل صحاح ستّہ کا اردو میں ترجمہ فرما کر ہند کے اہلِ اسلام پر احسان کیا ہو جب کوئی صحیح حدیث نہ ملی تو اپنی طرف سے ایک حاشیہ اس مضمون کا جڑ دیا کہ رسولِ کریم کے غزوات حصولِ فتح اور بہ جبر اشاعتِ اسلام کی غرض سے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ اسے کیا کہا جائے۔ بہ ہر حال ایسی حالت میں مولوی چراغ علی مرحوم کی کتابیں پیاسے کے لیے آبِ حیات، مریض کے لیے نوش دارو اور مار گزیدہ کے لیے تریاق کا کام دیں گی۔ مرحوم اس ضرورت کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے اور جب کہ مقلّد اور غیر مقلّد، سنّی و شیعہ تو تو میں میں میں مصروف تھے وہ ایک ایسی عظیم الشّان

خدمت اپنے دین و ملّت کی ادا کر رہے تھے کہ اس کی نظیر ان کے بعد پھر نظر نہ آئی۔ بعض مدّعیانِ حمایتِ دین و ملّت کی آنکھیں اب کھلی ہیں اور دن ڈھلے پر ایک جدید علمِ کلام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور اس کے متعلق مشورے اور کمیٹیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن انھیں خبر نہیں کہ مدّت ہوئی اس کی بنیاد سر سیّد ڈال چکے اور مولوی چراغ علی مرحوم اس کی تکمیل بھی کر چکے۔ اور خبر کیوں نہیں شاید اس کا اعتراف کرتے شرماتے یا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اعتراف کرو یا نہ کرو چلنا اسی نقشِ قدم پر پڑے گا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤ مگر بنیاد وہی ہو گی۔

مولوی صاحب مرحوم کا طریقۂ تحریر سب سے الگ اور نرالا ہے۔ وہ کبھی جوش میں آکر فصاحت کے دریا نہیں بہاتے، دوسروں کو الزام نہیں دیتے، عبارت کی رنگینی یا لطائفِ ادبی کا خیال نہیں کرتے اور نہ ناظرین کے جذبات کو اشتعال دے کر اپنی بات منواتے ہیں۔ وہ نفسِ معاملہ کو نہایت ٹھنڈے دل اور غور سے دیکھتے ہیں، اس کے متعلق تمام واقعات جمع کرتے ہیں اور سوائے قرآنِ پاک اور افعال و اعمال آں حضرت صلعم کے کسی دوسری خبر پر اپنے استدلال کی بنیاد نہیں رکھتے۔ ان کا مطالعہ ایسا وسیع، ان کی نظر ایسی غائر اور ان کی تحقیق ایسی گہری اور ان کی منطق ایسی مستحکم ہوتی ہے کہ جس مضمون پر وہ قلم اُٹھاتے ہیں پھر کسی دوسرے کے لیے ایک لفظ کی گنجایش نہیں چھوڑتے۔ ان کا زور جذباتِ انسانی پر نہیں بلکہ استدلالِ عقلی پر ہے وہ جذبات کو اُبھار کر جوش میں لانا نہیں چاہتے کیوں کہ یہ ناپائے دار ہے بلکہ از راہِ تحقیق وہ مضمون کو اس پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ اگر پڑھنے والا غور سے پڑھے تو اس کی صداقت اس طرح ذہن نشین ہو جائے کہ پھر اس کا نقش نہ مٹ سکے۔ وہ شاعر نہیں محقق ہیں، وہ فسانہ نگار نہیں منطقی ہیں، وہ واقعات اور اصل حقیقت سے بحث کرتے ہیں، تخیل و بلند پروازی سے کام نہیں لیتے۔ وہ اپنی تائید میں شاہانِ اسلام کے تاریخی

واقعات اور فقہا کی رائیں پیش نہیں کرتے بلکہ آیاتِ قرآنی، افعال و اعمال رسول صلعم کو سند گردانتے ہیں۔ وہ کسی الزام یا اعتراض کو الزامی جواب دے کر لفظی ہیر پھیر سے نہیں ٹالتے بلکہ جرأت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے اور زور سے اس کی تردید کرتے ہیں اور یہی طریقہ ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصانیف تعلیم و تحقیق دینِ اسلام کا ایک ایسا بے بہا مجموعہ ہیں کہ ان کو غور سے پڑھنے کے بعد حقیقت و حقانیتِ دینِ اسلام پر اس قدر عبور ہو جاتا ہے کہ سال ہا سال کی محنت اور صدہا کتب کے مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مرحوم نے اسلام کی ایسی بڑی خدمت کی ہے کہ ہم سب کو ان کا بہت شکرگزار اور ممنون ہونا چاہیے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ مولوی عبداللہ خاں صاحب ان کتابوں کا ترجمہ کرا کر اور بڑی محنت سے اُن کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر (جو اب تک طبع نہیں ہوئے تھے) ترتیب دے رہے اور شائع کر رہے ہیں۔

اب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جن موتیوں کی تلاش میں بڑے بڑے شناور غوطے کر رہے ہیں وہ دراصل مرحوم کی خوشہ چینی کر رہے ہیں خواہ کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے خواہ ان کی کتابوں کا حوالہ دے یا نہ دے۔

اس کتاب میں مرحوم نے کمالِ تحقیق سے کام لیا ہے اور اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر ایسی خوبی سے بحث کی ہے کہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون کس قدر وسیع ہے اور فاضل مصنف کی جاں فشانی، دماغ سوزی اور انتہائی تلاش کا حال کھلتا ہے۔

اس کا ترجمہ مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب (مترجم فلسفہ تعلیم ہربرٹ اسپنسر) نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بہت بامحاورہ صاف اور شگفتہ ہے۔

پبلشر نے بھی اس کتاب پر بہت محنت کی ہے جا بجا ایسے حوالوں کا اضافہ کیا

ہے جو مصنف کی نظر سے رہ گئے تھے اور بجائے ایک آدھ کے کئی ایک حوالے ہو گئے ہیں جس سے مصنف کے خیال کو بہت تائید ملتی ہے۔ بعض حوالے جو انگریزی کتاب میں غلط چھپ گئے تھے ان کی بھی تصحیح کی ہے۔ عربی اسماد اعلام کی جیسے کچھ مٹی انگریزی کتابوں میں خراب ہوتی ہے وہ ظاہر ہے ان ناموں کی صحت میں بھی بڑی احتیاط کی گئی ہے۔ کہنے کو تو یہ معمولی سا کام معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں بڑی محنت اُٹھانی پڑتی ہے اور بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام ایسا مشکل ہے کہ بعض مترجمین تو اس مشکل سے ڈر کر ترجمے ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مولوی عبداللہ خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ اوّل تو انھوں نے اس بے نظیر کتاب کا انگریزی سے اُردو ترجمہ کرایا اور پھر اس کی صحت اور چھپائی میں خاص طور سے محنت کی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مقبول ہوگی ؛

---

# مقدّمۂ مشاہیرِ یونان و روما

(مترجمہ مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی)

پڑھنے کی عادت بہت اچھّی ہی۔ مطالعہ ایک شریفانہ فعل ہی نہیں حکیمانہ فعل ہی، لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہی اور کتاب کتاب میں فرق ہی۔

مَیں ایک بدمعاش اور پاجی آدمی سے باتیں یا بے تکلّفی کرتے ہوئے جھجکتا ہوں اور آپ بھی میرے اس فعل کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن مَیں اس سے زیادہ بڑی بدمعاش اور پاجی کتاب پڑھتا ہوں نہ آپ کو ناگوار گزرتا ہی اور نہ مجھے ہی کچھ ایسی شرم آتی ہی بلکہ اس کی بات شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُترتی چلی جاتی ہی۔ پاجی آدمی کی تو شاید کوئی حرکت ناگوار ہوتی اور مَیں اس سے بیزار ہو جاتا مگر یہ چپکے چپکے دل میں گھر کر رہی ہی اور اس کی ہر بات دل ربا معلوم ہوتی ہی۔

اگر مَیں کسی روز بازار جاؤں اور چوک میں سے کسی محض اجنبی شخص کو ساتھ لے آؤں اور اس سے بے تکلّفی اور دوستی کی باتیں شروع کر دوں اور پہلے ہی روز اس طرح سے اعتبار کرنے لگوں جیسے کسی پُرانے دوست پر۔ تو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر ریل کسی اسٹیشن پر ٹھیرے اور مَیں اپنی گاڑی سے اُتر کر سیدھے بک اسٹال (کتب فروش کی الماری) پر پہنچوں اور پہلی کتاب جو میرے ہاتھ لگے وہ خرید لاؤں اور کھول کر شوق سے

پڑھنے لگوں تو شاید آپ کچھ نہ کہیں گے۔ حال آں کہ یہ فعل پہلے فعل سے زیادہ مجنونانہ ہے۔ اُس کے لیے تو کوئی عذر ہو بھی سکتا ہے، مگر اس کے لیے کوئی عذر ممکن نہیں ؛

مَیں ایک بڑے آباد شہر یا مجمع میں جاتا ہوں، کبھی ایک طرف نکل جاتا ہوں کبھی دوسری طرف جا پہنچتا ہوں اور بغیر کسی مقصد کے اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہوں۔ افسوس کہ باوجود آدمیوں کی کثرت کے مَیں وہاں اپنے تئیں اکیلا اور تنہا پاتا ہوں اور اس ہجوم میں تنہائی کا بار اور بھی گراں معلوم ہوتا ہے۔ میرے کتب خانے میں بیسیوں الماریاں کتابوں کی ہیں، مَیں کبھی ایک الماری کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں اور کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی دوسری الماری میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں۔ مَیں اس طرح سیکڑوں کتابیں پڑھ جاتا ہوں لیکن اگر مَیں غور کروں تو مَیں دیکھوں گا کہ مَیں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اس وقت میری آوارہ خوانی مجھے ستائے گی اور جس طرح ایک بھرے پرے شہر میں میری تنہائی میرے لیے وبال تھی اسی طرح اس مجمعِ شرفا و علما، ادبا و شعرا میں مَیں یکہ و تنہا اور حیران ہوں گا ؛

بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں مضر بھی ہے۔ جس قدر ہم بغیر کسی مقصد کے پڑھتے ہیں اسی قدر ہم ایک بامعنی مطالعے سے دُور ہوتے جاتے ہیں ؛

ملٹن نے ایک جگہ کہا ہے کہ "اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان کا گلا گھونٹنا"۔ جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ فضول اور معمولی کتابوں کے پڑھنے میں عزیز وقت ضایع کرنا اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ہے کیوں کہ ایسی صورت میں وہ ہمارے لیے مردہ ہے ؛

لوگ کیوں فضول، معمولی اور ادنا درجے کی کتابیں پڑھتے ہیں؟ کچھ تو اس لیے کہ ان میں نیا پن ہے۔ کچھ اس خیال سے کہ ایسا کرنا داخلِ فیشن ہے۔ اور کچھ اس غرض سے کہ اس سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی دو وجہیں تو طفلانہ ہیں۔ تیسری وجہ البتہ بظاہر

معقول ہی۔ لیکن اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم معمولی ذلیل اور ادنا معلومات کو اپنے دماغ میں بھرتے ہیں تاکہ اعلا معلومات کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگر ہم اپنے مطالعے کا ایک سیاہہ تیار کریں اور اس میں صبح سے شام تک جو کچھ پڑھتے ہیں لکھ لیا کریں اور ایک مدت کے بعد اسے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کیا کیا کر گزرے۔ اس میں ہم بہت سی ایسی تحریریں پائیں گے جن کا ہمیں مطلق خیال نہیں، بہت سے ایسے ناول ہوں گے جن کے ہیرووں تک کے نام یاد نہیں، بہت سی ایسی کتابیں کہ جن کی نسبت اگر ہم سے کوئی یہ کہتا کہ یہ ہم پڑھ چکے ہیں تو ہمیں کبھی یقین نہ آتا۔ بہت سی ایسی تاریخیں، سفرنامے، رسالے وغیرہ ہوں گے جنھیں پڑھ کر خوش تو کیا پچھتائے ہی ہوں گے۔ اگر ہم علی گڑھ کے طالب علموں کے نام ان کے حلیے، ان کے وطن، ان کے محلے، ان کی کتب نصابِ تعلیم اور ان کے شجرے یاد کرنے شروع کر دیں اور اُسے معلومات کے نام سے موسوم کریں تو لوگ کیا کہیں گے؟ غرض ایسا ہی کچھ حال اس سیاہے کا ہوگا۔ اس کا اکثر حصہ خرافات کی ایک عجیب فہرست اور ہماری ورق گردانی اور تضیع اوقات و دماغ کی ایک عمدہ یادگار ہوگی ؎

ملٹن نے کیا خوب کہا ہی "عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہی۔" اس قول میں مطلق مبالغہ نہیں۔ عمدہ کتاب خود ہی لافانی نہیں بلکہ اپنے لکھنے والے کو، اُن کو جن کا اس میں ذکر ہی، اور بعض وقت پڑھنے والوں کو بھی لافانی بنا دیتی ہی۔ عمدہ کتابوں نے انسانوں کے اخلاق و طبایع و آرا پر بہت بڑا اثر ڈالا ہی، خیالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کیا ہی، قوموں میں ہل چل اور انقلابات بپا کیے ہیں اور مُلکوں کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہی۔ اور یہی عمدہ کتاب کی نشانی ہی۔ میں آج آپ کو ایک ایسی ہی کتاب کا حال سُناتا ہوں یہ آج کل کی نہیں، دو دو صدی کی نہیں بلکہ سنہ عیسوی کی پہلی صدی کی لکھی ہوئی ہی۔ یہ اب تک زندہ

ہے یہ لافانی ہے۔ اس نے بہت سے مُردہ دلوں کو زندہ دل بنا دیا۔ بہت سے سوتے ہوؤں کو بیدار اور غافلوں کو ہشیار کر دیا، بہت سی قوموں میں قومیت و انسانیت کی رُوح پھونک دی اور اس میں اب بھی اسی سحر کاری کی قوت موجود ہے بہ شرطے کہ ہمیں اپنی آوارہ خوانی سے فرصت ہو۔

جب رُومہ کی قدیم سلطنت خانہ جنگیوں کی بدولت پارہ پارہ ہو گئی نیز مذہب عیسوی کے تازہ فروغ نے یونانِ قدیم کی تہذیب و حکمت کو برباد کر دیا تو چوتھی صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک برِّ اعظم یورپ میں سخت جمود کی کیفیت طاری رہی۔ علمائے مذہبی کی تلقین اور حاکمانہ تعلیم نے لوگوں کو دنیا اور معاملاتِ دنیا کی جانب سے بالکل بے پروا کر دیا تھا۔ ہر دل پر آنے والی زندگی کا ہول اور قیامت کا خوف ایسا بیٹھ گیا تھا کہ جو لوگ تارک الدنیا نہ تھے حیاتِ ظاہری کے مسائل پر غور کرنا انھیں بھی ناگوار اور تضیع اوقات معلوم ہوتا تھا۔ دماغوں میں اوہام پرستی اور متعصبانہ تنگ دلی اور قومی عزت و غیرت کے تمام اصولوں سے بے خبری کے سوا کسی چیز کے سمانے کی گنجائش نہ تھی اور شخصی بادشاہوں کے طفلانہ فرمان اور خود غرض پادریوں کے خلافِ عدل و انسانیت احکام کی تعمیل زندگی کا فریضۂ مسلّمہ بن گئی تھی۔

صدیوں تک اسی حالتِ خراب میں پڑے رہنے کے بعد آخر کار اہلِ مغرب میں حرکت پیدا ہوئی اور اُندلس کی اسلامی درس گاہوں کے طفیل سے اور اُن یونانی پناہ گزینوں کے اثر سے جو ترکی کی فتح قسطنطنیہ کے بعد جنوبی یورپ میں بھاگ آئے تھے یونانِ قدیم کے فلسفہ و حکمت اور رومی قوانین و نظامِ سلطنت کا علم ان ممالک میں پھیلا اور محض اس کی بدولت ذہنی ترقیوں کا وہ دَور یورپ میں شروع ہوا جسے بجا طور پر اہلِ یورپ عہدِ بیداری (یا نشاۃ الثانیہ) سے تعبیر کرتے ہیں۔ علم و مطالعہ کے شوق کے اس احیا نے ایک طرف تو اس زبردست مذہبی اصلاح کی تخم پاشی کی جو عیسائیوں کے

نئے فرقے پراٹسٹنٹوں کی تحریک کی سنگ بنیاد تھی اور دُوسری طرف عدل ومساوات' رواداری اور معقولیت' آزادیٔ خیال اور جمہوریت اور ایثار وحبِ وطن کا دِلوں میں گہرا نقش بٹھا دیا۔ اور درحقیقت محض قدیم علم ادب کا طفیل تھا کہ استبداد و مطلق العنانی کا زور ٹوٹا اور لوگوں کے خیالات میں وہ غیر معمولی تلاطم ہوا جس کا سب سے خوفناک مظاہرہ انقلابِ فرانس تھا۔

اس طرح تقریباً پانسو برس کی محنت ومطالعے کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ گویا اسی درخت کا پھل تھا جسے دو ہزار برس پہلے اہلِ یونان کے ہاتھوں نے بویا تھا۔

لیکن ان یونانی کتابوں میں جو یورپ کے ایسے ذہنی انقلابات کا سبب ہیں اگر ہم بہ غور تلاش و امتیاز کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پلوٹارک متوطن شیرونیہ (علاقہ یونان) کی کتاب 'مشاہیرِ یونان و روما' بھی من جملہ ان چند کتابوں کے ہے جنھوں نے مغرب کو قعرِ مذلت سے نکال کر اوجِ کمال پر پہنچا دیا اور اعلا انسانی خصائل کا ایسا سبق دیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔

مذہب ہو یا دنیوی معاشرت، سیاسیات ہو یا دینیات بغیر اخلاق کے چارہ نہیں۔ جب تک ان کی تہ میں اخلاق نہ ہو کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن قابلِ غور اور اہم سوال یہ ہے کہ اعلا اخلاق کی تعلیم کیوں کر دی جائے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اعلا اور پاکیزہ خیالات اس طرح متمکن ہو جائیں کہ دنیوی لالچ، خودغرضانہ خواہشات' دوستی اور مروّت انھیں ڈانواں ڈول نہ کر سکے؟

بعض کا خیال ہے صرف مذہبی تعلیم ہی سے اخلاق درست ہو سکتے ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ اخلاق کی کتابیں پڑھانے اور وعظ وپند کے ذریعے سے اخلاق سکھا سکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلا طریقہ حکم وفرمان پر مبنی ہے۔ اور بہت طبایع اسے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور اس لیے اکثر محروم رہ جاتی ہیں۔ اور دُوسرا طریقہ بے مزہ

اور روکھا پھیکا ہے، خصوصاً نوجوان طبیعتیں اُس سے بھاگتی ہیں اور واعظوں کے وعظ اور ناصحوں کی نصیحتیں رائگاں جاتی ہیں۔ ایک تیسری تدبیر اصلاحِ اخلاق کی صحبت ہے۔ بے شک یہ ایک کارگر اور مؤثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلا اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے کامل نمونے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ پہلے دو طریقوں میں دل کشی نہیں جو نصیحت کی تلخی کو کم کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ایک اور کمی بھی ہے، یعنی ان سے بڑائی حاصل کرنے کا دلوں میں ولولہ اور جوش پیدا نہیں ہوتا۔ اب صرف ایک ہی طریقہ باقی ہے جو مؤثر بھی ہے، دل کش بھی ہے اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرتا ہے۔ اور ہر کہیں میسّر آسکتا ہے، اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے حالات پڑھنے کے لیے دیے جائیں جنھوں نے دنیا میں ایسے بڑے بڑے کام کیے ہیں جو کبھی مٹنے والے نہیں، بہ شرطے کہ اُن کا لکھنے والا اُس گُر سے واقف ہو۔

پلوٹارک اُس گُر کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے یونان و روما کے سپوتوں کے حالات لکھنے میں ایسے دل آویز طریقے سے کام لیا ہے کہ خود بہ خود پڑھنے کی رغبت ہوتی ہے اور دُوسری بات جو پلوٹارک کی سبق آموز اور زندۂ جاوید کتاب کی وقعت بڑھانے والی ہے وہ اس کی تاریخی حیثیت اور صاحبِ کتاب کی غیر معمولی وسعتِ نگاہ ہے۔ اس کی مساعیِ تحقیق و جستجو کو سَیر کرنے کے لیے اوّل تو کتابوں کا ایک ذخیرۂ کثیر اس کے سامنے تھا، جو اب ناپید ہے اور دُوسرے وہ پہلی صدی عیسوی کا آدمی ہے اور اس لیے یونان و روما کی تہذیب و معاشرت کا جیسا صحیح اندازہ وہ کر سکتا ہے اس زمانے میں ممکن نہیں۔ پس تاریخی اعتبار سے ان ملکوں کی کوئی قدیم تاریخ مکمل بلکہ معتبر نہیں سمجھی جاتی جب تک مؤلف اس بات کا ثبوت نہ دے کہ اس نے پلوٹارک کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کو طالب علمانہ شوق و جاں کاہی سے پڑھا ہے۔

آپ اس کتاب میں حبِّ وطن، کامل ایثار، بے نفسی و جاں نثاری اور اولوالعزمی

کی ایسی زندہ اور سچی تصویریں دیکھیں گے کہ ان کو پڑھ کر انسان بے خود ہو جاتا ہے اور دل بے اختیار سچے جذبات سے اُبلنے لگتا ہے۔ اور خواہ کیسا ہی آدمی ہو یہ ممکن نہیں کہ اس کے پڑھنے کے بعد وہ متاثر نہ ہو اور ان انسانی اعلاخوبیوں کا دائمی اثر اس کے دل پر باقی نہ رہے۔ دنیا میں سیکڑوں آدمی ایسے گزرے ہیں کہ اس کتاب نے ان پر جادو کا سا اثر کیا ہے اور اس کی بدولت انھیں حیاتِ جاوید حاصل ہوئی ہے۔

روسیو جو فرانس کا ایک بڑا حکیم گزرا ہے اور جو ان چند برگزیدہ لوگوں میں سے تھا جو انقلابِ فرانس کا پیش خیمہ تھے۔ اس کتاب کو پڑھ پڑھ کر آپے سے باہر ہو جاتا۔ اور لڑکپن کے زمانے میں بھی اس سے ان بے نفس اولوالعزم لوگوں کی تقلید میں عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کتاب کو بہت عزیز رکھتا تھا اور ہمیشہ اس کے پڑھنے سے اس پر نئی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

فرانس کے عہدِ بیداری کے ایک دوسرے نام ور مصنف مونٹین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ پلوٹارک کے مطالعے سے بے انتہا متاثر ہوا تھا اور اپنی کام یابی کے لیے علاوہ دیگر یونانی فلسفیوں کے پلوٹارک کا بھی رہینِ منت تھا۔

پلوٹارک کو انسانی سیرت اور باطن کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا زندہ تصویریں ہمارے سامنے موجود ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے ہم خود اپنے اردگرد کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔ شیکسپیر کے کلام کا مشہور نقاد ریلے لکھتا ہے "شیکسپیر جو پلوٹارک کا بہت کچھ زیر بارِ احسان ہے بعض اوقات کیریکٹر (سیرت) کی تصویر اُتارنے میں پلوٹارک کے حیرت انگیز بیان کو نہیں پہنچتا"۔

فردوسی بھی اس بارے میں کمال رکھتا ہے اور شاہ نامے کے پڑھنے کے بعد ہم رستم و افراسیاب، سیاوش و سہراب وغیرہ کو نہیں بھول سکتے لیکن

حبِّ وطن، کامل ایثار اور انسان کے اخلاقی کمالات کی وہ تصویریں جو دل میں گھر کر لیتی ہیں اور جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق کا زبردست آلہ ہیں، اس میں نہیں پائی جاتیں۔ پلوٹارک کو اس خصوصیت میں سب پر تفوّق حاصل ہے اور جسے یقین نہ ہو وہ بروٹس، لکرگس اور کیٹو (خرد) وغیرہ کے حالات پڑھ کر دیکھ لے اور سوچے کہ ان اعلا صفات کی حامل کوئی اور کتاب بھی ہے:

اگر اس کتاب کے پڑھنے کے بعد کوئی اس سے متاثر نہ ہو اور اس کے دل میں اخلاقی کمالات کا جوش اور ولولہ پیدا نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خدا سے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگے کہ خدا اس کے حال پر رحم کرے:

مجھے سچی اور قلبی مسرت ہے کہ آخر یہ دل چسپ اور وقیع المنزلت کتاب جو دنیا کی امہاتِ کتب میں سے ہے انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی اور ہمارے اہلِ ملک کے سامنے من جملہ (پانچ جلدوں کے) اس کی پہلی جلد آج پیش کی جا رہی ہے۔ خدا کرے کہ اُسے یہاں بھی وہی تاثیر اور قبولیت نصیب ہو جس کی وہ مستحق ہے:

میں اس امر پر بھی خاص مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ انجمنِ ترقیِ اردو کی خوش نصیبی سے اُسے مترجم بھی ایسا ہی قابل اور محقق ملا ہے۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ جس جان کاہی، شوق اور محنت سے کیا ہے وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔ اور میری رائے میں یہ اردو ترجمہ بلحاظ طرزِ بیان، سلاست، اظہارِ مطالب انگریزی ترجمے پر فوقیت رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے لائق مترجم نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ کتاب کے شروع میں ایک تاریخی مقدمہ (جو گویا یونان اور روما کی قدیم تاریخ کا ایک خلاصہ ہے) اضافہ کر دیا ہے جس سے اردو ترجمے کی وقعت اور بڑھ گئی ہے۔ یہ بہت ضروری تھا، اس لیے کہ ان سوانح عمریوں میں خاص تاریخی سلسلہ نہیں ہے اور بہت سی باتیں اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتیں نہ کتاب کا پورا لطف آسکتا ہے جب تک کہ یونان و روما کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ پس یقین ہے کہ اردو خواں پبلک کے لیے یہ نہایت مفید اور کار آمد ثابت ہوگا:

# مقدمۂ جنگِ روس و جاپان

(مصنّفہ مولوی ظفر علی خاں صاحب)

انیسویں صدی کے نصف سے یورپ میں ایک نیا مرض چل نکلا ہے جس کا نام "جوع الارض" ہے۔ یہ مرض استسقا سے ملتا جلتا ہے۔ جس طرح استسقا کا مریض پیتا جاتا ہے اور پیاس نہیں بجھتی اسی طرح اس نئے دُکھ کا دُکھیارا ملک کے ملک ہضم کرتا جاتا ہے اور اس پر بھی ھل من مزید کا نعرہ بلند ہے۔ اس مرض میں وہی مبتلا ہوتے ہیں جو ظرف کے بڑے اور مزاج کے کڑے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے تاج دار اور شہنشاہ خاص کر اس کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی ہوس مٹانے کے لیے وہ وہ سامانِ کشت و خون و جنگ و جدل جمع کیا ہے جو دیدہ نہ شنید۔ فوج پر فوج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ خشکی اور تری دونوں پر پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ آلاتِ حرب میں اصلاحیں ہو رہی ہیں۔ اور پے در پے دوسروں پر ہاتھ ڈالنے اور خون بہانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ اور رعایا ہے کہ مارے بوجھ کے دبی جا رہی ہے۔ ملک کا روپیہ نہایت بے دردی کے ساتھ آپس کے کشت و خون کے لیے پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ خلقِ خدا جس کے پسینے کی یہ کمائی ہے بھوکوں مرے تو مرے مگر ان جابروں کی ہوس پوری ہو کے رہے۔ دوسرے سلاطین ان کی یہ تیاریاں دیکھ کر سہمے جاتے ہیں اور ان کے پنجے سے اپنے تئیں

بچانے اور جان سلامت رکھنے کے لیے مجبوراً وہ بھی اپنی فوجیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان مصارف کی وجہ سے بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں مثلاً بلگیریا اور سرویا کا حال پتلا ہو رہا ہے اور قریب ہے کہ اٹلی اور آسٹریا بھی اس کا مزہ چکھیں اور اپنے ہاتھوں اپنی قبر بنائیں:

انیسویں صدی کے نصف سے پہلے ریلوے اور تار برقی کا اجرا وسایلِ نقل و حرکت کی سہولتیں، خط وکتابت کی آسانیاں، مطابع کی کثرت اور علوم وفنون کی ترقی دیکھ دیکھ کر لوگ پھولے نہیں سماتے تھے اور کہتے تھے کہ فاصلہ جو کسی کے سکیڑے سکڑتا نہیں اور وقت جو کسی کے ٹالے ٹلتا نہیں اب دونوں انسان کے پنجۂ قدرت میں ہیں۔ اور یہ پیشین گوئی ہوتی تھی کہ تاریکی ظلمت ہوا ہو گئی ہے یہ زمانہ عام امن وصلح کا ہے۔ اب دنیا میں آزادی اور فارغ البالی کا ڈنکا بجے گا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد زمانے نے اُن کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سب خیالات کافور ہو گئے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی سامان جو تہذیب وشائستگی کی جان تھا۔ جنگ وجدل اور کشت وخون کا بھی مایۂ ناز ہے۔ وہی ریلیں وہی ٹیلی گراف بلکہ بے تار کا ٹیلی گراف، وہی مطبع، وہی قوتِ ایجاد واختراع سب کے سب صرفِ کشت وخون ہیں اور مرنے اور مار رکھنے کا سامان ہیں۔ ان ایجادوں نے جتنی آسانی تہذیب وشائستگی کی ترقّی دینے میں پیدا کی تھی اس سے کچھ کم ظلمت وجہالت کے پھیلانے میں نہیں کی۔ یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ گزشتہ تیس سال میں دنیا نے سوا جنگی تیاریوں میں مصروف رہنے کے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ اس سے زیادہ کوئی شرم کی بات نہیں کہ وہ زمانہ جو تہذیب وشائستگی اور ترقیٔ علوم وفنون کی معراج سمجھا جائے اس کا سب سے بڑا کام یہ ہو کہ لوگ ایک دوسرے کا خون پینے کے لیے تیار کیے جائیں۔ غرض انسان کی دو بڑی دولتیں یعنی روپیہ اور وقت اس کی نذر ہو رہا ہے: ؎

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ — کرتے ہیں بھر لے کو یاں خالی تفنگ
عہدِ گیتی پر نہ بھولیں کامراں — آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا اخلاق کیا ہتیار کیا — سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ (حالی)

عذر یہ ہے کہ سب کچھ ہم اپنے بچاؤ کے لیے کر رہے ہیں، سچ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ سچ یہ ہے کہ یہ تقاضائے فطرتِ انسانی ہے کہ قوت کے ہوتے ساتے آدمی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جہاں زور پیدا ہوا اور اس کے پَر لگے۔ چناں چہ ان سلاطین نے جو "جوع الارض" کے شکار ہو چکے ہیں دنیا کو اپنا شکار بنایا۔ آس پاس دست درازی شروع کی اور خدا کی خدائی کا ایک حصّہ ہضم کر گئے۔ چھوٹے چھوٹے لقموں سے اگر قطع نظر کی جائے تو وہ موٹی موٹی آسامیاں بھی جہاں سے گزشتہ پچاس سال سے یہ جوع الارض کے مریض لقمۂ تر بہ تر حاصل کر رہے ہیں تعداد میں کچھ کم نہیں ہیں۔ مثلاً سب سے بڑی مریضہ دولتِ برطانیہ ہے: جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ یہ درحقیقت مصر کی خالہ بن بیٹھی ہیں۔ اور محض از راہِ ہمدردی اس موٹے تازے بچے کے رکھ رکھاؤ اور دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ خیر یہ تو تھا ہی بیٹھے بیٹھے سوڈان پر ایک ہاتھ ایسا مارا کہ صفایا کر دیا۔ اس میں کہنے کو مصر بھی شریک ہے۔ ادھر ہندستان میں برہما کا الحاق ہوا اور برار کا پٹہ دوامی حضور نظام سے حاصل کیا۔ افریقہ میں ٹرانسوال سے وہ گشتم گشتا ہوئی کہ الامان الحفیظ خون کی ندیاں بہ گئیں، مُردوں کے پشتارے لگ گئے مگر نہ چھوڑا اور آخر لے کے چھوڑا۔ آرنج فری اسٹیٹ بھی اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور حکومتِ انگریزی میں شامل ہو گئی۔ جزیرۂ قبرس کو لارڈ بیکنس فیلڈ نے جو "جوع الارض" کا بہت بڑا مریض گزرا ہے بہ زمانہ برلن کانفرنس ٹرکی سے معاہدہ کر کے ہتیا لیا تھا۔ اس کا اصلی منشا یہ تھا کہ اسے فوجی بڑا ڈبنائے کیوں کہ ان دنوں فرانس کا ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں مصر پر فوج نہ بھیج دے۔ دولتِ فرانس اگرچہ جمہوری سلطنت ہے مگر پڑوس کا اثر کہیے یا زمانے کا یہ بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گئی اور

ٹیونس دبا بیٹھی اور ادھر انڈوچائنا کی عنانِ انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ یہاں تک کہ آنام، کوچن چائنا، کمبوڈیا اور ٹانکن جو پہلے خود مختار ریاستیں تھیں اپنی خود مختاری اُس جمہوری سلطنت کی نذر کر چکیں جس نے چار دانگِ عالم میں آزادی، مساوات، اخوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ روس جو اس مرض کے طفیل حیوانِ ناطق سے حیوانِ مطلق ہوتا چلا جاتا ہے اور جو اپنی حرص اور سخت جانی اور ایذا رسانی میں کسی طرح خرس کوہی سے کم نہیں بسر آیا۔ اور آرمینا کے شمالی صوبے آخر ڈکار ہی گیا۔ ادھر وسطِ ایشیا میں وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے کہ افغانستان سے ڈانڈا جا ملایا۔ دُوسری طرف مشرقِ الاقصیٰ میں تلاطم مچاتا ہوا منچوریا میں جا براجا۔ جرمنی نے جو اس مرض کا سب سے تازہ شکار ہے ایک طرف زنگبار میں اور دُوسری طرف کیوچیو (چین) میں جا جھنڈا گاڑا۔ اور سُنیے مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اور اسٹریا اور اٹلی بھی چلیں ہنس کی چال۔ ایک نے بوسینا (حبش)، کا ٹینٹوا دبا ہی دیا ہوتا مگر وہ تو پہلے کو آڈووا پر ایسی منھ کی کھائی کہ آدھا مرض جاتا رہا۔ بلجیم بھی کوئی سلطنت میں سلطنت ہے۔ یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو گئی اور گو نام کو نہ سہی مگر حقیقت میں کانگو فری اسٹیٹ پر قابض ہے۔ اور تو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس نے لڑکر اور خون بہا کر اپنا پیچھا چھڑایا اور آزادی حاصل کی تھی اور جس کے نام سے آزادی، امن، صلح، تہذیب و شائستگی کا بول بالا ہے افسوس ہے کہ اس میں بھی اس منحوس مرض کے آثار نظر آرہے ہیں۔ پچھلے دنوں بیٹھے بٹھلائے اسپین سے چھوڑ ہو گئی۔ تھوڑی سی لپاڈکی کے بعد اسپین تو بھاگتا نظر آیا اور اس آزادی کی ملکہ نے کیوبا، پورٹوریکو اور فلپائن کو مالِ غنیمت سمجھ کر بچا لیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو پھر باقی کیا رہا۔ بے چارہ افریقہ جسے برِ ظلمات کا خطاب عطا ہوا ہے ان شہ سواروں کی جولان گاہ بلکہ شکار گاہ ہے۔ جس قوم نے اس بدنصیب ملک سے غلامی کو مٹایا اس نے بہت بڑا احسان کیا۔ صرف اُن مظلوموں ہی پر نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ آدم پر۔ مگر یہ کیسی بھلائی اور کہاں کا احسان

ہے کہ اس کے بعد ہی اس غریب کا تِکّا بوٹی کر ڈالا اور اب تک نوچا نوچی اور لوٹ کھسوٹ مچ رہی ہے۔ اہلِ یورپ نے قریباً سارے ملک کے حصّے بخرے کر لیے ہیں اور جو ایک آدھ حصّہ باقی ہے وہ چند روز کا مہمان ہے ؞

یہ مرضِ متعدّی بھی معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ اور بڑے بڑے مدبّرینِ سلطنت تو خیر اس میں پھنسے ہی تھے اور پھنس رہے ہیں مگر تعجب اور سخت تعجّب یہ ہے کہ اچھے اچھے حکیم و فلسفی، فاضل مورّخ اور ادیب بھی اس کے اثر سے نہ بچے۔ یہ بزرگ بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ آنکھیں بند کر کے اسی ڈھرّے پر پڑ لیے اور اس دماغ سے جس میں اس مرض کے جرم گھس بیٹھے ہیں نئے نئے اصول اور مسائل اختراع کیے اور وہ طومار باندھا کہ ایک دنیا انھیں کی ہاں میں ہاں ملانے لگی اور حکمت و فلسفہ، تاریخ و تمدّن انھیں من گھڑت اصول پر قائم کر لیے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ

۱۔ تمدّن ہمارا، تہذیب ہماری، باقی سب وحشت اور جہالت ہے ؞

۲۔ بنی نوعِ انسان کی گوری چٹّی نسل (اہلِ یورپ و امریکہ) آب و ہوا کی خنکی، شکل و شمائل کی خوبی، رنگ و روپ کی صباحت، قوائے جسمانی و دماغی کی توانائی اور سلیم الطّبعی، عالی ہمّتی، مستقل مزاجی، جدّت طرازی اور مستعدی کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ دنیا کی رہ نما اور پیشوا بنے۔ بہ خلاف اس کے کالے پیلے انسان نما حیوان (اہلِ ایشیا و افریقہ) آب و ہوا کی گرمی، شکل و شمایل کی زبونی، رنگ و روپ کی تیرگی و زردی، قوائے دماغی و جسمانی کی کم زوری اور حدّتِ ذہن، پست ہمّتی، تلوّن، تقلید، کاہلی اور سریع الاعتقادی کے اعتبار سے اس لائق ہیں کہ اہلِ مغرب کے محتاج اور دستِ نگر رہیں ؞

۳۔ ہم (اہلِ یورپ) اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ دنیا پر حکومت کریں۔ اور تہذیب کی روشنی پھیلائیں اور اہلِ مشرق کے خلق سے یہ منشا ہے کہ وہ ہمارے غلام ہو کے رہیں اور ہم سے تہذیب و انسانیت کا سبق سیکھیں ؞

۴ - اس لیے ہمارا فرض ہو کہ جہاں کہیں ہم دیکھیں کہ جہالت کی ظلمت چھا رہی ہو۔ انصاف و عدل کا خون ہو رہا ہو یا حکومت وحشیانہ ہو وہاں ہم فوراً پہنچیں جہالت اور وحشت کا خاتمہ کر دیں۔ اور اُن اُصول پر حکومت کا ڈول ڈالیں جنھیں ہم بنی نوع انسان کے حق میں مفید اور بہتر سمجھتے ہیں ؀

یہ اُن لوگوں کے اصولِ متعارفہ ہیں۔ اور انھیں کو مدِّ نظر رکھ کر بڑے بڑے مورخ اور فلسفی دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے عجیب عجیب اور طرح طرح کے نتائج مستنبط کرتے اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ بن آئے کی بات ہو۔ وہ کیا ہم خود قائل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ان لن ترانیوں کو سُن کر مولانا حالی کا یہ شعر خود بہ خود زبان پر جاری ہو جاتا ہو ؎

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمھارے آگئے یاد احساں ہمیں

لیکن ایک اور لطف یہ ہو کہ اصول اصول میں فرق ہو۔ جن حالات میں جو اصول ہم پر عائد ہوتے ہیں اور جن کی بدولت ہمیں بہت کچھ کڑی سہنا پڑتی ہو وہی حالات بہ عینہ وہی موقع اگر کسی دولت یورپ میں آن پڑے تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور سب اصول و قواعد بالائے طاق دھرے رہ جاتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہو اسی بالغ نظر زمانہ شناس شاعر نے ؎

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہو زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

غرض ہمیشہ زمانے کا چلن اسی اصول پر رہا اور ہو کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ زبردست ہمیشہ غالب رہا اور نہ معلوم کب تک غالب رہے گا۔ جسے وہ انصاف کہے وہ انصاف ہو اور جسے وہ ظلم کہے وہ ظلم ہو۔ اور طرّہ یہ کہ مارے اور رونے نہ دے۔

یہی لوگ دنیا کے رہ نما اور مہذب کہلاتے ہیں اور یہی اس عالم کون و فساد کے چشم و چراغ ہیں۔ کتنے پتے کی بات کہی ہے کسی جاپانی نے کہ "اہلِ جاپان نے فلسفہ و ادب میں عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کر کے یورپ کے سامنے پیش کیں۔ لیکن یورپ اُنھیں ناشائستہ سمجھتا رہا۔ اس کے بعد انھوں نے رنگ بہ رنگ کے سوتی اور اونی اور ریشمی کپڑے اور چینی کے برتن اور آرایش و ضرورت کے سامان کے دل پسند نمونے تیار کر کے مغربی تہذیب کے نقادوں کی خدمت میں روانہ کیے۔ لیکن پھر بھی وہ کودن اور جاہل اور غیر مہذب ہی رہے۔ آخر انھوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور ڈیڑھ لاکھ روسیانِ ابیض کا گلا کاٹ ڈالا۔ اس پر اُن کو فوراً تہذیب و شائستگی کا تمغہ مل گیا اور وہ دفعتہً مہذب اقوام کے زمرے میں داخل ہو گئے"۔

اسی برادری کے ایک تاج دار کو جو اس منحوس مرض کا سب سے بڑا مریض ہے جو اس کی بدولت اکال الامم اور ہادم الاقوام بن گیا ہے اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے تھوڑے دن ہوئے اس پر اس بیماری کا دورہ پڑا۔ اس کی حالت غیر ہو گئی اور آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ اپنا لاؤ لشکر بّری اور بحری دل بادل فوج لے کر سمندروں کو کھندلتا ہوا ایک چھوٹی سی چٹان سے جا بھڑا۔ لیکن ٹکراتے ہی اُس کے جہاز پاش پاش ہو گئے۔ جوں جوں وہ غیظ و غضب میں آ کر اس پر حملے کرتا تھا اُتنا ہی اور زک اُٹھاتا اور جتنا کھسیانا ہو ہو کر جھپٹتا تھا اتنی ہی اور منھ کی کھاتا تھا۔ وہ شخص جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپ اُٹھتے تھے، جس کی نقل و حرکت کی جھوٹی افواہوں سے ایک عالم میں کھلبلی مچ جاتی تھی، جس کے رعب سے سلطنتوں کی قسمتیں بدل جاتی تھیں، جس کے ایک اشارے سے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جاتی تھی اور جس کی چیں جبیں تیغ و تفنگ سے زیادہ کارگر ہوتی تھی، جو آسمانی باپ کے مقابلے میں دنیا کا چھوٹا باپ کہلاتا تھا، وہ ایک چھوٹی سی ریاست کے ہاتھوں یوں تابڑ توڑ شکستیں کھائے اور ذلتیں اٹھائے،

خدا کی قدرت ہے۔ اس نامراد مرض نے آخر اس کے غرور کو خاک میں ملا کے چھوڑا اور اس کی ہوا و ہوس نے خود اُسے نادم کیا۔ وہ شخص جس نے دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لیے سفید علم بلند کیا تھا جس نے جنگ کے مٹانے اور صلح قائم رکھنے میں ایک عالم کو صلائے عام دی تھی اور دنیا میں ست جگ کا آغاز کرنا چاہا تھا معلوم ہوا کہ بڑا بہروپیا تھا۔ کیوں کہ اس نے محض دُوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے اور دُوسروں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانچ لاکھ بندگانِ خدا کا خون بہا دیا اور اربوں رُپے پر پانی پھیر دیا۔ لیکن غرور کا سر نیچا۔ اس کا وہ لشکرِ جرار جو "کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ" آندھی اور طوفان، گرج اور بجلیوں۔ کے ساتھ آیا تھا، دم بھر میں کافور ہو گیا۔ اور اس تاریکی کو پھاڑ کر مشرق سے وہ آفتاب طلوع ہوا ہے جس کی شعاعیں اہلِ ارض کے نشو و نما اور فروغ کا باعث ہو رہی ہیں ؂

روس کی شکست اس ذلت کے ساتھ اور جاپان کی فتح اس زور اور آب و تاب کے ساتھ ایک معمولی بات نہیں۔ یہ وہ انقلاب ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ اب زمانے نے نیا جنم لیا ہے۔ بہت سے پُرانے اصول مٹانے پڑیں گے۔ اور بہت سے نئے اصول بنانے پڑیں گے۔ بہت سے پُرانے سبق بھلانے پڑیں گے۔ اور بہت سے نئے سیکھنے پڑیں گے۔ واقعات کو اب دُوسری نظر سے دیکھنا ہو گا اور اصولِ تمدن و تاریخ میں دائرۂ نظر اور وسیع کرنا ہو گا۔ یورپ کا غرور اور تکبر اب قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اگر رہا تو وہ خود مٹ کے رہے گا۔ مشرق میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی ہے جس نے کلّہ بہ کلّہ یورپ کے قوی ہیکل دیو سے مقابلہ کر کے اسے زیر کیا ہے۔ اب اس سفید دیو کی لاش خون آلودہ خاک میں پڑی سسک رہی ہے وہ مرض جس کے ہاتوں یورپ لاچار تھا اور جس کے زور میں وہ بڑھ بڑھ کر قدم مار رہا تھا۔

اس کا علاج بحرالکاہل کے کنارے ایک جزیرے میں ہوا اور پیٹ پر عمل کرنے کے بجائے ڈاکٹر مکاڈو نے مریض کی چاند پر ٹیکا لگایا۔ کیوں کہ اس مرض سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور یہ وہی قدیم مشرقی علاج ہے جو صدیوں پہلے نمرود کے سر پر کیا گیا تھا۔ جاپان جیسا جنگ میں افضل رہا ویسا ہی صلح میں بھی۔ اور جنگ اور صلح اور شجاعت اور حلم دونوں کا سہرا اسی کے سر رہا۔ جس طرح اس کی بہادری اور حبّ الوطنی نے اہلِ عالم کو دنگ کر دیا تھا اس سے زیادہ اس کی فراخ حوصلگی اور صلح جوئی نے ساری دنیا کو ششدر و حیران کر دیا۔

یہ مریض کچھ تو اس دھچکے سے پہلے ہی ضعیف اور ناتواں ہو گیا تھا۔ ادھر اس کے گھر میں نفاق و جنگ و جدل کا طوفان بپا ہو گیا۔ چھوٹے باپ کے سعادت مند فرزندوں نے علمِ مخالفت بلند کر رکھا ہے۔ سارے ملک میں کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ وہ جبر و تعدی اور ظلم و ستم سہتے سہتے تنگ آگئے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس بات پر کمر باندھ لی ہے کہ یا تو آزادی حاصل کریں یا جان دے دیں۔ زار ہے کہ سہما جاتا ہے اور آئے دن نئی بلا اور مصیبت کا سامنا ہے۔ رعایا بغاوت پر تُلی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے سب آزادی آزادی پکار رہے ہیں۔ زار اور اُس کے وزیر بے کس اور بے بس ہیں۔ ہزار وعدے کرتے ہیں مگر یقین کسے آئے، ان کی نااہلی اور جابرانہ سلوک نے انھیں اس قابل نہ رکھا کہ ان کی بات باور کریں۔ فوج اور پولیس ہزار روکتی اور تھامتی اور گولیوں کا نشانہ کرتی ہے مگر وہ مادہ جو لاوے کی طرح زمین سے اُبل رہا ہے چند قزاقوں کی ہائیں اور چند قرابینوں کی ٹھائیں ٹھائیں سے کہیں رُکتا ہے؟ لیکن باوجود اس شریف مقصد کے جس کے پیچھے وہ جان و مال قربان کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اس عزت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو بہ حیثیت یورپین ہونے کے انھیں حاصل ہے۔ یعنی ظالم گورمنٹ کی مخالفت کرتے کرتے وہ اپنا رنج و غصہ ایک بے کس مشرقی قوم پر نکال رہے ہیں غریب

یہودی چُن چُن کے قتل کیے جا رہے ہیں۔ ان کے گھر بار لُٹ گئے۔ سیکڑوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو گئیں، خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ عراقی پر بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھے گورمنٹ کا وہ حال رعایا کی یہ کیفیت۔ اب اس ظالم مظلوم نما مریض یعنی زارِ روس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اپنی خوں خواری سے باز آئے۔ ظلم و تعدّی کے زمانے کو خیرباد کہے۔ اپنے جابرانہ اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ امن و صلح کا اعلان کرے۔ رعایا کو واجبی حقوق اور آزادی عطا کرے۔ ہاتھ کو روکے دل کو قابو میں رکھے اور اُس بُری گھڑی کو یاد کر کے پچھتائے جب جاپان پر دست درازی کا قصد کیا تھا۔

مگر اے بدنصیب مُلک تجھے بھی کچھ خبر ہے؟ خدا کی خدائی بدل گئی، زمین و آسمان بدل گیا، اصول و آئین بدل گئے اور تو ہے کہ ویسا ہی سکون پسند اور لدھڑ نظر آتا ہے جیسا پہلے تھا۔ گو تجھ میں بھی ایک سُرسُری سی پیدا ہو چکی ہے مگر کہاں یہ خفیف سی جنبش اور کہاں وہ قیامت کی حرکت کہ جس سے لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ ممالک میں تہلکہ پڑ گیا، سلطنتوں کی پالیسیاں بدل گئیں۔ تعلقات میں فرق آ گیا۔ حکومت کا رُخ پھر گیا۔ مغرب مشرق اور مشرق مغرب بن گیا۔ جو آگے تھے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اور جو پیچھے تھے وہ آگے بڑھ گئے اور ایسے بڑھے کہ زمین سے آسمان پر پہنچ گئے۔ جہاں وہ شجاعت اور شہرت کے ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں اور اپنی نورانی شعاعوں سے اوروں کو بھی منوّر کر رہے ہیں۔ اس کا ذکرِ خیر تیرے ہاں بھی ہے اور چرچے بھی بہت کچھ ہو رہے ہیں۔ لیکن خالی باتوں سے کیا حاصل۔ لڈو کہے سے کہیں منہ میٹھا ہوتا ہے؟ تجھ میں جوش نہیں تیرا دل بُجھا ہوا اور مردہ ہے۔ اور جوش ہو کہاں سے؟ اس لیے کہ تجھ میں حبِ وطن نہیں اور اس کے لیے ضرورت ہے تحریک کی اور تحریک بھی کیسی، جو برقی قوت کی طرح جوڑ جوڑ اور ریشے ریشے میں حرکت پیدا کر دے۔

ہمارے خیال میں کوئی تحریک اُس عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی جو ہمارے پڑوس میں ایک چھوٹے سے جزیرے والوں سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ ہماری عین خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسا انقلاب انگیز واقعہ ہماری زندگی میں واقع ہوا۔ جس کے طفیل ہم اپنے دماغ میں اس خیال کے لانے اور اپنی زبان سے یہ الفاظ کہنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ "جب ہمارے بھائی بند اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو اگر ہم دل پر رکھ لیں تو کیا کچھ بھی نہیں کر سکتے؟"

مگر اے بڑا لکاہل تجھ میں جوش اور حرکت پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ کیا وہ خوں خوار اور ہیبت ناک جنگِ روس وجاپان تیری آنکھوں کے سامنے پانی پت کے میدان پر پھر قائم کی جائے؟ کیا اُن بہادر محب الوطنوں کے سینوں میں سے دل نکال کر تیرے سامنے لائے جائیں کہ دیکھ اپنے ملک کی محبت میں یہ کیسے پھڑک رہے ہیں؟ یہ سب وہم وگمان ہے۔ ہاں البتہ ایک تدبیر ممکن ہے۔ ادب نے دُنیا میں بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ ہنستوں کو رُلانا اور روتوں کو ہنسا دینا دشمن کو دوست دوست کو دشمن بنانا اس کا ادنا کرشمہ ہے۔ بگڑی بات کا سنوارنا اور صاف سیدھی بات کا بگاڑ دینا اس کا ایک کھیل ہے۔ ایک ذراسی بات میں ہزاروں کا سر کٹوا دینا اور لاکھوں کا خون بہا دینا اور ایک کلمے میں پشتینی مخالفوں اور جانی دشمنوں کی جھٹ پٹ صلح کرا دینا اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تلواروں کا مقابلہ زبان سے اور نیزوں کا مقابلہ قلم سے کرتا ہے۔ اور اپنے زور سے جدھر چاہتا ہے دنیا کو کھینچ لے جاتا ہے لیکن اس میں بھی قسمیں ہیں اور درجے۔ نظم ہے، نثر ہے اور ان کی بھی بیسیوں قسمیں ہیں اور اس پر اپنی اپنی طبیعت اور اپنا اپنا دماغ۔ لیکن ان سب میں موثر اور کارگر اگر کوئی ہے تو ڈراما ہے۔ جو دنیا کی مختلف حالتوں اور انسان کی مختلف کیفیتوں کو اس خوبی سے دکھاتا ہے کہ نقل میں اصل کا مزہ آجاتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں وہ مزہ نہیں آتا ہے جس سے معلوم

ہوتا ہو کہ انسان بالطبع نقل کرنے اور نقل دیکھنے سے خوش ہوتا ہو۔ مثلاً وہی شے یا بات جو روزانہ دیکھنے یا سُننے میں آتی ہو جب ہم کسی تھیٹر میں اس کی نقل ہوتے دیکھتے ہیں تو جتنی وہ اصل کے مطابق ہوتی ہو اسی قدر اس میں لطف آتا ہو۔ غرض رنج والم، عیش و عشرت، نکہت و اقبال، کمال و زوال سب کی تصویریں سامنے کھنچ جاتی ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہو کہ درحقیقت یہ واقعات ہمارے سامنے گزر رہے ہیں۔ جو لوگ ڈراما کرنے والے ہیں اُن کی حالت صورت، بول چال، لباس سب کے سب ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جن باتوں کو ہم اپنی زبان یا صرف قلم اور فصاحت کے زور سے بار بار جتانا چاہتے ہیں وہ سب مرحلے ڈرامے کے ایک ایکٹ میں طی ہو جاتے ہیں۔ جہاں انسان کی اور تمام قوتیں قاصر ہیں وہاں اس کا جلوہ برقی لہر کا کام کرتا ہو۔ عالم، جاہل، بچے، بوڑھے سب پر اس کا اثر جادو کا سا ہوتا ہو۔ نصیحت بہت ناگوار اور تلخ ہوتی ہو لیکن یہاں آکر ایسی شیریں اور پُر لطف ہو جاتی ہو کہ جو اس سے بھاگتے تھے وہ خوشی خوشی اس کے سُننے کے لیے دوڑے آتے ہیں۔ کوئی واعظ، کوئی فصیح مقرر یا لکچرار اپنے کلام اور فصاحت سے اتنا اثر نہیں ڈال سکتا جتنا ڈرامے کے چند ایکٹ۔ خصوصاً جب واقعات ایسے حیرت افزا اور جوش انگیز ہوں جن سے قوموں کی قوموں میں انقلاب پیدا ہو گیا ہو، خیالات کی ترتیب بدل گئی ہو۔ دلوں میں اُمنگ اور اُمنگوں میں اُپج پیدا ہو گئی ہو۔ اور سونے میں سہاگہ یہ کہ ان واقعات کا لکھنے والا ایسا ہو جس کے قلم میں زور اور تاثیر ہو اور جسے نظم و نثر میں یکساں کمال ہو:

اس ڈرامے میں اقبال و ادبار کی سچی تصویریں کھینچی ہیں۔ ایک طرف حبِ وطن، شجاعت، جوش اور غیرت کا زور ہو اور دوسری طرف غرور و تکبر، لاف و گزاف، ذلت و نکبت کے آثار ہیں۔ غرض جنگ کی ابتدا سے انتہا تک سارے واقعات ڈرامے کے پردے میں اس خوبی اور بے تکلفی اور پُر زور اور پُر جوش نظم و نثر میں تحریر کیے گئے

ہیں کہ ممکن نہیں کہ آدمی پڑھے اور اس کے دل میں جوش اور غیرت موج زن نہ ہو۔ محبت جو حقیقی زندگی میں بھی اسی طرح جلوہ فگن ہوتی ہے جیسے فسانوں اور ڈراموں میں، وہ اس خوں ریز جنگ وجدل اور کشت و خون میں بھی عجیب طرح سے اپنی جھپکی دکھا گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا قلب ہی بجائے خود ایک عالم ہے جس میں ہزاروں کیفیات اور جذبات بستے ہیں۔ اور ایک ذرا سے اشارے پر اپنا کرشمہ دکھا جاتے ہیں۔ کیسا پُرزور ہونا چاہیے وہ قلم جو ان تمام کیفیات کو اس طرح بیان کرے کہ تصنع کا نام نہ ہو؟

مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جنگ وجدل، معرکہ آرائی، شجاعت و تہوّر، خدعہ و تدبّر، گھمسان و خوں ریزی، حسن و عشق کی گھاتیں، حریفوں کی چالیں، شکست و فتح، صلح و امن ان سب کارناموں کا ایسا صحیح خاکہ کھینچا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم خود اس میں شریک ہیں۔ علاوہ اس کے یہ اُردو میں ایک بے نظیر اور انوکھی تصنیف ہے۔ مصنف نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جس کی ملک کو ایسے وقت میں سخت ضرورت تھی۔ اس سے ہمیں عبرت اور سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ایک چھوٹی سی قوم بہت تھوڑے عرصے میں ایسی ترقی کرلے کہ بڑی بڑی ترقی یافتہ اقوام دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں۔ ایک پدّا شہ باز کا شکار کرے ایک پودنا دیو کو پچھاڑ لے۔ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ پڑھ جائیں اور ترقی کا خیال پیدا نہ ہو؟ ہمیں جنگ کی ضرورت نہیں، جہاد کی حاجت نہیں، ہاں ہے تو جہادِ اکبر کی ضرورت ہے۔ دیو نفس کو پچھاڑیں اس کے کھوٹ چُن چُن کے نکالیں۔ خود غرضی، نفاق اور سُستی و کاہلی کو پاس نہ آنے دیں اور ایک ایسی سلطنت کے زیرِ عاطفت جو امن جو، صلح پسند اور ہم درد ہے، ترقی کی راہیں نکالیں، زمانے کی رفتار کو سمجھیں اور اس بامِ رفعت پر چڑھنے کی کوشش کریں جہاں پہنچے بغیر ممتاز ہونا محال ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ وہ ملک جو ہمیشہ سے علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں مشہور اور

ضرب المثل ہے ہماری کوشش اور اتحاد سے اپنی قدیم غیرت اور عظمت کو پھر حاصل کرلے؟ ممکن ہے مگر کب؟ جب ہم میں دل ہو، دل میں عزت، ہمت اور جوش ہو اور جوش میں قیام اور ثبات ہو: ع

گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

حیدرآباد دکن
۱۵ر نومبر سنہ ۱۹۰۵ء

---

## مقدّمۂ

# 'جنگ نامۂ سیّد عالم علی خاں'

فرخ سیر کے عہد سے لے کر محمّد شاہ بادشاہ کے کچھ زمانے تک سیّد عبداللہ خاں (قطب الملک) اور سیّد حسین علی خاں (امیر الامرا) ساداتِ بارہ سلطنت کے مالک و مختار تھے۔ یہ بادشاہ گر تھے اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پُتلی تھے۔ نواب نظام الملک (آصف جاہ) سے ان کی اَن بَن ہوگئی تھی، اس لیے دربارِ شاہی سے دُور رکھنے کے لیے رفیع الدّرجات کے عہد میں ان کو صوبہ داریٔ مالوہ پر مامور کیا گیا۔ نظام الملک بہادر نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی اور بادلِ ناخواستہ تعمیلِ حکم کی اور وہاں کے نظم و نسق میں مصروف رہ کر اس خطّے کو مفسدوں سے پاک کیا۔ چوں کہ سادات کو نظام الملک بہادر کے بڑھتے ہوے اقتدار اور کثرتِ فوج کی وجہ سے اندیشہ ہوگیا تھا۔ حسین علی خاں نے نظام الملک کو لکھا کہ دکن کے صوبوں کے انتظام کے لیے ہمارا ارادہ ہے کہ ہم صوبۂ مالوہ میں رہیں، آپ اپنے لیے اکبر آباد، الہ آباد، ملتان، برہان پور کے صوبوں میں سے کوئی ایک صوبہ انتخاب کرلیں۔ نظام الملک اس سے بہت مکدّر ہوئے اور اس کا جواب کسی قدر درشتی کے ساتھ دیا۔ امیر الامرا اور قطب الملک نے نظام الملک کے وکیل کو خلوت میں بُلا کر سخت سُست کہا۔ جب اس کی خبر نظام الملک کو پہنچی تو وہ آمادۂ پیکار ہوگئے۔

کہتے ہیں کہ اس میں محمد امین خاں کے توسط سے شاہی اشارہ بھی تھا۔ غرض انھوں نے اپنے رفقا کو ساتھ لے کر دکن کی جانب کوچ کیا اور نربدا کو عبور کیا (وسط جمادی الاخریٰ سنہ ۱۱۳۲ھ مطابق مئی سنہ ۱۷۲۰ء) جب امیر الامرا کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے دلاور علی خاں بخشی، راجا بھیم سنگھ اور راجا گنجک سنگھ (ضلع دار) کو نظام الملک کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ نظام الملک کا ستارہ عروج پر تھا قلعۂ اسیر اور قلعۂ برہان پور بغیر جنگ وجدال کے ہاتھ آئے اور انور خاں صوبے دار برہان پور اور عوض خاں صوبے دار برار اور رنبھا سردار مرہٹہ اور بہت سے زمیں دار اور پٹھان ان کے شریکِ حال ہو گئے۔ جب دلاور علی خاں کا لشکر کوچ کرتا ہوا برہان پور سے جانبِ مشرق چودہ کوس پر پہنچا تو نظام الملک نے اپنا لشکر اس کے مقابلے کے لیے غیاث خاں کی سرکردگی میں روانہ کیا، لڑائی میں دلاور علی خاں اور اس کے دونوں راجا رفیق مارے گئے (۱۹ جون سنہ ۱۷۲۰ء)

سیّد عالم علی خاں بارہہ جس کی عمر بیس سال کی تھی (دیکھو شعر ۴۶) فرخ سیر کے وزیر سیّد عبداللہ قطب الملک کا بھتیجا اور متبنّیٰ تھا۔ وہ اپنے دوسرے چچا سیّد حسین علی خاں کے دہلی چلے جانے پر (دسمبر سنہ ۱۷۱۸ء) دکن کے چھ صوبوں کا صوبے دار یا نائب صوبے دار مقرر کیا گیا تھا (شعر ۳۶) اسے نظام الملک کے مقابلے کے لیے بھیجا تو وہ فوج لے کر فردا پور میں جو اورنگ آباد سے ۶۰ میل کے فاصلے پر برہان پور اور اورنگ آباد کے درمیان واقع ہے، خیمہ زن ہوا۔ نظام الملک برہان پور سے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ جب نظام الملک کے لشکر نے دریائے پورنا سے عبور کیا (۲۰ جولائی سنہ ۱۷۲۰ء) تو عالم علی خاں ۵ شوال سنہ ۱۱۳۲ھ کو معہ اپنے رفقا نہور خاں (دیکھو شعر ۳۱۶) غالب خاں (شعر ۲۵۳۔ ۳۰۵) عمر خاں (۱۶۸، ۲۶۳، ۳۷۴) میٹھے خاں (شعر ۱۶۸، ۲۵۳، ۴۵۷)

محمدی بیگ (شعر ۱۶۸، ۲۵۴) امین خاں (۱۲۵، ۲۵۶، ۲۵۹) غیاث الدین خاں، خواجہ رحمت اللہ، فدوی خاں وغیرہ اور سرداران دکن و مرہٹہ مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ نظام الملک نے مرحمت خاں کو اپنے فرزند غازی الدین خاں کی معیت میں ہراول کیا اور عبدالرحیم خاں، رعایت خاں، غیاث خاں، اختصاص خاں وغیرہ کو میمنہ و میسرہ پر مقرر کر کے خود مع عوض خاں قول لشکر میں متمکن ہوئے ؛

عالم علی خاں بڑی مردانگی اور شجاعت سے لڑا اور اگرچہ اس کا سارا بدن زخموں سے چُور تھا مگر اس کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا تھا۔ آخر اسی طرح لڑتے لڑتے یہ بہادر نوجوان اس دنیا سے کوچ کر گیا ؛

اس کے بعد سیّدوں کے خاندان نے دولت آباد میں پناہ لی (دیکھو شعر ۴۰۱) خافی خاں کی تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہی ؛

مجھے اس جنگ نامے کے تین نسخے دست یاب ہوئے، ایک نسخہ میرا ذاتی ہی اسے (ا) سے تعبیر کیا گیا ہی۔ دوسرا نسخہ مجھے مولوی عبدالحمید صاحب وکیل کنٹر نے عنایت فرمایا جو (ب) سے موسوم ہی اور تیسرا وہ نسخہ ہی جو مسٹر ولیم آردن ( William Irvine ) نے مہاراجا بنارس کے کتب خانے سے حاصل کیا اور رسالۂ انڈین اینٹی کیوری' (Indian Antiquary of India) بابت ماہ جنوری و مارچ سنہ ۱۹۰۴ء میں مع انگریزی ترجمے کے شایع کیا۔ یہ نسخہ (ج) ہی ؛

مسٹر آردن کا نسخہ اوّل و آخر سے ناقص ہی۔ عبدالحمید صاحب کے نسخے میں شروع کے کچھ اشعار غائب ہیں، میرا نسخہ مکمّل ہی اور اس کی ترتیب اور تحریر دوسرے نسخوں سے بہتر ہی اس لیے میں نے اس نسخے کو بنیاد قرار دیا ہی، البتّہ دو ایک جگہ ایک ایک مصرعہ غائب ہی اور بعض مقامات پر کوئی کوئی لفظ رہ گیا ہی، کہیں کہیں مصرعہ پورا کرنے کے لیے قیاس سے جو لفظ بڑھا دیے ہیں انھیں توسین

میں لکھ دیا ہے۔ دُوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلافِ نسخ بھی ظاہر کر دیا ہے۔ تینوں نسخوں میں اشعار کی کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے، جو اشعار نسخۂ (۱) میں نہیں اور دوسرے نسخوں سے اضافہ کیے گئے ہیں ان پر علامت × لگا دی گئی ہے اور جن اشعار پر یہ × نشان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دُوسرے نسخوں میں نہیں ہیں ؎

مسٹر ولیم آردن نے اس کا مصنّف "سودشت" بتایا ہے انھیں اپنے نسخے کے ایک شعر سے دھوکا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو شعر ۴۱۴، ان کے نسخے میں اس شعر کا دُوسرا مصرع یوں ہے: ع

"سودشتا یہ کیا کیا ستم ہائے ہائے"

سودشتا کے الف کو ندائیہ اور "سودشت" تخلّص قرار دیا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ لفظ "دستا" ہوگا کاتب نے غلط لکھ دیا۔

دُوسرے نسخوں میں یہ مصرع اس طرح ہے: ع

"سو ایسا ستم یو ستم ہائے ہائے"

یا یہ ممکن ہے کہ ایسا کو کاتب دشتا لکھ گیا۔ کاتبوں سے یہ بعید نہیں۔ اب انھیں یہ فکر ہوئی کہ اس نظم میں فارسی، عربی کے لفظ بہ کثرت ہیں۔ یہ ضرور کسی مسلمان کی لکھی ہوئی ہے اور "سودشت" ہندی لفظ ہے تو انھوں نے یہ تاویل کی کہ اکثر مسلمان مصنّف جب کوئی چیز ہندی میں لکھتے تھے تو اس میں تخلّص بھی ہندی رکھتے تھے ؎

آردن صاحب کے منشی نے مصنّف کو پنجابی بتایا ہے مگر خود وہ اُسے بالائی دواب کا خیال کرتے ہیں جہاں کے ساداتِ بارہ رہنے والے تھے۔ لیکن اندرونی شہادت پر غور کرنے کے بعد انھوں نے یہ قیاس قایم کیا کہ مصنّف دکنی ہے اور چوں کہ قلی اس زمانے میں زندہ تھا اور سنہ ۱۱۳۲ھ میں دہلی میں تھا اور یہ واقعات بھی

اسی سنہ میں واقع ہوے اس لیے غالباً اس کا مصنف دکنی ہے۔

مسٹر آروِن کا یہ قیاس بالکل صحیح ہے کہ مصنف دکنی ہے، زبان صاف بتاتی ہے، لیکن مصنف کے متعلق ان کا قیاس غلط ہے، اس میں وہ مجبور تھے وہ اپنے نسخے کو کامل سمجھے ہوے تھے، حال آں کہ آخر سے کئی شعر غائب تھے۔ مصنف نے خود آخر میں اپنا نام بتا دیا ہے۔ اگر یہ شعر ان کے نسخے میں ہوتا تو انھیں یہ اُلجھن نہ ہوتی۔

یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جو نام اور سنین آئے ہیں وہ تاریخ کی رُو سے بالکل صحیح ہیں۔ مصنف کو عالم علی خاں سے ہم دردی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ حق بہ جانب ہے۔ اس سن میں جس دلیری اور جیوٹ سے لڑ کر اس نے جان دی ہے وہ بے شبہ قابلِ تعریف ہے۔ یہاں تک کہ نظام الملک کے طرف دار مورخوں نے بھی اس کی بہادری کی تعریف کی ہے۔ نظم سادہ ہے اور کہیں تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیا۔ بعضے اشعار موثر بھی ہیں خصوصاً جب عالم علی خاں ماں سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں اور رخصت ہوتے ہیں یا جب عالم علی خاں کے مرنے کی خبر آتی ہے اور ماں اس کا ماتم کرتی ہے۔

## مقدّمہ

# کتاب حیاتِ حضرت امیر خسروؒ

(مؤلفہ خان بہادر تقی محمد خاں)

اس سرزمین سے حضرت امیر خسروؒ جیسا صاحبِ ذوق ذی کمال جامع صفات شخص اب تک پیدا نہیں ہوا وہ فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ ہر صنفِ سخن پر قادر ہیں۔ ان کے فارسی اشعار شمار سے باہر ہیں۔ استادِ غزل شیخ سعدیؒ مانے ہوئے ہیں لیکن اگر کسی کو ان کی ہمسری کا دعوا ہوسکتا ہے تو وہ حضرت امیر ہیں۔ ان کے کلام کی فصاحت اور روانی اور خاص کر سوز و گداز جس میں تصوّف کی چاشنی ہے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یوں تو سب اہلِ زبان کو اپنی زبان کا غرّہ ہوتا ہے لیکن اہلِ ایران اس معاملے میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ کسی غیر ایرانی کے کلام کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن حضرت امیر کے سامنے انھیں بھی جھکنا پڑا۔

تذکرہ نویسوں اور امیر کے سوانح نویسوں نے ان کے حالات اور کلام اور تصانیف کے تبصرے میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ وہ فنِ موسیقی کے بھی استادِ کامل تھے۔ اور ضمنی اور سرسری طور پر اس کمال کے متعلق بھی لکھا ہے کہیں کسی نے تفصیل سے یہ نہیں لکھا کہ آپ نے اس فنِ لطیف میں کیا کیا اختراعات اور ایجادات کیں۔ اور

ہندی اور ایرانی موسیقی کی ترکیب و تدوین میں کون سے نئے نئے راگ ایجاد کیے اور کون کون سے ساز آپ کی طبع ایجاد آفریں کے رہینِ منت ہیں۔ غرض کہ حضرت امیر کے اس کمال کی تفصیل سے تمام تذکرے اور ان کی سوانح خالی ہیں معلومات کا فقدان اور فن کی دشواریاں ایسی ہیں کہ کسی کو اس پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ سعادت خان بہادر نقی محمد خاں صاحب کی قسمت میں لکھی تھی۔ انھوں نے کمال محنت اور تحقیق سے اس دشوار کام کو انجام دیا اور ان تمام قاعدوں سے استفادہ کیا جن تک دست رس ممکن تھی بلکہ ان تحریروں اور تصانیف تک بھی رسائی حاصل کی جو اب تک نظر سے پوشیدہ تھیں۔ اور یہ ظاہر دست رس سے باہر خیال کی تھیں۔

فاضل مصنف نے اپنی سعی کو صرف کتابوں کے مطالعے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ماہرینِ فن سے مشورہ کر کے ہر نکتے کو سمجھا اور لکھا ہے۔ اس جستجو اور تحقیق میں انھوں نے اس فن میں اتنی مہارت خود ضرور حاصل کر لی ہوگی جو اس بڑھاپے میں ان کی تفریح طبع کے لیے اچھا خاصا لطیف شغل کا باعث ہو جائے گا جو " ہم حظِ نفس ہست و ہم قوتِ روح "

فاضل مصنف کی سعئ طبع سے امیر کے کمال کا وہ حصہ تو روشنی میں آگیا جو اب تک تشنۂ تکمیل تھا۔ اب صرف ایک آرزو رہ گئی ہے جس کے پورا ہونے کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی وہ امیر کا ہندی کلام ہے اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ہندی میں بھی بہت کچھ کہا ہے ان کے فارسی کلام میں بہت سے ہندی لفظ بے تکلف استعمال میں ہیں اور خود اپنے دیوان 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ " جزوے چند نظم ہندی نیز نذر۔ دوستان کردہ شدہ است" لیکن افسوس اب تک ان کا ہندی کلام دست یاب نہیں ہوا۔ پہیلیاں پہیلیاں، ان ملیاں،

مکرنیاں، دوہے وغیرہ ان کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کی کوئی سند نہیں کہ یہ انھیں کے ہیں۔ ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ ان میں سے بعض انھیں کے ہوں لیکن صدہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے الفاظ اور زبان کی ترکیب میں بہت کچھ فرق پیدا ہوگیا ہے۔ چناں چہ ان میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں جن کی زبان اس وقت کی زبان نہیں معلوم ہوتی۔ اگر امیر کا ہندی کلام مل جاتا تو ہماری زبان کی بعض گتھیاں سلجھ جاتیں۔

---

# مقدمہ بر کتاب تجرّد اور ازدواج

(مصنفہ سیّد محمد نقی صاحب)

میرے دوست سید محمد نقی صاحب نے ایک ایسے نازک مسئلے پر بحث چھیڑی ہے جس کے متعلق یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص اس کے متعلق ایک رائے رکھتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ اختلاف ہے۔ مگر جس قدر یہ مسئلہ نازک ہے اسی قدر دل چسپ اور اہم بھی ہے۔ اس لیے جتنی چھان بین اس میں کی جائے فائدے سے خالی نہ ہوگی۔ انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ "اس پر بطور تمہید کے تم بھی کچھ لکھو"۔ میں نے عذر کیا اور کہا کہ "بھئی تمھیں تمہید اگر لکھانی ہو تو کسی ایسے سے لکھواؤ جو ان معاملات کی اونچ نیچ سے واقف ہو"۔ میرا لکھنا تو ایسا ہی جیسے کوئی ساحل پر کھڑا ان بد نصیب لوگوں کا حال لکھے جن کا جہاز عین منجدھار میں پہنچ کر معرضِ طوفان وبلا میں آگیا ہے۔ "آپ بیتی ہیں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی میں کہاں" یہ سن کر بھی ان کا اصرار کم نہ ہوا۔ مجبوراً لکھتا ہوں۔ اور لکھا کیا ہوں احمد کی ٹوپی محمود کے سر رکھے دیتا ہوں۔

کئی سال ہوئے امریکہ کے ایک مشہور اخبار نے اشتہار دیا کہ "جو عورت

خاوند کے قابو رکھنے کی سب سے بہتر تدبیر بتائے گی اُسے دو ہزار سینٹ (بیس ڈالر) انعام دیا جائے گا۔" کوئی ڈیڑھ سو عورتوں نے خط لکھے۔ اُن میں سب سے بہتر جو جواب سمجھا گیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"جہاں محبّت ہے وہاں قابو میں رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں اور جہاں محبّت نہیں وہاں دنیا کی ساری تدبیریں بے کار ہیں۔ مرد اپنے گھر میں راحت چاہتا ہے اور پیاری بیوی خوب جانتی ہے کہ یہ عیش اسے کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ مکر و حیلے سے نہیں بلکہ خلوص اور سچائی سے اور ایسی ترکیبوں سے جسے عورت ہی خوب سمجھتی ہے۔ کچھ ضرور نہیں کہ وہ اپنی ذرا ذرا سی تکلیفیں اُس سے بیان کرے بلکہ وہ خود بہ خود انھیں دریافت کرلے گا اور بہ خوشی اس میں ساتھ دے گا۔ اُسے لونڈی بن کر نہیں رہنا چاہیے اور نہ کوئی سچّا مرد اسے پسند کرے گا بلکہ سچی بیوی بن کر رہے اس کی خوشی میں شریک ہو اس کی ترقّی سے فخر و مسرّت ہو اور دکھ درد میں ساتھی رہے، اور وہ محبّت بھری صحبت اور دل کا چین مہیّا کرے جس کے لیے مرد کو بیوی کی تلاش تھی۔

جب باہم کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اگر وہ سچ پر ہے تو اس پر قائم رہے جب جھگڑا رفع دفع ہو جائے گا تو خاونداس کی پہلے سے زیادہ عزّت کرے گا۔

میاں بیوی، بچّے نہیں ہیں کہ وہ مکر و حیلے اور دم دلاسے سے اس رشتے کو قائم رکھیں۔ شرم ہے اس عورت کے لیے جو محض مرد کو قابو میں رکھنے کے لیے بنتی سنورتی اور بناؤ سنگار کرتی ہے۔ خلوص اور سچائی سب سے بڑی چیز ہے۔ اور جو عورت اپنے مرد کو قابو میں رکھنا چاہتی ہے اُسے چاہیے

کہ پہلے محبت پیدا کرے"۔

یہ ایسی جچی تلی رائے ہے کہ میں سمجھتا ہوں اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ خلوص اور محبت کامیابی کا راز ہے: ؎

ہوتے ہیں غیر اپنے بنتے ہیں رام وحشی
اُلفت کی بھی جہاں میں کیا حکم رانیاں ہیں

لیکن اُس سے پہلے انتخاب کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ جن ملکوں میں انتہا سے زیادہ آزادی ہے اور جہاں انتہا سے زیادہ پابندی ہے اس کا رونا دونوں جگہ یکساں ہے۔ مگر ہمارے ملک میں تو غضب یہ ہے کہ ماں باپ لڑکے لڑکی کی کچھ پیش نہیں جانے دیتے وہ آنکھ بند کر کے انھیں کنوئیں میں دھکیل دیتے ہیں اور جب گرنے کی دھم سے آواز آتی ہے تو اس پر تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے اور خوشی مناتے ہیں اور اس قدر غل غپاڑا مچاتے ہیں کہ اُن "کشتگانِ خنجرِ تسلیم" کی آواز تک نہیں سُنائی دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ ماں باپ کی رضا اور مشورہ ضروری ہے، مگر لڑکے لڑکی کی رائے مقدم ہے کیوں کہ ان کا تو عمر بھر کا ساتھ ہے ماں باپ کا کیا ہے، چند روز تک رنگ رلیاں منا کے الگ ہو گئے۔ اگر خدانخواستہ موافقت نہ آئے تو عمر بھر ماں باپ کی جان کو دعا دیتے رہیں گے۔ ان کی اوقات تو الگ خراب ہوئی اور اولاد جدا بگڑی۔ ایسی شادی درحقیقت خانہ بربادی ہوتی ہے۔ اگر شادی لڑکے یا لڑکی کی رائے سے ہوئی اور پھر اَن بن رہی تو اس کا الزام انھیں کے سر رہے گا اور اپنے کیے کو خود بھگتیں گے۔

بعض صاحب محض اس خیال سے کہ آپس میں اُن کی دوستی اور محبت ہے، اس رشتے کو مستحکم کرنے کے لیے اپنے لڑکے لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ اور بعض تو انتہا کر دیتے ہیں کہ بچوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی آپس میں یہ عہد کر لیتے

ہیں کہ اگر ایک کے لڑکا دوسرے کے لڑکی ہوں تو بڑے ہو کر آپس میں ان کی شادی کر دی جائے گی۔ عورتوں میں خاص کر یہ مرض زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ شادی تو بڑے چاؤ چو چلے سے ہوتی ہے، مگر نتیجہ اکثر اچھا نہیں ہوتا۔ عقل کے دشمن یہ نہیں سمجھتے کہ ہم میں اگر محبت ہے تو کیا ضرور ہے کہ ہماری اولاد میں باہم ایسی ہی محبت ہو۔ غرض یہ کہ قسم قسم کے رواج رائج ہیں جو اصلاح طلب ہیں۔

شادی کی ابتدا جبر سے شروع ہوئی۔ قدیم زمانے میں دلھن کا اُڑا لے جانا ایسا ہی تھا جیسے مال و اسباب اور مویشی کا لوٹ مار کر لے جانا۔ جس کے آثار اب بھی شادی کی مختلف رسوم اور ماں باپ کی زبردستی میں پائے جاتے ہیں۔ اور لوگ اسی لکیر کو پیٹے چلے آتے ہیں۔ دو شخصوں کو مجبور کرنا کہ آپس میں محبت کرو ایک متضاد بات ہے۔ جہاں جبر ہے وہاں محبت کہاں۔ اور جہاں محبت ہے وہاں جبر کی حاجت نہیں۔ ممکن ہے کہ بعضے یہ کہیں کہ اکثر بعد میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں اور اتفاقات پر بھروسہ کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔

ہمارے دوست نے تجرد پر خوب بحث کی ہے جو زمانے کے مناسب ہے۔ حساب کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ مجرد لوگ بہ نسبت متاہل کے زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔ ان کی نسبت (۵۶) اور (۴۰) فی صدی کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ شادی کرنے کے قابل نہیں وہ کبھی اس کی ہوس نہ کریں۔ مثلاً بعض بیماریاں ایسی ہیں کہ جن کے ہوتے شادی کرنا (مرد ہو یا عورت) سخت مضر ہے خود اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے۔ یا اس کے علاوہ جو لوگ کم زور دل و دماغ کے ہیں انھیں بھی شادی سے اجتناب لازم ہے۔ چناں چہ حال میں آئرلینڈ میں مجانین کی تعداد بہت بڑھ گئی تو اسباب جنون کی تحقیق کی گئی تو اس میں ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کم زور دل و دماغ کے لوگ جو شادی کر لیتے ہیں ان میں سے اکثر

مجنون ہو جاتے ہیں اور بالفرض اگر مجنوں نہ بھی ہوں تو یہ کیا کم ہے کہ خود بیمار رہیں اور دوسروں کو بیمار رکھیں اور چلتے وقت دنیا میں ایسی یادگار چھوڑ جائیں جو خود اپنے لیے نیز دوسروں کے لیے وبال ہو۔ یہی حال بچپن اور بڑھاپے کی شادی کا ہے۔ پہلی ایک خوف ناک کھیل ہے اور دوسری ایک شرم ناک ہوس ہے۔ نتیجے دونوں کے خراب ہیں ایک وقت سے اول ہے اور دوسری وقت کے بعد۔ اصل وقت شباب کا ہے جس کی بچے کو خبر نہیں اور بوڑھا جسے کھو چکا ہے اور مڑ مڑ کے حسرت کے ساتھ دیکھتا ہے شادی کر کے جوان ہونا چاہتا ہے مگر جوانی کی بات کہاں ؎

ہوس پختن از کودکِ ناتمام	چناں زشت نہ بود کہ از پیرِ خام

غرض یہ مضمون مرد، عورت، بیاہے، بے بیاہے، ریفارمر اور قدامت پسند سب کے لیے یکساں دل چسپ ہے اور امید ہے کہ بڑی توجہ کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ کیوں کہ اس میں ایک ایسے نوجوان کے خیالات ہیں جس کی نظر تہذیب کے پرانے اور نئے دَور دونوں پر ہے اور ہر بحث میں اعتدال سے تجاوز نہیں کیا ہے۔؛

---

# مقدمہ

## فرہنگ اصطلاحاتِ کیمیا مرتبہ انجمن ترقی اردو (پاکستان)

اس برعظیم (پاک و بھارت) میں سینکڑوں زبانیں ہیں لیکن ان میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں ایک صدی سے اصطلاحات علمی کا مسئلہ زیر بحث ہے اور اصطلاحات وضع کرنے کے اصول قائم کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کے تحت اصطلاحات وضع کی گئی ہیں اور علمی کتابوں اور مضامین میں استعمال ہوئی ہیں۔

سب سے اول یہ کام قدیم دہلی کالج میں ہوا جہاں تمام قدیم اور جدید علوم کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور بہت سی کتابیں جدید علوم کی ترجمہ یا تالیف کی گئی ہیں، اسی زمانے (۱۸۴۰ء) میں دکن میں نواب شمس الامراء کی زیرِ نگرانی سائنس کی بعض کتابیں سنہ شمسیہ ترجمہ یا تالیف ہوئیں اور ان میں علمی اصطلاحات کا اجتماع ہوا۔ ان کے علاوہ بعض اداروں نے بھی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کی ضمن میں کچھ کچھ یہ کام کیا لیکن مستقل اور منظم طور پر یہ خدمت انجمن ترقی اردو اور خاص کر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے انجام دی، جامعہ عثمانیہ میں ہر علم و فن اور خصوصاً جدید علوم کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ اور تالیف کی گئیں اور ہزارہا اصطلاحات وضع کرکے انھیں مروج کیا گیا۔ یہ ایسا بے بہا ذخیرہ ہے جو ہماری قومی زبان کی ترقی و تکمیل کے لیے دلیل راہ کا کام دے گا۔

اردو زبان میں اصطلاحات کا بنانا زیادہ دشوار نہیں، ایک تو یہ کہ اردو کا دامن بہت وسیع ہے اور اس میں الفاظ بنانے اور غیر زبان کے الفاظ قبول

کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ دوسری بڑی خوبی اس زبان کی یہ ہے کہ جس طرح یہ عربی زبان سے مستفید ہوسکتی ہے جو تصریفی ہے اسی طرح یہ فارسی اور ہندی زبانوں سے فائدہ حاصل کرسکتی ہے جو ترکیبی ہیں۔ تصریفی زبان میں مادہ کے ذرا ذرا سے تغیر اور ردّ و بدل سے خوب صورت اور مختصر نئے الفاظ بن جاتے ہیں۔ ترکیبی زبانوں میں لاحقوں اور سابقوں کے اضافہ سے نیز دو لفظوں کے جوڑنے سے (بتغیر اور بلا تغیر) نئے لفظ بنا لیے جاتے ہیں۔ اردو کا تعلق ان دونوں قسم کی زبانوں سے ہے اور اصطلاحات بنانے میں وہ ان کی خصوصیتوں سے بلا تامل فائدہ اٹھا سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ادب میں ان سے کام لیا گیا ہے۔ اصطلاحات وضع کرنے میں اُن سے زیادہ آزادی سے کام لے سکتے ہیں۔

اصطلاحات کے وضع کرنے میں انجمن نے یہ اصول قرار دیے ہیں:۔

۱۔ اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ماہرانِ زبان اور ماہرانِ فن دونوں کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ وضع اصطلاحات میں دونو پہلوؤں کا خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے سانچے میں بھی ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے بھی ناموزوں نہ ہو۔

۲۔ اصطلاحات بنانے کے لیے ان تمام زبانوں سے الفاظ لے سکتے ہیں جو ہماری زبان کا لازمی جز ہیں یعنی عربی فارسی اور ہندی، ان میں سے کسی زبان کا بھی ایسا مادہ لے سکتے ہیں جو سہل ہو یعنی مروج اور موزوں ہو۔

۳۔ دوسری زبانوں سے بھی الفاظ لے سکتے ہیں لیکن ان الفاظ سے اشتقاق یا ترکیب کے ذریعے جو الفاظ بنائے جائیں وہ اردو صرف و نحو کے بموجب ہوں، یعنی لفظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن اس کے نحوی قاعدے نہیں لے سکتے۔

۴۔ کسی اصطلاحی لفظ سے پورے اصطلاحی معنی ظاہر نہیں ہوتے۔ ہر ایسے لفظ میں اصطلاحی معنی کی ایک جھلک یا اس کی کسی خصوصیت کا اشارہ ہوتا ہے۔ اس لیے اصطلاح وضع کرتے وقت حتی الامکان یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اصطلاحی لفظ سے اصطلاحی معنی کی جھلک یا معنی کا کوئی نمایاں جز ظاہر ہو۔

۵۔ ایسی اصطلاحیں جو ہماری زبان میں قدیم سے رائج ہیں اور اب بھی اسی طرح کارآمد ہیں، برقرار رکھی جائیں۔ البتہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں اور رائج ہو گئی تھیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کی رو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے اُن کا ترک کرنا مناسب ہے اور اُن کی بجائے دوسرے لفظ وضع کیئے جائیں۔

۶۔ جو لغات غیر زبانوں سے لے کر قدیم زمانے میں معرب کر لیے گئے ہیں۔ یا جو دخیل ہیں وہ اپنے حال پر قائم رہیں، اصل کی طرف رجوع کرنا ضرور نہیں۔

۷۔ امالہ، ترخیم، فکِ اضافت اور دوسرے تصرفات سے بوقت ضرورت بے تامل کام لیا جائے۔

۸۔ جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیر زبانوں کے اسمار سے مصادر بنا لیے گئے (مثلاً بدلنا، قبولنا، بخشنا، پتھرانا وغیرہ)، اسی طرح اب بھی ضرورت کے وقت اسمار سے افعال بنا لینا جائز ہے چناں چہ اس اصول پر برقانا، قومیانا وغیرہ بنائے گئے ہیں۔

۹۔ مرکب اصطلاحوں کی ترکیب میں ہندی لفظ کے ساتھ عربی فارسی کا جوڑ اور عربی فارسی سابقے اور خصوصاً لاحقے ہندی الفاظ کے ساتھ

استعمال کیے جاسکتے ہیں، ہماری زبان میں اس کا رواج پہلے سے ہے۔ مثلاً بے حد، باا‌ثر، پنسورا، لاچار، سمجھ دار، بے چین، اگال دان وغیرہ یا فارسی ہندی اسما یا صفات سے اسم کیفیت عربی قاعدے کی رو سے بنانا یہ طریقہ بھی ہماری زبان میں پہلے سے مروج ہے جیسے یگانگت، رنگت وغیرہ۔

۱۰- علوم کے نام کے لیے انگریزی میں .Logy لاحقہ ہے۔ ہم نے اس کے لیے "یات" تجویز کیا ہے، جیسے Biology حیاتیات، .Geology ارضیات Psycholony نفسیات وغیرہ۔ اسی طرح ہم نے لاحقہ .Meter کے لیے جو آلات کے ناموں کے ساتھ آتا ہے "پیما" اور .Graph کے لیے "نگار" SCOPE کے لیے "نما" لاحقے رکھے ہیں، جیسے .Spectrometer طیف پیما .Seismograph زلزلہ نگار، .Electroscope برق نما اسی اصول پر دوسرے سابقے اور لاحقے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

۱۱- ایسے انگریزی اصطلاحی لفظ جو عام طور رائج ہو گئے ہیں یا ایسے لفظ جن کے اشتقاق مشکوک ہیں یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں انھیں بدستور رہنے دیا جائے۔ کیوں کہ نہ تو ان کا ترجمہ ہو سکتا ہے اور نہ ترجمہ کی ضرورت ہے۔

۱۲- بعض انگریزی اصطلاحیں ایسی بھی ہیں جو حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں وہ الفاظ اُس وقت کی معلومات کے لحاظ سے تجویز کیے گئے تھے، چوں کہ زبان میں ایک مدت سے رائج ہیں اب ان کا بدلنا ممکن نہیں لیکن ہمیں اس بارے میں انگریزی کی تقلید نہیں کرنی چاہیے اور اُن کے لیے ایسے الفاظ تجویز کیے جائیں جو جدید تحقیقات کی رو سے صحیح مفہوم ادا کرنے پر قادر

ہوں مثلاً Atom جس کے معنی ہیں جو نہ ٹوٹ سکے۔ اس خیال کی بنا پر ہماری قدیم کتابوں میں اس کا مترادف جزلا یتجزیٰ رہا، اگرچہ اب جدید تحقیق سے یہ نظریہ غلط ثابت ہو گیا ہے لیکن چوں کہ ایک زمانے سے زبان میں یہ لفظ استعمال ہوتا چلا آرہا ہے اس لیے اس کا بدلنا ممکن نہ ہوا ہم نے اردو میں اس کی تقلید نہیں کی اور اس کے لیے "جوہر" کا لفظ تجویز کیا ہے جو صحیح مفہوم ادا کرتا ہے۔

۱۳۔ جہاں دو یا زیادہ الفاظ کو ملا کر ایک مرکب لفظ بنانا منظور ہوا جیسے فن کیمیا میں اکثر ضرورت پڑتی ہے تو اس قدر تصرف جائز رکھا جائے کہ ہر لفظ مفرد میں دو ایک حرف حذف کر کے اختصار پیدا کیا جائے تاکہ اسے اصطلاحی صورت حاصل ہو سکے مثلاً نخزمایہ (نخست + مایہ). Protoplasm. نخش طلا (خشت + طلا). Bullion. نرماب (نرم + آب). Mild Temper ہوامیزہ (ہوا + آمیزہ) .Carborated

۱۴۔ حتی الامکان مختصر لفظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کر سکیں۔ انگریزی اصطلاحات کا بدل یا مترادف تجویز کرتے وقت مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے۔ البتہ ہر اصطلاح کا لفظی ترجمہ مناسب نہ ہوگا۔

۱۵۔ اشیا کے جو نام عربی فارسی اردو یا پاکستان و بھارت کی کسی زبان سے یورپ میں گئے ہیں اور انھوں نے اپنی شکل تبدیل کر لی ہے ان کو بجنسہ انگریزی زبان سے نہیں لینا چاہیے بلکہ ان کی اس شکل کو اختیار کرنا چاہیے جو اصل زبان میں ہے۔

۱۶۔ اگر ایک علم کی کسی انگریزی اصطلاح کے لیے کوئی ایسی اصطلاح تجویز کی جائے جو پہلے سے کسی اور علم میں مستعمل ہو تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں، انگریزی، عربی

اور دوسری زبانوں میں بہت سی ایسی اصطلاحیں ہیں جو مختلف علوم میں یکساں مستعمل ہیں اور اُن کے جداگانہ معنی لیے جاتے ہیں۔

فرہنگ اصطلاحات کیمیا پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی اس وقت اس میں ۲۳۰۰ اصطلاحیں تھیں، طبع دوم کے وقت (۶۲۵) اصطلاحوں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ کیمیا کی تمام بنیادی اصطلاحیں آجائیں، میجر آفتاب حسن صاحب ایم ایس سی (علیگ)، بی ایس سی (لندن)، پرنسپل انجمن ترقی اُردو کالج قابل شکریہ ہیں کہ اُنھوں نے اس کام میں خاص طور پر مدد دی۔

سائنس کی دوسری شاخوں کی فرہنگیں بھی زیر ترتیب ہیں حتی الامکان انھیں جلد شائع کرنے کا انتظام کیا جائے گا، فرہنگوں میں ہم نے مذکورۂ بالا اصولوں پر عمل کیا ہے۔

۲ر اپریل ۱۹۵۳ء
عبدالحق

# مقدمہ

## اسٹینڈرڈ انگریزی اُردو ڈکشنری

زبان کے لیے لغت کا ہونا جیسا کچھ ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں، لیکن لغت لکھنا بڑا ٹیڑھا اور کٹھن کام ہے۔ اور جہاں واسطہ دو زبانوں سے ہوتا ہے وہاں یہ دشواری اور بڑھ جاتی ہے، اور بڑا پتا مارنا پڑتا ہے۔ ایک ہماری زبان ہی کیا بلکہ ہندستان کی اکثر زبانوں کی لغات یورپینوں اور خصوصاً انگریزوں نے لکھیں۔ اُردو یا ہندستانی کی لغات زیادہ لکھی گئیں اس لیے کہ یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ہندستان میں کام دے سکتی ہے۔ انگریزی اُردو لغات بھی پہلے پہل انھیں صاحبوں نے لکھیں۔ یوں تو اس کا سلسلہ سترھویں صدی سے شروع ہوتا ہے لیکن ایسی کتابیں جو قابل لحاظ ہوں، ان کا آغاز اٹھارھویں صدی کے نصف آخر کے بعد سے ہوتا ہے۔ ہم یہاں صرف ایسی انگریزی اُردو لغات کا مختصر سا ذکر کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلا نام جارج ہالڈے (George Holdy) کا ہے۔ اس نے اردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی جس میں انگریزی ہندستانی لغت بھی شامل ہے وہ اس زبان کو مورز (Moor) کہتا ہے۔ ابتدا میں اہل یورپ اردو یا ہندستانی کو مور یا مورش کہتے تھے۔ یہ کتاب پہلی بار وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ۱۷۸۲ء میں شائع ہوئی۔ اُس وقت چوں کہ کوئی اور کتاب نہ تھی، بہت مقبول ہوئی اور

متعدد بار چھپی۔ بعد ۱۸۰۹ء تک سات بار چھپ کر شائع ہوئی، گلکرسٹ اس کی بہت برائی کرتا ہے۔

۱۔ فرگسن (Fergusson.) نے ۱۷۷۳ء میں انگریزی ہندستانی اور ہندستانی انگریزی لغت لکھی جس میں صرف و نحو کا حصہ بھی شامل ہے۔ یہ رومن حروف میں لندن میں چھپی

۲۔ اس کے بعد جان بورتھ وک گلکرسٹ (John Borth,Wick Gilchrist) کا نمبر آتا ہے۔ اس نے اُردو یا ہندستانی زبان پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اردو زبان کا بڑا محسن اور قدردان ہوا ہے۔ اس نے اردو زبان کو مقبول بنانے میں بڑا کام کیا ہے۔ یہاں ہیں صرف اِن چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں جن کا تعلق انگریزی اُردو لغت سے ہے:

(۱) انگریزی ہندستانی لغت۔ یہ کتاب ۱۷۸۶ء میں تصنیف ہوئی اور کلکتہ میں ۱۷۹۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں انگریزی الفاظ اور محاوروں کے معنی اُردو اور رومن دونوں حروف میں دیے گئے ہیں۔

(۲) اورینٹل لنگواسٹ۔ یہ انگریزی ہندستانی اور ہندستانی انگریزی لغت ہے۔ اس کے شروع میں زبان اردو کے متعلق بعض فوائد اور صرف و نحو کی بحث ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی

(۳) اینٹی جارگنسٹ (Anti-Jargonist.) یا مقدمۂ ہندستانی زبان (جسے مورز بھی کہتے ہیں) اس میں زبان کے ابتدائی اصول سے بحث کی ہے۔ اور اس کے ساتھ انگریزی ہندستانی اور ہندستانی انگریزی لغت بھی ہے۔ ۱۸۰۰ء میں شائع ہوئی۔

(۴) برٹش انڈیا مونیٹر (The Antijargonist Stranger's Guide Oriental Linguistic Co.) یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۱۸۰۶ء

میں اور دوسری ۱۸۰۹ء میں اڈنبرا میں شائع ہوئی - پہلی جلد ہندستانی زبان کی اہمیت پر عام بحث اور صرف ونحو اور دیگر فوائد پر مشتمل ہے اور دوسری جلد میں انگریزی ہندستانی اور ہندستانی انگریزی لغت رومن حروف میں ہے۔

(۵) ہندستانی گرامر، صرف ونحو پر مفصل کتاب ہے اور کثرت سے امثلہ اردو حروف مع ترجمے کے پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں انگریزی ہندستانی اور ہندستانی انگریزی الفاظ کی لغت ہے جسے ایک قسم کی فرہنگ سمجھنا چاہیے، کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئی۔

(۶) ہندستانی فلالوجی یعنی انگریزی ہندستانی لغت مع مقدمہ صرف ونحو، لندن میں ۱۸۱۰ء میں شائع ہوئی۔ معنی رومن حروف میں ہیں۔ دراصل یہ وہی کتاب ہے جو انگریزی اردو لغات کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں معنی اردو اور رومن دونوں حروف میں ہیں اور اس میں صرف رومن حروف میں۔

(۷) ایسٹ انڈیا گائڈ۔ اس کا پورا نام یہ ہے East India Guide to the Hindustani or the Grand Popular & Military language of all India improperly called Moor & Moorish.

ہندستانی زبان یعنی تمام ہندستان کی عظیم الشان مقبول اور فوجی زبان کا گائڈ، جو غلطی سے مور یا مورش کہلاتی ہے۔ کتاب کے شروع میں زبان کی صرف ونحو اور دیگر فوائد سے بحث کی ہے اور اس کے بعد انگریزی ہندستانی لغت ہے، معنی رومن حروف میں دیے ہیں۔ ۱۸۲۰ء میں لندن میں چھپی۔

۳- ہنری ہیرس نے ۱۷۹۰ء میں ایک انگریزی ہندستانی لغت لکھی، اس میں اشخاص و مقامات کے اعلام کا بھی اضافہ کیا ہے۔ مدراس میں طبع ہوئی۔

۴- لفٹننٹ روبک نے جو گلکرسٹ کے مددگار اور اردو زبان کے بڑے شائق

تھے، بحری اصطلاحات کی انگریزی اُردو لغت لکھی اور شروع میں ایک مقدمہ اردو صرف و نحو پر لکھا، کلکتہ میں ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ دوسابھائی سہراب جی نے ۱۸۴۳ء میں ایک اچھی بڑی کتاب تالیف کی جس میں بول چال اور محاورے کے جملے انگریزی ہندستانی اور گجراتی فارسی زبانوں میں دیے ہیں۔ اس کے اُردو کے بعض جملوں میں گجرات اور جنوب کا اثر پایا جاتا ہے۔

۶۔ ہنری گرانٹ نے ۱۸۵۰ء میں یورپین اصحاب کے لیے ایک اینگلو ہندستانی فرہنگ مرتب کی جو کلکتہ میں طبع ہوئی۔

۷۔ متھرا پرشاد نے انگریزی اُردو ہندی لغت رومن حروف میں لکھی جو بنارس میں ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔

۸۔ سداسکھ لال کی اینگلو اردو ڈکشنری الہ آباد سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔

۹۔ ہیزل گرو (G. P. Hazelgrone) نے انگریزی ہندستانی کی ایک فرہنگ تیار کی جو ۱۸۷۰ء میں بمبئی میں شائع ہوئی۔

۱۰۔ ایچ بلاک مین نے انگریزی اُردو لغت لکھی جو الہ آباد میں ۱۸۷۷ء میں طبع ہوئی۔ یہ اسکول ڈکشنری ہے۔

۱۱۔ مولوی عبدالودود کی انگریزی اردو لغت (رومن حروف میں) ۱۸۷۹ء میں تالیف ہوئی اور کلکتہ سے شائع ہوئی

۱۲۔ ڈاکٹر فیلن نے نیو انگلش ہندستانی ڈکشنری تالیف کی جو بنارس سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۔ دُرگا پرشاد نے انگلش اُردو ٹرینسلیٹرز کمپنین کے نام سے ایک لغت تالیف کی جو پہلی بار بنارس میں ۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی اور دوسری بار ۱۸۹۰ء میں

کسی قدر اضافے کے ساتھ شائع ہوئی۔

۱۴۔ ریونڈ کریون ( Cravern ) کی رائل ڈکشنری، انگلش ہندستانی ۱۸۹۵ء میں لندن میں طبع ہوئی

۱۵۔ تھابرن W. L. Thouburn. کی انگلش اُردو ڈکشنری لکھنؤ میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی۔

۱۶۔ رینکنگ ( G. Ranking. ) کی انگریزی ہندستانی ڈکشنری ۱۹۰۵ء میں کلکتہ اور لندن میں شائع ہوئی۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں انگریزی اردو لغت پر لکھی گئیں جو زیادہ تر مدارس کے طلبہ کے لیے ہیں۔ ان تمام لغات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، دو کتابیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں ایک ڈاکٹر گلکرسٹ کی، دوسرے ڈاکٹر فیلن کی۔ اگرچہ گلکرسٹ کی لغت کو چھپے ہوئے اس وقت تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں لیکن اُس وقت کے لحاظ سے جب یہ تالیف ہوئی سب سے بہتر اور قابل قدر کتاب تھی باوجود اتنی مدت گزرنے کے اب بھی وہ بیکار نہیں ہے۔ بعض اوقات اس میں اُردو کے ایسے اچھے پرانے لفظ مل جاتے ہیں جو بعد کی لغت میں نظر نہیں آتے لیکن اُس وقت انگریزی زبان کو یہ وسعت حاصل نہیں تھی۔ اس لیے لغت کی حیثیت سے وہ کارآمد نہیں ہوسکتی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی محنت، تلاش اور وسعت نظر بہت قابلِ داد ہے۔ ڈاکٹر فیلن کی کتاب بہت بعد کی ہے پھر بھی اسے لکھے ہوئے تخمیناً پچاس سال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کتاب کی طبع سے پہلے ہی انتقال کر گئے، اور انھیں تکمیل اور نظر ثانی کا موقع نہ ملا، تاہم کتاب موجودہ تمام لغات میں بہتر ہے۔ ڈاکٹر فیلن نے مختلف قسم کی لغات لکھ کر اُردو زبان کے حق میں بڑا کام کیا ہے۔ اور ان کو مددگار بھی ایسے مل گئے تھے جن سے نہ صرف کام میں بڑی مدد ملی بلکہ وہ خود کام کے ہو گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر فیلن کی اس لغت کو ان تمام لغتوں پر ترجیح ہے جو اس سے پہلے لکھی گئیں لیکن آج کل وہ بھی کارآمد نہیں رہی۔ انگریزی زبان اس پچاس سال میں کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ایک جدید جامع لغت کی شدید ضرورت تھی اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ لغت مرتب کی گئی ہے۔

ایسی لغت کے لکھنے میں ایک مشکل تو یہ ہے کہ انگریزی لفظ یا محاورے کے صحیح مفہوم کو پوری طرح سمجھنا، دوسری مشکل اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ سمجھنے کے بعد اس کے لیے اپنی زبان کا ویسا ہی لفظ یا محاورہ تلاش کرنا جو اس مفہوم کو کامل طور پر ادا کر دے۔ جب تک دونوں زبانوں پر پوری قدرت نہ ہو اور الفاظ و محاورات کے استعمال سے کامل واقفیت نہ ہو، اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس مشکل کو کون نہیں سمجھتا، میں بھی سمجھتا تھا، لیکن جب کام کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ جتنا ہم نے سمجھ رکھا تھا اس سے کہیں کٹھن ہے۔

غرض جب تہیہ کر لیا گیا کہ اس ضرورت کا پورا کرنا ضروری ہے تو تدبیر یہ سوچی گئی کہ یہ کام متحدہ طور پر انجام پانا چاہیئے یعنی متعدد اصحاب مل کر یہ کام کریں، ایک تو اس لیے کہ یہ مشکل اور بڑا کام ایک آدمی کے بوتے کا نہیں، دوسرے ہمیں مل کر کام کرنے کی بھی عادت ہونی چاہیئے، ورنہ بڑے اور اہم کام کبھی انجام نہ پا سکیں گے، اور اگر ہوئے بھی تو ناقص اور غیر مستند ہوں گے۔ اس خیال سے اول بعض صاحبوں کے مشورے سے ایک فہرست ایسے اصحاب کی مرتب کی گئی جو اس کام کے اہل سمجھے گئے۔ اس کے بعد ان سے استصواب کیا گیا، جن صاحبوں نے رضامندی ظاہر کی، ان کے سپرد ایک ایک حرف کیا گیا اور جو حرف زیادہ بڑے تھے ان کے ایک یا زیادہ حصے کر کے کئی صاحبوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ پہلے ان صاحبوں سے ایک دو صفحے کے ترجمے کا نمونہ طلب کیا گیا اور ترجمے کے متعلق

ضروری ہدایتیں بھی لکھ دی گئیں۔ نمونے آنے پر انھیں غور سے دیکھا گیا اور صحت کی گئی اور مزید ہدایتیں دی گئیں اور فی صفحہ معاوضہ بھی مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد ترجمے کا کام شروع ہو گیا، ان میں سے بعض تو نمونے ہی تک رہے۔ بعض چند قدم آگے بڑھے، مگر بھاری پتھر تھا، چوم کے چھوڑ دیا۔ ان کی جگہ نئے آدمی تلاش کیے گئے۔ غرض ترجموں کے آنے میں بہت دیر لگی اور دیر بھی اتنی کہ دل اُلجھنے لگا، مگر یہ اطمینان تھا کہ کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ ختم ہونے کے بعد سرسری طور سے نظرثانی کرنی پڑے گی اور کتاب چھپنے دے دی جائے گی اور صرف یہی ایک مرحلہ چھپنے کا باقی رہ جائے گا۔ دیر ہوئی بھی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ترجمے رفتہ رفتہ آنے شروع ہوئے۔ اب جو انھیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو اندازہ کیا گیا تھا وہ غلط نکلا، دو ایک ترجموں کے سوا باقی سب ایسے نکلے کہ انھیں از سرِ نو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں اس زمانے میں اورنگ آباد کالج میں تھا، کالج ہی کے چند صاحبوں کی شرکت سے میں نے ایک مجلس بنائی اور نظرثانی کا کام شروع کر دیا۔ ایک ایک لفظ پر گفتگو ہوتی تھی۔ پہلے نرم نرم پھر گرم گرم بحث ہونے لگتی، یہاں تک کہ بعض وقت تو تو میں میں تک نوبت پہنچ جاتی۔ معلوم یہ ہوا کہ بڑی کمیٹی سے کام نہیں چل سکتا، اور اگر یہی رفتار رہی تو کتاب ختم ہونے کو عمرِ نوح درکار ہوگی۔ اس لیے میں نے صرف دو صاحبوں کو یعنی سید وہاج الدین صاحب اور مولوی محمد حسین صاحب محوی کو ساتھ رکھا اور کچھ دنوں اس طرح کام کیا۔ اصطلاحات اور خاص خاص الفاظ کے ترجموں کے لیے میں نے ایک کمیٹی حیدرآباد میں بنا رکھی تھی جس میں مولوی وحید الدین سلیم مرحوم، مولوی غلام یزدانی صاحب اور مولوی سید ہاشمی صاحب شریک رہتے تھے اور جب کبھی میں جاتا تو میں بھی شریک رہتا۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ کمیٹی بھی نہ رہی۔ اس کے بعد مجھے حیدرآباد جانا پڑا

اتفاق سے گرمیوں کی تعطیلوں میں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کا حیدرآباد آنا ہوا۔ ان دو صاحبوں کو اور ڈاکٹر یوسف حسین کو میں اورنگ آباد لے کر آیا اور ہم ہر روز کئی گھنٹے ان ترجموں کی نظر ثانی میں صرف کرنے لگے۔ تعطیل کے بعد ہم سب منتشر ہو گئے۔ صرف ڈاکٹر یوسف حسین حیدرآباد میں میرے شریک کار رہے اور ہم تھوڑا بہت کام کرتے رہے۔ آخر یہ طے پایا کہ یہ کام ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو تفویض کر دیا جائے۔ انھوں نے بھی اسے قبول کر لیا۔ وہ نظر ثانی کر کے بھیجتے رہے اور اس کے بعد میں اسے ایک نظر دیکھ لیتا اور پھر چھپنے کو دے دیا جاتا۔ کچھ اوراق کی نظر ثانی میں نے تنہا کی اور بعض کی مولوی سید ہاشمی نے لیکن اس کام کا زیادہ بار ڈاکٹر عابد حسین ہی کے سر رہا۔

پروف دیکھنے کا کام بھی کچھ آسان نہ تھا، یہ بڑی دیدہ ریزی اور ہوشیاری کا کام ہے۔ باوجود اشتہار دینے کے بھی کوئی کام کا آدمی نہ ملا، اس لیے کہ اس میں اُردو و انگریزی دونوں کی لیاقت کی ضرورت تھی۔ شیخ چاند ایم اے مرحوم نے جو اس وقت میرے ساتھ بطور ریسرچ سکالر کے کام کرتے تھے، پروف خوانی کا کام اپنے ذمہ لیا، کچھ دنوں کے لیے مجھے مسٹر سید سراج الدین ناکامیاں بی۔ اے (لندن) ہاتھ آ گئے۔ انھوں نے پروف خوانی اور نظر ثانی کا کام بڑی دلسوزی اور احتیاط کے ساتھ کیا اور ان سے مجھے بڑی مدد ملی لیکن بمبئی یونیورسٹی میں جب انھیں ایک خدمت مل گئی تو وہ چلے گئے۔ ابتدا میں کچھ دنوں تک دوسرا پروف تصحیح کے لیے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی خدمت میں جاتا رہا لیکن الٰہ آباد سے کاغذوں کے آنے جانے میں بہت دیر ہو جاتی تھی اس لیے اسے ترک کرنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی پروف پڑھنے کے بعد تصحیح کے متعلق جو جو اشارے اور ہدایتیں دیں، وہ بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ میں ان سب

صاحبوں کا اور خاص کر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا بہت شکر گزار ہوں، کیوں کہ ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ کام اب تک تکمیل کو نہ پہنچتا۔

کہنے کو تو یہ نظر ثانی تھی لیکن حقیقت میں از سرِ نو ترجمہ کرنا پڑا۔ شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہوگا جو حکّ و اصلاح سے بچا ہو۔ بڑی احتیاط یہ کی گئی ہے کہ انگریزی لفظ کے لیے اُردُو لفظ، انگریزی محاورے یا روزمرہ کے لیے اردو محاورہ یا روزمرہ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح بٹھائی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔ لفظ کی تشریح تو آسان ہے لیکن لفظ کے لیے ویسا ہی لفظ اور محاورے کے لیے ویسا ہی محاورہ لانا مشکل کام ہے۔ بعض اوقات ایک ایک لفظ کے لیے بیسیوں کتابوں کے ورق اُلٹنے پڑتے تھے۔ بول چال یا عامیانہ الفاظ کے لیے اُردو میں بھی اسی قسم کے لفظ تلاش کرنے پڑتے تھے، علمی اصطلاحوں کے لیے علمی اصطلاحیں اور پیشہ وروں کی اصطلاحوں کے لیے پیشہ وروں کی اصطلاحیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لانی پڑتی تھیں۔ ایسی صورتوں میں اکثر اوقات کتابیں اور لغات کام نہیں دیتی تھیں۔

اسی طرح انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اُردو مترادف الفاظ سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں ہر معنی کا نمبر شمار دے دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آجائے اور ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر ظاہر کیا گیا ہے کیوں کہ محض تشریح کر دینے سے نہ تو پورا مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال معلوم ہوتا ہے۔

ایک بڑی مشکل وہاں پیش آتی تھی جب کسی انگریزی لفظ کے مفہوم کے لیے اُردُو زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا تھا۔ انگریزی میں درحقیقت بعض ایسے لفظ ہیں کہ ان کا مترادف ہماری زبان میں نہیں۔ ایسے موقع پر تشریح

اور تعریف کے ساتھ نیا لفظ وضع کر دیا گیا ہے لیکن ایسے لفظ وضع کرنے میں حتی الامکان اس امر کی کوشش کی گئی کہ جدید لفظ زبان کی فطری ساخت کے مطابق ہو، مثلاً Colour Blindness. کے لیے ہمارے ہاں کوئی لفظ نہیں۔ اکثر مترجمین نے Colour Blind. کا ترجمہ "عمی اللون" کیا ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں، یہ لفظ ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں ایک لفظ "رتوندا" ہے۔ یہ اس مرض کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے رات کو نظر نہیں آتا۔ یہ لفظ رات، اور اندھا سے مرکب ہے۔ میں نے اسی وزن اور اسی ترکیب پر Colour Blindness. کے لیے "رنگوندا" بنالیا ہے۔ صفات بھی اسی آسانی سے بن جاتی ہیں، جیسے رتوندیا اور رنگوندیا۔ یا مثلاً Absentee. کے لیے کوئی لفظ نہیں ملا، ہماری زبان میں ایک لفظ "حاضر باش" ہے۔ اسی اصول پر ہم نے "غائب باش" بنالیا، Absent اور Absenter. میں جو فرق ہے وہی غیر حاضر اور غائب باش میں بھی ہے۔ اکثر ایسے الفاظ کے آگے (ج) کا نشان بڑھا دیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ جدید لفظ وضع کیا گیا ہے۔ اس طرح اس لغت کی بدولت خود زبان میں بیش بہا اضافہ ہو گیا ہے۔

حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ لفظ کے تحت کے محاورات بھی حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے جائیں تاکہ تلاش میں اُلجھن نہ ہو۔

انگریزی زبان بڑھتی ہوئی دولت ہے۔ ہر سال اس میں کچھ نہ کچھ نئے الفاظ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لغت کی تالیف کے اثنا میں بہت سے جدید لفظ زبان میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایسے الفاظ جو عام ضرورت کے ہیں اور روزمرہ کے استعمال میں آ گئے ہیں، بطور ضمیمہ کے کتاب کے آخر میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

اصول ترتیب میں کنسائز آکسفورڈ کی پابندی کی گئی ہے لیکن دوسری جدید انگریزی لغات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اتنی بڑی کتاب کی چھپائی کا معاملہ بھی دقت سے خالی نہ تھا بعض مشہور مطابع سے اس بارے میں خط و کتابت کی گئی تو ان کا نرخ اتنا گراں نکلا کہ پوری کتاب کی چھپائی انجمن کی بساط سے باہر تھی۔ نرخ کی گرانی کی وجہ یہ معلوم ہوی کہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کی ملی جلی چھپائی میں زیادہ وقت لگتا اور زیادہ مشکل پڑتی ہے اس لیے مصارف زیادہ ہو جاتے ہیں۔ آخر انجمن نے خود ہی اس کی چھپائی کا بار اپنے ذمے لیا۔ اس میں جو جو کھکھیڑیں اُٹھانی پڑیں ان کا ذکر فضول ہے۔ لغت کے لیے کاغذ بھی خاص طور پر بنوایا گیا۔ یہ کاغذ بائبل پیپر کہلاتا ہے۔ یہ باریک بھی ہے اور مضبوط بھی۔ اگر ذرا موٹا کاغذ لگایا جاتا تو اس کا ایک جلد میں سمانا مشکل ہوتا۔ دو جلدوں میں ہونے سے ایک دقت تو یہ پیش آتی ہے کہ لفظ کی تلاش میں کچھ زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ دوسرے دو جلدوں کے ہونے سے خرچ بڑھ جاتا ہے اس لیے اس کاغذ کو پسند کیا گیا۔

جہاں تک ممکن ہوا صحت کا خیال رکھا گیا ہے تاہم بعض بعض جگہ خامیاں رہ گئی ہیں مگر وہ ایسی خفیف ہیں کہ پڑھنے والے کو فوراً معلوم ہو جائیں گی۔ اگر طبع ثانی کا موقع ملا تو نہ صرف یہ خامیاں رفع ہو جائیں گی بلکہ ہر قسم کی اصلاح اور اضافے کی بھی کوشش کی جائے گی لیکن باوجود اس کے یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ ہے کہ ایسی جامع لغت ہماری زبان میں تو کیا ہندستان کی کسی زبان میں نہیں۔

اس کی ترتیب، نظر ثانی، اصلاح، طبع کا سلسلہ سالہا سال سے چلا آتا تھا آج اس کے ختم ہونے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ تھا کہ سر سے ٹل گیا۔ امید ہے کہ جو صاحب اس سے کام لیں گے، وہ ہماری محنت اور جاں سوزی کی داد دیں گے۔

اورنگ آباد دکن

۸ ر دسمبر ۱۹۳۷ء

عبدالحق

# مقدمہ

## آرٹ اِن اُرْدُو پوئٹری

جناب شہاب الدین رحمت اللہ صاحب ادیب بھی ہیں اور صناع (آرٹسٹ) بھی۔ ان دو خوبیوں کی یکجائی ان کے ذوق سلیم پر دلالت کرتی ہے۔ ان کو انگریزی پر بھی اسی قدر قدرت ہے جس قدر اُردو پر۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے اُردو شاعری کے نشو و نما اور ارتقا کو شاعری کے مختلف دبستانوں کے ذریعہ دکھایا ہے اور ہر دبستان کے ممتاز شعرا کے کلام کی خصوصیات سے مختصر طور پر جامع الفاظ میں بحث کی ہے اور اس پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور صرف انھیں شعرا کا انتخاب کیا ہے جنھوں نے اپنے حسن کلام سے اُردو زبان کو فروغ دیا ہے۔ مختصر حالات اور تنقید کے بعد ان شعرا کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ اشعار کے انتخاب میں بھی قابل مؤلف کی خوبیٔ ذوق نمایاں ہے یعنی ایسے ہی شعر انتخاب کیے ہیں جن سے شاعر کی اصل خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اصل اردو اشعار کے ساتھ اُن کا انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے۔ یہ ترجمہ نظم میں ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں نظم کا نظم میں ایسا ترجمہ کرنا کہ مفہوم میں فرق نہ آنے پائے اور اصل کی خوبی اور زورِ بیان قائم رہے نہایت دشوار ہے۔ یہ فاضل مؤلف کی قدرت زبان کا کمال ہے کہ انگریزی

ترجمہ نہایت صفائی اور خوش اسلوبی سے ایسی اچھی زبان میں کیا ہے کہ جسے پڑھ کر ان لوگوں کو، جو اُردو سے ناآشنا ہیں قریب قریب اصل شعر کا لطف آجائے گا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قابل مؤلف شعر کا ذوق ہی نہیں رکھتے شاعر بھی ہیں۔

رائے سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے خصوصاً تنقیدی امور میں اس کا بہت امکان ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسے مقام ملیں گے جن سے بعض نقادوں کو اختلاف ہوگا، لیکن جس شوق اور خلوص سے مؤلف نے اس مشکل کام کو انجام دیا ہے اور اس کے لیے مطالعہ اور تحقیق کی جو محنت برداشت کی ہے وہ بلاشبہ قابلِ تحسین ہے۔

کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں اُردو کی ابتدا، اس نام کی توجیہ حکومت مغلیہ میں اس کا وجود، دکنی اُردو، اُردو کے اصنافِ سخن کا مختصر ذکر کیا ہے، جو گویا اصل موضوع کا پس منظر ہے۔ اس کے بعد اردو شاعری کے خاص دبستانوں اور اُن کے خاص اور ممتاز شعرا کا بیان شروع ہوتا ہے۔ شروع میں دکنی شعرا کا چند سطروں میں ذکر کرکے ابتدا ولی سے کی گئی ہے اور خاتمہ اقبال پر ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری پر بہ نسبت دوسرے شعرا کے ذرا تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔ زندہ شعرا کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے۔

کتاب کا اختتام ایک "خاتمہ" پر ہوتا ہے جس میں مؤلف نے بعض دلچسپ بحثیں کی ہیں، مثلاً انگریزی ادب، انگریزی تعلیم، انگریزی حکومت کے اُردو شاعری پر کیا اثرات پڑے، اور اس سے خیالات میں، اسلوب بیان میں، طرزِ اظہار میں کیا کیا تغیرات ہوئے، مشاعرے کا شعر پر کیا اثر ہوا اور شاعروں کے بنانے میں اس نے کیا کام کیا۔

مؤلف کی رائے میں مغربی ادب سے مرعوب ہو کر اُردو شاعری پر نکتہ چینی کرنا اور اس کی روایات وخصوصیات کو یکسر نظرانداز کر دینا خلافِ انصاف ہے۔

سب سے آخر میں "بلبل سے شاہین تک" کے موضوع پر فاضل مؤلف نے بہت پرلطف خیال ظاہر کیا ہے۔ بلبل کو ہماری شاعری میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے چہچہوں میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ یہ المیہ اور طربیہ دونوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ شاہین عہدِ نو کی پیام آور ہے جس کی پرواز میں عزم اور بلندی ہے۔ اُردو شاعری کو بلبل کی بھی ضرورت ہے اور شاہین کی بھی۔ ان دونوں کے امتزاج سے اس میں نیا رنگ اور نئی قوت پیدا ہو گی۔

اُردو شاعری پر انگریزی زبان میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے۔ فاضل مؤلف ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اُردو شاعری کو اُس طبقہ تک پہنچایا ہے جو اب تک ہماری شاعری کی حقیقت اور اُس کے محاسن سے ناآشنا ہے۔ جن اصحاب کو ہمارے شعرا کے کلام اور اُس کے تنقیدی مقالات تک دسترس نہیں یا جو برعظیم پاک و ہند کی مقبول ترین زبان اُردو سے ناواقف ہیں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بصیرت افروز ہو گا۔

مؤلف نے بعض اشعار کے مفہوم کو تصاویر کے روپ میں ظاہر کیا ہے۔ یہ کام انھوں نے اپنے کیمرے اور اپنے موقلم سے لیا ہے۔ اس سے کتاب کی رونق اور دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

# مقدمہ

## چین و عرب کے تعلقات

مولوی بدرالدین چینی فاضل جامعۂ ازہر (مصر) و بی۔ اے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، چینی مسلمان ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، اردو زبانوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور چینی تو اُن کی مادری زبان ہے۔اس وقت اُن کا تعلق چینی ری پبلک کے سفیر متعینہ دہلی (ہند) کے دفتر سے ہے۔ اس سے قبل وہ اسی خدمت پر ایران میں تھے۔ وہ نہایت سلیم الطبع اور عالمانہ مزاج کے شخص ہیں۔ سرکاری کام سے جو وقت بچتا ہے وہ مطالعہ اور علمی تحقیق میں صرف ہوتا ہے۔ اس سے قبل ان کی ایک تصنیف "چینی مسلمان" شائع اور مقبول ہو چکی ہے۔ یہ کتاب یعنی چین و عرب کے تعلقات" جسے انجمن ترقی اُردو پاکستان شائع کر رہی ہے۔ ایک محققانہ تالیف ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کے لکھنے میں چینی، عربی، فارسی، اردو اور یورپی زبانوں کے تمام مستند ماخذوں سے مدد لی ہے۔ انھوں نے یہی نہیں کیا کہ ان کتابوں سے اقوال جمع کر کے نقل کر دیئے ہیں بلکہ واقعات کو مبصرانہ تنقید اور تحقیق سے دیکھا ہے اور بہت سی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا جو ایک زمانے سے چلی آرہی تھیں ازالہ کیا ہے۔

اس کتاب میں آٹھ باب ہیں، پہلے باب میں "چین و عرب کے تعلقات

قبل اسلام" کا ذکر ہے۔ باقی ابواب میں سیاسی، تجارتی، دینی، سفارتی، صناعی اور فنی تعلقات کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اب تک ہم چین کے مسلمانوں کی تاریخ اور اُن کے کارناموں سے بہت کم واقف تھے کیوں کہ ہمارے علما نے کبھی اس طرف توجہ نہ کی۔ اب اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہمارے سامنے آتا ہے جس کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔

چین میں اسلام کا آغاز ۳۱ھ سے ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ بلادِ عرب اور ممالک اسلام اور چین میں باہم سفارتوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنے اخلاق، پرہیزگاری اور کردار سے چین میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور حکومت کے نظم و نسق میں بھی بہت اعتماد اور وقعت پیدا کر لی اور اہم سرکاری مناصب پر فائز ہوئے۔ بعض دور ایسے بھی گزرے کہ انھیں حکومت کی بدگمانی اور سازشوں کی وجہ سے سخت ظلم و ستم اور عقوبتیں جھیلنی پڑیں اور ہزاروں لاکھوں ہلاک ہوئے لیکن ان سب آلام و مصائب کو صبر و استقلال اور خاموشی سے برداشت کیا اور اگرچہ سیاسی اور سرکاری اداروں میں ان کی کوئی آواز نہ تھی تاہم زراعت و تجارت کے کاروبار اور اپنے اخلاق و کردار کی بدولت اپنی حیثیت کو قائم رکھا۔

چینی مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بڑی محبت ہے۔ وہ دین کی تعلیم اور اشاعت سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ان کی عالی شان مسجدیں اس کا خاص مرکز تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد چار اور پانچ کروڑ کے درمیان ہے۔ اسی دینی تعلق کی وجہ سے عربی فارسی زبانوں نے چینی سوسائٹی میں بار پایا اور اس وقت بھی چینی مسلمانوں کی زبان میں

سینکڑوں عربی فارسی کے الفاظ موجود ہیں بعض صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے عربی کی طرف زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ اور ان علاقوں میں اب بھی بہت سے مسلمان عربی پڑھ سکتے ہیں اور بول بھی سکتے ہیں۔ اب بھی سینکڑوں کتبے ایسے پائے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہیں۔ عہد مینگ میں عربی زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور بادشاہ چینگ تو خود بھی عربی زبان سیکھتے تھے اور اُن کا میلان اسلام کی طرف تھا۔ عہد مغول میں عربی فارسی کا زیادہ رواج ہوا لیکن فارسی کو زیادہ تر فوقیت حاصل ہوئی اور چوں کہ مغول فرماں رواؤں کی کوئی خاص زبان نہ تھی اس لیے حکومت کی دفتری اصطلاحات یا تو فارسی سے لی گئیں یا چینی سے۔ اس طرح فارسی کا اثر بڑھ گیا۔ اب بھی چینی مسلمانوں میں دنوں کے نام سوائے جمعہ کے سب فارسی ہیں یعنی شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ، چہارشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ۔ اسی طرح وہ پنجگانہ نمازوں میں نیت عربی میں نہیں فارسی میں باندھتے ہیں مثلاً نیت کردم کہ بگزارم دو رکعت نماز بامداد۔"

علاوہ اس کے وہ حکایات و قصص جن کا تعلق دینی نصائح و مواعظ سے ہے وہ بھی فارسی ہیں اور یہ چیزیں مجالس میں سنائی جاتی ہیں یہاں تک کہ بچوں اور عورتوں کی زبان پر بھی رواں دواں ہیں خواہ وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن علمی میدان میں فارسی عربی کا مقابلہ نہیں کر سکتی چینی مسلمانوں میں عربی کے عالم اور مصنف بھی ہوئے ہیں اور اس زمانے میں بھی بعض چینی مسلمان عربی زبان کی تکمیل کے لیے جامعہ ازہر (مصر) جاتے ہیں۔

سب سے دل چسپ وہ باب ہے جس میں فاضل مصنف نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ وہاں کے مسلمانوں پر چینیوں کا اور چینیوں پر مسلمانوں پر کیا اثر پڑا۔ مسلمانوں نے چین میں عربی طب اور ہیئت کے معلومات پھیلائے "پیکن یونیورسٹی"

میں اس وقت بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ اسلامی طب کی کتابوں کا موجود ہے۔ چینیوں نے مسلمانوں سے بارود اور توپ لی تو مسلمانوں نے چینیوں سے قطب نما لیا۔ مسلمانوں نے چین سے چار لی تو مسلمانوں نے انھیں حنا یا سمین اور زعفران دیا کاغذ چینیوں کی ایجاد ہے اور اس کے بنانے کی ترکیب مسلمانوں ہی نے چینیوں سے حاصل کی اور انھیں کی بدولت کاغذ یورپ اور دوسرے ممالک عالم میں پہنچا۔ چینی ظروف مشہور آفاق ہیں مسلمانوں ہی نے اول اول ممالک اسلامیہ میں ان کو رواج دیا، اور اس صنعت میں خود بھی بہت سی جدتیں کیں مصوری اور نقاشی میں چینی کا جواب نہیں، ایرانی مصوری پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔ نقاشی میں مسلمانوں نے بھی حیرت انگیز ایجادیں کی ہیں، یہ اور دوسرے تمام حالات آپ اس کتاب میں تفصیل سے پڑھیں گے اور مصنف کی محنت اور تحقیق کی داد دیں گے۔

تاریخی لحاظ سے یہ کتاب نہایت قابل قدر ہے۔ اس موضوع پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ مصنف نے اس کے لکھنے میں بڑی جستجو، کاوش اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ اگرچہ مصنف کی زبان چینی ہے، اُردو اُنھوں نے ہندستان میں سیکھی تاہم اُنھوں نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھی جس کے لیے ہم اُن کے بہت شکر گزار ہیں۔

اس کتاب کی کتابت ۱۹۴۷ء کے وسط میں دلّی میں ہوئی مطبع میں چھپنے کے لیے جانے ہی والی تھی کہ وہاں خوں ریز ہنگامے شروع ہو گئے ہندو غارت گروں نے انجمن پر حملہ کیا۔ تمام ساز و سامان لوٹ لیا یا غارت کر دیا۔ انجمن کا ایک قابل اور بوڑھا کاتب اور اُس کے بیوی بچے بڑی بے دردی سے قتل کر دیے گئے۔ کتابوں پر بھی ہاتھ صاف کیا کچھ لوٹ لے گئے اور کچھ پھاڑ کے پھینک پھانک دیں۔ فسادات کے بعد جب میں وہاں گیا تو غسل خانوں،

باورچی خانوں، گدام، پاخانوں اور برآمدوں میں ردّی کے ڈھیر پڑے تھے۔ انھیں ردّیوں میں سے اس کتاب کا مسوّدہ اور کاپیاں بھی ملیں، وہ بھی اس طرح کہ ایک حصہ کہیں ملا اور کچھ کا غذ پھٹے پھٹائے کسی دوسری جگہ۔ یہ محض اتفاق اور ہماری خوش نصیبی تھی کہ یہ بیش بہا علمی سرمایہ اس طوفان بے تمیزی میں بچ رہا اور ہم اسے اردو داں طبقے کی خدمت میں پیش کر سکے۔ چھپائی میں جو نقص نظر آتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ افسوس ہے کہ اس پریشانی کے باعث نظرِ ثانی بھی نہ ہو سکی اور کتابت میں غلطیاں رہ گئیں جس کے لیے ناظرین کرام سے عذر خواہ ہیں۔

# مقدمہ

## پُراسرار کائنات

اس میں شک نہیں کہ اردو نے گزشتہ پچھتر سال میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اس عرصے میں اس کا ادبی سرمایہ برابر بڑھتا رہا ہے اور بلاشبہ اس میں ترقی کی بے پایاں صلاحیت ہے لیکن اس صلاحیت سے کام لینا اہلِ زبان کا کام ہے۔ ہمارے اہلِ علم نے اس صلاحیت سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی لیکن ہماری حکومتوں اور یونیورسٹیوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

اس برعظیم پاکستان و بھارت کی بے شمار زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ سو برس سے جدید علوم ترجمہ و تالیف کے ذریعہ اُردو میں منتقل ہونے شروع ہوئے۔ سوا سو برس ہوتے ہیں جب قدیم دہلی کالج میں تمام جدید علوم اردو زبان کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے۔ سارے برعظیم میں صرف یہی کالج تھا جہاں اس اصول پر عمل ہوتا تھا۔ اس وقت کے ماہرین تعلیم نے نیز سرکاری رپورٹوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی قابلیت ان طالب علموں سے کسی طرح کم نہیں جو انگریزی کے ذریعہ ان علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ کالج کی مجلس ترجمہ نے تخمیناً ڈیڑھ سو کتابیں ترجمہ و تالیف کیں جو تاریخ جغرافیہ۔ اصول قانون، ریاضیات، کیمیا

میکانیات، فلسفہ، طب جراحی، نباتیات، عضویات معاشیات وغیرہ علوم پر مشتمل تھیں، صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ علمی اور سائنسی اصطلاحات وضع کرنے کے اصول بھی تجویز کیے۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد اس کا شیرازہ بکھر نہ جاتا تو یہ کالج اُردو زبان و ادب کی عظیم الشان خدمت انجام دیتا۔ اس مقام پر یہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جس زمانے میں کالج میں علمی کتابوں کے ترجمے اور تالیف کا یہ کام ہو رہا تھا، اسی زمانے میں حیدر آباد میں امیر کبیر شمس الامراء کی زیر سرپرستی سائنس کی کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے چنانچہ ان کا ستۂ شمسیہ مشہور رہی۔ یہ سائنس کی اچھی کتابیں ہیں۔

اس کے چند سال بعد ۱۸۶۴ء میں (سر) سید احمد خاں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اس کا مقصد یہ تھا کہ علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر اہل وطن میں مغربی ادب و علوم کا مذاق پیدا کیا جائے۔ سوسائٹی نے تاریخ معاشیات، ریاضیات، فلاحت وغیرہ پر تقریباً چالیس کتابیں شائع کیں اسی زمانے میں سرسید نے اردو یونیورسٹی کی تحریک کی مگر حکومت نے اس کی سرپرستی نہ کی اور یہ تحریک بے ثمر رہ گئی۔

اس کے بعد ترجمے کا شوق کم ہوتا گیا اور انگریزی نے اس قدر زور پکڑا کہ یہ علمی ذوق ٹھٹھر کر رہ گیا۔ پنجاب میں ڈاکٹر لائٹنر نے کوشش کی ان کی کوشش سے اورینٹل کالج تو قائم ہو گیا لیکن اردو کے ذریعہ مغربی علم و حکمت کی اشاعت تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے —— اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے —— کہ نصف صدی کے بعد مرحوم دہلی کالج نے جامعہ عثمانیہ کی صورت میں ظہور کیا۔ ہم خوش تھے کہ مظلوم اردو کے دن پھرے اور اب وہ برِ اعظم ایشیا کی مشترک زبان

ہو کے رہے گی اور یہ ہو کے رہتا اگر بھارت حیدرآباد پر غاصبانہ قبضہ نہ کر لیتا سب سے پہلے اس کا نزلہ جامعہ عثمانیہ پر گرا، اس کا سررشتہ تالیف و ترجمہ جس نے صدہا کتابیں علوم و فنون کی ترجمہ و تالیف کیں اور ہزارہا اصطلاحات علمیہ وضع کر کے اُردو میں بیش بہا اضافہ کیا، یک لخت بند کر دیا گیا اور ذریعہ تعلیم اردو جو جامعہ عثمانیہ کی ممتاز خصوصیت اور اس کا بڑا کارنامہ تھا، موقوف کر دیا گیا۔ حیدرآباد میں ہماری تہذیب اور زبان کو جس بے دردی سے مٹایا گیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے دل دکھتا ہے۔

دوسرا ادارہ جس نے اُردو میں علم اور ادب کی اشاعت کی بے لوث خدمت کی وہ انجمن ترقی اُردو ہے۔ اس نے اب تک کم و بیش تین سو کتابیں مختلف علوم پر شائع کی ہیں۔ علمی اصطلاحات کے چودہ مجلدات شائع ہو چکے ہیں اور کام اس وقت بھی جاری ہے۔ دنیا کی بعض امہات کتب کا ترجمہ کرایا، اُردو کے شعرا کے قدیم نایاب تذکرے مرتب کر کے شائع کیے اور اُردو زبان کی نہایت قدیم کتابیں جن کے نام تک سے لوگ ناواقف تھے شائع کر کے زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا۔

لیکن باوجود اس کے اس کتاب کے فاضل مترجم سید محمد تقی صاحب کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اصل منزل تک پہنچنے کے لیے کئی اور مراحل طے کرنا باقی ہیں جن میں سے ایک اہم مرحلہ ان امہات کتب کا اردو میں منتقل کرنا ہے جو ہمارے لائق مترجمین کے عظیم اور تاریخی مساعی کے باوجود ابھی تک اُردو میں نہیں آ سکیں یہ انقلابی اور عہد آفریں کتابیں ہیں۔ اگر ہم اُردو کو علمی اعتبار سے بلند مرتبہ تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ان کا اردو کے لباس میں آنا لازم ہے۔

مگر سید صاحب نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ جب کہ ہم ڈیڑھ سو سال سے

انگریزی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اس برعظیم میں بیسیوں یونیورسٹیاں اور سینکڑوں کالج ہیں جہاں سے ہمارے ہمارے نوجوان اعلیٰ ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں اور غیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں رہ کر علمی تحقیقات کی عزت حاصل کرتے ہیں یہ کام کیوں نہ ہو سکا؟ اور ہمارے لائق فائق نوجوانوں نے جنھوں نے ایک عمر علم و حکمت کے حصول میں صرف کی ہے اور اعلیٰ ڈگریاں اور بہترین علمی اعزاز رکھتے ہیں کیوں ایسی کتابوں کے ترجمے کی ہمت نہیں کی؟ اس کا ایک سبب ہی ہمارا نظام تعلیم۔ اگر کسی قوم کو جاہل رکھنا مقصود ہو تو اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اسے غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ اگر ہمیں علوم و فنون کی تعلیم اپنی زبان کے ذریعہ دی جاتی، اور انگریزی زبان بھی ہمیں اپنی زبان کے ذریعہ پڑھائی جاتی تو ناقابل تلافی جسمانی، ذہنی، دماغی اور اخلاقی نقصانات سے محفوظ رہنے کے علاوہ علمی اعتبار سے ہماری زبان کا مرتبہ نہایت بلند ہو جاتا اور سائنس، فلسفے، ادب اور دیگر علوم و فنون کے خیالات و افکار خود بخود اردو میں چھنتے اور نکھرتے چلے آتے اور وہ علم و حکمت کی دولت سے مالامال ہو جاتی۔

جاپان میں تعلیمی اصلاح ہمارے بعد شروع ہوئی اور اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ایسی ترقی کی کہ دنیا حیران رہ گئی پچھلی جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہونے کے بعد بھی اس نے پھر اگلا سا عروج حاصل کر لیا۔ وہاں ہر علم اور ہر زبان جاپانی کے ذریعے سکھائی جاتی ہے اس لیے ہر علم اور ہر ادب کے خیالات بلاتکلف جاپانی زبان میں آجاتے ہیں جاپانیوں نے دنیا بھر کی امہات کتب اور بقول سید محمد تقی صاحب "تحتی امہات کتب" کا ترجمہ کر ڈالا ہے اور جب دنیا میں کہیں بھی کوئی اعلیٰ پایہ کی کتاب شائع ہوتی ہے تو

فوراً اس کا ترجمہ جاپانی میں ہو جاتا ہے۔ غیر جاپان کی بات تو پرانی ہو گئی ہے وہ نئی قومیں جنھیں آزادی حاصل کیے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں انھوں نے بھی تھوڑے ہی دنوں میں اپنا غیر فطری نظامِ تعلیم بدل دیا۔ چین ترکی، انڈونیشیا مصر وغیرہ میں اب فرسودہ غیر طبعی نظام تعلیم نہیں پایا جاتا۔ ان تمام ممالک میں تعلیم اور سارے کاروبار اپنی زبان ہی میں ہوتے ہیں۔ حال ہی میں برما گورنمنٹ نے لاکھوں کے صرف سے برمی زبان میں ان سائی کلوپیڈیا تیار کرائی ہے جس وقت ان کی پہلی دو جلدیں رنگون میں آئیں تو بڑی خوشیاں منائی گئیں، جلسے کیے گئے اور شہر میں وزیر اعظم کی سرکردگی میں شاندار جلوس نکالا گیا۔ ہمیں اردو میں انسائیکلوپیڈیا تو کیا مستند لغات بھی میسر نہیں اور سب سے عبرت ناک اور سبق آموز مثال اسرائیل کی ہے، یہودی جب سے فلسطین میں جا کر آباد ہوئے ہیں۔ انھوں نے عبرانی زبان کو جو دو اڑھائی ہزار سال سے مردہ ہو چکی تھی پھر سے زندہ کیا۔ ان کی یونیورسٹی میں نیچے سے لے کر اوپر تک کے مدارج میں تمام کاروبار اور سرکاری اور بول چال کی زبان عبرانی ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ عبرانی کے سوا کوئی دوسری زبان استعمال کر سکے اور ہم ہیں کہ ابھی تک سو سال سے اسی بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ اُردو ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے یا نہیں، یہ انتہائی پست ہمتی کی علامت نہیں بلکہ ہماری قومی خودداری اور غیرت پر شرمناک داغ ہے اور اس تعلیمی نظام کا صریح نقصان یہ ہے کہ ہماری زبان علمی اعتبار سے وہ ترقی نہ کر سکی جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس پر بھی جن صاحبوں نے تھوڑا بہت حقیقی علمی کام اپنی زبان میں کیا ہے یہ ان کی فطری ذہانت اور عالی ہمتی کا نتیجہ ہے۔

خیالات کے بدلنے، علمی ذوق پیدا کرنے، نئے اسلوب بیان سجھانے اور زبان کی ترقی میں ترجمہ کا بڑا دخل ہے۔ ترجمہ کا کام بہت کٹھن ہے تالیف و تصنیف

سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ تالیف و تصنیف میں اظہار خیال کی آزادی ہوتی ہے ترجمے میں قدم قدم پر پابندی کا سامنا ہوتا ہے۔ اصل مصنف کے طرزِ فکر، اسلوب بیان، اظہار خیال کے انداز اور خاص الفاظ کے معانی کی نزاکت کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اور بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے تاکہ اصل مصنف کا مفہوم اپنے الفاظ اور محاورے میں اس طور سے ادا ہو جائے کہ مصنف کے منشا کے سمجھنے اور بیان کے انداز اور قوت میں فرق نہ آنے پائے۔

تین قسم کی کتابوں کے ترجمے میں خاص طور پر دشواری ہوتی ہے۔ ایک آسمانی صحیفوں کے ترجمے میں کہ جس میں لفظ کے ذرا سے فرق سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ دوسرے قدما کی امہات کتب (کلاسکس) کے ترجمے میں جن کا ایک وصف ایجاز ہوتا ہے۔ قدیم اساتذہ و حکما علمی مسائل کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے بعد کے علما کو ان کتابوں کی شرحیں اور حواشی لکھنے پڑے آج کل کے اہل علم مسائل کے بیان میں اس قدر طوالت سے کام لیتے ہیں کہ ان کے خلاصے لکھنے پڑتے ہیں۔ ترجمہ میں اس ایجاز کو قائم رکھ کر اپنی زبان کے مناسب الفاظ میں مصنف کے صحیح مفہوم کو ادا کرنا آسان کام نہیں۔ تیسرے فلسفہ اور سائنس کی امہات کتب کا ترجمہ جن کے سمجھنے کے لیے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلسفہ و سائنس کے پیچیدہ اور گہرے مسائل آدمی خود تو غور و فکر اور محنت کے بعد سمجھ سکتا ہے لیکن ان مسائل کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے دوسروں کو سمجھانا نہایت مشکل ہے۔ اس میں بڑے صبر اور محنت کی ضرورت ہے۔

مجھے اس امر کے بیان کرنے میں فخر اور مسرت ہے کہ فاضل مترجم جناب سید محمد تقی صاحب نے سر جیمس جینس کی مشہور آفاق کتاب Mysterioue Universe. "پُراسرار کائنات" کا ترجمہ کر کے نہ صرف صحیح اور موضح ترجمے کی اعلیٰ مثال پیش

کی ہے۔ بلکہ اُردو کے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں خاص امتیازی مقام رکھتی ہے اور اسرار کائنات جیسے گہرے اور دقیق مسائل سے بحث کرتی ہے۔ اُردو میں ایسی کتاب کا ترجمہ کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس کے لیے مسلسل غور و فکر، شدید محنت اور صبر اور غائر نظر کی ضرورت ہے۔ ان سب کے علاوہ زبان پر بھی اتنی قدرت ہونی چاہیئے کہ وہ اس قسم کے مشکل اور مختلف نوعیت کے خیالات کو بخوبی ادا کر سکے۔ سید صاحب میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں اور انھوں نے اس کتاب کے ترجمے میں اپنی فطری ذہانت، ژرف نگاہی، انہماک اور خلوص کی بدولت ان تمام مشکلات پر قابو حاصل کر لیا ہے جو ایسے کاموں کے رستے میں حائل ہوتی ہیں۔

مجھے رہ رہ کر یہ افسوس ہوتا ہے کہ ایسا صاحب نظر، صاحب ذوق اور علم و حکمت کا شیدائی اردو صحافت میں دن رات اپنا سر کھپاتا ہے اس کا مقام کسی علمی ادارے یا اکیڈیمی یا یونیورسٹی میں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن کیا وہ ہماری کسی یونیورسٹی میں نبھ سکتے تھے!

ایک روزانہ اخبار کی اڈیٹری کے جھنجھٹ کے بعد اپنا علمی ذوق قائم رکھنا اور ایسی دقیق علمی کتابوں کے لیے فرصت نکالنا بڑی ہمت کی بات ہے۔ خدا ان کو ہمت اور قلم میں برکت دے۔ ہمیں ان سے ابھی اور کام لینے ہیں۔

# مقدمہ

## وادی سندھ کی تہذیب

انسان ایک ہے، تہذیبیں بہت سی ہیں۔ انسان نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں اور ان سے اس کی جانچ کی جاتی ہے، قومیں مٹ جاتی ہیں مگر ان کے کارنامے باقی رہ جاتے ہیں اور ان سے ان کی تہذیب، تمدن اور ان کے عروج وزوال کی داستان مرتب ہوتی ہے لیکن ایسی تہذیبوں کی داستان بڑی دردناک ہے جو اس خرابہ آباد دنیا میں تاریخی عہد سے بہت قبل نمودار ہوئیں اور زمانے کے بے درد ہاتھوں سے برباد ہو کر بے نام ونشان ہو گئیں۔ موہنجو دارو کی تہذیب ایک ایسے ہی عہد کی یادگار ہے۔

لیکن انسان وہ بلا ہے جو آسمان میں تھگلی لگائے اور زمین کا پیٹ چاک کر کے پاتال تک جا پہنچے اس نے قوموں کی تہذیب کے نشان کھود کھود کے نکالے ہیں جو ہزاروں سال پہلے سطح ارض پر سے ناپید ہو گئی تھیں۔ اس نے ٹیلے کھود کر پرانے نشان نکالے، اینٹوں کے سالے کو پرکھا، برتنوں کے ٹکڑے جوڑے مقبروں کے مردے اکھاڑے، ان کے ڈھانچوں اور دوسرے سامان کو جو ان کے ساتھ دفن تھا، دیکھا بھالا اور ایک ایک چیز کا تجزیہ کیا، غرض اس نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا اور کوئی ٹھیکرا کوئی پتھر حتیٰ کہ راکھ تک اس کی نظر تحقیق سے

نہ بچی، انسانی ذہانت اور محنت و استقلال کا انتہائی کمال یہ ہے کہ ان مدفون تہذیبوں کی زبانوں کے نقوش کو بھی پڑھ کر اور سمجھ کر چھوڑا جس کا جاننے اور سمجھنے والا دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔

اپریل ۱۹۴۴ء کے پہلے ہفتہ کراچی میں ہماری اردو کانفرنس تھی۔ موہنجو دارو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار اسی اردو کے سلسلے میں کراچی، حیدرآباد، خیرپور وغیرہ آنے کا اتفاق ہوا تھا مگر اس شہرِ خموشاں کی زیارت سے محروم رہا۔ اس مرتبہ میں نے اور میرے عزیز دوست عبدالرحمن صدیقی مرحوم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اسے دیکھ کر جائیں گے۔ چنانچہ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے کعبۂ مقصود کا رخ کیا۔ ایک روز لاڑکانے میں قاضی فضل اللہ صاحب کے ہاں قیام کیا اور دوسرے دن موہنجو دارو کو روانہ ہوئے۔ وہاں کے مقیم ڈاکٹر فضل احمد خاں صاحب نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی اور دریافت شدہ کھنڈروں اور ان میں سے نکلی ہوئی ایک ایک چیز دکھائی ہم نے جب یہاں کے مکانات، ان لوگوں کی تعمیری صلاحیتیں، شاہراہیں اور گلیاں، ان کی اینٹیں، صفائی اور صحت کے اصول، پانی کی نکاسی کی پٹی ہوئی نالیاں، کنوئیں اور ان میں اترنے کی سیڑھیاں، مٹی کے خوبصورت کوزے اور برتن، تانبے اور کانسے کے ظروف، حمام اور غسل خانے، اسلحہ اور اوزار، سنگ تراشی کے نمونے اور مجسمے، زیورات، مہریں، کاشت کاری کا سامان اور دوسری صنعتوں کے نمونے دیکھے تو ہم دنگ رہ گئے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ آریاؤں نے جو اپنی برتری اور تہذیب کا طلسم باندھ رکھا تھا، موہنجو دارو نے اُسے پاش پاش کر دیا ہے۔

اس معائنے اور سیر میں دو تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ اس کے بعد مہتمم صاحب

نے اپنی عنایت سے ہمیں ان ویران کھنڈروں میں صاف ستھرا اور "پاک" کھانا کھلایا۔ پاک سے میرا مطلب یہ ہے کہ اب شہروں میں کھانا پاک نہیں ملتا، اس میں ملاوٹ ہوتی ہے اور کوئی شے خالص نہیں ہوتی۔

اسی دوران میں میں نے مہتمم صاحب سے کہا کہ اردو میں اب تک موہنجو دارو کے حالات و اکتشافات پر کوئی کتاب نہیں، اگر آپ ایک ایسی کتاب لکھ دیں تو اُردو کی بڑی خدمت ہوگی۔ انھوں نے بخوشی میری درخواست قبول فرمالی۔ دلّی جانے کے بعد میں نے انھیں یاددہانی کی۔ انھوں نے لکھا اس کے لیے مجھے گورنمنٹ آف انڈیا سے اجازت لینی ضروری ہے۔ گورنمنٹ نے درخواست کرنے پر اجازت دے دی۔ فضل احمد خان صاحب کتاب لکھنے کے لیے آمادہ ہوگئے اور اس کا خاکہ بھی تیار کر لیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد انھیں سرکاری کام سے چین جانا پڑا اور وہاں سے انھیں نہیں معلوم کہاں کہاں جانا پڑا اور یہ کام یونہی رہ گیا اور کتاب لکھنے کی نوبت نہ آئی۔

اب جو میں نے محمد ادریس صاحب کی کتاب "وادی سندھ کی تہذیب" دیکھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میری دیرینہ آرزو پاکستان میں آکر پوری ہوئی۔ صدیقی صاحب نے اس تالیف میں ان تمام معلومات اور اکتشافات کو جو ماہرین آثار قدیمہ نے تحقیق و تجسّس سے وادئ سندھ کی موقوعہ بستیوں کی کھدائی کے بعد حاصل کی تھیں بڑے سلیقے سے مرتب کر کے پیش کیا ہے اور ان سب معلومات کو تفصیل سے ایسی صاف ستھری اور شگفتہ زبان میں ایسے دل آویز طریقے سے بیان کیا ہے کہ کتاب پڑھتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ گویا ہم موہنجو دارو کی سیر کر رہے ہیں۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اس خوبی سے لکھی گئی ہے جس کے لیے صدیقی صاحب قابل مبارک باد ہیں۔

ماہرین آثار قدیمہ نے اس بات میں بہت کچھ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ حیرت انگیز کام کیا ہے لیکن ایک مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے۔ وہ ان حروف اور نقوش کا پڑھ کر سمجھنا ہے، جو مہروں مٹی کے برتنوں، کانسی کے ظروف کے ٹکڑوں اور پتھروں پر کندہ ہیں محققین نے اس کے متعلق متعدد نظریے پیش کیے ہیں لیکن اب تک اس قسم کی سب کوششیں ناکام رہیں اور لوگ مایوس ہو چکے ہیں لیکن انسان نے کبھی ہار نہیں مانی، ایک نہ ایک دن اس کی سعی کامیاب ہو کر رہے گی اور لسانیات کا وہ کونا جو اب تک تاریکی میں ہے اجاگر ہو کر رہے گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے روشنی میں آنے سے لسانیات کے بعض ایسے مسائل حل ہو جائیں جن کی جستجو میں ہم آج تک سرگرداں ہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ دریافت کے اس سلسلہ میں ہماری زبان کا کوئی سرا کہیں دور جا کر اس سے جا ملے۔

# مقدمہ

## مضامین محفوظ علی

سید صاحب کا خاندان بدایوں کے قدیم خاندانوں میں ہے اور وہاں کے خوش حال زمینداروں میں تھے۔ بدایوں کے ساتھ شریف کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے یہ اس کا مستحق ہے کہ وہ ایک زمانہ تک علم و فضل اور عرفان و معرفت کا مرکز رہا ہے۔ بدایوں کا نام لیتے ہی سب سے اول دو بڑی باکمال اور عجیب و غریب ہستیاں سامنے آجاتی ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء اور عہد اکبر کے مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی جن کے نام کا جز ہو گیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں ہماری زبان میں "بدایوں کے للا" ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔ حالانکہ وہ بستی اہلِ کمال کی بستی تھی۔

سید محفوظ علی نے مدرستہ العلوم مسلمانان (ایم۔ اے۔ او کالج) علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ بی۔ اے میں سید صاحب، ظفر علی خاں، حافظ ولایت اللہ اور راقم الحروف سب ساتھ تھے۔ ۱۸۹۵ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن چلے گئے اور کچھ مدت کے بعد ریاست خیرپور سندھ میں ملازم ہو گئے اور سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ اس وقت کے والیٔ ریاست کے حالات اور دیگر مقامی واقعات اور لطیفے بڑے مزے سے بیان کیا کرتے تھے۔ ریاست کی ملازمت ترک کرنے کے بعد ان کی تعیناتی برٹش سمالی لینڈ (افریقہ) میں ججی کے عہدے پر ہو گئی۔ وہاں انھوں نے

بعض ایسے قابل تعریف اصلاحی کام کیے جن کی وجہ سے رعایا میں بہت مقبول ہو گئے۔ افریقہ کے سفر کا حال اُنھوں نے اس کتاب میں "افریقہ کا مسافر" کے عنوان سے بڑے دلچسپ پیرایے میں لکھا ہو۔ سمالی لینڈ کی عجیب سرزمین میں ان کا دل نہ لگا اور استعفا دے کر ہندستان چلے آئے۔

بمبئی پہنچے تو مولوی ظفر علی خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ حیدر آباد کے حالات اور وہاں کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر رخصت لے کر بمبئی چلے آئے تھے یہ پرانے دو دوست ایک جگہ رہنے لگے اور خیال کے گھوڑے سرپٹ دوڑانے لگے۔ بمبئی شہر کی شان و شوکت، تجارت کی گہما گہمی اور لوگوں کی دولت و ثروت دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دو چار ان کے جاننے والے تو پہلے سے وہاں تھے۔ بعد میں جب ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا اور بمبئی کے اندرونی حالات پر سے پردہ اُٹھا تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ مجہول تُوندیل سیٹھ جو دکانوں پر دن بھر بیٹھے اپنے منیموں کو آرڈر دیتے اور کلرکوں سے چٹھیاں لکھواتے رہتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کے مالک ہیں عالی شان محلوں میں رہتے ہیں، اعلیٰ درجے کی موٹروں میں سیر کرتے ہیں گھوڑ دوڑوں میں اور جوئے میں ایک ایک رات میں ہزاروں کی بازیاں لگا دیتے ہیں۔ رات بھر عیش و عشرت کرتے اور دن میں دس بجے سو کر اُٹھتے ہیں۔ یہ گھامڑ مودھو جو الف کے نام بے نہیں جانتے ایسا کونسا بڑا کام کرتے ہیں کہ ان پر دھن برستا ہو اگر ہم نے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور جان مار کر علم سیکھا ہو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا تو کیا اتنا بھی نہ کر سکیں گے جو یہ جاہل تاجر کر گزرتے ہیں۔ ہم یورپ اور امریکہ کے تاجروں سے زیادہ بے تکلفی اور مساوات کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ معاملات پر زیادہ قابلیت کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہم جیسی شستہ اور فصیح انگریزی میں ان کو مراسلات لکھیں گے۔ اِن کے کرایے کے کلرک کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

غرض یہ بات کئی روز تک موضوع بحث رہی رات کو خواب بھی اسی کے آتے تھے انھوں نے یہ بھی سن رکھا تھا "نکھد چاکری" تم بیوپار نوکری سے دونوں بیزار تھے اور اسے انتہائی ذلت اور غلامی سے بدتر خیال کرتے تھے۔ غرض رات دن یہی دھن سوار تھی اور بڑے بڑے پروگرام بناتے تھے۔ ابھی سے رہنے کے لیے مالابار ہل پر کوٹھیوں کا معائنہ کرنے لگے۔ سواری کے لیے موٹر کار ضروری ہو بڑے بڑے تاجروں اور لکھ پتی اور کروڑ پتی سیٹھوں سے ملاقات کرنی ہو وکٹوریہ یا دوسری گاڑیوں میں جانے سے آدمی نظروں سے گر جاتا ہے اس لیے دن میں کئی کئی پھیرے موٹر خانوں کے بھی ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات ان منصوبوں کے متعلق اختلاف بھی ہو جاتا تو بحث بڑی تیز اور گرم ہو جاتی، مگر تھوڑی دیر بعد پھر ہنسی خوشی اصل موضوع پر گفتگو ہونے لگتی۔ خیال کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس کی سیر میں جو لطف آتا ہے۔ وہ کسی تفریح اور کسی عیش میں نہیں ملتا اور جب ایسے دو قابل ادیب اور شاعر اس دنیا میں بیٹھیں گے تو کیا کیا گل نہ کھلائیں گے۔

شیخ چلی علیہ الرحمۃ ایسے مورکھ نہ تھے جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ معقول پسند آدمی تھے۔ ہر بات کو عقل کی ترازو میں تولتے، بہت سوچ بچار کرتے اور مہینوں سوچتے، جب تک عقلی دلائل سے ثبوت بہم نہ پہنچتا قائل نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علت و معلول کے باہمی تعلق کے سختی سے پابند تھے۔ انھوں نے جتنے منصوبے بنائے وہ علت و معلول کی زنجیر میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان میں کسی منطقی غلطی کا امکان نہ تھا اور اس نظر سے ان پر کوئی حرف گیری نہیں ہو سکتی، باوجود ان عقلی اور منطقی احتیاط اور صغریٰ اور کبریٰ کی صحیح ترتیب اور صحیح استنباط کے وہ کیوں ناکام رہے؟ اس لیے کہ خیالی دنیا اور عملی دنیا میں بُعد المشرقین ہے۔

غرض ان دونوں صاحبوں نے بمبئی کی تجارت گاہوں، کمپنیوں، مشہور

دکانوں کا غور سے معائنہ کیا اور مختلف اقسام اور مختلف ممالک کے سامانوں کی جانچ پڑتال کی۔ ایک دستی یعنی نوٹ بک ہر وقت اُن کی جیب میں رہتی تھی جہاں کوئی کام کی چیز نظر پڑی فوراً ٹانک لی۔ دیکھنے بھالنے، بحث وتکرار اور مشورے کے بعد جب اصل مرحلے طے ہو گئے اور بات پختہ ہوئی تو انھوں نے اپنے تمام مشاہدوں تجربوں، مشوروں کی بنا پر ایک کام کا پروگرام تیار کیا۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک پر نظر ڈالی اور کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی چھوٹنے نہ پائی۔ اس میں بڑی سر دردی کرنی پڑی اور اس دوران میں بعض معاملات ایسے آئے جن پر گھنٹوں بحث رہی۔ خدا خدا کرکے یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ یہ سب متفقہ طور پر طے شدہ امور، جو کوئی دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے تھے، نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ کرائے گئے۔ نہایت نفیس سنہری جلد کی کتاب بن گئی۔ دوسرے دن انھوں نے اپنے بعض ہم خیال اور ہم دانش دوستوں کو گرین ہوٹل میں فسٹ کلاس ڈنر دیا اور یہ کتاب ان کے سامنے پیش کی اور اس کے بعض حصے سنائے اور کچھ زبانی تشریح کی۔ سب نے اسے پسند کیا اور دونوں کو دلی مبارک باد دی اور کامیابی کی دعائیں کیں۔

دوسرے دن اتوار تھا انتظام وغیرہ میں صرف ہوا تیسرے دن اللہ کا نام لے کر انھوں نے ایکسپورٹ امپورٹ کا دفتر کھولا اس کا نام اورینٹل کمرشیل ایجنسی ہے جو پہلے ہی طے ہو چکا تھا ایک شاندار بورڈ پر اردو انگریزی دونوں زبانوں میں خوبصورت حروف میں لکھوا کر لگوایا گیا۔ سامان کی فرمائشیں پہلے ہی غیر ملکوں کو جا چکی تھیں، جاپان سے ریشم اور اون کا سامان، چین سے چینی ظروف، تصویریں اور پردے، افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان، فرانس سے زیبائش و آرائش کی اشیاء، اور نہ معلوم کہاں کہاں سے کیا کیا درآمد کیا۔

سامان ایسا نفیس اور دل کش تھا کہ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ مگر یہ خوشی کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ تجارت جسے معمولی چیز سمجھے ہوئے تھے "علم دریاؤ" نکلی۔ ہر فن اور ہر پیشے کے کچھ گر ہوتے ہیں اس کے ساتھ تجربہ اور طبیعت کی مناسبت لازمی شرطیں ہیں۔ یہ دونوں گریجویٹ جن کی سات پشت میں کسی نے تجارت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور جو نہ کبھی تجارتی ماحول میں رہے، چوبیس پچیس سال اسکولوں اور کالجوں میں گزارے، اس کے بعد دو چار دفتروں کی خاک چھانی بس یہ تھی اُن کے تجربے اور دنیا شناسی کی ساری کائنات۔ اس برتے پر درآمد برآمد کی تجارت خام خیالی نہ تھی تو کیا تھی؛ نتیجہ یہ ہوا کہ پونجی کم ہوتی گئی۔ مال کی نکاسی برائے نام ہوئی۔ جب انتظار اور صبر کی گنجائش باقی نہ رہی تو بصد یاس و حسرت دکان بڑھانی پڑی۔ انسان کی صلاحیت اس میں ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کو پہچانے۔ اس کی نہ ہمارے بزرگ پروا کرتے ہیں نہ ہمارے معلّم اور اُستاد۔ لڑکے اسکولوں اور کالجوں میں اس طرح داخل کر دیے جاتے ہیں جیسے بھیڑ بکریاں باڑے میں۔ پڑھتے پڑھتے جب امتحانوں کی آزمائش سے صحیح سلامت نکل آتے ہیں تو بھٹکتے پھرتے ہیں، مہینوں دفتروں کے چکر کاٹتے ہیں۔ بُرا بھلا جو موقع ملتا ہے صبر شکر کرکے قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب چند ہی ہوتے ہیں جنھیں اپنے ذوق کے موافق کوئی کام مل جاتا ہے۔ یہ تعلیم جو ڈیڑھ سو برس سے ہمارے ملک میں جاری ہے ایک ہی ڈھرے پر چلی آرہی ہے چھوٹی موٹی اصلاحوں سے کام نہیں چلتا انقلابی اصلاحوں کی ضرورت ہے۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے دونوں دوست ایک لُٹے پٹے قافلے کے مسافروں کی طرح چلے آرہے ہیں، بچا کھچا سامان بھی ساتھ ہے جس سے ان کی نفاستِ ذوق کا پتہ لگتا تھا۔ ان میں سے بعض اشیا، حیدرآبادی دوستوں نے

خرید لیں۔ ایک دو چیزیں اب بھی میرے پاس بطور یادگار باقی ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں رسّی تڑاکر بھاگے تھے پھر اُسی تھان پر آگئے اور طوقِ غلامی خوشی خوشی اپنے گلے میں ڈال لیا۔ سید صاحب کو صدر نظامت کوتوالی میں مترجمی کی خدمت مل گئی۔ اب پھر دو دوست ایک جگہ ہو گئے اور خوش تھے۔ یہ خوشی یکجائی کی وجہ سے تھی ورنہ جس قدردانی کے وہ مستحق تھے وہ انھیں نصیب نہ ہوئی۔

اسی زمانے میں مولوی ظفر علی خاں نے دکن ریویو نکالا۔ یہ خوب چمکا اور مقبول ہوا۔ اکثر تنقیدی علمی و ادبی مضامین بڑے پائے کے تھے محفوظ علی صاحب ظفر علی خاں صاحب کے مشیر تھے اور کچھ نہ کچھ لکھنا بھی پڑتا تھا۔ میں بھی اس میں گاہے گاہے لکھتا تھا۔ میرا ایک مضمون "عالمِ اسلامی" کے نام سے باقساط نکلا جو چار سو صفحات تک پہنچ گیا تھا۔ اسی کو دیکھ کر مولانا حالی نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت لطف آیا، نہایت پرزور مضمون لکھا ہے۔ آپ ہی کا حصہ تھا۔ مگر برٹش فارن پالیسی پر اس میں جا بجا نوک جھوک کی گئی ہے وہ سراسر خلافِ مصلحت ہے۔۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں۔ اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو للہ آپ اس سلسلے کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے گا۔"

دکن ریویو جب تک رہا بڑی شان سے رہا اور علمی حلقوں میں اس نے بڑا نام پایا سید صاحب بہت دنوں حیدرآباد میں رہے۔ وطن کی یاد نے انھیں بیتاب کر رکھا تھا۔ آخر ایک روز وہ نوکری چھوڑ چھاڑ وطن کو سدھارے۔ وہاں زیادہ دن چین سے نہ بیٹھنے پائے۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا کلکتہ چھوڑ کر دلی آگئی اور دلی

پھر ایک بار سلطنت کی راجدھانی قرار پائی تو مولانا محمد علی بھی کلکتہ کا قیام ترک کرکے دلّی آگئے اور یہاں سے انھوں نے اُردو کا ایک ہفتہ وار اخبار ہمدرد جاری کیا اس میں سید صاحب بھی پکڑے گئے۔ اس میں ان کے بعض مزاحی مضمون نکلے جو لوگوں نے بڑے شوق سے پڑھے مگر یہ جم کے دلّی میں نہ رہے، کسی نہ کسی ترکیب سے بدایوں جا پہنچتے، مولانا محمد علی بہت "جھنجھلاتے" خط لکھتے، آدمی بھیجتے، مگر یہ مشکل سے ہاتھ آتے، جو کوئی انھیں پکڑنے جاتا اُسے لطیفے اور حکایتیں سُنا کر خوب خوش کرتے اور کہتے تم چلو میں ایک آدھ روز میں ضروری کام سے فارغ ہوکر پہنچ جاؤں گا۔ عدالت میں صرف ایک پیشی کا کام رہ گیا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی مجھے پہنچا جانو۔

حیدرآباد میں ان کے بڑے فرزند ابن علی پولیس میں ملازم ہو گئے تھے ان سے ملنے کے لیے وہاں گئے، اُس زمانے میں میں بھی حیدرآباد میں تھا ان کو ابن علی کی پولیس کی ملازمت پسند نہ تھی مجھ سے بار بار کہتے تھے اسے کسی طرح پولیس کی ملازمت سے نکال کر کسی اور محکمے میں لگا دو۔ میں نے کوشش بھی کی لیکن اس کے بالا افسروں نے کہا کہ یہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ پولیس میں بہت کم ہیں، بہت ترقی کریں گے، انھیں یہیں رہنے دو۔ چند سال کے بعد دوبارہ حیدرآباد گئے۔ اتفاق سے ان دنوں میں بھی دلّی سے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ کئی روز بہت پُرلطف صحبت رہی۔ دلّی اگرچہ بدایوں سے قریب ہے مگر وہاں اُن سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا ملاقات ہوئی تو حیدرآباد دکن میں۔ جب انجمن اورنگ آباد سے دلّی منتقل ہوئی تو میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ دن انجمن میں آکر رہیں اور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ وعدہ کرتے رہے مگر کبھی دلّی آنے کی توفیق نہ ہوئی، میں ہی ایک آدھ بار بدایوں گیا۔ حیدرآباد کی ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ بدایوں سے باہر نہ گئے اور آخر دم تک وہیں رہے۔

سید محفوظ علی خاص وضع و خیال کے آدمی تھے۔ ان میں قدیم روایات اور جدید خیالات ایک حد تک ساتھ چلتے تھے اور بس۔ مثلاً مغربی علوم کی تعلیم کے حامی تھے۔ وہ ان توہمات اور باطل خیالات کے مخالف تھے جو قدامت یا مذہب کے نام سے قوم میں مروج تھے۔

زمانے کے تقاضوں کا پورا کرنا ضروری سمجھتے تھے کیونکہ جو قوم زمانے کا ساتھ نہیں دیتی وہ زندہ نہیں رہتی۔ اُنھوں نے انگریزی تعلیم پوری حاصل کی علی گڑھ کالج میں کئی سال رہے لیکن کبھی اپنے لباس میں تبدیلی نہیں کی وہی اچکن اور پاجامہ، سر پر عمامہ یا معمولی ٹوپی یا کبھی کبھار ترکی ٹوپی پہن لیتے تھے، ڈاڑھی مونچھیں کبھی اُسترے سے آشنا نہ ہوئیں۔ مذہب کے بہت پابند تھے۔ تمام ارکان اسلام احتیاط سے ادا کرتے تھے۔ آخر میں حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ پردے کے حامی تھے اور عورتوں کی آزادی جیسی کہ آج کل پائی جاتی ہو نا پسند کرتے تھے۔ اپنی زبانوں اور مذہب کی تعلیم کو مسلمانوں کی قومیت کے لیے لازم خیال کرتے تھے، آرائش و زیبائش کی اشیاء کو کبھی ہاتھ نہ لگایا، اُن کا لباس، رہنا سہنا نشست و برخاست ملنا جلنا سب قدیم طرز کا تھا، مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کے بڑے حامی تھے۔ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ بدایوں میں بچوں کی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ ان سب باتوں کے باوجود زمینداری کی خو بو اُن کے مزاج سے نہ گئی یہی وجہ ہو کہ وہ اپنے وطن اور زمینداری کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جم کے نہ رہے، مولانا محمد علی نے کیسے کیسے جتن کیے کہ وہ اُن کے پاس دلّی میں رہیں اور ہمدرد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں مگر وہ کسی طرح ہتے نہ چڑھے۔

قصبات کے شرفا کو اپنی شرافت پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ وہ اہل شہر کو پسند نہیں کرتے اور اُن کے اخلاق و عادات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، قصبات

کے شرفا، اپنی وضعداری اور روایات کے سختی سے پابند ہوتے ہیں، ان پر جان دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ شادی بیاہ میں یا جہاں عزت کا معاملہ ہوتا ہے۔ بے دریغ خرچ کرنے میں مضائقہ نہیں کرتے۔ دوستی اور دشمنی دونوں میں بڑے شدید ہوتے ہیں انتقام کا مادہ بھی کم شدید نہیں ہوتا۔ ایک ایک انچ زمین کے لیے، درخت کی ایک ایک ٹہنی پر لڑ مرتے ہیں اور خون خرابے تک نوبت آجاتی ہے۔ مقدمہ بازی زمینداری کا لازمہ ہے۔ عدالت ان کا دوسرا گھر ہے۔ آئے دن مقدمہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ بعض زمیندار مقدمہ لڑتے لڑتے قانون میں ایسے ماہر ہو جاتے ہیں اور ایسے ایسے نکتے نکال لیتے ہیں کہ وکیل منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں سید صاحب ایسے زمیندار تو نہ تھے مگر پھر بھی زمیندار تھے۔

پہلی نظر میں وہ قدیم وضع کے سنجیدہ بزرگ معلوم ہوتے تھے لیکن وہ بڑے زندہ دل ظریف اور خوش طبع شخص تھے، بڑے بڑے مزے کے لطیفے سنایا کرتے تھے اور باتوں باتوں میں مزاح کی کوئی ایسی پُر لطف بات کہ جاتے تھے کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ دلّی کی ایک مجلس میں جہاں حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی اور دوسرے اہل علم اور صاحب ذوق تشریف رکھتے تھے۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی کے ذوق ادب پر بحث ہو رہی تھی اس بحث کے اثنا میں سید محفوظ علی نے چپکے سے کہا کہ اس بارے میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں دونوں بزرگوں کے ذوق کے نمائندے مولانا ابوالکلام آزاد اور جسٹس عبدالرحمٰن موجود ہیں، ان سے ان بزرگوں کے ذوق کا اندازہ کر لیجیے۔ یہ سنتے ہی ساری محفل پھڑک اٹھی۔ ایسے ان کے بہت سے لطیفے ہیں جن کے لیے الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ ان مضامین میں جو اس مجموعے میں شامل ہیں، ان کی ظرافت اور لطیف مزاح اور طنز کے نمونے ملیں گے، مثلاً وہ اخبار میں

کا ذکر کرتے ہوئے اخبار مشرق کا نام نہیں لیتے بلکہ اُسے "اخبار مخالف قبلہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو لوگ اس وقت کے اس اخبار سے واقف ہیں وہ اس میں پر لطف خفیف طنز محسوس کریں گے۔ اپنے مضمون "افریقہ کا مسافر" میں اتوار کے روز جہاز میں گرجا کی نماز ہوتی ہے۔ یہ اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس مذہبی عبادت میں کتنے لوگ شریک تھے اور وہ کس حیثیت اور نوعیت کے تھے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

> مردوں میں ایک تو ۸۰ سے متجاوز پادری تھے اور دوسرے ایک تیمورلنگ فوجی افسر تھے جو ٹانگ میں گولی چھپاکر تبت سے بھاگے تھے اور یہ حسبِ رخصت علالت ولایت جا رہے تھے۔ چھت کے ادھر عین نماز کے وقت تاش ہو رہا تھا۔ چوں کہ چھت پر نماز کا کمرہ صاف نظر آرہا تھا لہذا ایک بڑے میاں نے جو شریکِ صحبت تاش تھے بہ مقتضائے اس تعلق خاطر کے جو آخر عمر میں مذہب سے ہو جاتا ہے اتنا کیا کرسی چھت کے کنارے کی طرف رکھ لی تھی کہ تاش کھیلتے کھیلتے جب دنیا کی بے ثباتی کا خیال آجائے تو مناجات کا بھی ایک آدھ حرف سُن لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان دلوں پر مذہب کی حکومت ابھی بہت کچھ ہے۔"

اس آخری جملے میں طنز قابل دید ہے۔

سید صاحب، صاحبِ ذوق تھے، ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ الفاظ کی تحقیق کا بہت شوق تھا، اس کا کافی ذخیرہ جمع کیا تھا۔ بعض تاریخی موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھ رہے تھے جو آخر تک نامکمل مسودوں کی صورت میں رہے اور اب نہ معلوم ان پر کیا گزری۔ وہ نام نمود سے بہت بچتے تھے اور اپنے کام کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ مضامین بھی جو اس مجموعے میں شامل ہیں فرضی

ناموں سے لکھے۔ افسوس کہ ہمیں ان کے اتنے ہی مضامین مل سکے، باقی اور بھی ہوں گے، اگر کبھی ملے تو ان کو شائع کردیا جائے گا۔

سید صاحب کی نثر میں پختگی اور شگفتگی ہے اور ادائے خیال میں بعض وقت وہ بہت خوبصورت اسلوب اختیار کر لیتے ہیں اور خصوصاً جہاں ظرافت یا مزاح کا موقع آجاتا ہے وہاں اپنے بیان اور الفاظ کے استعمال میں بڑی جدت اور ذہانت سے کام لیتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ مضامین جو خاص حالات میں لکھے گئے تھے اور ایک خاص ادبی شان رکھتے ہیں قدردانی سے محروم نہ رہیں گے۔

۱۹۵۶ء

# مقدمہ

## خطبات گارساں دتاسی

عرصہ ہوا جب سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) انگلستان تشریف لے گئے اور انڈیا آفس لائبریری میں کام کر رہے تھے تو حسن اتفاق سے فرانس کے مشہور مستشرق موسیو گارساں دتاسی کی یہ کتاب جس کا اصلی نام "ہندستانی ادب از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء" ہے اور جو اب اردو میں "خطبات گارساں دتاسی" کے نام سے شائع کی جا رہی ہے ان کی نظر پڑی۔ نواب صاحب موصوف دتاسی کے نام سے بہت پہلے سے واقف تھے کیوں کہ وہ ان کے والد مرحوم سید محمود کے دوست تھے، نیز انھوں نے سر سید مرحوم کی مشہور کتاب "آثار الصنادید" کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا تھا، نواب صاحب فرماتے تھے کہ "جب میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو میرے دل کی عجیب کیفیت تھی اور اس خیال سے میری مسرت اور فخر کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ایک نامور عالم جو غیر ملک کا رہنے والا ہے۔ سالہا سال تک میری مادری زبان کے مطالعے اور عالمانہ تحقیق میں مصروف رہا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہندستان کے کسی بڑے سرکاری عہدے پر مامور تھا بلکہ اس لیے کہ وہ بغیر کسی دنیاوی غرض کے محض علم کی خاطر اس زبان سے محبت کرتا تھا۔" اسی وقت سے انھوں نے یہ ٹھان لی کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں ضرور

ہونا چاہیے۔

جب وہ انگلستان سے حیدرآباد واپس آئے تو انھوں نے یہ کتاب مجھے دکھائی اور خود توجہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ابتدائی چھ خطبے ترجمہ کر کے بھی دیے لیکن بعض مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اس کام کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ اب مجھے کسی دوسرے مترجم کی تلاش ہوئی۔ تین خطبوں (ساتویں، آٹھویں، نویں) کا ترجمہ میں نے بہ جبر عبدالباسط صاحب بی۔ اے سے کرایا جو بمبئی کے روزانہ اخبار "بمبئی کرانیکل" میں کام کرتے ہیں۔ ایک ایسے شخص سے جس کے ذمہ روزانہ اخبار کی ترتیب ہو، کسی دوسرے کام کی توقع رکھنا عبث ہے۔ آخر اُن سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ مصنف نے اپنی کتاب کے پانچویں خطبے میں کچھ اضافہ کر کے اسے "ہندستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف" کے نام سے الگ کتابی صورت میں شائع کیا تھا، میں نے پانچویں خطبے کے بجائے اس اضافہ شدہ مقالہ کو اس کتاب میں درج کر دیا ہے۔ اس کا ترجمہ مسز پھنال نے کیا۔ باقی تمام خطبوں کے ترجمے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس)، ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی نے کیا۔ جس کے لیے میں ان کا بہت شکرگزار ہوں۔

یوں تو ایسے مستشرقین کی اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے اُردو زبان کی قابلِ قدر خدمت کی ہے لیکن ان میں خاص کر دو ایسے گزرے ہیں جن کا اردو پر بڑا احسان ہے ایک جان گلکرسٹ، دوسرا گارساں دتاسی۔

گارساں دتاسی فرانس کے بندرگاہ مارسیل میں ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا، جیسا کہ خود اُس نے ایک جگہ لکھا ہے وہ عام تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیرس پہنچا اور السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر سل وستر دی ساسی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوا اور عربی اور ترکی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ جس طرح پروفیسر براؤن نے ترکی پڑھتے پڑھتے فارسی کی طرف توجہ کی، کیونکہ بغیر فارسی کے علم کے ترکی کا مطالعہ کامل نہیں ہو سکتا،

اسی طرح گارساں دتاسی نے عربی اور ترکی کے ساتھ فارسی کی تحصیل شروع کردی۔ مشرقی السنہ کے شوق ہی نے اسے اُردو کی طرف متوجہ کیا۔ آخر اس میں اُس نے ایسا کمال حاصل کیا کہ پیرس کے السنۂ مشرقیہ کے کالج میں ہندستانی زبان کی پروفیسری کی ایک جدید خدمت قائم کی گئی اور اس پر گارساں دتاسی کا تقرر کیا گیا۔

پروفیسر اُردو کی حیثیت سے انھوں نے بہت قابل قدر کام کیا اور اردو کی تبلیغ و اشاعت اور حمایت کی، جو خدمت انجام دی ہے، وہ اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اس نے متعدد کتابوں کا اردو سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا، کئی کتابیں اُردو صرف و نحو اور اردو ادب و تاریخ پر تالیف کیں، بعض اُردو کتابوں کو صحت اور محنت کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ان سب کی تفصیل یہ ہے:۔

## ترجمے

میر کی مثنوی اژدر نامہ، تحسین الدین کی مثنوی کامروپ، گل بکاؤلی کا خلاصہ مرثیۂ مسکین، سرسید کی آثارالصنادید، اقتباسات اخوان الصفا، نہال چند کی تاج الملوک و بکاؤلی (نثر) باغ و بہار (میر امن)

## تالیفات

اردو زبان کے قواعد، ہندستانی ادب کی تاریخ، خطبات سالانہ، ہندستانی شاعر عورتیں، ہندستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف، ہندستانی فرانسیسی و فرانسیسی ہندستانی لغات کی نگرانی و امداد،

## ترتیب

کلیاتِ ولی، مثنوی کامروپ

یوں تو ان کی تمام ادبی خدمات لائق قدر ہیں لیکن اُن کے تین کام ایسے ہیں جو خصوصیت کے ساتھ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو کلیات ولی کی

ترتیب و اشاعت، دوسرا تاریخ ادب ہندستانی اور تیسرا سالانہ خطبات۔

کلیاتِ ولی کے متعدد قلمی نسخے مختلف مقامات سے حاصل کرکے جمع کیے اور ان کا مقابلہ کرکے بڑی محنت سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا جو ۱۸۳۴ء میں شائع ہوا۔ تاریخ ادب ہندستانی ان کا بڑا کارنامہ ہے اس کے لیے گارساں دتاسی نے بہت بڑا سامان جمع کیا، اُس زمانہ میں اور پھر پیرس میں بیٹھ کر اس قدر مطبوعہ نسخوں اور قلمی تذکروں کا فراہم کرنا اور معلومات کا بہم پہنچانا فی الواقع حیرت انگیز ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ عظمیٰ و آئرستان کی مجلس تراجم کے سلسلۂ مطبوعات میں شریک ہے۔ اسے مصنف نے ملکۂ معظمہ برطانیہ کے نام پر ان کی اجازت سے معنون کیا تھا۔ اس ایڈیشن کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں اور دوسری ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔ درمیانی وقفہ میں بہت سا نیا مسالہ جمع ہوگیا جو بطور ضمیمہ شائع کیا گیا۔ مرور زمانہ سے جدید معلومات کا اور اضافہ ہوتا گیا اور آخر ۱۸۷۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ جو تین جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کی ترتیب قدیم تذکروں کے طرز پر ہے یعنی بہ ترتیب حروف ابجد اردو اور ہندی مصنفین اور شعرا کا ذکر ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس میں زیادہ تحقیق اور تنقید سے کام کیا گیا ہے اور مصنف نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو قدیم تذکروں اور کتابوں سے ہر مصنف کے متعلق معلومات جمع کیے جائیں۔ اس کے علاوہ ایک بات جو ہمارے تذکروں میں مفقود ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ہر مصنف یا شاعر کے کلام سے بعض ایسے نتائج اور معلومات اخذ کیے ہیں جن سے اس کی زندگی اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں جا بجا غلطیاں پائی جاتی ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں بہت سی ایسی معلومات ظہور میں نہیں آئی تھیں جو اس وقت ہماری دسترس

میں ہیں۔ دوسرے آخر وہ غیر ملک کا شخص تھا اور کبھی ہندستان آنے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا، اس سے ہمارے ادب اور ہمارے معاملات کے سمجھنے میں کہیں کہیں غلطی کا سرزد ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب اس بات پر ہے کہ اس اجنبی شخص نے ہندستان سے ہزارہا میل کے فاصلے پر پیرس میں بیٹھ کر ہمارے ادبیات پر ایسی بے مثل اور عجیب کتاب لکھ ڈالی۔

آخر میں ان خطبات کے متعلق چند الفاظ لکھنا چاہتا ہوں جو اُردو زبان کے قالب میں پہلی بار آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، انھیں بھی اُردو ادب کی تاریخ کا ایک جز سمجھنا چاہیئے۔ بحیثیت پروفیسر کے گارساں دتاسی کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ ہر سال کے آخر میں ایک لکچر دیتا تھا جس میں وہ اُس سال کے ادبی ارتقا پر تبصرہ کرتا تھا یعنی اس سال ہندستانی اور ہندی میں کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں، کون کون سے نئے اخبار یا رسالے جاری ہوئے۔ کتنے جدید مطبعے قائم ہوئے، کن کن مصنفوں نے ادب میں اضافہ کیا، یہ تمام معلومات وہ مختلف ذرائع سے اور خصوصاً ہندستان کے عہدہ داروں کے توسط سے بذریعہ خط و کتابت برابر حاصل کرتا رہتا تھا، وہ صرف نام گنوانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ تبصرہ ایک طرح کی تنقیدی حیثیت بھی رکھتا ہے وہ ساتھ ساتھ ہر کتاب اور اخبار اور رسالے کی حقیقت اور قدر و قیمت بھی بیان کرتا جاتا ہے اور مصنفین کے حالات اور مساعی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ مختلف ادبی مباحث کے ضمن میں وہ بعض اوقات ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا تذکرہ بھی خاص انداز سے کر جاتا ہے۔ ان میں ہمیں بعض باتیں ایسی نظر آئیں گی جن سے اس وقت کی دوسری کتابیں اور تاریخیں خالی ہیں۔ ان خطبات میں بھی کہیں کہیں ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جنھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے لیکن ان خفیف اسقام سے

کتاب کی عظمت اور اہمیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ان خطبوں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اُردو زبان سے دلی لگاؤ ہے وہ اسے ہندستان کی ترقی پذیر اور عام زبان خیال کرتا ہے، اور ہر موقع پر ہندی کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتا ہے اور اس کے فروغ اور ترقی کا دل سے خواہاں ہے۔ ایک دوسری بات یہ مترشح ہوتی ہے کہ وہ پکا عیسائی ہے اور عیسائی مبلغین کی کوششوں کو بڑے شوق سے بیان کرتا ہے اور عیسائی مذہب کی اشاعت کا متمنی ہے۔ تیسری بات جو وہ صاف صاف کہتا ہے یہ کہ ہندستان میں انگریزی حکومت باعثِ برکت و خیر ہے۔

یہ خطبے ۳ دسمبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوئے اور ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء تک باستثنا ۵۸ء کے جسے ۵۷ء کی شورش کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے برابر جاری رہے۔ یہ ۱۹ سال کی مسلسل کاوش کا نتیجہ ہیں۔ بقول نواب مسعود جنگ بہادر کے "تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اس کتاب کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک یعنی ۱۹ سال کے عرصہ میں ہمارے ادب و زبان میں کن اصول پر کام انجام پایا۔ نیرنگئ تقدیر دیکھئے کہ ہمیں اپنی زبان کی تدریجی ترقی کے حالات کے لیے ایک فرانسیسی سے رجوع کرنا پڑتا ہے جس نے ۸۵ سال قبل اس طرف توجہ کی تھی۔ ہماری ادبی تاریخ میں جو کمی نظر آتی ہے، وہ اس ترجمے سے بہت کچھ پوری ہو جائے گی۔"

گارساں دتاسی بلاشبہ بڑا آدمی تھا۔ اس نے عمر بھی بڑی پائی، چوراسی برس کی عمر میں ۱۸۷۸ء میں انتقال کیا۔ وہ عمر بھر علمی مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔ ہندستانی زبان سے اس کا شغف عشق کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا کارنامہ اس قدر وقیع ہے کہ وہ ہماری زبان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایک

لمحہ کے لیے سوچیے اور دیکھیے کہ یہ منظر کس قدر عجیب اور دلچسپ ہے کہ ایک بڈھا فرانسیسی عالم ہندستان سے کالے کوسوں دور پیرس کی یونیورسٹی میں اپنے یورپین شاگردوں کو (جن میں فرانسیسیوں کے علاوہ دوسری قوم کے لوگ بھی شریک ہیں) ہندستانی زبان پر بڑے جوش اور شوق سے لکچر دے رہا ہے اور ان کے دلوں میں اس غریب زبان کا شوق پیدا کر رہا ہے، اپنی فرصت کا تمام وقت اسی زبان کی تحقیق میں صرف کرتا ہے۔ اہلِ زبان اور غیر اہل زبان دونوں سے خط و کتابت کرتا ہے۔ ایک ایک کتاب، ایک ایک اخبار اور رسالہ کا حال پوچھتا ہے، قلمی نسخوں کی نقلیں منگواتا ہے، اُن کی تصحیح کرتا ہے، مرتب کر کے چھپواتا ہے، خود اس زبان کی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتا ہے اور ہندستانی ادب کے مختلف شعبوں پر بحث کرتا ہے اور اس کی مفصل اور مبسوط تاریخ لکھتا ہے اس سے بڑھ کر انسان کے بڑے ہونے کی کیا علامت ہو سکتی ہے۔

اُردو زبان والے اس کا جس قدر احسان مانیں کم ہے۔

ان خطبات میں جہاں جہاں فاضل مصنف سے کوئی لغزش یا فروگذاشت ہو گئی تھی اس کی تصحیح و تکمیل میں نے حاشیہ میں کر دی ہے۔ میں آخر میں اپنے قابل شاگرد شیخ چاند صاحب ایم۔ اے۔ ال ال بی (ریسرچ اسکالر) عثمانیہ کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے طبع کے وقت پروف پڑھنے اور اُن کی تصحیح کا کام بڑی محنت سے انجام دیا۔ اس کے علاوہ متن کے بعض مقامات پر جو میری نظر سے رہ گئے تھے، انھوں نے مفید حاشیوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

۲۸ / اگست ۱۹۳۵ء

سیف آباد حیدرآباد دکن

# مقدمہ

## ناقابلِ فراموش

دنیا میں پند و نصیحت کی ہزارہا کتابیں ہیں۔ ایک سے ایک اچھی۔ اور ہر زبان میں ہیں۔ الہامی اور آسمانی صحیفے بھی ہیں۔ اخلاق و کردار پر تقریریں اور وعظ بھی ہوتے ہیں ماں باپ اپنی اولاد کو وقت بے وقت نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو سمجھاتے اور ہدایت کرتے ہیں لیکن یہ تدبیریں کچھ زیادہ کارگر اور موثر ثابت نہیں ہوتیں۔ ایک میں حکم و فرمان ہے اور دوسری پھیکی اور بے مزہ جس میں کوئی دلکشی نہیں۔ تعلیم کے لیے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ ذہنی قابلیت اور امتحانات کرنے کے لیے اچھی درس گاہیں ہیں لیکن اخلاق اور کردار کی بلندی جغرافیہ اور ریاضی کی طرح پڑھنے اور رٹنے سے میسر ہوتی ہے نہ پروفیسروں کے لکچروں سے۔ یہ نایاب شے صالح صحبت اور شائستہ ماحول ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بلا شبہ یہ ایک کارگر اور موثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے نمونے نصیب نہیں ہو سکتے خصوصاً اس زمانے میں جبکہ دولت اور اقتدار کی ہوس مقصدِ حیات بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا صرف ایک ہی بدل ہے وہ یہ کہ ان اولوالعزم برگزیدہ ہستیوں کی آپ بیتی یا حالاتِ زندگی مطالعہ کے لیے پیش کیے جائیں جنھوں نے اپنی خودی کو مٹا کر جان اور مال اور اپنا سب کچھ اپنی قوم یا وطن یا خلقِ خدا کی خدمت کے لیے نثار

کر دیا، جن کی بے نفسی، فروتنی، بے لوث خدمت اور عزم راسخ نے افراد یا قوموں کی قسمتیں بدل دیں یا جن کی حق پرستی، باطل شکنی اور راست گوئی کے کارناموں نے مردہ دلوں میں نئی رُوح پھونک دی۔ ان حالات کو پڑھ کر دلوں میں امنگ، ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی بننے اور ویسے ہی کام کرنے کا شوق دلوں کو گدگداتا ہے۔

یہ کتاب "ناقابل فراموش" بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے اس میں ایک ایسے شخص کے تجربوں اور مشاہدوں اور تاثرات کا بیان ہے جو عمر بھر حق کی حمایت میں باطل سے دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور اس کی بدولت اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور عقوبتیں سہیں، اس پر چوری جعل سازی، سازش، کوکین بیچنے، نوٹ بنانے کے عجیب الزامات لگائے گئے، جھوٹے مقدمات چلائے گئے اور اس کی پاداش میں اُسے بارہا جیل خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے ایسے ایسے والیان ریاست کا مقابلہ کیا جن کی قوت اور دولت بے حساب تھی اور جنھوں نے بڑوں بڑوں کو نیچا دکھایا تھا۔

دیوان سنگھ کا گھر مظلوموں اور ظلم رسیدوں کی پناہ گاہ تھا۔ وہ اپنی فریاد لے کر ان کے ہاں پہنچتے یا لکھ کر بھیجتے۔ ان میں امیر غریب رئیس سبھی قسم کے لوگ تھے۔ جب تحقیق ہو جاتا کہ شکایت صحیح ہے تو وہ ان کی حمایت کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ ان میں اکثر ظالم جابر، بے درد والیانِ ریاست کے ستائے ہوئے ہوتے تھے جن کے مقابل ہوتے ہوئے بڑے بڑے بہادر سورماؤں کے پتّے پانی ہوتے تھے۔ سردار صاحب نے ایک جگہ مسٹر ہارنی مین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اخبار نویس دنیا میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے پیدا ہوا ہے جو مصائب میں مبتلا ہوں، ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو عیش و آرام میں ہوں۔" دیوان سنگھ نے ہارنی مین کے اس قول پر ہمیشہ عمل کیا اور جان جوکھوں میں ڈال کر مظلوموں کی حمایت کی۔ اگرچہ اس کی بدولت انھیں بہت سے

بُرے دن دیکھنے پڑے۔ پندرہ بار گرفتار ہوئے اور آٹھ جیلوں کی سیر کی لیکن ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں اور جتنے مقدمات قائم ہوئے اسی قدر ان کی عزت اور وقعت بڑھتی گئی۔ وہ چاہتے تو بغیر زیادہ دوادوش کے گھر بیٹھے بے شمار دولت حاصل کر لیتے لیکن بڑی سے بڑی رشوت اور بڑے سے بڑا لالچ بھی انھیں اپنے اصول میں ڈانواڈول نہ کر سکا۔

یہ آپ بیتی بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اس میں جہاں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار، مظالم اور سازشوں، رشوت کی گرم بازاری۔ پولیس اور حکومت کی چیرہ دستیوں، جیلوں کی زندگی اخلاق کی انتہائی پستی، خود غرضی، ہوا و ہوس، غداری اور نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے وہاں غریبوں کی مہمان نوازی، مخلص دوستوں کی وفاداری اور وضعداری، احسان شناسی اور بے لوث خدمت کا بھی کوئی نہ کوئی واقعہ نظر آئے گا۔ غرض یہ کتاب انسانی فطرت کے مطالعہ کے لیے ایک عجیب مرقع ہے۔

سردار دیوان سنگھ کی زندگی سے ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے۔ ان کی تعلیمی حالت کچھ بھی نہ تھی صرف پانچویں جماعت پڑھنے پائے تھے کہ حالات سے مجبور ہو کر تعلیم ترک کرنی پڑی اور محض اپنے سرگرم شوق اور شب و روز کے مطالعہ سے ایسی لیاقت حاصل کی کہ وہ صحافت (جرنلزم) کی صف اول میں آگئے اور ان کا اخبار آزادیٔ رائے، بے لاگ تنقید اور زورِ بیان کے اعتبار سے بہترین اخبار سمجھا جانے لگا۔ کامیابی کا راز کام کی لگن، محنت اور استقلال میں ہے۔ جو اقوام اور افراد کام سے بھاگتے اور محنت سے جی چراتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام اور غلام رہیں گے۔ کامیابی اور آزادی ان کی قسمت میں نہیں۔

# رسائل

# مقدمۂ رسالہ اُردو

ابتدا سے انجمنِ ترقیٔ اُردو کے مقاصد میں یہ داخل ہی کہ اس کی طرف سے ایک رسالہ شایع کیا جائے لیکن سرمایے کی قلت اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے یہ ضروری مقصد اب تک عمل میں نہ آیا۔ اب حالات اور واقعات بہت کچھ بدل چکے ہیں، انجمن کی حیثیت بھی وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اور اگرچہ اس کا سرمایہ ایسا نہ ہو جس پہ ہم فخر کرسکیں مگر ایک حد تک قابلِ اطمینان ضرور ہی اور گو اس کے ارکان کی تعداد، جیسا کہ ہماری خواہش ہی، ہزاروں تک نہ پہنچی ہو تاہم اس کے سرپرستوں اور حامیوں کی ایک مختصر جماعت ایسی ہی جو اس کی ترقی کی خواہاں اور اس کی اعانت کے لیے دل سے آمادہ رہتی ہی۔ علاوہ اس کے اقتضائے وقت ایک ایسی چیز ہی جس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہی اور جسے وقت پر نہ سمجھنے سے ہمیشہ پچھتانا پڑتا ہی۔ اس کے بعد تامل کرنا یا کسی بہتر زمانے کا انتظار کرنا قابلِ الزام ہوگا۔ اس لیے بعد غور اور مشورے کے یہ قرار پایا کہ اس سال جس طرح بن سکے انجمن کا رسالہ ضرور شایع ہونا چاہیے۔

اب سوال یہ ہی کہ یہ رسالہ کیسا ہوگا؟ معاً اس سوال کے جواب میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہی، کیا اس کی تشریح کی ضرورت ہی؟ انجمن کا مقصد ظاہر ہی اور اس کا رسالہ اس کے مقصد کے تابع ہوگا۔ اس لیے بظاہر کسی تشریح یا توضیح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس بارے میں جب بعض احباب سے گفتگو آئی تو معلوم ہوا کہ

اس کے سمجھنے میں کچھ اُلجھن پیدا ہوتی ہو اور کیا عجب ہو کہ ہمارے بعض ناظرین کو بھی اُردو زبان کے موجودہ رسالوں پر قیاس کرنے سے مغالطہ ہو۔ لہٰذا اس رسالے کی خصوصیت کے متعلق مختصراً کچھ لکھ دینا مناسب ہوگا:

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہو کہ یہ رسالہ خالص ادبی ہوگا۔ یہ مثل کشکول کے نہ ہوگا جس میں ہر قسم کی رطب و یابس اور اَن مل بے جوڑ مضامین بھر دیے جاتے ہیں اور کوئی خاص مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ صرف پیشانی پر اس قدر لکھ دینا کافی ہو:- اخلاقی، تاریخی، معاشی، سیاسی رسالہ" میں نے یہ تعریضاً نہیں کہا، ملک کو ایسے رسالوں کی بھی ضرورت ہو۔ مگر انجمن کا رسالہ ادب اور اس کے متعلقات کی حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا:

اس پر اکثر صاحبوں نے اعتراض کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاغذ کی یہ ناؤ کب تک چلے گی اور یہ مضمون کب تک مساعدت کرے گا۔ بہت ہوا تو دو سال چلے گا اور آخر یہ دفتر تہ کرنا پڑے گا:

میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہو کہ ان صاحبوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا اور روشِ عام اس رائے کا باعث ہوئی ہو۔ اگر ذرا غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ میدان باوجود تنگی کے بہت کچھ وسعت رکھتا ہو اور بجائے خود ایک عالم ہو۔ قلم کا مسافر آبلہ پا نہ ہو تو یہاں وہ وہ منظر نظر آئیں گے جن کے لطف اُٹھانے اور بیان کرنے کو ایک عمر چاہیے۔ نظر کوتاہی نہ کرے تو بہت سے ایسے خزانے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں اور جنھیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں:

کون انکار کر سکتا ہو کہ بہت سے الفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں۔ بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساطِ قدردانی تک

نہیں پہنچا۔

بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گم نامی میں رہ گئیں یا شائع ہوتے ہی ناپید ہو گئیں۔

زبان کے رسم الخط، املا اور انشا میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔

اُردو کی تاریخ اور اس کی نشوونما میں بہت سی منزلیں ابھی طے کرنی باقی ہیں۔

شاہ راہِ زبان سے مختلف شاخیں ایسی پھوٹتی ہیں جن کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ مثلاً خود اُردو اور اس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں۔ ان میں باہم کیا تفاوت اور تعلق ہے اور ملک میں اُن کا کیا درجہ ہے؟

زبان کی ترقی و اشاعت کی بہت سی ایسی تجویزیں ہیں جو ابھی تک عالمِ خیال سے صفحۂ قرطاس پر نہیں آئیں۔ ان پر بحث کرنا، ان کا جانچنا اور ان کو عمل میں لانا بھی بڑا کام ہے۔

تنقید جو ادب کی جان اور ذوقِ سلیم کی روحِ رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلے میں ہے اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔ اس کے بغیر ادب کی خدمت ادا ہونی ممکن نہیں۔

اُردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہییں اور خاص کر جو خدمت انھوں نے اُردو کی کی ہے اُسے وضاحت کے ساتھ دکھانے اور ان کے کلام پر ہمدردانہ اور تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے اَن مول جواہر ہیں جو صاحب نظر ادیب اور شائقینِ ادب کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے اہلِ ملک اسلوبِ بیان، طرزِ تخیل و ادائے مطلب

سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں ؛

خود غیر زبانوں کے ادب کا بیان ہمارے لیے سبق آموز اور عبرت خیز ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس نے کن ذرایع سے ترقی حاصل کی اور اہلِ ملک کے خصائل و عادات پر کیا اثر ڈالا اور مُلک کے اُبھارنے اور بنانے میں کیا کام کیا؟

اس زمانے میں اُردو کے حامی اور بہی خواہ اپنی زبان کو علمی زبان بنانے کے متمنی ہیں اور اس کے لیے بہت کچھ سعی بھی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کس قدر دشوار اور کٹھن منزل ہے۔ جدید اصطلاحات اور نئے خیالات کے لیے الفاظ کی تلاش کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ باوجود ہزار سرگردانی اور جاں کاوی کے بیان تشنہ رہتا ہے اور مطلب ادا نہیں ہوتا۔ بعض اچھے اچھے ذہین اور مستعد اصحاب اس کوہ کنی اور مغز پاشی سے عاجز ہو کر کام چھوڑ بیٹھے ہیں یا یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے خیال و رائے کے مطابق من مانے الفاظ استعمال کرنے لگتا ہے جس سے پڑھنے والے کو سخت اُلجھن ہوتی ہے اور زبان میں کوئی لفظ قائم نہیں ہونے پاتا۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کہاں کریں، ان بحثوں کو کیوں کر پیش کیا جائے اور فیصلہ کس طرح ہو۔ اس کی ایک ہی صورت ہے جو ہمارے آپ کے پیشِ نظر ہے ؛

علاوہ اس کے زبان و ادب کے متعلق اور بہت سے مباحث اور مسائل ہیں جو کتابوں میں نہیں آسکتے جنھیں الگ شایع نہیں کر سکتے۔ ان کی کھپت ایسے ہی رسالے میں ہو سکتی ہے جس کا یہی مقصد ہے تاکہ لوگ اسے پڑھیں ضرورت ہو تو اپنے خیالات اور تنقید سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اور عالمانہ بحث سے سب کو فائدہ پہنچے ؛

پھر ایک بات اور ہے کہ بعض انشا پرداز ایسے بلند نظر اور پاکیزہ مذاق ہیں جو اپنے جگر پارے معمولی اخباروں اور عام رسالوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔ اُن کے لیے بھی تو آخر کوئی سامان ہونا چاہیے ؛

غرض جس قدر غور کیجیے گا اسی قدر اس مضمون میں وسعت نکلتی آئے گی۔ اس قدر لکھنے کے بعد اب ضرورت باقی نہیں رہی کہ میں رسالے کے مقاصد بیان کروں مختصر یہ کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ اُردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقینِ ادب اُسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اُٹھائیں اور اہلِ ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کے پرچے ڈھونڈھتے پھریں ۔

بعض احباب یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں کی آب و ہوا ایسے بلند پایہ رسالوں کے لیے راس نہیں۔ 'تہذیب الاخلاق' اتنے دنوں رہا سوائے محدود قدردانوں کے اس کے خریداروں کی تعداد کبھی زیادہ نہ ہوئی۔ 'معارف' نے بڑا زور مارا آخر اس کا جو حشر ہوا ظاہر ہے۔ 'حسن' بھی چند سال اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہو گیا۔ 'دکن ریویو' بڑے آن بان سے نکلا مگر نہ چل سکا اور بند کرنا پڑا۔ اب تم کس برتے پر یہ نیا رسالہ نکالتے ہو؟

یہ سب سچ ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ 'تہذیب الاخلاق' نے ملک میں انقلاب پیدا کر دیا، خیالات میں ہل چل ڈال دی اور ادب اردو میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اگرچہ اس کے خریداروں کی تعداد محدود تھی اور تین بار نکل کے بند ہوا لیکن جو کام اس نے کیا وہ اُردو زبان میں ہمیشہ یادگار اور لایقِ تعریف رہے گا۔ اب بھی اُس کے مضامین مستقل کتابوں کی صورت میں شایع ہوتے ہیں اور لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور اُردو نصابِ تعلیم کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اس کے مضامین نہ ہوں۔ 'معارف'، اگرچہ ناقدردانی کی وجہ سے بند ہو گیا، لیکن اس کے پُرزور مضامین اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے سارے مُلک میں غلغلہ پڑ گیا تھا۔ اب بھی اس کے مضامین اسی وقعت سے دیکھے جاتے ہیں اور وقت پر اس کے پرچوں کی تلاش

ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اردو زبان کی خدمت نہیں کی اور اپنی ادبیت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر نہیں بٹھا دیا تھا۔ "حسن" اپنے محققانہ مضامین کی وجہ سے اب تک یاد آتا ہے۔ اس وقت کے بہترین انشا پرداز اس کے لکھنے والے تھے۔ اور اس نے اردو زبان میں جو اضافہ کیا وہ ہر طرح قابلِ شکریہ ہے۔ "دکن ریویو" نے اُردو کی کچھ کم خدمت نہیں کی وہ جس آب وتاب سے نکلتا تھا اس کے مضامین جس شوق سے پڑھے جاتے تھے اس کے قدردان اب بھی موجود ہیں۔ اس کی نظم ونثر دونوں اُردو کے لیے مایۂ ناز تھیں۔

اصل یہ ہے کہ کوئی چیز ہونی چاہیے۔ جس مقصد سے جو کام کیا جائے اس کا پُورا حق ادا ہونا چاہیے۔ خواہ وہ ایک سال رہے یا دس بیس سال۔ مگر جب تک رہے اس کی نظر بلندی کی طرف رہے، پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کو جیسی ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نصیب نہیں ہوئی۔ تاہم اس کا رُخ آگے کی طرف ہے۔ لوگوں میں اپنی زبان کی ترقی کا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ہر سال علمی اور ادبی کتابوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نئے نئے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ طرزِ تحریر میں نمایاں فرق ہوتا جاتا ہے۔ ترجمہ وتالیف میں نئی شان نظر آتی ہے۔ قدردانوں کی تعداد بھی روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ لکھنے پڑھنے اور کتابوں کا شوق بھی پہلے سے زیادہ نظر آتا ہے۔ ایسے وقت میں ایک ایسے رسالے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ جہاں حالت امید افزا اور شوق بڑھا ہوا ہے، وہاں تھوڑا سا کھٹکا بھی ہے۔ بعض نئے انشا پرداز جدّت کے دھوکے میں یا تقلید کے غیر محسوس اثر سے بے مزہ، مبہم اور دُور از قیاس استعارات وتشبیہات اور نامربوط، غریب اور بھونڈی ترکیبوں کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کی طرزِ تحریر ہوتی ہے۔ "عربی نہ فارسی نہ ترکی"۔ بعض صاحبوں نے ایسا رنگ اختیار کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نہیں

عربی فارسی لکھ رہے ہیں اور مرزا غالب نے ابتدا میں فارسی آمیزش سے جو اُردو نظم میں رنگ پیدا کیا تھا وہ اب اردو نثر میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرا فرقہ ان سے بھی چار قدم آگے ہی جو انگریزی کا دل دادہ ہی۔ انگریزی الفاظ کا کہیں کہیں استعمال اگرچہ معیوب ہی مگر اتنا نہیں جتنی انگریزی نما اُردو۔ انگریزی نما اُردو سے مراد اُردو کی وہ طرزِ تحریر ہی جو فطرتِ اردو کے خلاف انگریزی ترکیب اور وضع پر لکھی جاتی ہی جس میں اُکھڑے پکھڑے فقروں کو جوڑ کر انگریزی وضع کا ایک طول طویل جملہ بنا دیا جاتا ہی جس کے سامنے ابوالفضل کی نثر بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جملوں کا بھونڈا اور طولانی ہونا تو ایک طرف، اس میں الفاظ کا استعمال اور اُن کی غیر مانوس اور بے لطف ترکیب اور غضب ڈھاتی ہی۔ چند صاحب اس قسم کی اُردو لکھیں تو خیر کچھ مضائقہ نہیں لیکن ڈر یہ ہی کہ اُن کی تقلید میں اگر دوسرے لوگ بھی اسی ڈھرے پر پڑ لیے تو اُردو کی آب رو خاک میں مِل جائے گی۔ کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اُردو زبان کی تاریخ میں ایک ایسا وقت آیا تھا جب کہ اردو طرزِ تحریر پر فارسی عربی کے بے محل اور جا و بے جا استعمال سے فارسی عربی کا رنگ ایسا غالب آگیا تھا کہ اردو کی حیثیت بگڑ چلی تھی۔ خدا خدا کرکے یہ جنون کم ہوا تو اب ایک دوسری بلا نازل ہوئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح فارسیت کے غلبے کو کم ہونے میں ایک مدت لگی، جس کے لیے ہم سرسید، حالی و آزاد جیسے صحیح مذاق اور عالی پایہ انشا پردازوں کے ممنون ہیں، پھر ایک مدت گزرنے کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں اور انگریزیت کے اثر کو مٹانے کے لیے کسی خاص جد و جہد یا لطیفۂ غیبی کا انتظار کرنا پڑے۔ یہ کس قدر ظلم کی بات ہی کہ ہم دوسری زبانوں کو پڑھ پڑھ کر خود پسندی یا غرورِ علمیت میں ان کی آمیزش اور آلایش سے اپنی زبان کو گندہ کر دیں۔ ہر زبان خاص خاص خصوصیتیں رکھتی ہی۔ ہر زبان میں طرزِ ادا کے خاص اسلوب ہوتے ہیں۔ ہر زبان کی فصاحت جداگانہ ہوتی ہی۔ اور اس لیے اس میں لکھنے کے لیے

ان خصوصیتوں کا مطالعہ ضرور اور اُن کی پیروی لازم ہے۔ جدّت کا کوئی مانع نہیں، یہ زبان کا حسن ہے بہ شرطے کہ حسنِ ذوق اس کا ہم نوا ہو۔ کسی ایک زبان کو دُوسری زبان کی خراد پر چڑھانا بدمذاقی ہی نہیں جہالت ہے۔ غلطی کا ہونا اس قدر قابلِ اعتراض نہیں جس قدر بے مزہ، بے جان اور غیر مانوس طرزِ تحریر قابلِ اعتراض ہے، یہ گویا زبان کا گلا گھونٹنا ہے۔ یہ ظاہری لباس کے تغیّر و تبدّل سے فرنگی کو حبشی یا حبشی کو فرنگی بنانا ہے۔

زبان کوئی بے جان یا مردہ شے نہیں ہے۔ یہ بھی دُوسرے جان داروں کی طرح بڑھتی گھٹتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ اس پر بھی آب و ہوا اور گرد و پیش کے دُوسرے حالات کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اگر ہم اس کی صحت اور خوش حالی کے خواہاں ہیں تو ہمیں اس کے اصولِ نشو و نما سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

زبان کے حسن و فروغ یعنی فصاحت کا دار و مدار صحیح ذوق پر ہے اور صحیح ذوق کا پیدا کرنا اور پھیلانا سب سے بڑی خدمت زبان کی ہے۔ جن حضرات کے ہاتھ میں اخبار اور رسالے ہیں انھیں سب سے بڑھ کر یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کیوں کہ ان کی ذمّہ داری بہت بڑی ہے اور عام طور پر لوگ انھیں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

ہمیں کسی کے مقابلے میں کوئی خاص دعوا نہیں لیکن ہم اپنی بساط کے موافق کوشش کریں گے کہ زبان کی خصوصیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، پاک صاف اور شستہ زبان کا استعمال کریں اور ذوقِ سلیم کے پیدا کرنے میں طرح طرح سے مدد دیں۔

اس لیے جانے پہچانے، مقبول و معروف انشاپردازوں اور زبان کے ہواخواہوں ہی سے نہیں بلکہ ان سے بھی جو نام و نمود کے خواہاں نہیں اور گوشۂ عزلت میں رہ کر ادبی ذوق سے خود ہی حظ اٹھاتے ہیں یہ التجا ہے کہ وہ ہماری اس سعی میں ہمیں مدد دیں۔ نیز ان حضرات سے جو کسی بلند پایہ رسالے کے نہ ہونے سے اپنے خیالات کے اظہار میں مضائقہ کرتے تھے یہ درخواست ہے کہ اگر وہ اسے اپنے مذاق کے مطابق پائیں تو اعانت میں دریغ نہ فرمائیں۔

# مقدمۂ رسالۂ سائنس

ہم اپنی نسبت کچھ ہی کہیں لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ ہم سائنس کے علم و عمل میں اس قدر پیچھے ہیں کہ گویا ترقی کرنے والی قوموں کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ ہماری گزشتہ تعلیم کا بہت بڑا حصہ منطق، فلسفہ، ادب و شاعری وغیرہ کے نذر ہوتا تھا اور اب بھی ان مضامین کو ہمارے نظامِ تعلیم میں بہت کچھ دخل ہے۔ اس لیے تخیل نے عمل کی جگہ بھی گھیر لی ہے۔ ایشیائی اور خاص کر ہندی دماغوں کا علاج سائنس ہے۔ اس سے نہ صرف سائنس کی معلومات کا حاصل ہونا مقصود ہے بلکہ اس طریقۂ تحقیق کی تعلیم بھی مدِ نظر ہے جو سائنس ہمیں سکھاتا ہے اور جو علم کی ہر شاخ اور معاشرت کے ہر شعبے کے لیے ضروری ہے۔ ہندستان کے کالجوں میں سائنس کی جو تعلیم ہوتی ہے، اگرچہ وہ بھی ناقص ہے، تاہم جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ لیکن ان درس گاہوں کے باہر اندھیر گھپ ہے۔ چشم بد دور، اردو میں رسالوں کی تعداد کافی ہے اور ہر مہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ جاری ہوتا رہتا ہے، مگر وہ زیادہ تر ادب اور تاریخ وغیرہ سے بحث کرتے ہیں، سائنس کے لیے کوئی رسالہ مخصوص نہیں ہے۔ مشکل یہ پیش کی جاتی ہے اور صحیح بھی ہے کہ سائنس کے مضامین کو اپنی زبان میں کیوں کر ادا کریں۔ اس مشکل کو عثمانیہ یونی ورسٹی نے رفع کر دیا ہے۔ لیکن اس کا دائرہ بھی کالج کے احاطے تک محدود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیض کو عام کر دیں۔

اس خیال سے انجمنِ ترقّیٔ اردو نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کی مساعی کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم اس رسالے کو ڈرتے ڈرتے اہلِ ملک کے سامنے پیش کرتے ہیں اس لیے کہ ہم ابھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک مقصد تو یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو سائنس کے معلومات سے نیز ان خیالات اور ایجادات و اختراعات سے آگاہ کرتے رہیں جو دنیا میں سائنس کے متعلق روز بہ روز ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ خود ہمارے لوگ اپنی تحقیقات کو ملک کے سامنے پیش کریں یا سائنس کے مختلف شعبوں پر محققانہ مضامین لکھیں کوشش یہ کی گئی ہے کہ مضامین عام فہم ہوں، لیکن یہ کام آسان نہیں، تجربہ ہوتے ہوتے معلوم ہوگا کہ ہمیں اس کا کیا ڈھنگ رکھنا چاہیے۔ جامعۂ عثمانیہ نے جہاں اصطلاحات وغیرہ کی وضع میں آسانی پیدا کی ہے وہاں یہ مشکل بھی آپڑی ہے کہ ہم ان الفاظ اور اصطلاحات کو استعمال کرتے کرتے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ باہر والوں کے لیے یہ کہاں تک عام فہم ہیں۔ "عام فہم" پر فاضل ایڈیٹر نے بہت پُرلطف بحث کی ہے اور میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس رسالے کے بعض نقائص سے ہم خود بھی آگاہ ہیں، لیکن جب یہ پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو پھر ہمیں اس کے معائب اور محاسن سے پوری آگاہی ہو جائے گی اور اُس وقت ہم اس کی اصلاح میں زیادہ کوشش کریں گے۔ البتّہ اتنا میں پہلے ہی سے عرض کیے دیتا ہوں کہ ایک دو مضمون اس میں ضرور ایسے ہیں کہ وہ اصطلاحات کی بھرمار سے کسی قدر مشکل ہو گئے ہیں اور اگر زیادہ فکر اور محنت کی جاتی تو کچھ نہ کچھ آسانی ضرور پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ پہلا نقش ہے، اس قسم کی فروگزاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب لکھنے والے پڑھنے والوں کو اور پڑھنے والے لکھنے والوں کو سمجھنے لگیں گے تو یہ شکایت خود بہ خود رفع ہو جائے گی۔

لیکن اتنی بات سے ضرور ہمیں خوشی ہوتی ہو کہ رسالہ شایع ہونے سے پہلے ہی ہرطرف سے اس کے اجرا پر مسرت اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہی، یہاں تک کہ یورپ کے بعض ماہرین فن اور اعلا درجے کے سائنس دانوں نے بھی جوش اور خلوص کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا ہی اور اپنے مضمون مرحمت فرمائے ہیں ؛

انجمن نے محض اردو زبان کی ترقی اور اہلِ ملک کی بھلائی کی خاطر اس کٹھن کام کو اپنے ذمے لیا ہی، اس کی کام یابی کا دار و مدار جس قدر ہم پر ہی، اسی قدر ملک والوں پر بھی ہی ؛

قیمت دوسرے رسالوں کے مقابلے میں کسی قدر زائد معلوم ہوئی، لیکن اس میں سراسر مجبوری ہی۔ مضامین لکھوانے کی اجرت اور نقشوں اور بلاکوں کی قیمت اور دوسرے اخراجات جو صرف ایسے ہی رسالے سے مخصوص ہوتے ہیں، اس قدر پڑ جاتے ہیں کہ خرچ کا نکلنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہی۔ پانسو پورے بک جائیں تو صرف خرچ نکل سکتا ہی اور موجودہ حالت میں اس کی توقع نہیں ہو سکتی، ممکن ہو کہ چند سال کی کوشش کے بعد آمد و خرچ برابر ہو جائے ؛

آخر میں، میں ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی ایم، اے۔ پی ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے باوجود اپنی مصروفیتوں کے میری درخواست پر نہایت کشادہ دلی اور ایثار کے ساتھ اس رسالے کی ترتیب کا کام اپنے ذمے لیا ہی اور یہ اس کی کام یابی کی مبارک فال ہی ؛

# مقدمہ رسالۂ معاشیات،

انسانی فطرت کچھ عجیب ہی، جو چیزیں انسان سے سب سے قریب ہیں اُن پر اس کی نظر سب کے بعد پڑتی ہی، اور جو سب سے دُور ہیں ان کا مطالعہ وہ سب سے پہلے کرتا ہی۔ فلکیات کا علم انسان نے سب سے پہلے حاصل کیا، اور اپنی ذات یعنی نفسیات کے علم کا نمبر سب سے بعد میں آیا۔ یہی حال معاشیات کا ہی، جس کا تعلق ہماری زندگی اور زندگی کے ہر شعبے سے قریب تر ہی۔ اسے علم کی حیثیت حاصل ہوئے کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا لیکن اب یہ کیفیت ہی کہ یہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہی، دُوسری ساری تحریکیں اس کے سامنے ماند ہوگئی ہیں بلکہ ہماری زندگی کی ہر تحریک کا اس سے لگاؤ ہی اور بغیر اس کے مسائل سمجھے کوئی تحریک سرسبز اور بار آور نہیں ہوسکتی۔ روٹی کپڑا اور رہنے کا آسرا یہ انسان کی مقدم بنیادی ضروریات ہیں اور یہی معاشیات کے بنیادی عنصر ہیں۔ یوں دیکھنے میں یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہی لیکن حقیقت میں یہ ایسی آسان نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، مالیات، زر، بنکاری، سیاست، سائنس سب سے ہی۔ پھر اب ان کا دائرہ محدود نہیں رہا اور یہ مقامی اور ملکی امور نہیں رہے بلکہ انھوں نے عالم گیر حیثیت حاصل کرلی ہی اور بہ ظاہر ان معمولی چیزوں

کے مسائل ایسے پیچیدہ اور وسیع ہو گئے ہیں کہ ان کو اپنی زبان میں سمجھنا سمجھانا بھی سہل نہیں رہا:۔

معاشی مسائل کا تعلق زمانے کے حالات سے ہے' جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں ان مسائل کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے، نئی نئی مشینوں، سائنس کے عجیب وغریب انکشافات نے زندگی میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے' اور گزشتہ جنگ کے بعد تو معاشیات میں بہت بڑا انقلاب ہو گیا ہے اور اس علم کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ملک کی اصلاح اور خوش حالی کی جدّوجہد میں اس کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ پاکستان میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ شدید ہے کیوں کہ اس کے پاس تو کوئی معاشی اعداد و شمار موجود ہی نہیں، غیر منقسم ہندستان میں اعداد و شمار اُس پیمانے پر تو کبھی بھی جمع نہیں ہوئے جیسے کہ امریکہ کی متحدہ ریاستوں یا یورپ کے بعض ملکوں میں فراہم کیے جاتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ ملک میں تعلیم کی اور تربیت یافتہ لوگوں کی کمی تھی ۔ مثلاً زراعت جو اس برِّعظیم کا سب سے اہم پیشہ ہے اس کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کا کام پٹواریوں کے سپرد ہے، جو صرف مقامی زبان کی معمولی نوشت و خواند سے واقف ہوتے ہیں۔ بعض علاقوں اور خصوصاً دکن میں یہ عہدہ موروثی ہے، اور خاندانی پٹواری ایک معیّنہ رقم کے بدلے میں یہ خدمت دوسرے آدمیوں کو ٹھیکے پر دے دیتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صحیح اعداد و شمار کی فراہمی بڑی دشوار ہو جاتی ہے پھر بھی بعض معاشی کمیشنوں اور کمیٹیوں نے اپنی تحقیقات کے سلسلے میں کافی مواد فراہم کیا۔ نیز حال میں بین اللقوامی اداروں کے واسطے سے کچھ اعداد فراہم کیے گئے، لیکن پاکستان کے وجود میں آنے اور بالخصوص بنگال اور پنجاب کے بٹ جانے سے یہ سارا سامان بکھر منتشر ہو گیا۔ اور اب ہندستان یا پاکستان میں کسی چیز کے متعلق بھی صحیح اعداد و شمار موجود نہیں، ان حالات میں معاشیین کی ذمّہ داریاں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں:۔

اردو کی اشاعت اور ترقی کے ساتھ ہی ساتھ انجمنِ ترقیٔ اردو کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اردو ادب کی کمی پوری کرے۔ کوئی زبان شائستہ اور ادبی ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی جو علمی خیالات ادا کرنے سے قاصر ہے اور جس میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ نہیں۔ اسی بنا پر انجمن نے سنہ ۲۸ ۱۹ء میں رسالہ "سائنس" جاری کیا اور جنوری سنہ ۴۶ء میں رسالہ "معاشیات" نکالا۔ "معاشیات" ڈیڑھ سال تک برابر پابندی سے نکلتا رہا اور ملک میں کافی مقبول ہو گیا کہ سنہ ۴۷ ۱۹ء کے وسط میں ملک کی تقسیم کے بعد حالات کا نقشہ ہی بدل گیا، انجمن کو بھی اس سلسلے میں بہت کچھ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سی عزیز یادگاریں اور نایاب و قیمتی مسودے تلف ہو گئے اور سب سے بڑھ کر نقصان یہ ہوا کہ انجمن کی ساری علمی اور عملی جدّ و جہد ختم ہو گئی۔

بہرحال اب انجمن نے پاکستان کے واسطے ایک علاحدہ مرکز کراچی میں بنالیا ہے اور جب انجمن کو ایک اچھی اور مناسب عمارت مل گئی، اور رفتہ رفتہ کچھ کام کرنے والے بھی جمع ہونے لگے تو ہم نے از سرِ نو کام کا ڈول ڈالا۔

ہندستان کے مسلمانوں نے جن مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا ان میں اُردو زبان کی حفاظت اور اس کی ترویج و اشاعت کو بھی نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ قائدِ اعظمؒ مسلم عوام کے احساسات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے اور ان کو ترجیح دیتے تھے اسی لیے انھوں نے صاف و صریح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:

"پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی"۔

اُردو کو قومی اور سرکاری زبان قرار دینے کے مسئلے پر عوام اور اربابِ فکر سب ہی متفق ہیں لیکن ابھی تک حکومت کی جانب سے اردو کو سرکاری محکموں میں رائج کرنے کی مؤثر تدبیریں اختیار نہیں کی گئیں اور غالباً اس کا سبب یہ غلط فہمی ہے کہ ابھی اردو زبان

سرکاری اور دفتری امور کی انجام دہی کے لیے موزوں نہیں۔ اس قسم کے اندیشوں اور خیالوں کا اظہار کوئی نئی چیز نہیں، لیکن عملی تجربے کے بعد یہ بے بنیاد ثابت ہوئے۔ دُور کیوں جائیے ہمارے سامنے حیدرآباد دکن کی مثال موجود ہے جہاں فارسی کے بجائے اُردو کو سرکاری زبان کا مرتبہ دیا گیا، اور تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود چند ہی سال میں تمام دفتری اور عدالتی کارروائی اسی زبان میں ہونے لگی؛ مدارس اور جامعہ میں اُردو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی اور چند ہی سال میں جامعۂ عثمانیہ نے اس قدر ترقی کر لی کہ نہ صرف فنون اور سائنس بلکہ مغربی طب اور انجنیری تک کی اعلا تعلیم اُردو زبان میں دی جانے لگی۔ اور اب تو یہ شکایت بھی نہیں کی جا سکتی کہ اردو میں جدید علوم کا ذخیرہ نہیں۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ڈھائی سو سے زائد کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان میں سیاست، معاشیات، فلکیات، طبیعیات، کیمیا، ریاضی، تاریخ، قانون، طب اور انجنیری غرض کہ ہر فن کی کتابیں موجود ہیں، ان کتابوں کا ایک سٹ انجمن نے بھی منگوا لیا ہے اور دُوسرا سٹ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی لائبریری میں بھی آ چکا ہے، ان سے پاکستان بہت کچھ استفادہ کر سکتا ہے۔ صرف ایک دلیرانہ اقدام کی ضرورت ہے اس کے بعد کامیابی یقینی ہے۔

اب دنیا کا یہ حال ہے کہ آن میں کچھ ہے آن میں کچھ، اور ہمیں یہ جلدی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد ملک میں علم کے دریا بہا دیں۔ کتابیں لکھنا، اور شایع کرنا، اچھی کتابوں کے ترجمے کرنا بے شک مفید ہے اور یہ بھی ہم کریں گے لیکن یہ کافی نہیں وقت اور کام کی اہمیت کسی اور چیز کی بھی طالب ہے، اس لیے یہ خیال ہوا کہ معاشی مسائل کو ملک میں مقبول کرنے کے لیے رسالہ 'معاشیات'، دوبارہ جاری کیا جائے، اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ پاکستان کے چند ذمّہ دار اور اہل الرّائے معاشیین نے میرے اس خیال سے اتّفاق کیا اور یہ طے کیا گیا کہ اگست سے اس رسالے کو دوبارہ جاری کیا جائے، اور ان سب نے رسالے کو علمی امداد دینے کا وعدہ کیا، چناں چہ ایک مجلسِ ادارت ترتیب دے دی گئی، جس میں

ملک کے اچھے اچھے معاشیین شامل ہیں۔ اس مجلس کی معتمدی کے لیے بھی ہمیں ایک قابل اور مستعد نوجوان کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں جنھیں معاشیات سے خاص لگاؤ ہی اور جن کا مطالعہ وسیع ہی، اور اس قسم کے کام کا تجربہ بھی ہی، ان حالات میں یقین ہی کہ یہ رسالہ بہت جلد مقبولِ خاص و عام ہوگا اور ہم کو پوری پوری امید ہی کہ اُردو کے بہی خواہ جو اسے علمی و ادبی زبان بنانے کے خواہش مند ہیں، اپنی ہر قسم کی اعانت سے محروم نہ رکھیں گے۔

# ہماری ادبی و تنقیدی مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| لکھنؤ کا دبستان شاعری | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | ۱۳/۵۰ |
| غزل اور متغزلین | ,, | ۴/۵۰ |
| جرات، اسکا عہد اور عشقیہ شاعری | ,, | ۲/- |
| نظیر اکبر آبادی اور اسکا عہد | ,, | ۵/- |
| تجربے اور روایت | ,, | ۳/۲۵ |
| آغا حشر اور اُنکے ڈرامے | وقار عظیم | ۵/- |
| فن افسانہ نگاری | ,, | ۵/- |
| داستان سے افسانے تک | ,, | ۱۰/- |
| ہماری داستانیں | ,, | ۱۰/- |
| مختصر تاریخ ادب اردو | ڈاکٹر اعجاز حسین | ۷/- |
| مذہب و شاعری | ,, | ۵/۵۰ |
| دکن میں اردو | نصیرالدین ہاشمی | ۱۰/- |
| اردو ڈرامہ، تاریخ و تنقید | عشرت رحمانی | ۶/۵۰ |
| تذکرے، تبصرے | جلیل قدوائی | ۳/- |
| تنقیدیں و خاکے | ,, | ۳/- |
| تخلیق و تنقید | عبدالسلام | ۳/۵۰ |
| روشن مینار | ڈاکٹر اخترحسین رائے پوری | ۲/۵۰ |
| نقد میر | ڈاکٹر سید عبداللہ | ۹/- |
| نئے پرانے شاعر | ,, | ۹/- |

اردو کی تین مثنویاں خان رشید ۳/۵۰

دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محی الدین زور ۳/۲۵

**اردو مرکز گنپت روڈ لاہور**

مطبوعہ: سن رائز آرٹ پرنٹرز۔ لاہور